ماہنامہ
حکایت
لاہور
سالگرہ نمبر ستمبر 2015ء
ہم نے اپنا آج، آپ کے
کل کیلئے قربان کر دیا!
سالگرہ نمبر ستمبر 2015ء
حکایت
قیمت 110/- روپے

ماہنامہ حکایت لاہور

جلد: 45 | ستمبر 2015ء | شمارہ: 01

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن منیجر: فضل رزاق 0343-4300564
محمد نثار 0322-4515963

قیمت -/110 روپے

ہیڈ آفس 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنگ میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجیے:
monthlyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

اور خدا (کی خوشنودی) کے لئے حج اور عمرے کو پورا کرو۔ اور اگر (رستے میں) روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو) اور جب تک قربانی اپنے مقام نہ پہنچ جائے سر نہ منڈاؤ اور اگر کوئی تم میں بیمار ہو یا اُس کے سر میں کسی طرح کی تکلیف ہو تو اگر وہ سر منڈا لے تو اُس کے بدلے روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے پھر جب (تکلیف دُور ہو کر) تم مطمئن ہو جاؤ۔ تو جو (تم میں) حج کے وقت تک عمرے سے فائدہ اٹھانا چاہے وہ جیسی قربانی میسر ہو کرے اور جس کو (قربانی) نہ ملے وہ تین روزے ایامِ حج میں رکھے اور سات جب واپس ہو۔ یہ پورے دس ہوئے۔ یہ حکم اُس شخص کے لئے ہے جس کے اہل وعیال مکے میں نہ رہتے ہوں اور خدا سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ خدا سخت عذاب دینے والا ہے (۱۹۶)

سورۃ البقرہ

اس شمارے میں

اس شمارے میں

عالم بغیر عمل کے، درخت بغیر پھل، توپ بغیر گولے کے، قانون بغیر عمل درآمد کے، کنواں بغیر پانی کے [illegible] نظم و ضبط کے، معاشرہ بغیر انصاف کے، حکمران بغیر ساکھ کے سب راکھ کا ڈھیر ہے۔

کرپشن اور جھوٹ ہماری پہچان ہے۔ ہم دو نمبر کاموں میں ایک نمبر لوگ ہیں۔ ہم نے ایسی ایسی وارداتیں ایجاد کی ہیں کہ شیطان بھی توبہ توبہ کرنے لگے اور خود جرم کو بھی پسینہ آ جائے۔ مثلاً جنگل تو ہم نے بیچ ہی دیے تھے، گلیشیئر توڑ کر ان کی برف بیچنے کا اچھوتا آئیڈیا بھی ہمارے زرخیز ذہن میں ہی اترا۔ دودھ میں پانی [illegible] ملاوٹ تو ہماری شناخت تھی ہی کہ ہم نے ایک اور ٹیکنالوجی متعارف کرادی کہ تکبیر پڑھ کر جانور ذبح کرنے سے پہلے اس کی شہ رگ میں پانی انجیکٹ کرکے اس کا وزن بڑھا دو تاکہ حلال آمدنی میں چند کلو مزید حلال شامل ہو جائے۔ بالکل ایسے ہی کرپشن ہماری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے غالباً یہ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہوئی تھی۔ پاکستان کے معرض وجود میں آتے ہی جائیدادوں کے جعلی کلیم اور جعلی ذاتیں بھی ساتھ ہی معرض وجود میں آ گئی تھیں۔ دنیا کی تاریخ میں ہم ہی شاید وہ پہلا اور آخری معاشرہ ہیں جہاں لوگوں نے تھوک کے حساب سے اپنی ذاتیں، شناختیں، ولدیتیں تبدیل کیں۔ سو جھوٹے کلیموں اور جھوٹی ذاتوں سے شروع ہونے والا یہ شعور چلتے چلتے جعلی ڈگریوں تک آ پہنچا۔

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

آپ بھی کبھی نہ کبھی اس تجربے سے ضرور گزرے ہوں گے کہ [illegible] کوئی حرکت کی اور پکڑے گئے اور شرمندہ شرمندہ سے آپ ہو گئے۔ حالانکہ لینا ایک نہ دینے دو۔ آپ نے ایسی قسم کی شرمندگی تو ہم بھی جھیلتا ہے کہ کیا دھرا کسی اور کا ہے اور ندامت قوم کو ہو رہی ہے۔ سابق وزیراعظم یوسف رضا گیلانی ماشاءاللہ خاندانی آدمی ہیں، گدی ان کے خون میں رچی بسی ہے اور ملک کی سب سے بڑی گدی بھی دیکھ چکے۔ ترک خاتون اول کی طرف سے [illegible] سیلاب کے لیے دیا گیا ہار انہیں نادرا کو واپس کرنا پڑا۔ جس ترک خاتون اول کا یہ ہار ہے ان کے میاں کبھی استنبول کی گلیوں میں شربت بیچا کرتے تھے۔ پھر سیاست میں آئے اور وزارت عظمیٰ کے منصب تک جا پہنچے۔

پاکستان کی عزت اور وقار کے حصول کے لیے ہمیں اپنے گریبانوں میں جھانکنا اور اپنے لیڈروں کے بارے میں سوچنا ہوگا کہ عالم اسلام کی قیادت کن ہاتھوں میں ہے۔ یہ سونے کے پجاری ہمیں کبھی سرخرو نہ ہونے دیں گے۔ مغربی حکمرانوں میں سے کتنے ہیں جنہیں دولت کے انبار لگانے اور سونا جمع کرنے کا جنون ہوا!

صدر زین العابدین کے منوں سونے سے لے کر سونے کے اس پستول پر غور کریں جو قتل کے وقت معمر قذافی کے ہاتھ میں تھا۔ ہاں مغرب کے حکمرانوں کی تو عورتیں بھی سونے، جواہرات میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔ کبھی دیکھا، جیسا مرکل، ہیلری کلنٹن، مشعل اوباما اور کونڈا لیزا رائس جیسی عورتوں کو؟ انہوں نے تو زیور کی تعریف (Defination) ہی تبدیل کر دی ہے اور ہمارے حکمران مرد بھی ہیرے جواہرات اور قیمتی دھاتوں کے دیوانے ہیں [illegible]

دستگیر شہزاد

خصوصی فیچر

لڑاؤ اور اسلحہ بیچو

دنیا کے بڑے ممالک میں دن رات اسلحہ ساز فیکٹریاں ہر قسم کا اسلحہ تیار کر رہی ہیں۔ یہ سپر طاقتیں اپنا اسلحہ بیچنے کے لئے مختلف ممالک میں جنگیں کراتی ہیں۔

☆ افضال مظہر انجم
afzalmazhar@gmail.com

یورپ

امریکہ عرصہ دراز سے اپنی مضبوط معیشت کی وجہ سے دنیا پر راج کر رہے ہیں۔ ان کی کھربوں ڈالر کی معیشت میں اربوں ڈالر کی ایکسپورٹ معیشت کے لئے بت بڑا اسہارا ہے۔ سائنسی وتکنیکی طور پر بہت آگے ہونے کی وجہ سے ان کی الیکٹرونکس کی اشیاء آٹو موبائل بشمول طیارہ ساز صنعت، ہیوی مشینری کی صنعت ملک میں اربوں ڈالر کا زرمبادلہ لانے کا باعث ہے۔ ان صنعتوں کے علاوہ ایک اور صنعت جو ان ممالک کے لئے اربوں ڈالر کی کمائی کا ذریعہ ہے وہ اسلحہ سازی کی صنعت ہے۔ یوں تو اسلحہ سازی میں ٹینک، توپیں، گولہ بارود اور اربوں ڈالر مالیت کے جنگی جہاز تک شامل ہیں لیکن موجودہ دور میں نت نئے تجربات کی روشنی میں کسی بھی ملک کے لئے کارآمد فاعی سامان خواہ وہ ایڈوانس کمپیوٹر، سپر کمپیوٹر کی شکل میں ہو۔ میزائل، سب میرین، ڈرون، طیارہ بردار بحری جہاز کی شکل میں دنیا کے ممالک کے لئے اپنے دفاع کی خاطر جدید سے جدید اسلحہ حملہ، دفاع یا حفاظتی انتظامات کے لئے جدید ٹیکنالوجی سے مزین ان انسٹرومنٹس کا حصول انتہائی کشش کا باعث ہے۔

حامی یا پروردہ ممالک کو اسلحہ کی فراہمی

سپر طاقتوں کا عرصہ دراز سے اپنے اپنے حامی یا پروردہ ممالک کو اسلحہ کی فراہمی کا سلسلہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے مسلسل جاری ہے۔ اس جنگ عظیم میں سپر

خوشحالی کی بجائے اسلحہ کی خریداری کے لئے خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ملاحظہ کریں۔

☆لبنان جیسے چھوٹے ملک نے فرانس سے 3 ارب ڈالر کا اسلحہ حاصل کیا۔

☆1992ء تا 1997ء تک صرف سعودی عرب نے 66 ارب 10 کروڑ ڈالر اور تائیوان نے 20 ارب 60 کروڑ ڈالر کا اسلحہ خریدا۔

☆2012ء میں عمان جیسے چھوٹے ملک کا برطانیہ کے ساتھ 4 ارب 10 کروڑ ڈالر کا معاہدہ ہوا۔

اسلحہ فروخت کرنے والے ممالک

2014ء میں اسلحہ کی ایکسپورٹ کرنے والے ممالک کی فہرست سے اندازہ کریں کہ صرف ایک سال میں بڑے ممالک نے کتنا اسلحہ تیار کر کے دیگر ممالک کو ایکسپورٹ کیا۔

امریکہ	10194 ملین ڈالر
روس	5971 ملین ڈالر
چین	1978 ملین ڈالر
فرانس	1200 ملین ڈالر
برطانیہ	1083 ملین ڈالر
اسرائیل	1073 ملین ڈالر
جرمنی	1110 ملین ڈالر

اسلحہ کے خریدار ممالک 2014ء

سعودی عرب	4243 ملین ڈالر
انڈیا	2629 ملین ڈالر
ترکی	1550 ملین ڈالر
چین	1357 ملین ڈالر
انڈونیشیا	1200 ملین ڈالر
ویت نام	1058 ملین ڈالر
تائیوان	1039 ملین ڈالر
یو اے ای	1031 ملین ڈالر
پاکستان	659 ملین ڈالر

اسلحہ بنانے والے 10 بڑے ادارے

دنیا میں اسلحہ مع طیارہ سازی 10 ٹاپ اداروں کی لسٹ ملاحظہ کریں۔ ان صنعتوں میں ان ممالک کی کھربوں ڈالر کی سرمایہ کاری ہوئی ہے اور ان ممالک کی معیشت میں اربوں ڈالر کے اسلحہ کی فروخت سے ان ممالک کی معیشت کو مضبوط سہارا ملا ہوا ہے۔

☆تھیلز (Thales) فرانس: 10370 ملین ڈالر

☆لاک ہیڈ مارٹن (Lock head martin) امریکہ: 35490 ملین ڈالر

☆بوئنگ (Boing) امریکہ: 3700 ملین ڈالر

☆بی اے ای سسٹمز (BAE System) برطانیہ 26820 ملین ڈالر

☆ریتھی آن (Raytheon) امریکہ: 21950 ملین ڈالر

☆نارتھ روپی (Northropyuman) امریکہ 20200 ملین ڈالر

☆جنرل ڈائنامیکس (General Dynamics) امریکہ: 18660 ملین ڈالر

☆ای اے ڈی ایس (EADS) یورپ 15740 ملین ڈالر

☆یونائیٹڈ (United Technologies) امریکہ 11900 ملین ڈالر

☆فنمے کینیکا (Finmeccanico) اٹلی 10560 ملین ڈالر

"اے ابراہیم! تُو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ ہم یوں ہی اچھا کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

جمعیتِ آدم
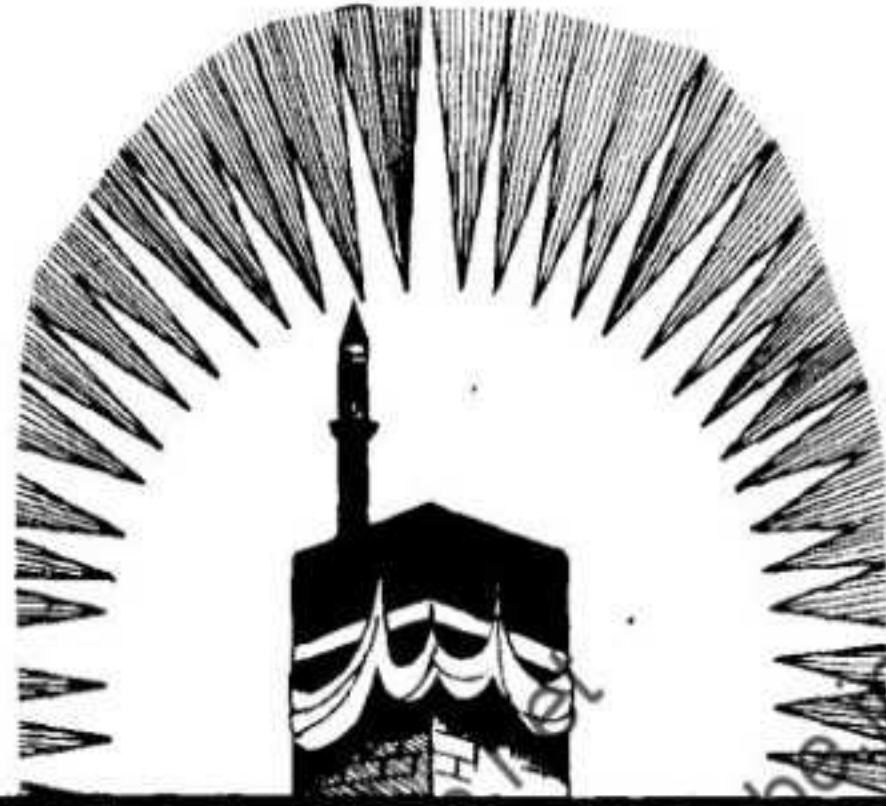
☆ محمد اعظم

ہزاروں سال ہوئے خطۂ کلدان (بابل) کے شہر اُر کے چند باشندوں کا ایک مختصر سا قافلہ، جس کے قائد دنیا کے برگزیدہ پیغمبر حضرت ابراہیمؑ تھے، سواری کے چند جانور اور قلیل ساز اور راہ لئے سرگرم سفر تھے۔

ابراہیمؑ نے جب ہوش سنبھالا تو بقول مولانا ابوالکلام آزاد "تاروں کی عجیب و غریب روشنی ان کے سامنے آئی، چاند کی دلفریبی نے کو آزمانا چاہا اور سورج اپنی سطوت و عظمت سے چمکا تاکہ ان کی فطرت کو مرعوب کر سکے۔ تو "اسلام" ہی تھا جس نے اندر سے صدا دی کہ "میں فنا پذیر ہستیوں (آفلین) کو دوست نہیں رکھتا۔ میں ہر طرف سے کٹ کر صرف اس ایک ہی ذات کا ہوگیا ہوں جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا۔ الحمدللہ کہ میں مشرکوں سے نہیں ہوں۔

انہوں نے جب آنکھ کھولی تو ان کے چاروں طرف بت پرستی کے مناظر تھے۔ انہوں نے خود اپنے گھر کے اندر جس کسی کو دیکھا اس کے ہاتھ میں سنگ تراشی کے اوزار اور بتوں کے ڈھانچے تھے۔ وہ کلدان کے بازاروں میں پھرے مگر جس طرف دیکھا بتوں کے آگے جھکے ہوئے سر تھے اور جس طرف کان لگایا خدا فراموشی کی صدائیں آ رہی تھیں۔ وہ کون سی چیز تھی جس نے تمام ان چیزوں کو ہٹا کر جو آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی جاتی تھیں ان کے دل میں ایک ان دیکھے محبوب کی لگن لگا دی؟ اور ایک ان سنے نغمے کی تلاش میں ان کے سامع کو آوارہ کر دیا؟ ان کے سامنے تو بتوں کی قطاریں تھیں جن کو ان کی آنکھیں دیکھتی تھیں۔ پھر وہ کون تھا جو ان کے اندر بیٹھا خدائے قدوس کو دیکھ رہا تھا اور اس قدرتی جوش و قوت کے ساتھ، جو کسی بلندی سے گرنے والے آبشار یا کسی زمین سے ابلتے ہوئے چشمے میں ہوتا ہے۔ ان کی زبان سے فاطر السموات والارض کی یہ شہادت کی راہیں کھول دیں۔ وہ، کہ بھوکا ہوں تو کھلاتا اور پیاسا ہوں تو پلاتا ہے اور وہ، کہ جب بیمار پڑتا ہوں تو اپنی رحمت سے شفا دے دیتا ہے۔ جو موت کے بعد حیات بخشے گا اور جس کی رحمت سے امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میری خطاؤں سے درگزر کرے گا" اور پھر یہ کیا تھا کہ

جب ان کا سنگ تراش چچا پتھروں سے پرستش کی صورتیں بناتا تھا تو بے اختیار ان کی زبان سے نکلتا تھا کہ "تم جن بت پرستیوں میں مبتلا ہو مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت سے سرفراز فرمایا اور آپ نے اعلائے کلمتہ الحق کا فریضہ ادا کرنا شروع کیا۔ آپ نے سب سے پہلے گھر والوں کو دعوت توحید دی اور پھر عام لوگوں کو اللہ کے دین اسلام کی طرف بلایا لیکن وہ بد بختانِ ازلی اپنے آبائی مسلک کو کسی قیمت ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ الٹا ان کے در پے آزار ہو گئے اور شہنشاہ نمرود سے فریاد کرنے لگے۔ چنانچہ آپ کو گرفتار کر کے دربار شاہی میں پیش کر دیا گیا۔ اللہ کے اس پیغمبر کے لئے یہ بہت بڑی آزمائش تھی لیکن آپ اس میں پورے اترے اور دشمنانِ دین نامراد اور خاسر رہے۔

جب ابنائے وطن اور حاکم وقت اپنے آبائی مسلک کو کب پرستی اور اصنام پرستی کو چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے تو آپ مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور سرزمین فلسطین کی طرف روانہ ہو گئے۔

مولانا سیمان ندوی فرماتے ہیں: "حضرت ابراہیم نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رخ کیا اور بحر میت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط کو آباد کیا۔ اپنے بیٹے حضرت اسحاق کو کنعان میں بسایا۔ اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جس کو ان کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسمٰعیل کی سکونت مقرر کی"۔

یہ سب کچھ آپ نے مشیت ایزدی کے مطابق کیا تھا۔ جس نے آپ کے مقدر میں انبیائے کرام کی دو شاخوں بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کا مورثِ اعلیٰ ہونا لکھ دیا تھا۔

جب آپ حضرت اسمٰعیل کو لے کر وادی فاران (حجاز) کی طرف چلے تو وہ ابھی شیر خوار تھے۔ ان کی والدہ ماجدہ حضرت ہاجرہ بھی ہمراہ تھیں۔ آپ نے ان دونوں کو اس مقام پر چھوڑا جہاں اب مکہ آباد ہے۔ علامہ سیمان ندوی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا۔ قبول حق ایک طرف اس وسیع خطہ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا۔ حضرت ابراہیم نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا۔ مصر آئے، ناموس کو خطرے کا سامان ہوا۔ فلسطین پہنچے کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ خدا کا جہاں نام لیتے تھے شرک اور بت پرستی کے غلغلے میں آواز دب کر رہ جاتی تھی۔ معمورۂ عالم کے سفحے نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے۔ اب ایک سادہ، بے رنگ قسم کے نقش و نگار سے معرا ورق درکار تھا جس پر طغرائے حق لکھا جائے۔ یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا جو تمدن اور عمران کے ہر داغ سے کبھی داغدار نہ ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم، حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیل کو عرب میں لائے اور ان کو یہیں آباد کیا"۔ وہ مقام جہاں ابراہیم نے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو آباد کیا، مکہ تھا۔

جب ابراہیم کی دوسری بیوی سارہ جو اسحٰق کی والدہ تھیں، نے انتقال کیا تو ابراہیم دوبارہ مکے آئے اور دیکھا کہ اسمٰعیل اب جوان ہو چکے ہیں۔ ابراہیم نے اس عرصے میں ایک عجیب خواب دیکھا۔ آپ نے اسمٰعیل سے کہا: "اے فرزند! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے؟"

اسمٰعیل نے بلا پس و پیش جواب دیا۔ "ابا جان! جس بات کے لئے آپ سے کہا گیا ہے اسے فی الفور پورا

کیجئے۔ ان شاء اللہ، آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے“۔

ابراہیم اپنے فرزند اسمٰعیل کو لے کر ایک مقام پر پہنچے اور اسمٰعیل کو زمین پر لٹا دیا۔ ہاتھ میں تیز چھری پکڑ لی۔ دونوں اللہ کے بندوں نے رضائے الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ ابراہیم چھری کے وار سے اسمٰعیل کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے والے تھے کہ آواز آئی۔

”اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ ہم یوں ہی اچھا کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔ حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان اور ہم نے ایک بہت بڑی قربانی کے عوض اسے ذبح ہونے سے بچالیا اور ہم نے بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے اس واقعے کی یاد کو باقی رکھا۔ ابراہیم پر سلامتی ہو۔ ہم نیکوں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں۔ بلاشبہ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا“۔
(صفت 107 تا 111)

باپ بیٹے کی اطاعت شعاری خدا تعالیٰ کو پسند آ گئی اور اس نے ایک ”ذبح عظیم“ (بہت بڑی قربانی) کے لئے اسمٰعیل کو ذبح ہونے سے بچا لیا۔ یہ ”بڑی قربانی“ کیا تھی۔ مولانا سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔ ”اور عین اس وقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی اللہ کا حکم سن کر گردن جھکا دی تھی تو آواز آئی تھی۔ اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لئے مخصوص کر دینا اور اس کے ذریعے اس گھر کو دائرہ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے“۔

ابراہیم نے اسی اثنا میں خانہ کعبہ کی بنیاد رکھی۔ باپ بیٹا دونوں اس کی تعمیر میں لگ گئے۔ اسمٰعیل پتھر اور گارا ڈھوتے اور ابراہیم اپنے مبارک ہاتھوں سے اسے تعمیر کرتے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

”اور (پھر دیکھو وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا) جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیاد چن رہا تھا اور اسمٰعیل بھی اس کے ساتھ شریک تھا (ان کے ہاتھ تو پتھر چن رہے تھے اور دل و زبان پر یہ دعا طاری تھی) اے ہمارے پروردگار (ہم تیرے دو عاجز بندے، تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں سو) ہمارا یہ عمل تیرے حضور مقبول ہو۔ بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم ہو جائیں اور ہماری نسل سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرماں بردار ہو۔ خدایا ہمیں عبادت کے طور طریقے بتلا دے اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر۔ بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزری کی کوئی انتہا نہیں اور خدایا ایسا کیجئے کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے۔ کتاب اور حکمت کی انہیں تعلیم دے اور ان کے دلوں کو مانجھ دے۔ اے پروردگار بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے“۔ (بقرہ 127 تا 129)

جب ابراہیم اور اسمٰعیل اللہ کا گھر تعمیر کر چکے تو حکم ہوا۔ اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے۔ وہ تیرے پاس پیادہ اور دور کے سفر سے تھکی ماندی، دبلی سواریوں پر ہر دور و دراز راستے سے آئیں گے تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چوپائے جانور روزی دیئے ہیں ان کی قربانی پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام لیں تو ان سے کچھ کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ اس کے بعد میل کچیل دور کریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں“۔ (الحج 27-29)

چنانچہ اس مقدس اعلان کے بعد زمین حجاز میں حج شروع ہو گیا۔ ابراہیم و اسمٰعیل کی تعلیمات پر عمل کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں مکے آنے اور مناسک حج ادا کرنے لگے۔

مرورِ زمانہ سے ان مناسک میں تبدیلیاں رُونما ہونے لگیں۔ لوگوں نے حج کو مشرکانہ رسوم کا مجموعہ بنا لیا۔ اس گھر میں جو توحید کا واحد مرکز تھا، بے شمار بت نصب کر دیئے گئے اور ان کی پرستش کرنے لگے اور ہر طرف فسق و فجور کا دور دورہ ہو گیا۔

یکا یک رحمت حق جوش میں آئی اور مکے کے ایک معزز قبیلے بنو ہاشم میں، جو حضرت اسمٰعیلؑ کی شاخ سے تھا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا۔ آپ نے منصب نبوت پر فائز ہو کر توحید خالص کی تبلیغ کی اور اس راہ میں آپ کو بھی سنت ابراہیمی کے مطابق مکے سے ہجرت کر کے مدینے میں آباد ہونا پڑا۔ آپ نے راہ حق میں بڑے بڑے مصائب و آلام برداشت کیے، کفار مکہ اور یہودیوں سے کئی خونی معرکے لڑنے پڑے۔ آخر کار تائید ایزدی سے آپ نے مکے کو فتح کر کے خانہ کعبہ کو بتوں کی لعنت سے پاک و صاف کیا اور حج ادا کیا۔ اس روز سے آج تک ہر سال دنیا کے کونے کونے سے صاحب استطاعت اصحاب حج ادا کرتے ہیں۔

مسلمان صدیوں سے حج اور مناسک حج ادا کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ادا کرتے رہیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ حج ادا کر کے اس کا صحیح مقصد کماحقہ پورا کرتے ہیں۔ مولانا سلیمان ندوی اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''مسلمان ڈیڑھ سو برس تک، جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے، حج کا موسم ان کے سیاسی اور تنظیمی ادارے کا سب سے بڑا عنصر رہا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات طے پا جاتے تھے۔ اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے اور مختلف ملکوں کی رعایا آ آ کر اپنے والیوں اور حکاموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھیں اور انصاف پاتی تھیں۔ یہ اسی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے۔ ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں۔ جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اور ان پر آنے والے امتحانات کے متعلق تو ہر سال ذی الحجہ کے مہینے میں علمائے کرام بیان کرتے رہتے ہیں لیکن ابراہیمؑ کے وطن کے متعلق معلومات نہیں دیتے۔ میرا مقصد اس علاقے کی اور اس کے معاشرتی اور مذہبی حالات کے متعلق معلومات مہیا کرتا ہیں جو یقیناً آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

جدید تحقیقات میں وہ علاقہ اور شہر دریافت ہو گئے ہیں جہاں ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا تھا۔

اندازہ لگایا گیا کہ 2100ء قبل مسیح کے لگ بھگ کے دور میں یہ علاقہ خوب آباد تھا۔ یہ علاقہ عراق کے شمال اور مغرب میں پھیلا ہوا تھا اس کے صدر مقام کا نام اُر تھا۔ اس شہر کی آبادی اس زمانے میں اڑھائی سے چار لاکھ کے درمیان تھی۔ اس حکومت کے تجارتی تعلقات پامیر سے اناطولیہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس ملک کی زیادہ آبادی یا تو تجارت پیشہ تھی یا پھر کسی نہ کسی صنعت کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اس زمانے کے کھنڈروں سے جو تحریریں ملی ہیں ان کے مطابق یہاں کے لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ اپنے خداؤں سے ان کی دعائیں زیادہ تر درازیٔ عمر، خوش حالی اور کاروبار میں ترقی کے لئے ہوتی تھیں اس ملک کی آبادی تین طبقوں پر

مشتمل تھی۔

1- عمیلو: جس میں اونچے طبقے کے لوگ یعنی پجاری، عہدہ دار اور فوجی افسر شامل تھے۔

2- مشکینو: تجارت، زراعت اور صنعت سے وابستہ لوگ۔

3- اردو: غلام اور خدمتگار لوگ۔

ان میں پہلے طبقے کے لوگ چونکہ خاص امتیاز رکھتے تھے اس لئے اس کے حقوق بھی زیادہ تھے اور ان کی جان و مال کی قیمت بھی دوسرے طبقوں سے زیادہ تھی۔

ابراہیمؑ کے والد بھی اسی پہلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ریاست کے کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔

کھنڈرات سے ملنے والی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس ملک کے کئی ہزار خدا تھے ہر شہر کا ایک محافظ خدا تھا جو "رئیس البلد" یعنی شہر کا بڑا بزرگ کہلاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔

اُر شہر کا رب البلد "نتار" تھا اسی طرح دوسرا اہم شہر ارسہ تھا۔ اس کا رب البلد شماش تھا اس طرح ان بڑے خداؤں کے ماتحت چھوٹے چھوٹے خدا بھی جن کے نام آسمانی ستاروں اور سیاروں کے ناموں پر رکھے گئے تھے ان خداؤں اور دیوتاؤں کی شبیہیں بنا کر لوگوں نے گھروں میں بھی رکھی ہوئی تھیں اور گھروں میں ہی ان بتوں کے آگے اپنی رسم عبادت پوری کر لیتے تھے۔

نتار بت کو چونکہ ممتاز مقام حاصل تھا اس لئے اس بت کو اُر شہر میں ایک پہاڑی کے اوپر بنی ایک عالی شان عمارت میں نصب کیا گیا تھا اور اس عمارت کی شان ایک محل جیسی تھی۔ مندر میں بہت سی عورتیں اس دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں جیسی تھی اور مندر کے پجاری بھی ان دیوداسیوں سے خدمت کرا لیا کرتے تھے۔

نتار محسن ایک دیوتا ہی نہ تھا بلکہ وہ ملک کا ایک بڑا زمیندار، بڑا تاجر اور بڑا کارخانہ دار بھی تھا یعنی بکثرت باغات، زمینیں مکانات اور کارخانے اس دیوتا کے نام پر وقف تھے اور ان سے حاصل ہونے والی آمدن کے علاوہ بھی لوگ اپنی مرادیں مانگنے کے لئے غلہ، دودھ، کپڑا، سونا، چاندی اور دوسری چیزیں اس بت کی نذر کرتے تھے اور ان تمام معاملات کی دیکھ بھال کے لئے ایک بڑا سٹاف موجود تھا۔

اس کے علاوہ ملک کی ایک بڑی عدالت اسی مندر میں قائم تھی۔ جس کے جج اس مندر کے بڑے پجاری تھے اور ان کے فیصلے خدائی فیصلے سمجھ کر قبول کر کئے جاتے تھے۔

جو شاہی خاندان ابراہیمؑ کے زمانے میں برسراقتدار تھا اس خاندان کے بانی کا نام نمو تھا اور یہ سلطنت 2300 ق م میں قائم ہوئی تھی اسی کے نام سے اس خاندان کو نمو کا نام ملا جو عربی زبان میں نمرود ہو گیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے تو اس ملک سے ہجرت کر لی کیونکہ وہاں کے لوگ ان کا پیغام سننے کو تیار نہیں تھے لیکن حضرت ابراہیمؑ کے چلے جانے کے بعد اس خاندان پر مسلسل تباہی نازل ہونی شروع ہو گئی۔ پہلے عیلامیوں نے ارو تباہ کیا اور نتار کے بت کو بھی اٹھا کر لے گئے اور وہ بڑا خدا ان کے کسی کام نہ آیا اور یہ علاقہ عیلامیوں کے غلام کی حیثیت اختیار کر گیا ایک عرصے بعد بابل میں ایک عربی خاندان نے زور پکڑا اور یہ علاقہ فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا اور یوں نتار پر لوگوں کا یقین ختم ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد جس کا تعین نہیں کیا جا سکتا اس ملک کے لوگوں نے ابراہیمؑ کی تعلیمات کا اثر قبول کر لیا چونکہ 1910 ق م میں یہاں کے بادشاہ حمورابی نے ملک کے لئے جو قوانین مرتب کئے تھے ان قوانین میں مشکوٰۃ نبوت سے حاصل کی گئی روشنی واضح نظر آتی ہے۔

✿○✿

بارود میں پھول

پاک فوج کے ایک آفیسر کی ڈائری کے چند ورق۔ شہید نے ٹینکوں، توپوں کی گولہ باری اور بارود کی آگ میں محبت کے دھنک رنگ پھول کھلا رکھے تھے۔

☆ زبیدہ یوسف

محترم عارف محمود صاحب! یہ ڈائری میرے قریبی عزیز میجر ندیم سیال شہید کی ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ وہ کمانڈنگ آفیسر کے حکم پر ایک مشن پر گئے تھے پھر وہ اپنے مشن سے واپس نہ آئے۔ اللہ نے ان کی آرزو پوری کردی۔ وہ دشمن کی صفوں میں اتنی دور تک گھس گئے تھے کہ وہاں سے زندہ آنا تقریباً ناممکن تھا۔ غالباً انہوں نے زندگی کا ارفع اور اعلیٰ مقصد پالیا تھا۔ یہ ڈائری ان کے جسد خاکی کے ساتھ گھر آئی تھی۔ یہ ایک فوجی افسر کے احساسات ہیں، سچے اور سادہ غالباً ان میں ادب کی چاشنی نہ ہوگی اس کے باوجود اگر آپ مناسب سمجھیں تو چھاپ دیں کم از کم کسی کو اپنی اہمیت کا احساس تو ہو جائے گا اور ممکن ہے وہ احساس میجر صاحب کی روح کو سکون دے سکے۔

25 اگست 1965ء

ابھی ابھی مجھے میرے اردلی نے جگا دیا ہے اور میں گرم گرم چائے پی رہا ہوں، میرا اردلی بوٹوں پر پالش کر رہا ہے اور میں سوچتا ہوں وہ ایسا کیوں کر رہا ہے!

جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں، میں بھی اپنی کمپنی
کے ساتھ جلد سے یہاں سے چلا جاؤں گا، بھارتیوں نے
اعوان شریف پر گولہ باری کر کے اچھا نہیں کیا۔ جنگ مجھے
بہت قریب تر محسوس ہو رہی ہے اور میں اپنے دل میں
اعتماد اور سکون کی لہر کو محسوس کرتا ہوں۔ ملٹری اکیڈمی کی
تربیت، استادوں کی نصیحت اور میرا پندرہ سالہ فوجی تجربہ،
مجھے ہر آزمائش کے لئے تیار پا رہا ہے۔ میں جب اپنے
سپاہیوں میں ہوتا ہوں تو مجھے کتنا سکون ملتا ہے۔ اس
وقت اور صرف اس وقت تمہارا خیال مجھے نہیں آتا۔ ورنہ
میرا ہر لمحہ تیری قربت میں گزرتا ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا
ہوں اگر تم مجھے مل جاتیں تو کیا یہ درد، جو میری زندگی کا
حصہ بن گیا ہے، پھر بھی باقی رہتا؟ اچھا ہوا کہ تم نے مجھے
ٹھکرا دیا۔ مجھے غلطی کی سزا تو ملنی ہی چاہئے تھی۔ نہ جانے
ذہن کے کس کونے میں وہ شعر میری یادوں کے افق پر آ
گیا ہے جو میں نے تمہیں سینما کے باہر سنایا تھا۔ آہ! وہ
دن کیا دن تھا جب تم چوہدری کے ساتھ سینما سے نکل رہی تھیں
اور اتفاقاً ہماری ملاقات ہو گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ تم مجھ
سے بہت دور ہو لیکن نہ جانے میں نے آس لگائی ہی
کیوں تھی؟ تم نے تو کبھی بھی مجھے پیار بھری نظروں سے نہ
دیکھا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے مجھے یہ احساس کیوں
ہوا کہ تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں لیکن اسی روز میرے
خواب بکھر گئے تھے۔ جب تم نے کیفے میں چائے پیتے
ہوئے کہا تھا۔ کوئی شعر ہی سنائیے اور اس کے جواب میں
نہ جانے کیسے میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

اے دل کے نصیب ہے توفیق اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

6 ستمبر 1965ء

آخر وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا۔ آج مجھے کوچ کا
حکم مل گیا ہے اور میں اپنی کمپنی کے ساتھ محاذ پر جا رہا
ہوں۔ ہندوستان نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے۔ ایک دن تو
یہ ہونا ہی تھا کیونکہ ہمارا وجود ہندوستان کو کبھی بھی پسند نہ
تھا۔ ان کے خیال میں بھارت ماتا کے ہم نے ٹکڑے کر
دیئے ہیں اور وہ اسے پھر جوڑنا چاہتے ہیں۔ میرے دل
میں کوئی خوف کوئی پریشانی اور کوئی دکھ نہیں۔ سوائے ایک
نامعلوم درد کے جو تمہاری جدائی نے مجھے بخشا ہے۔ صبح ہی
صبح میں روانہ ہو گیا تھا۔ گوجرانوالہ سے گزرتے ہوئے
دل میں ٹیس سی اٹھی تھی۔ غالباً تم اس وقت سو رہی ہو گی۔
جانے کوئی خواب دیکھ رہی ہو گی۔ میں یہ جانتے ہوئے
بھی کہ تمہارا گھر صرف دو سو گز کے فاصلے پر ہے۔ میں تم
سے ملنے نہ آیا۔ آخر فاصلہ ہی کتنا تھا۔ اب تو زندگی کی
قدریں ہی بدل گئی ہیں۔ اس وقت میری سوچ صرف
میرے خوابوں کی کارگزاری پر لگی ہوئی ہے۔ خدا ہمیں
کامیاب کرے۔ بھلا میں کیا کھالے بیٹھا۔ زندگی اسی کا
نام تو نہیں لیکن میں کیا کروں کہ تمہارے شہر سے گزرتے
ہوئے تمہاری یاد میرے ذہن پر ہتھوڑے لگا رہی ہے اور
میں نے اپنی اس خواہش کو کتنے زوروں سے دبا دیا ہے کہ
صرف ایک بار تمہیں اور دیکھوں۔ اس کشمکش میں تمہارا
گھر اور تمہارا شہر بہت پیچھے رہ گیا اور اب میں زندگی کی
حقیقتوں سے دوچار ہونے کے لئے تیار ہو گیا ہوں۔ گولہ
باری کی آوازیں کانوں میں آنے لگی ہیں اور منزل مقصود
کے قریب ہوں۔ آج میرا اور میرے جوانوں کا امتحان
ہے۔ میرے ریڈیو پر "وقت شہادت ہے آیا" بج رہا ہے
اور مجھے ایک سکون سا مل رہا ہے۔ اگر میں تمہیں نہ دیکھ سکا
یا نہ مل سکا تو یہ ضرور سمجھنا کہ مرتے وقت بھی تمہارا خیال
تمہاری تمنا اور تمہیں چھو لینے کی ایک حسرت ضرور تھی۔
یقین کرو کہ تمہاری محبت نے مجھے مرنے کے انداز
سکھائے ہیں اور میں اسی بانکپن سے شہید ہوں گا کہ جس
شدت سے میں نے تمہیں چاہا تھا۔

6 بجے شام میں نے اپنی کمپنی کو مورچے کھودنے کا

حکم دیا۔ جوانوں نے مورچے کھودنے شروع کر دیئے ہیں۔ میرا صوبیدار یٰسین جو گجرات کا رہنے والا حسین اور دلاور جوان ہے۔ میرے ساتھ کھڑا جنگ کی صورتِ حال پر تبصرہ کر رہا ہے۔ اس کا وجیہہ چہرہ میرے سامنے ہے۔ وہ گولیوں سے بھرا ہوا پستول لگائے اپنی زائد گولیوں کو گن رہا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ میرے ماتحت چار سال سے کام کر رہا ہے۔ اس کے گھریلو حالات کو صرف میں جانتا ہوں۔ وہ ایک باعزت اور شریف گھرانے کا فرد ہے۔ مجھے معلوم ہے اس کے دل میں بھی محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ اس کی آغاز محبت کی داستان جو اس نے مجھے اس وقت سنائی تھی جب وہ محاذ پر جا رہا تھا اور آج ہم دونوں گولیوں کی بوچھاڑ میں کھڑے صرف جنگی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔

7 ستمبر 1965ء

رات بھر مورچوں کی دیکھ بھال اور دشمن کے متوقع حملہ کی تدابیر پر غور کرتا رہا۔ دشمن کے ہوائی جہازوں نے آج صبح ہی صبح بہت سخت حملہ کیا تھا مگر ہمارے دو شاہینوں نے چھ جہازوں کو مار بھگایا۔ دشمن کی گولہ باری سے میرا تمام جسم دھوئیں سے کالا ہو گیا ہے لیکن میری روح کے نہ جانے کون سے کونے میں تم چھپی ہوئی ہو۔ اے کاش! تم مجسم ہو کر میرے سامنے آ جاتیں تو میں تمہیں اپنے دل میں رکھ کر اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دیتا۔ یہ دل یہ دماغ یہ روح کیا ہے؟ انسان کا انسان سے اتنا گہرا تعلق کیسے ہو جاتا ہے کہ گولیوں کی بوچھاڑ اور توپوں کے دھماکوں میں بھی وہ اس کو نہیں بھول سکتا۔ جس سے اس نے محبت کی ہو۔ آج میرے چار جوان شہید ہو گئے ہیں۔ میں نے ان کی لاشوں کو بڑے احترام سے دفنایا ہے۔ یقین کرو، محبت انسان کو بہت مغرور اور تنہا بنا دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ فوجی زندگی ایک دوسرے کو میدانِ جنگ میں قریب بھی لے آتی ہے اور یہی جذبہ ہے جب کوئی شہید ہوتا ہے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی گولی میرے سینے کے پار ہو گئی ہے۔

8 ستمبر 1965ء :

میں نے تمہیں نائب صوبیدار یٰسین خان کی موت کا قصہ تو نہیں سنایا؟ اس وقت میرے دل میں نہ جانے کیوں وہ کردار گھوم رہا ہے۔ جس نے آخر میں یٰسین کی جان لی۔ وہ کون تھی، کیا تھی، کیسی تھی؟ اس سے غرض نہیں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس نے یٰسین کو اپنی بے پناہ محبت کا یقین دلایا تھا اور یہ سیدھا سادہ فوجی ان وعدوں اور ان باتوں پر اعتماد کر کے نہ جانے اس نے زندگی کے کتنے سنہری خواب بُن ڈالے تھے۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلتا اگر اس نے یہ قصہ مجھے خود نہ سنایا ہوتا۔ یہ دسمبر 1964ء کی بات ہے جب لڑائی کا میدان دور بہت دور تھا اور زندگی فوجی مشقوں اور تربیت کے علاوہ کچھ بھی نہ تھی۔ اس وقت اس نے مجھے کہا تھا کہ اس کی زندگی میں محبت کا ایک چراغ روشن ہو رہا ہے اور وہ اس کو اپنانا چاہتا ہے۔

آج پورا دن دفاعی کاموں میں گزر گیا۔ ہندوستانیوں کا زور دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ ان کے اور پاکستان کی بقاء کے درمیان صرف ہماری جانیں ہی ہیں اور ہم لوگ یہی سوچ کر لڑ رہے ہیں۔ نہ جانے یہ کون سا جذبہ ہے جس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہو جاتی ہے اور دوست بُرا نہ مانو تو تمہاری محبت بھی اس وقت جب توپوں کی گھن گرج اور گولیوں کی بوچھاڑ میں خون گرما جاتا ہے۔ تو زندگی کتنی بے حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔ دنیا بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔

9 ستمبر 1965ء

آج پھر نائب صوبیدار یٰسین نے پٹرولنگ پر

جانے کے لئے مجھ سے اجازت مانگی ہے۔ فوج میں پٹرولنگ سب سے جان جوکھوں کا کام ہے۔ نہ جانے یہ بار بار اپنے آپ کو موت کے حوالے کیوں کرنا چاہتا ہے۔ آج ہندوستان نے ٹینکوں کا بہت بڑا حملہ کیا تھا جس کو ہم لوگوں نے پسپا کر دیا لیکن ان کے اس حملے کو پسپا کرنے میں میرے جوانوں کی کئی قیمتی جانیں کام آ گئی ہیں۔ ہماری جو نفری پہلے ہی کم تھی اور کم ہوگئی اور اب ہر جوان دو جوانوں جتنی دیکھ بھال اور کام پر مامور ہے۔ ہمارے دفاعی موروچوں میں جگہ جگہ رخنے پڑ گئے ہیں لیکن ہماری ہمتیں اور ہمارا جذبہ اسی طرح سربلند ہے۔ نائیک الیاس نے کھڑے ہو کر گولیوں کی بوچھاڑ میں حملہ آوروں کو للکارا تھا اور دس منٹ تک برابر آگ اور خون برستا رہا۔ میں اس وقت یہی سمجھا تھا الیاس آدمی نہیں آگ کا شعلہ بن گیا ہے اور تھوڑی دیر میں دیکھتے دیکھتے وہ دشمن کے گولہ بارود میں نہ جانے کہاں چھپ گیا جب دھواں صاف ہوا تو صرف اس کا ایک بوٹ ہی مجھ کو مل سکا جس میں اس کا پاؤں موجود تھا، باقی نہ جانے وہ کہاں چلا گیا۔ الیاس نے میرے ساتھ مستقل آٹھ برس تک نوکری کی تھی۔ وہ اس وقت سے میرے ساتھ تھا۔ جب میں ملٹری اکیڈمی کاکول سے کمیشن لے کر پہلی دفعہ یونٹ میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے پوسٹ ہوا تھا۔ اس وقت یہ پہلی مرتبہ میرا اردلی ہو کر آیا تھا اور پھر مسلسل آٹھ برس تک میرا اردلی رہا۔ جب تک کہ اسے ترقی نہ مل گئی اور اب الیاس میری آنکھوں کے سامنے فضا میں تحلیل ہو گیا۔ ایسے غم نہ جانے میں نے کتنے کھائے ہیں۔ انسان اپنی موت کو ہنسی خوشی لبیک کہہ سکتا ہے لیکن ان کی موت جو آپ کو پیارے ہوں کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ یہ غم روح کے غم بن جاتے ہیں اور انسان کے چہروں پر لکیریں ڈال کر چلے جاتے ہیں لیکن میں بھی کیا لکھنے بیٹھا۔

رات 12 بجے ابھی ابھی یٰسین واپس پٹرولنگ سے آیا ہے، میں اپنے مورچے میں شمع کی روشنی جلائے بیٹھا ہوں۔ اس کے بائیں بازو پر زخم آیا ہے لیکن اس کو اس کی پروا نہیں، وہ اپنی رپورٹ سنا رہا ہے اور میں اسے فسٹ ایڈ دے رہا ہوں۔ میرے اصرار پر بھی وہ ڈاکٹرز کے پاس جانے کے لئے تیار نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے۔ وہ کسی بڑے ہسپتال میں بھیج دیا جائے گا اور پھر وہ میدانِ جنگ سے دور ہو جائے گا۔ رپورٹ پیش کرتے کرتے وہ نہ جانے کیوں اداس ہو گیا۔ افسر اور ماتحت کے رشتے، میں اس سے بے تکلف نہیں ہو سکتا لیکن میرا دل بہت چاہتا ہے کہ اس سے پوچھوں کہ اسے کیا غم ہے؟ میدانِ جنگ میں فوجی رشتے بہت مضبوط ہو جاتے ہیں پھر یٰسین مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز ہے لیکن یہ کیونکر پوچھوں؟ جانتا ہوں اسے محبت کا غم ابھرنے نہیں دیتا اور اس غم کو وہی محسوس کر سکتے ہیں جنہیں اس سے گزرنا پڑا ہو۔ یٰسین کا غم مجھے اپنا غم لگتا۔

یٰسین نے اپنی ماموں زاد بہن سے محبت کی اور پھر کورس کرنے کے لئے باہر چلا گیا۔ ایک سال بعد جب واپس آیا تو اس کے دل کو کوئی اور جیت چکا تھا۔ محبت کے تمام وعدے نہ جانے یہ لڑکیاں کیسے بھلا دیتی ہیں؟ اور اس طرح یٰسین ایک پکے پھوڑے کی طرح ہو گیا۔ جو نہ جانے کب پھوٹ کر بہہ جائے اور اب وہ سوچ کی ان منزلوں پر پہنچ گیا ہے۔ جہاں زندگی بے حقیقت سی چیز لگنے لگتی ہے۔

میں نے سوچا کہ مجھے کوشش اس امر کی کرنی چاہئے کہ اسے پٹرولنگ پر نہ بھیجوں۔ صبح چار بجے دھیما دھیما سا چاند نکلا ہوا ہے۔ میں اپنے مورچوں کے گرد چکر لگاتے لگاتے ایک جگہ ٹھہر جاتا ہوں۔ کہیں سے دھیرے دھیرے مدھم سُروں میں گنگنانے کی آواز آتی ہے۔ میں رک کر سننے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ تو میں نہ پہچان سکا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ مگر ظالم کی آواز میں کتنا دکھ اور غم بھر

ہوا ہے۔ میں اس غمگین آواز کو سن کر ٹھٹک جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے تم بہت شدت سے یاد آنے لگتی ہو۔نہ جانے کیوں ہر چیز جو دل کو مسل کر رکھ دے اس وقت تمہارا یاد آنا ناگزیر کیوں ہو جاتا ہے۔ جس مورچے سے یہ آواز آرہی ہے۔ وہاں تک پہنچ کر رک جاتا ہوں۔ مورچہ کا سنتری مجھے للکارتا ہے۔ میں اپنے مخصوص الفاظ دہراتا ہوں۔ مجھے آنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ وہ نغمہ یکا یک خاموش ہو جاتا ہے۔ وہاں تین آدمی ہیں اور صوبیدار یٰسین اُن کا رہنما ہے۔ یٰسین آج اور دنوں کی بجائے بہت تنہا تنہا اور اداس ہے۔

یہ کون گنگنا رہا تھا؟ یٰسین اثبات میں جواب دیتا ہے اور میں اس سے وہی شعر گنگنانے کو کہتا ہوں۔ کس قدر خوبصورت شعر ہے

شام ڈھلتے ہی یہ احساس ہوا ہے مجھ کو
ایک دن اور ترے غم میں سسکتے گزرا

کیا تم فوجیوں کے دکھ درد اور غم کو جان سکتی ہو؟ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں، ان کے معصوم سے قہقہے یہ سب کچھ روزمرہ کی باتوں میں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اس وقت یٰسین کی آواز نے کیسا سماں باندھ دیا تھا۔ کاش، میں اس کو الفاظ میں بیان کر سکتا۔ ہر سپاہی کی ایک محبوبہ ضرور ہوتی ہے جس سے وہ فرصت کے لمحات میں باتیں کرتا ہے۔ اس وقت ہم سب لوگ اپنی اپنی محبوباؤں کو کس شدت سے یاد کر رہے تھے۔ اس اداس خاموشی کو دشمن کے حملہ نے یکا یک توڑ دیا۔ میں اور صوبیدار یٰسین ایک دم اچھل کر مورچوں سے باہر آ گئے۔ دشمن نے معمول کے مطابق صبح کا حملہ شروع کر دیا ہے۔ ہم لوگوں پر ذمے داریاں بھی تو بہت ہوتی ہیں، لوگوں کو کیا معلوم کہ فوج میں افسر ہونے کے کیا معنی ہیں۔ جس کی قیمت صرف جان سے ہی ادا کی جا سکتی ہے اور اس لئے ہم دونوں مورچوں سے باہر آ کر دشمن کے حملے کی سمت معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تا کہ اپنا تمام فائر اس سمت میں کھول دیں۔ دشمن نے پھر وہی اپنی پرانی چال سے حملہ کیا ہے یعنی اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر آگے بڑھا ہے لیکن اللہ اکبر کا نعرہ لگانے میں بہت فرق ہے اور اس فرق کو صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے آگ اور خون کی ہولی کھیلتے ہوئے اس متبرک نام سے مدد لی ہو۔

کیسا جوش اور جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نام کے لینے سے اللہ اکبر...... اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔ ہم نے پھر دشمن کو پیچھے دھکیل دیا ہے اور اب دور کھیتوں کے درمیان وہ اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔ میں بھی ادھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے کسی سپاہی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ میں اپنی چاروں سمت دیکھتا ہوں۔ خندقوں اور مورچوں کا ایک حصار میرے چاروں اور پھیلا ہوا ہے جیسے کسی حسین گردن میں ست لڑی مالا جگمگا رہی ہو۔ میں اس وقت اپنے جوانوں کے کتنا قریب اپنے آپ کو محسوس کرتا ہوں۔ ایسے ہی لمحوں میں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ زندگی کیا ہے۔ یہ جینا یہ مرنا، یہ زندگی کی کشمکش آخر یہ سب کچھ کیا ہے اور اس وقت انسان اپنے آپ کو کیسا خالی خالی محسوس کرتا ہے لیکن ایسے نازک لمحات میں بھی تمہاری یاد اور تمہاری محبت مجھ پہ چھائی رہتی ہے۔ یہ خالی خالی احساس صرف تھوڑی دیر کا ہی ہوتا ہے۔ اس کے کے بعد ایک دم تمہاری یاد کا تانا بانا بندھ جاتا ہے اور میں پھر چاروں طرف سے اس میں گھر جاتا ہوں اور...... ہم پہ وارفتگی ہوش تہمت نہ دھرو۔

10 ستمبر 1965ء

آج ایک موٹر سائیکل سوار پکڑا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم لوگوں نے ہندوستان کی بکتر بند ڈویژن کی پوری نفری سے ٹکر لی ہے۔ میں بھی یہ سوچتا تھا۔ کل کے حملوں میں ہراول دستے تھے۔ اب عالباً لڑائی کا بازار

ذروں میں گرم ہوگا لیکن ہم بھی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور میں مسلسل جاگنے سے عجیب سی تھکن، عجیب سا اضمحلال محسوس کرتا ہوں اور نہ جانے تم اندر ہی اندر کیا کیا سوچ رہی ہوگی۔ جانے کس طرح اپنا وقت کاٹ رہی ہوگی۔ تمہیں یاد ہے۔ وہ دن جب میں کاکول سے کمیشن لے کر آیا تھا اور تم نے میرا تعارف اپنی سہیلی سے کراتے ہوئے کتنا خوبصورت انداز اختیار کیا تھا کہ ''یہ اسیرِ کاکل ہیں''۔ ہاں تم نے صحیح کہا تھا۔ میں اسیر تھا اپنی مادر درس گاہ کا۔ جس نے مجھے اتنی عزت دی تھی کہ میں اپنی فوج کا ایک افسر تھا اور میں ایک اور کاکل کا بھی اسیر تھا لیکن اس وقت مجھے اس کا احساس کتنا کم تھا۔ میں تو صرف یہ جانتا تھا کہ تم دسویں کلاس میں پڑھنے والی ایک لڑکی ہو اور اس محبت، اس جلن کا احساس کتنا کم تھا۔ اس محبت، اس جلن کا احساس کتنا کم تھا۔ اس محبت، اس جلن کا احساس تو مجھے بہت بعد ہوا اور اس یقین میں تمہارا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میں تم سے شکوہ نہیں کرتا۔ اس لئے کہ شیوہ مردانگی نہیں نہ مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ اس لئے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج یہ غم جو بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ یہ نعمت مجھے کبھی نہ ملتی۔ اب شدید ترین خواہش تمنا اور آرزو صرف یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں دشمن سے بھرپور ٹکر لیتے ہوئے شہید ہو جاؤں اور مجھے یقین ہے کہ میری روح اس کے بعد بھی تمہاری تمنا اور تمہاری آرزو کرتی رہے گی۔

تُو ملے یا نہ ملے یہ تو ہے تقدیر کے ہاتھ
پر تیرے ملنے کی ہر حال میں صورت اچھی

شام چھ بجے ابھی ابھی ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا ہے کہ ایک بہت بڑا حملہ آج رات یا کل صبح ہوگا مجھے دشمن کے علاقہ میں پٹرول پارٹی بھیجنے کی ہدایت بھی کی گئی ہے تاکہ میں وہاں سے کچھ مفید معلومات حاصل کروں ابھی میں نے فیلڈ فون رکھا ہی ہے کہ یٰسین اٹھ کھڑا ہوا جیسے جانے کو تیار ہو۔ میں نے صرف نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور میں ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا کتنا غم، کتنا کرب ہے میرے مولا کیا تُو انسان کو اتنے دکھ بھی دے سکتا ہے۔

یٰسین کو میں نے پٹرولنگ پر جانے کی اجازت دے دی ہے وہ سراپا التجا میرے پاس آیا تھا یہ فیصلہ کتنا مشکل اور جان لیوا تھا لیکن مجھے کرنا پڑا۔ یٰسین کو میں نے اپنے بہترین دس جوانوں کے ساتھ بھیجا ہے اور اب انتظار کی جاں گسل گھڑیاں شروع ہوئی ہیں جو ہر کمانڈر کا مقدر ہے۔ صبح 3 بجے ابھی ابھی یٰسین کا پٹرول واپس آ گیا ہے میں گننا شروع کرتا ہوں۔ ایک دو تین لیکن چھ جوانوں کے بعد اندھیرے سے کوئی جوان نہیں نکلتا دو دور سے آتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ میں پھر کوشش کر کے دیکھنے اور گننے کی کوشش کرتا ہوں لیکن کوئی فائدہ نہیں چار جوان شہید ہو گئے۔ یا نہ جانے کہاں چلے گئے۔ یٰسین میرے بالکل قریب آ گیا لیکن اس حالت میں کہ زخموں سے چور ہے تمام وردی خون میں بھیگی ہوئی ہے اس کے سینے پر گولی کا نشان ہے جسے صاف دیکھ رہا ہوں اس نے قریب آ کر اسی طرح مجھے سلیوٹ کیا جیسے وہ بیرکوں میں کرتا تھا میں کہنا چاہتا ہوں کہ یٰسین تم لیٹ جاؤ تم زخمی ہو لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کے اندر کا فوجی اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جب تک وہ پوری تفصیلات نہ بتا دے گا یہ احساس فرض کتنا بلند ہے میرے معبود! وہ اپنے جملے ادا کر رہا تھا تو کمزوری اور نقاہت نے اس کو بالکل نڈھال کر دیا اور وہ میرے مورچہ ہی میں گر پڑا میں نے اسے اٹھایا میں اپنے اردلی کو آواز دیتا ہوں کہ طبی امداد کے لئے لے جائے۔ یٰسین کا سر میرے پاؤں میں ہے اور جنبشِ سر سے مجھے منع کرتا ہے بہت ہی دھیمی اور سرگوشی انداز میں وہ کہہ رہا ہے۔ میجر صاحب میرا وقت آ چکا ہے خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے شہادت سے نوازا وہ

اپنی جیب سے ایک تصویر اور ایک مرجھایا ہوا پھول نکال کر مجھے دیتا ہے لیکن وہ کیا کہنا چاہتا ہے میں سمجھ نہیں سکا اس کی آواز لڑکھڑا جاتی ہے اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

کبھی تم نے کسی آدمی کو مرتے دیکھا ہے کاش تم یہ دیکھو کہ شہادت کیسی پیاری اور پُر سکون چیز ہے۔ یٰسین میرے ہاتھوں میں دم توڑ گیا۔ اس کے خون سے رچے ہوئے چہرے پر ایک ابدی سکوت اور ایک ملکوتی مسکراہٹ تھی اس کے پورے جسم سے ایک عجیب مہک ایک عجیب خوشبو آ رہی تھی اور میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یٰسین شہید ہو چکا ہے میں نے اس کے سر کو آہستہ سے زمین پر رکھ دیا ہے اور ایک کونے میں کھڑا اپنے جذبات اور احساسات کو قابو کرنے کی کوشش میں تھا۔ یٰسین شہید کی روح تو نہ جانے کہاں اپنے بے وفا محبوب سے ملنے کو چلی گئی تھی۔

11 ستمبر 1965ء

یٰسین شہید کی موت نے میری زندگی میں ایک خلا چھوڑ دیا ہے وہ میری زندگی کا ایک حصہ تھا۔ اس کے ساتھ میری جوانی کی بہترین یادیں وابستہ تھیں۔ اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ سب کچھ پیچھے رہ گیا۔ موت میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ گرد و غبار کے بادل چاروں طرف منڈلا رہے ہیں اور اس ماحول میں ہم لوگ صرف ایک ہیولہ دکھائی پڑتے ہیں معلوم نہیں زندوں کی دنیا کیسی ہوتی ہوگی۔ مجھے پھر تمہارا خیال ستانے لگا ہے جب میں خوش ہوتا ہوں یا اداس ہو جاتا ہوں تو تم بہت یاد آتی ہو شاید محبت کی یہ ایک نشانی ہو۔

صبح 9 بجے آج ہندوستان کے حملوں میں وہ جوش و خروش نہیں تھا صرف دو حملے کر کے خود ہی پسپا ہو گئے ہیں آج قائد اعظم کا یوم وفات ہے اور کور کمانڈر نے کیا خوبصورت پیغام بھیجا ہے کہ اس سے بہتر ہم قائد اعظم کو خراج عقیدت نہیں پیش کر سکتے کہ ان کے بنائے ہوئے پاکستان کو بچانے کے لئے ہم اپنی جانیں لڑا دیں اور اگر ضرورت پڑے تو یہ جانیں وطن کی خدمت میں کام بھی آ جائیں لیکن ان کو شاید یہ احساس پہلے ہی ہے کہ ان کے ماتحت ہر سپاہی اور ہر افسر اپنی جان کی بازی لگانے کو ہر وقت تیار ہے۔ تم نہ جانے اس کو کیا سمجھو لیکن خدا گواہ ہے کہ میں ہر صبح اس امید پر اٹھتا ہوں کہ آج کا دن میری شہادت کا دن ہوگا اور یہ خیال مجھے بے انتہا مسرت بخشتا ہے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے جینے کی خواہش نہیں یا زندگی مجھے پیاری نہیں لیکن ایک انسان کی زندگی میں اور ایک سپاہی کی زندگی میں کچھ لمحات ایسے آتے ہیں کہ جب اس کے لئے موت زندگی سے کہیں زیادہ پُر سکون، کہیں زیادہ پیاری اور پُر مسرت ہوتی ہے کاش ایسا میرے لئے بھی ہو سکے۔

آج مجھے میرے کمانڈنگ آفیسر نے بلایا تھا اور میں ابھی ابھی وہاں سے واپس آیا ہوں اور ایک بہت اہم مشن پر جا رہا ہوں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ شام کا اندھیرا بڑھ رہا ہے مجھے صبح کے اجالے سے پہلے پہلے واپس آنا ہے۔ اس کے باوجود تمہارے ساتھ لارنس کے کھلے باغ کے چائے خانے میں چائے پینے کا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔

میرے معبود! وہ لمحے کہاں گئے کبھی کبھی میں سوچنے لگتا ہوں کہ تم اگر صرف میری ہوتیں تو نامعلوم میرا کیا حال ہوتا۔ اچھا معاف کرنا میرا حوالدار آ گیا ہے اور اب میں اپنے مشن پر جانے کی تیاری کروں گا معلوم نہیں یہ تحریر کبھی تمہاری نظروں سے گزرے گی یا نہیں یا میرے ساتھ کسی مورچے میں ہی دفن ہو جائے گی۔۔۔۔ کون جانے؟

◆✱◆

بڑے صاحب نے ڈائری اٹھائی وہ ساری کی ساری خالی تھی اہلکار حیران رہ گئے، دن رات لکھنے کے باوجود ڈائری کالی نہ ہوئی؟

نجات

☆ رحمی شاہد

کھردرا بے رونق فرش، کونوں کھدروں سے آتی ٹڈیوں کی کریہہ آوازیں اور مچھروں کی بھرمار، وائے قسمت اس پر اس "قید خانے" کی واحد کھڑکی سے چھن چھن کر آتی چاند کی دلفریب روشنی جو اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور مکان و محل کی قید سے آزاد کھڑکیوں کے جھروکوں سے جھانکنے پر مجبور تھی وگرنہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ یہاں کبھی نہ آتی۔

اس کمرے نما، یا قبر نما کمرے کے ایک کونے میں مٹی کا گھڑا اور سلور سٹیل کا ایک میلا سا گلاس رکھا تھا یوں جیسے کوئی قبر پر پانی ڈالتے ڈالتے اسے یہاں چھوڑ گیا ہو۔ دیواروں کی وحشت کمرے کو ہولناک کیے ہوئے تھی اور اس ہولناکی کی نحوست اس بات کی پُرزور تائید کر رہی تھی کہ یہاں کوئی 'ذی ہوش' اور 'ذی روح' رہ نہیں سکتا۔

مگر یہاں پڑے ایک وجود نے اس بات کی نفی کی تھی۔

ہاں، یہاں کوئی تھا۔ مرنے والوں کو اپنی پسند کی قبر نہیں ملا کرتی۔ جب اعمال کا ترازو خدا کی رضا سے پسندیدگی ... جنم ضرور دے دیتا ہے، وہ بڑا منصف ہے، بڑا بے نیاز۔

اس وجود سے آنے والی سانسوں کی آوازیں اس کے "مردہ" ہونے کی نفی کر رہی تھیں۔ کبھی کبھی زندگی بڑی دیدہ دلیری سے موت کی نفی کرتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب موت اسی دیدہ دلیری کو اس کے منہ پر دے مارتی ہے۔

غلام حسین اس پُراسرار اور خوفناک ماحول میں بھی بڑے سکون سے سویا ہوا تھا یوں جیسے کوئی امیر ترین انسان آج عرصے بعد اپنے بستر پر نرم اور بھیگ میں لگی نیند سویا ہوا ہو اور یہ آج کی بات نہ تھی وہ جب سے اس ڈیڈ سیل (Dead Cell) میں آیا تھا وہ یونہی سکون سے سویا کرتا تھا۔ موت سے پہلے موت کے خوف میں مبتلا کر کے مار دینے والے اس کمرے میں عجیب سی بے حسی اور خود احتسابی کا راج تھا۔ ہر انسان کو اپنے کیے کی سزا مل

رہتی ہے۔ یہ جیل خانہ اس مفروضے کی بڑی بے دردی سے تردید کرتا تھا۔ یہاں کئے کی سزا سے زیادہ دیئے کی سزا کو فوقیت دی جاتی تھی۔ جیل کے چھوٹے سے چھوٹے عہدے دار سے لے کر بڑے سے بڑے اہل کار تک سب اپنے فرض کے گورکھ دھندے کو جھوٹے اور دکھاوے کے ثبوتوں میں تولتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نہیں کہ یہاں انصاف کی روشنی پھوٹتی نہیں ہاں اتنی کم ضرور ہوتی ہے کہ اکثر اوقات بڑے سے بڑے گناہگار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور چھوٹے سے چھوٹے بے گناہ کو لے ڈوبتی ہے۔

غلام حسین اپنی دو دن بعد دی جانے والی پھانسی کا منتظر تھا مگر موت اور اس کی سزا کا کوئی خوف، ذرا اس کی آنکھوں کی پتلیوں سے نمایاں نہ تھا۔ وہ بڑا مطمئن اور پرسکون تھا۔ جرم والوں نے اطمینان اور سکون کا بڑا بیر ہوا کرتا ہے بے حسی اور سکون کے درمیان حائل لکیر جرم والوں کو بے گناہوں سے دور لے جاتی ہے۔ اس کمرے کے باہر کھڑے اہلکار کو غلام حسین کی آنکھوں کے سکون سے بڑی عداوت سی تھی اور اسے یقین کے ساتھ انتظار تھا کہ کیا یہ سکون انتشار کو جنم دیتا ہے 'پھانسی والی رات' یا 'پھانسی والی صبح' یہ شیطانی لذتوں کا کھیل رچا کر انسانوں کو اس میں الجھا کر ابلیس تو جھوم جھوم جاتا ہے۔ مگر غلام حسین جیسے لوگ خدا کی خدائی میں بڑی مضبوطی سے پناہ لئے رکھتے ہیں۔ وہ جب سے ''قانون والوں'' کے ہاتھ لگا تھا ایک چپ نے اس کا ہاتھ تھام رکھا ہے جو سال ہونے کو آیا اپنی گرفت سے اسے آزاد نہ ہونے دیتی تھی۔

''یہ قتل کیس میں یہاں آیا تھا تقریباً سال پہلے''۔ باہر کھڑے اہلکار نے دوسرے نئے آنے والے اہلکار کو بتاتے ہوئے کہا جو اس کے سکون اور رویے سے بڑا متاثر نظر آتا تھا۔

''یہ سکون یہ عبادت سب ڈھونگ ہے یار!'' خباثت اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔ ''تو سوچ بے کہا کر لی جج کو چلی۔ موت سامنے ہو تو بڑے سے بڑا مجرم بدل جایا کرتا ہے اور پھر یہ غلام حسین کیا چیز ہے؟ بیوی کے یار کو مارا ہے اس نے اور نہ صرف مارا ہے بلکہ بے رحمی سے اس کی لاش کو ٹکڑوں میں کاٹا ہے۔ وہ تو بھلا ہو اس کے چھوٹے بھائی کا جو وقت پر پولیس لے کر پہنچ گیا ورنہ یہ تو پکڑ میں ہی نہ آتا۔ اتنی غیرت اندر تھی تو بیوی کو قابو میں رکھتا... کہیں کا'' اس نے موٹی سی گالی دے کر کہا۔

اندر بیٹھے غلام حسین کے وجود میں ذرا سی لرزش ہوئی اس کے ہاتھ اپنی قیمتی متاع جاں واحد ڈائری پر لکھتے لکھتے لحہ بھر کو رکے۔ بے غیرت اور ڈھونگی کے الفاظ تیر کی طرح اس کے کانوں سے ٹکرائے اور وہ ڈائری بند کرکے زمین پر جالیٹا چادر منہ تک تان کر وہ اپنے اندر ہونے والی ہلچل کو شکوؤں سے بچانے میں جت گیا۔ مگر کانوں میں آوازیں آنا بند نہ ہوئیں اور دنیاوی سرگرمیوں کے زوال پذیر ہونے کے بعد ابھی یہ آوازیں اور تیز ہو جاتیں۔ تیز، تیز اور تیز پھر ایک دم چپ سی کی طرح چادر تان کر جا سوئیں۔

حفیظاں بی بی اور اس کے چھوٹے بھائی دلاور حسین کی آوازیں سرگوشیوں سے لے کر ہلکی ہلکی ہنسی اور پھر قہقہوں میں تبدیل ہوتی ہوئی آوازیں۔

''بے چارہ غلام حسین بے موت ہی مارا گیا۔ دلاور حسین بے چارے کے تو وہم و گمان میں نہ ہوگا کہ یہ سب کھیل ہم نے رچایا ہے''۔ حفیظاں کی آواز آئی۔

''اور تو نے اداکاری بھی تو کمال کی کی ہے۔ حفیظاں میری جان!''

''کیا کرتی اس نامراد سے جان چھڑانی مشکل ہو رہی تھی۔ نمانا بڑا استھر بندہ تھا کوئی موقع ہی نہ دیتا تھا کہ جان چھڑانے کا اور پر یہ کمینہ آنے روز پیچھے رہتا سوچا ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں گے''۔

اور باہر پولیس والوں کے ہاتھوں گھسٹتے غلام حسین ۓ کانوں میں کسی نے سیسہ ڈال دیا ہو۔ اس کے جسم سے جان نکل گئی تھی، اس نے کلمہ پڑھ لیا اور چپ کی چادر تان لی۔ قانون ثبوت مانگتا ہے اور یہ ثبوت اسے بڑی فراوانی میں ملے اور کیوں نہ ملتے، جب جرم کرنے والا ہی چپ سادھ لے تو بے گناہی گونگی ہو جاتی ہے۔

اگلی صبح غلام حسین نے خلاف عادت غسل کی فرمائش کی پہنے کپڑے دھو کر اسی طرح پہن لئے اور اپنی قبر میں آن بیٹھا۔ آج وہ بس لکھتا ہی جا رہا تھا نہ کھایا نہ سویا اور نہ ہی لیٹا۔

"پتہ نہیں یہ کیا لکھتا رہتا ہے چلو کل صبح پھانسی ہو جائے گی تو پڑھوں گا"۔ اہلکار نے جذباتی ہو کر سوچا۔

اگلی صبح آ گئی..... نجات کی صبح..... پھانسی کی صبح..... موت سے گلے ملنے کی صبح۔ ساری رات کا جاگا غلام حسین نہا دھو کر دھلے ہوئے کپڑے پہنے ڈائری کو سینے سے لگائے اطمینان سے چادر اوپر تاننے کی بجائے زمین پر بچھا کر اس کے اوپر سویا ہوا تھا۔ جب دو اہلکار اسے لینے آئے اس کے چہرے پر پھیلے نور نے انہیں ٹھوکر لگانے سے روک دیا۔ عجب روشنی سی تھی جو "عمل والوں" کی قبر میں روشنی بکھیرے رکھتی ہے۔ آوازیں دیں ہلایا جلایا مگر وہاں جو چپ تھی نہ ٹوٹی۔ بڑے صاحب بھی آئے مگر یہ بلاوا بھی کارگر نہ ٹھہرا۔ اس کا بلاوا تو شاہی تھا آپ کے۔

'خدائی نور کا بلاوا' بھیج کر بڑی نرمی اور آہستگی سے اللہ پاک نے اسے موت کی سواری میں اپنے پاس بلا لیا تھا۔ بڑے صاحب نے ڈائری اٹھائی وہ ساری کی ساری خالی تھی اہلکار حیران رہ گئے، دن رات لکھنے کے باوجود ڈائری کالی نہ ہوئی؟ کیوں.....؟ کیونکہ جس کے نام لکھی گئی تھی وہ تو اجلا تھا۔

☆●☆

آج میرے سینے سے لگی عورت مجھے ادھوری عورت لگ رہی تھی جسے میں سحرش کی عورت پنے کی سوچ کہہ رہا تھا۔ وہ تو مرد کی سوچ تھی جسے سحرش مرد بن کر سوچ رہی تھی۔

ادھوری عورت

☆ شازیہ محسن

سرما کی چلتی سرد ہواؤں کی خنکی، چاندنی کا روپ دھارے کھڑکی پر پڑے پردوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ کمرے میں جلتے نیلے بلب کی مدھم روشنی چاندنی کی سپیدی سے مل کر بہت عجیب اور پُر اسرار سی محسوس ہو رہی تھی بلکہ ایک لمحے کو تو مجھے یوں لگا کہ جیسے یہ سارا ماحول رات کی خاموشی میں ڈھل کر غیر فطری سا ہو گیا ہو۔ میں نے ایک نظر بیڈ کے دوسرے سرے پر لیٹی سحرش کو دیکھا۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھے آنکھیں موندے وہ اس وقت خواب آور گولیوں کے زیر اثر بظاہر بے خبر نیند میں تھی مگر تھوڑی دیر بعد اس کی سانسوں کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی۔ چہرے کے تاثرات یوں بدل جاتے جیسے اس نے خواب میں کوئی بھیانک منظر دیکھ لیا ہو۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان بھی تازہ تھے۔ دیر ہی کتنی ہوئی تھی اسے بلک بلک کر بچوں کی طرح روتے ہوئے۔ شاید آج کی رات اس کے لئے بہت کٹھن تھی آزما اور اس کے پورے وجود کے ساتھ تکمیل کی آخری شب تھی۔

پاگل عورت، زندگی سے بڑھ کر بھی کوئی قیمتی شے ہے اسے تو ہر قیمت پر بچانا ہی زندگی کی معراج ہے۔ میں نے چاہا کہ اس کے ہاتھ سینے سے ہاتھ اٹھا کر آہستگی سے نیچے رکھ دوں لیکن اس نے اپنے ہاتھوں سے بہت مضبوطی سے اپنی لٹتی ہوئی کائنات کو تھاما ہوا تھا۔ کتنا خوفناک ہے اس کے لئے یہ تصور۔ کتنی مشکلوں اور دلیلوں سے وہ اس پر راضی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر زارا اگر صرف ڈاکٹر ہوتی اور سحرش کی سہیلی نہ ہوتی تو شاید کبھی اپنی اس مریضہ کی زندگی کی ضامن نہ بنتی۔ مجھے یاد ہے، پہلی بار میں ہی سحرش کو ڈاکٹر زارا کے پاس لے کر گیا تھا۔ ہمارے یہاں پہلی بچی گڑیا کی پیدائش قریب تھی، سحرش کسی غیر معمولی حسن کی مالک نہ تھی لیکن اس کے دلکش سراپے میں قیامت کی وہ ساری گرہیں

لگی تھیں جنہیں ایک ایک کر کے کھولتے ہوئے میں سچ مچ اپنی خوش بختی پر ناز کرنے لگا۔ سحرش میری نہیں میرے گھر والوں کی پسند تھی لیکن شادی کے بعد مجھے یوں لگتا جیسے وہ ازل سے میری پسند، میرا انتخاب اور میرا فخر ہی ہو۔ سحرش کی شخصیت کے سارے رنگ دھنک کی طرح تھے جن میں سے کسی ایک رنگ پر نظر رکھنا ناممکن تھا۔ سارے رنگ آپس میں گڈمڈ تھے۔ پیار کے، وفا کے، ادا کے۔

گڑیا کی پیدائش کے بعد ڈاکٹر زارا نے سحرش کو بہت کھلے انداز میں تنبیہ کی کہ وہ ادھوری نہیں بلکہ پوری ماں بنے۔ ممتا کی خوشبو اور بہتے دھاروں پر کوئی بند نہ باندھے، کوئی غلاف نہ چڑھائے مگر سحرش کے دماغ کے پردے پر تو آج کی عورت کی شبیہ ابھر رہی تھی اس لئے زارا کی نصیحت پر کان دھرنا نہ اپنے اندر کی آواز سنی۔ ڈاکٹر زارا ٹرانسفر ہو کر دوسرے شہر چلی گئی۔ گڑیا کے بعد ببلی اور پھر سنی...... شادی کے سات برس اور تین پھول۔

سحرش سے میری والہانہ وابستگی میں کوئی کمی نہ آئی۔ ہماری محبت کی چاندنی یونہی روز اوّل کی طرح ہم دونوں کے دلوں کے آنگن میں چھلکتی رہتی کہ سیاہ بادل کے ایک آوارہ ٹکڑے نے چاند کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ڈاکٹر زارا کی شہر واپسی ہوئی تو سحرش اس کی وہی پرانی سہیلی مریضہ بن کر اس کے مطب میں پہنچ گئی۔

مجھے تم پر شدید حیرت ہو رہی ہے اور غصہ بھی آ رہا ہے کہ تم کئی برسوں سے اپنے سینے میں اس ناسور کو پالتی رہی اور تمہیں کچھ ہوش نہ آیا۔ سحرش! تم کسی گاؤں کی ان پڑھ یا جاہل عورت بھی نہیں ہو کہ بے خبر رہی۔ یہ سراسر ظلم ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سے خود پر کیا ہے۔

ڈاکٹر زارا کے لفظوں سے زیادہ اس کے چہرے پر کرب و تاسف تھا اور سحرش کی کیفیت سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہو رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ بلال مجھے اس آسیب سے بچا لو،

وقت کے ساتھ

اللہ تعالیٰ کسی بھی انسان کو صلاحیتوں اور خوبیوں کے بغیر پیدا نہیں کرتا۔ گھڑی کی سوئیاں اور سورج کی کرنیں آگے کی طرف سفر کر رہی ہیں اور آپ اگر وقت کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں تو آپ بھی نہ کبھی اپنی منزل پر ضرور پہنچ جائیں گے۔

(دستگیر شہزاد)

میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ سحرش کے کئی ٹیسٹ ہوئے، ہر ٹیسٹ پہلے سے زیادہ خطرناک نکلا اور آخری ٹیسٹ نے تو دھماکہ ہی کر دیا جسے سن کر سحرش کی چیخیں نکل گئیں۔ سحرش نے آپریشن کرانے سے انکار کر دیا۔

ڈاکٹر زارا کا ہر فون، ہر ملاقات پر ایک ہی اصرار ہوتا سحرش دیر نہیں کرو، یہ ضروری ہے زندگی بچانے کے لئے۔

لیکن...... لیکن کچھ کہنے سے پہلے سحرش کی آواز گھٹ جاتی، اس کے ہاتھ کانپنے لگتے، سینے کا زیر و بم بڑھ جاتا، یوں جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے بھی منزل تک نہ پہنچ پا رہی ہو۔

سحرش! اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فضول اندیشے اور واہمے تمہیں ڈرا رہے ہیں۔ دیکھنے والوں کو کیا پڑی ہے کہ تمہارے اندر جھانکیں۔ مجھے فقط تمہاری زندگی عزیز ہے، اسے گزند نہیں پہنچنی چاہئے''۔ میں نے سحرش کو اپنے ساتھ لگا کر ہولے ہولے دلاسہ دیا۔ اس کی گرفت آہستہ آہستہ مجھ پر کم ہوتی جا رہی تھی۔ کتنی ہی دیر میرے بازوؤں کے ہالے میں بچوں کی طرح سسکتی رہی۔ شاید کہ وہ آج رات یونہی اپنے وجود کے تلاطم سے مجھے زیر و زبر رکھتی لیکن اس کا آپریشن ہونا تھا۔ میں نے سحرش کے ہاتھ اٹھا کر پھر اس کے سینے پر رکھ دیئے اور پہلو بدل کر

سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

دوسرے دن سحرش ہسپتال میں داخل ہوگئی۔ چار گھنٹے کے بعد اس کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر زارا نے سحرش کی زندگی کو کینسر جیسے موذی مرض سے بچانے کے لئے اس کا بریسٹ ریمووکردیا۔ سحرش کے چہرے کی شادابی پر زردی سی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ویران اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ میں نے سحرش کی سرد ہتھیلیوں پر اپنے ہاتھوں سے گرمی پہنچاتے ہوئے کہا۔

''سحرش! نئی زندگی مبارک ہو۔ اب تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی، پھر سے وہی پہلے والی سحرش جو میری اپنی.....''

''بلال میں خود کو کھوکھلا محسوس کر رہی ہوں''۔ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کرب زدہ لہجے میں کہا۔ ''جیسے کوئی سورج سے اس کی روشنی چھین لے، چاند بے نور ہو جائے''۔

''محض پاگل پن ہے، چاند کا سینہ بھی داغدار ہوتا ہے لیکن اس کی چاندنی تو پھیکی اور بے کیف نہیں ہوتی۔ تم عورت بن کر سوچ رہی ہوناں اس لئے.....عورت پنے کے دائرے سے نہیں نکلتی۔ میں نے سحرش کی پھیلی ہوئی بانہوں کی تڑپ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے سحرش کا وجود ہوا میں تحلیل ہو رہا ہو۔ ڈاکٹر زارا نے کہا تھا کہ وہ ادھوری نہیں پوری ماں ہے۔ مگر سحرش پوری ماں نہ بن سکی یہاں تک کہ آج میرے سینے سے لگی عورت مجھے ادھوری عورت لگ رہی تھی جسے میں سحرش کی عورت پنے کی سوچ کہہ رہا تھا۔ وہ تو مرد کی سوچ تھی جسے سحرش مرد بن کر سوچ رہی تھی۔ میں نے سحرش کے ماتھے کو چوما اور آہستہ سے اسے خود سے الگ کر کے بستر پر لٹایا اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔

+★+

تاریخی ناول

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

مغلانی بیگم

قسط: 13 ☆ رفیق ڈوگر

مغلانی بیگم نے کاغذ تہہ کر کے لفافہ میں ڈال کر اس پر مہر ثبت کی اور طشتری میں رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بہت تھکی تھکی سی تھی اس ایک ماہ کے عرصہ میں اس نے شاہی لشکر کے ساتھ بہت طویل سفر کئے تھے۔ ماگھ کا دوسرا ہفتہ تھا جب احمد شاہ ابدالی خضر آباد میں سورج مل کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوئے تھے اور پھاگن کے دوسرے ہفتہ میں واپس خضر آباد پہنچ گئے تھے۔ پورا مہینہ وہ مرہٹوں سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔ خضر آباد سے روانہ ہو کر وہ ڈگ پہنچے اور سورج مل کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ ابھی لڑائی شروع ہی ہوئی تھی کہ مرہٹوں کے ایک لشکر کی روازی کی طرف پیش قدمی کی خبر پہنچی۔ جہان خاں نے تیز رفتار دستوں کے ساتھ شب خون مار کر مرہٹوں کو شکست دے دی لیکن دو روز بعد مرہٹہ جرنیل ملہار راؤ ہولکر ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ روازی کے نواح میں پہنچ گیا۔ بادشاہ نے ڈگ کا محاصرہ اٹھا لیا، وہ دکن سے مرہٹوں کے مزید لشکر کے پہنچنے سے پہلے ملہار راؤ کی قوت کچلنا چاہتے تھے مگر شاہی لشکر کی روانگی کی اطلاع ملتے ہی مرہٹے فرار ہو کر بہادر گڑھ پہنچ گئے۔ شاہجہان آباد پر مرہٹوں کے حملہ کے خدشہ کے پیش نظر بادشاہ روازی سے دھن کوٹ پہنچ گئے۔ مرہٹہ لشکر اچانک شاہجہان آباد کے افق پر نمودار ہوا اور قطب مینار کے نواح میں کالکا دیوی کے مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ شاہ برق رفتاری سے خضر آباد پہنچ گئے، ان کی آمد کے دوسرے روز مرہٹے دریا پار کر کے دوآبہ میں داخل ہو گئے اور سکندر آباد کو تاراج کر کے لوٹ لیا۔ جہان خاں نے چودہ گھنٹے میں سو میل کا فاصلہ طے کر کے مرہٹوں پر اچانک حملہ کر دیا اور انہیں شکست دے کر آگرہ کی طرف بھگا دیا۔

اس سارے سفر میں مغلانی بیگم شاہی لشکر کے ساتھ رہی تھیں، ڈگ کے محاصرہ میں ان کا دستہ بھی شامل تھا۔ سفر اور لڑائی میں بھی انہیں سب سے زیادہ فکر عمادالملک سے رابطہ کر کے اسے نواب شولاپوری بیگم کا مراسلہ پہنچانے کی تھی۔ ڈگ سے روانگی پر اس نے ایک خفیہ ایلچی کے ذریعے عمادالملک کے لئے جو مراسلہ ارسال کیا تھا اسی صبح اس کا جواب موصول ہوا تھا۔ عمادالملک کے جواب سے وہ اور بھی زیادہ تھکاوٹ محسوس کرنے لگی تھی اپنے عظیم خاندان کی باقیات کے تحفظ کی کوشش میں اسے احمد شاہ ابدالی کے لشکر کے ہمراہ رات ایک جگہ پڑتی تو سورج کسی دوسرے پڑاؤ میں طلوع ہوتا تھا۔ عمادالملک نے نواب شولاپوری بیگم کی درخواست مسترد کر دی تھی اور اس کے ساتھی مرہٹے ہر جگہ شکست پر شکست اٹھا رہے تھے اور بیگم اس مایوسی میں امید کی بیساکھیاں تلاش کر رہی تھیں۔

کنیز کے قدموں کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ”طہماس خاں کو حاضر کریں“۔

کنیز خیمے سے باہر نکل گئی۔

اس نے طشتری سے مہر بند لفافہ اٹھانا چاہا تو محسوس ہوا کہ بازوؤں میں اتنی بھی طاقت نہیں رہی۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی، لفافہ واپس رکھ کر وہ نشست پر دراز ہو گئی۔

طہماس خاں خیمے میں داخل ہو کر آداب کے مراحل طے کر چکا تو اسے شرمندگی محسوس ہوئی، جلدی سے تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اس نے لفافہ اٹھا کر طہماس خاں کی طرف بڑھا دیا۔ ”اپنے سواروں کو ہمراہ لیں اور ابھی شاہجہان آباد روانہ ہو جائیں۔ نواب بیگم کے حضور یہ مراسلہ پیش کر کے ان کے جواب کا انتظار کریں اور جواب لے کر جلد واپس آئیں“۔

طہماس خاں نے سر تسلیم خم کر دیا اور سیدھے کھڑے ہو کر دست بستہ عرض کیا۔ ”حضور یہ خادم معافی کا خواستگار ہے۔ ملک سجاول کا پیامبر ولی عہد کا پیغام لے کر آیا ہے اور حاضری کی اجازت کا منتظر ہے“۔

بیگم کو پیامبر کی آمد کی خبر پہنچ چکی تھی۔ ...

کر، ''ہم منتظر ہیں'' کہا اور نشست پر ٹھیک سے بیٹھ گئی۔

ایک دراز قامت نوجوان خیمے میں داخل ہوا اور اس نے اپنی کمر کے گرد سنہری پٹکا باندھ رکھا تھا، سر پر پگڑی اس انداز میں باندھی تھی کہ ٹوپی معلوم دیتی تھی، کانوں میں بڑی بڑی سونے کی مرکیاں، طویل آنکھیں اور موٹی مونچھیں۔ نوجوان نے اپنی کمر سے لٹکتی تلوار پر ہاتھ رکھ کر آداب عرض کیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

لفظ بیگم کے ہونٹوں پر ہی تھم گئے۔ وہ تھکاوٹ بھول گئی اور اس کے حسن اور جوانی میں کھو گئی۔

''سردار معظم نے یہ مراسلہ حضور تک پہنچانے کا حکم دیا تھا، ان کا ارشاد تھا کسی خادم کو نہ دینا اس لئے حضور کو تکلیف دی''۔ نوجوان نے ایک مہر بند لفافہ آگے بڑھایا۔

بیگم نے ہاتھ بڑھا کر مراسلہ وصول کیا۔ ''ہم ملک صاحب کے پیغام کے لئے خوش ہیں، ان تک ہمارا شکریہ پہنچا دیں''۔ نوجوان کے سلام کا جواب نہ دینے پر وہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ ''ہم سمجھتے ہیں آپ ملک کے اپنے قبیلے سے ہیں''۔

''حضور کا اندازہ درست ہے''۔ نوجوان نے جواب دیا۔

''ہم سمجھتے ہیں پہلے بھی ہم آپ کو دیکھ چکے ہیں''۔ اس نے سلام کا جواب نہ دینے کی تلافی کرنا چاہی۔

''میں حضور کے روبرو پہلی بار حاضر ہوا ہوں''۔ نوجوان نے جواب دیا۔

''بیگم نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''ملک پور کے نوجوانوں کو پہچاننے میں ہم پہلے بھی دھوکہ کھا چکے ہیں''۔

''دھوکہ دینے والا سوچ کر کرتا ہے اور دھوکہ کھانے والا لاعلم ہوتا ہے''۔ نوجوان نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ہمیں تمہارے جواب سے بے پناہ مسرت ہوئی ہے''۔ بیگم خوش ہو گئی۔

''مجھے حضور کے فرمان سے دکھ ہوا ہے، ہم نے بھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا''۔ نوجوان سنجیدہ تھا۔

''ہمارے لئے تم قابل عزت ہو، ہمارا ہرگز یہ مطلب نہ تھا''۔ بیگم بھی سنجیدہ ہو گئی۔

نوجوان نے اجازت لی اور خیمے سے باہر نکل گیا۔ بیگم اسے جاتا دیکھتی رہی خیمے کے دروازے کے پاس کھڑا طہماسپ خان حیران تھا۔ نوجوان کی بے باکی اور بیگم کا اس کے ساتھ رویہ اس کے لئے دونوں نئے تھے۔

''ہم چاہتے ہیں تم ابھی شاہجہان آباد روانہ ہو جاؤ اور جلد واپس آنے کی کوشش کرو''۔ بیگم شاید بھول گئی تھی کہ وہ پہلے بھی ایسا ہی حکم دے چکی ہے۔

طہماسپ خان جا چکا تو بیگم نے مراسلہ پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے مراسلہ پڑھتی جاتی تھی اس کے چہرے پر خوشی کی لہروں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پورا مراسلہ پڑھ کر اس نے تہہ کر کے طشتری میں رکھ دیا اور کچھ دیر بعد پھر اٹھا کر پڑھنے لگی۔

***

احمد شاہ ابدالی کے خیمہ خاص میں ان کے افغان وزرا اور سردار [illegible] جواب [illegible] بھی حاضر تھے کہ وہ ہندوستان کے حالات پر مشورہ اور فیصلوں کے لئے مشاورت طلب کی تھی اور عرض بیگی باشی پرچہ نویسوں کی تازہ رپورٹیں پڑھ کر سنا رہا تھا۔ کہ تازہ خبر یہ معلوم ہوئی تھی کہ پیشوا باجی راؤ ایک زبردست فوج تیار کر رہا ہے اور وہ افغانوں سے فیصلہ کن لڑائی کرنا چاہتا ہے۔ عرض بیگی باشی نے پرچہ ختم کر کے بادشاہ معظم کی طرف دیکھا مگر ان کے چہرے پر کوئی ردعمل نظر نہ آیا۔ خیمے میں موجود سردار اور وزرا بھی سر جھکائے بیٹھے رہے تو اس نے دوسرا پرچہ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ پرچہ نویس نے لکھا تھا کہ مرہٹہ پیشوا نے

اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے پاس افغانوں کے خلاف اتحاد اور مدد کے لئے وکیل بھیجا ہے۔ پیشوا نے شجاع الدولہ کے نام مراسلہ میں لکھا ہے کہ افغان ان کے اور مرہٹوں کے مشترکہ دشمن ہیں، ان کو شکست دینے اور ہندوستان کے معاملات سے خارج کرنے کے بعد مرہٹے شجاع الدولہ کو مغلیہ سلطنت کا وزیراعظم بنا دیں گے۔ یہ پرچہ ختم کر کے ایک بار پھر عرض بیگی باشی نے شاہ کی طرف دیکھا اور انہیں خاموش پا کر اگلا پرچہ اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ یہ پرچہ سرہند سے آیا تھا اور پرچہ نویس نے لکھا تھا کہ پٹیالہ کے سردار آلا سنگھ کے پاس مرہٹوں کا ایلچی پہنچا ہے اور وہ مسلمانوں کے خلاف سکھوں کو متحد کرنے اور مرہٹوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پرچہ ختم ہوا تو عرض بیگی باشی نے سر جھکا دیا اور آداب بجالا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

بادشاہ نے اس انداز میں گردن اٹھا کر نجیب الدولہ کی طرف دیکھا جیسے وہ کسی گہرے خواب سے بیدار ہوئے ہوں۔ ''مابدولت آپ کی سفارت کاری کے بارے میں جاننا چاہیں گے تاکہ معلوم ہو کہ کون مرہٹوں کا ساتھ دے گا اور کس کس کے غیر جانبدار رہنے کا امکان ہے''۔

نواب نجیب الدولہ کھڑے ہو گئے، آداب عرض کر کے انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے حاکموں اور راجوں مہاراجوں سے اپنے اور اپنے وکیلوں کے مذاکرات کی تفصیل بیان کی اور بتایا کہ راجپوت مرہٹوں کا ساتھ نہ دینے کا اپنا وعدہ پورا کریں گے کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ شاہجہان آباد میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنے کے بعد مرہٹے انہیں بھی ختم کر دیں گے۔ بھرت پور کا جاٹ حکمران مرہٹوں سے خوفزدہ بھی ہے مگر مذہب کے نام پر اس لڑائی میں وہ ان کا ساتھ دے گا۔ پنجاب کے سکھ جتھیدار بھی مرہٹوں سے خوفزدہ ہیں اور جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے بعد مرہٹے انہیں بھی کچل دیں گے۔ اس لئے سکھ مرہٹوں کی فوج کے ساتھ مل کر بادشاہ کے خلاف کسی جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔

''سردار آلا سنگھ کا رویہ کیا ہے؟'' بادشاہ نے پرچہ نویس کے مراسلہ کی روشنی میں جاننا چاہا۔

''سردار آلا سنگھ سکھ جتھیداروں میں بہت ہوشیار اور طاقتور ہے، اس کا دیگر سکھوں پر بھی اثر ہے، وہ آخری وقت تک دیکھے گا کہ کس فریق کا پلا بھاری ہے''۔ نجیب الدولہ نے جواب دیا۔

''راجپوتوں نے تو ہمیں مراسلے بھیجے تھے اور مرہٹوں کے خلاف ہمارے ساتھ مل کر لڑنے کا وعدہ کیا تھا''۔ بادشاہ نے پوچھا۔

''حضور، حکم دیں تو راجپوت اپنے وعدے پورے کرنے پر آمادہ ہیں''۔ نجیب الدولہ نے جواب دیا۔

''ہم جاننا چاہتے ہیں اس بارے میں ہمارے سرداروں کی کیا رائے ہے؟'' بادشاہ نے افغان سرداروں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

وزیراعظم شاہ ولی خان اجازت لے کر کھڑے ہو گئے اور آداب کے بعد عرض کیا کہ راجپوتوں کو لڑائی میں شامل کرنے کی بجائے ان کا اپنی اپنی ریاستوں میں رہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح راجپوت مرہٹوں کی پشت پر ان کے دکن سے رابطہ کی راہ میں حائل رہیں گے۔ دیگر افغان سرداروں نے اس کی تائید کی تو بادشاہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے جے پور اور جودھ پور کے راجپوت حکمرانوں کے لئے اس مضمون کے مراسلے تیار کرنے کا حکم دیا۔

شجاع الدولہ کے ساتھ اپنے روابط کے بارے میں نجیب الدولہ نے بتایا کہ وہ ہندوستان کی مغل سلطنت کی وزارت عظمیٰ کا خواہشمند ہے اور مرہٹوں نے اس کی یہ خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ پیشوا نے شجاع

الدولہ کو لکھا ہے کہ آپ شیعہ ہیں اور افغان سنی اس لئے وہ ہمارے اور تمہارے مشترکہ دشمن ہیں، ان کے خلاف ہمیں مل کر لڑنا چاہئے۔ شجاع الدولہ کے کچھ شیعہ سردار پیشوا سے متفق ہیں اور مرہٹوں کا ساتھ دینے پر بضد ہیں مگر شجاع الدولہ نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا کیونکہ سورج مل عماد الملک کو وزیراعظم بنوانے کا وعدہ کر چکا ہے۔

''ہم سمجھتے ہیں شجاع الدولہ کو احساس ہونا چاہئے کہ مرہٹے ہندو راج کا جو خواب دیکھ رہے ہیں اس میں سنی کی مانند شیعہ کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ آپ ہماری طرف سے نواب شجاع الدولہ کے پاس سفارت لے کر جائیں گے کہ ہم انہیں ہندوستان کا آئندہ وزیراعظم دیکھنا چاہتے ہیں''۔ بادشاہ نے حکم دیا۔

''بندہ حضور کے اس اعتماد اور حکم کے لئے شکر گزار ہے''۔ نجیب الدولہ نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سفارت میں حضور ملکہ زمانی بیگم کو شامل کرنے کا حکم صادر فرمادیں تو بہت مناسب ہوگا۔ شجاع الدولہ کے فیصلہ میں ان کی والدہ محترمہ کی رائے بہت اہم ہوگی۔ ملکہ زمانی حضور کی طرف سے انہیں پیغام اور خوشخبری سنائیں تو فیصلہ آسان ہو جائے گا''۔

بادشاہ نے نجیب الدولہ کے مشورہ کو سراہا اور مغل شہنشاہ محمد شاہ کی بیوہ ملکہ زمانی کو وفد میں شامل کرنے کی اجازت دے دی۔

''بندہ حضور سے یہ درخواست کرنے کی بھی اجازت چاہے گا کہ ملک سجاول کو سردار آلا سنگھ کے پاس بھیجا جائے۔ اس کا جرنیل سردار لکھنا، ملک کا ہم قبیلہ ہے اور پہلے بھی اس کے ذریعے ہم آلا سنگھ سے معاملات کرتے رہے ہیں''۔ نجیب الدولہ نے درخواست کی۔

''مابدولت خوش ہیں کہ ملک سجاول ملت کے مفاد میں ہمیشہ کمربستہ رہے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس بار بھی وہ کامیاب لوٹیں گے''۔ بادشاہ نے کہا۔

ملک سجاول نے تعمیل حکم کا یقین دلایا۔

''مغلانی بیگم نے اس مہم میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں عماد الملک کو مرہٹوں سے الگ کرنے کے لئے انہوں نے بہت کوشش کی ہے۔ ہمیں ان کی ان کوششوں کی قدر ہے اور ہمیں دکھ ہے کہ جہان خان نے ان کی شان میں گستاخی کی۔ ہم نے معین الملک کو اپنا فرزند کہا تھا، تیمور شاہ کو اس کا احترام کرنا چاہئے تھا۔ ہم نے ان کے لئے تیس ہزار روپیہ سالانہ کا جو وظیفہ مقرر کیا تھا وہ انہیں پسند نہیں تھا۔ اب ہم نے انہیں سیالکوٹ کا پرگنہ جاگیر میں عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ شاہ ولی خان انہیں ہمارے اس حکم سے آگاہ کریں گے اور کل ہی انہیں اس عطا کی سند حوالے کر دیں گے''۔ بادشاہ نے حکم دیا۔

''آج رات بیگم صاحبہ اور ان کے ملازمین کے لئے کھانا ہمارے شاہی مطبخ سے جائے گا''۔

شاہ ولی خان نے تعمیل حکم کے لئے سر جھکا دیا۔

مشاورت کے فوراً بعد شاہ ولی خان نے بیگم کے ہاں حاضر ہو کر انہیں بادشاہ کے حکم سے آگاہ کیا اور دوسرے روز پرگنہ سیالکوٹ کی جاگیر کا شاہی فرمان اور وہاں کے حکام کے نام پرگنہ کی نظامت بیگم کے حوالے کرنے کی دستاویز انہیں پہنچا دی گئیں۔

***

احمد شاہ ابدالی نے مغلانی بیگم کی پرانی خواہش پوری کر دی تھی۔ اب وہ شاہ کی وظیفہ خوار نہیں تھی، بہت بڑی جاگیر کی مالک تھی۔ سیالکوٹ کے پورے پرگنہ پر اس کی حکومت ہوگی۔ اس خیال سے اسے بہت اطمینان تھا لیکن پنجاب کی صوبیداری سے ایک پرگنہ کی حکومت کا مقابلہ کرتی تو بیتے دنوں کی یادیں اسے دکھی کرتیں۔ ان یادوں کو ذہن سے جھٹک کر نئی حکومت کا نظم چلانے پر غور کرتی تو پریشانی اور بھی بڑھ جاتی۔ سارا پنجاب جنگ کا شکار تھا۔ کاشتکار اور زمیندار اپنی جان اور [illegible]

مانتے تھے جس کے پاس اپنی فوج ہو۔ سکھوں کے جتھے حاکموں اور جاگیرداروں کو لوٹ لیتے تھے۔ کاشتکار جتھیداروں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے کسی کمزور جاگیردار کو مالیہ نہیں دیتے تھے اور نہ مالکانہ۔ پرگنہ سیالکوٹ سکھوں کی سرگرمی اور سرکشی کے اہم مراکز میں سے ایک تھا اگرچہ اب بھی دو صد خواتین و حضرات اس کے وابستگان میں شامل تھے مگر ان میں فوج بھرتی کرنے اور اتنے بڑے پرگنہ کے کاشتکاروں اور زمینداروں کو مالکانہ ادا کرنے پر مجبور کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنی مشکل بیان کر کے شاہ ولی خاں سے مدد کے لئے کہا تو اس نے جو جواب دیا اس سے اس کی انا کو گہرا زخم لگا تھا۔

''حضور تو پنجاب کی صوبیداری کے خواہشمند تھے، اس کے مقابلہ میں پرگنہ سیالکوٹ تو بہت چھوٹا علاقہ ہے''۔ اس نے ملک تجاول سے درخواست کی کہ وہ ملک قاسم کو اس کی طرف سے جاگیر کا ناظم بنانے پر راضی کریں مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ ''قاسم تو اب جہان خاں کی کمان میں ہے، حضور اس سے بات کریں''۔

احمد شاہ ابدالی نے جہان خاں کی گستاخی پر اظہار افسوس کرنے کے باوجود وہ جہان خاں سے کسی قسم کی مدد کی درخواست نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جاگیر کا فرمان شاہی ملنے کے بعد اس نے اپنا دستہ وہیں شاہی لشکرگاہ میں چھوڑ دیا اور خود شاہجہان آباد روانہ ہو گئی تاکہ جاگیر کا انتظام سنبھالنے کا بندوبست کر سکے۔

شاہ جہان آباد میں امن تھا، قلعہ معلی میں شاہنشاہ ہند مزے میں تھے اور قلعہ کی فصیل سے باہر ابدالی کے ناظم یعقوب خاں کا حکم چلتا تھا۔ بازار کھل چکے تھے، لوگ اپنے گھروں اور کاروبار پر واپس آ گئے تھے، جو امراء شہر سے بھاگ گئے تھے وہ بھی واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ امن کے باوجود شہر میں ہر کوئی اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند دکھائی دیتا تھا، کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کل کیا ہوگا۔ دکن سے مرہٹوں کی مزید فوجیں روانہ ہو چکی تھیں جن کے ساتھ بھاری توپ خانہ بھی تھا۔ مرہٹہ لشکر کا کماندار ہر پڑاؤ پر یہ اعلان کرتا آ رہا تھا کہ وہ جامع مسجد دہلی کے محراب میں سومنات کی مورتی رکھ کر اس کی پوجا کرانے آیا ہے۔ شہر سے چھ سات میل باہر افغان فوج پڑاؤ ڈالے مرہٹوں کا انتظار کر رہی تھی۔ طاقتور مسلمان حاکموں احمد خاں بنگش اور شجاع الدولہ نے ابھی تک مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دینے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بہار میں مقیم مقتول شہنشاہ عالمگیر ثانی کے بیٹے نے اپنے شہنشاہیت کا اعلان کر دیا تھا اور احمد شاہ ابدالی کو مراسلہ بھیجا تھا کہ وہ ان کی شہنشاہیت کے حق میں فرمان جاری کر کے ان کے شاہجہان آباد اور قلعہ معلی کے تخت و تاج کے حصول میں مدد دیں۔ مغلیہ تخت و تاج پر شاہجہان ثانی براجمان تھا۔ ہندوستان کا کیا بنے گا۔ شہنشاہ [illegible] رہے گی بھی یا نہیں اور اگر رہے گی تو شہنشاہ ہند کون ہوگا، شاہجہان ثانی ہی بنا رہے گا یا شاہ عالم ثانی کو ا [illegible] قلعہ میں بٹھا [illegible] جائے گا یا پھر مرہٹوں اور افغانوں کی [illegible] میں فتح حاصل کرنے والا خود شاہنشاہ ہندوستان بننا پسند [illegible] گا؟ کسی کو کچھ اندازہ نہ تھا، سب اس بارے میں سوچ رہے تھے مگر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ کس کا ساتھ دیں۔

شمالی ہند کے میدانوں پر موسم سرما کی حکمرانی ختم ہو چکی تھی اور گرما نے قدم جما لئے تھے سرد علاقوں کے افغان سب سے زیادہ اس دشمن سے خوفزدہ ہوتے تھے مگر ان کے بادشاہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں کسی فیصلہ کے بغیر واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔ ان کے ہندوستانی حلیفوں کو افغانوں کے اس خوف کا احساس تھا اس لئے نواب نجیب الدولہ نے درخواست کی تھی کہ بادشاہ معظم علی گڑھ منتقل ہو جائیں تاکہ گرمی کا مقابلہ

آسان ہو جائے۔ بادشاہ نے ان کا مشورہ قبول کر لیا تو بیگم نے بھی اپنا دستہ اور ذیرہ شاہی لشکر کے ساتھ مظفر آباد سے علی گڑھ بھیج دیا تھا مگر خود شاہجہان آباد میں مقیم رہیں۔ انہوں نے طہماس خاں کو جاگیر کا ناظم مقرر کر کے سیالکوٹ بھیج دیا تھا۔ وہ خود حالات کا جائزہ لینے کے لئے دارالحکومت میں ہی رہنا چاہتی تھیں۔ شاہجہان آباد واپس آنے کے بعد سے ان کی سوچ بدلنے لگی تھی۔ شاہجہان آباد کے بعض امراء کا خیال تھا کہ احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کے اتنے بڑے لشکر اور جدید ترین توپ خانہ کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے، اس لئے بیگم دونوں فریقوں سے تعلق قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ان کا دستہ اور ذیرہ شاہ کی لشکر گاہ میں تھے تو خود ان سے الگ رہ کر وہ مرہٹوں کی قوت کا جائزہ لینا چاہتی تھی اور کبھی کبھی وہ عمادالملک کے فیصلے کے درست ہونے کے بارے میں سوچنے لگی تھی اس لئے جب نواب شولاپوری بیگم نے عمادالملک کے فیصلہ اور مراسلہ پر دکھ کا اظہار کیا تو اس نے اسے تسلی دی۔ ''عمادالملک ہندوستان کے حالات اور مرہٹوں کی قوت کو بہتر جانتا ہے، حضور کو اس کے بارے میں زیادہ فکر نہیں کرنا چاہئے''۔

نواب شولاپوری بیگم اس کا جواب سن کر چونکی۔ ''ہم مرہٹوں کی قوت کو اپنی قوت سمجھنے کی غلطی کے حق میں نہیں''۔

مغلانی بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خیال کرنے لگی تھی کہ شولاپوری بیگم اپنے بیٹے کے قتل کی وجہ سے عمادالملک کے ہر فیصلہ کی مخالفت کرتی ہیں۔

سردی کے بعد بادِ بہاری سے درختوں میں نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں تو نواب شولاپوری بیگم کی قلعہ نما حویلی کے وسیع باغ کے ٹنڈ منڈ درختوں کی شاخوں پر سبز کونپلیں دیکھ کر اس نے سوچا تھا شاید یہ بھی ان کے خاندان کے موسم بہار کی واپسی کی نشانیاں ہوں اور سیالکوٹ کے پرگنہ کی جاگیر اور مرہٹوں کے لشکر جرار کی عمادالملک کی حمایت میں آمد اقتدار کے موسم خزاں کے بعد بہار کی نئی کونپلیں ثابت ہو سکیں۔

''ہم سمجھتے ہیں شہنشاہ شاہجہان ثانی سلطنت تیموری کو سہارا دے سکے گا''۔ اس نے موضوع بدل دیا۔

''شہد کے خالی چھتے میں پھنسی اکیلی مکھی کے بارے میں جس کا دل جو چاہے سوچے کوئی پابندی تھوڑا ہے''۔ نواب شولاپوری بیگم نے گردن اٹھائے بغیر جواب دیا جیسے اسے شہنشاہ اور سلطنت تیموریہ سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

***

بارشوں سے شاہجہان آباد کی جھلسا دینے والی گرمی کا زور ٹوٹ گیا تو حبس کا زور بڑھ گیا حالات کی بے یقینی نے مغلانی بیگم کے لئے یہ موسم اور بھی ناقابل برداشت بنا دیا۔ پہلے خبر آئی کہ احمد خاں بنگش اپنے لشکر سمیت احمد شاہ ابدالی سے آن ملے ہیں۔ اس کے بعد نجیب الدولہ اور ملکہ زمانی کے لکھنؤ سے کامیاب لوٹنے کی اطلاع شاہجہان آباد کے بازاروں اور امراء کی حویلیوں میں سنی جانے لگی تو ان کی رائے پھر سے بدلنا شروع ہوگئی۔ شجاع الدولہ کے پاس جنگجو دستوں کے علاوہ توپ خانہ بھی تھا، مرہٹوں کی طرف سے ہندوستان کا وزیراعظم بنانے کی پیشکش اور احمد شاہ ابدالی کی فتح کو کنی فتح قرار دینے کی وجہ سے شجاع الدولہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کس کا ساتھ دے۔ مگر ملکہ زمانی نے اس کی والدہ کو شاہ کی طرف سے یقین دلایا کہ مرہٹوں کو کچلنے کے بعد ہندوستان کی وزارت عظمیٰ اس کے بیٹے کے سپرد کر دی جائے گی تو والدہ نے بیٹے کو مسلمانوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے اسے سمجھایا کہ مرہٹے اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کریں گے اور مسلمانوں کی قوت کے خاتمہ کے بعد اس کی ریاست پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ ان کے لئے سنی اور شیعہ برابر ہیں پھر اس کا بھی کیا یقین ہے کہ ضرور

مرہٹے ہی کامیاب ہوں گے۔ ان کا اتحادی سورج مل عمادالملک کو وزیراعظم دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس نے مرہٹوں کے ساتھ مل جانے کا فیصلہ کیا تو سورج مل اور عمادالملک کے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مل جانے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی اور ہندوستان کے علماء اور مسلمان جواب عمادالملک کو ملت کے دشمنوں کا ایجنٹ سمجھتے ہیں، وہ سب اسے ملت فروش قرار دیں گے۔ شجاع الدولہ لشکر اور توپ خانہ سمیت شاہ کے حضور حاضر ہوگیا۔

اسی دوران سیالکوٹ سے طہماس خاں کا مراسلہ موصول ہوا کہ چہار محل کا حاکم پرگنہ سیالکوٹ کا قبضہ دینے پر آمادہ نہیں تو بیگم کی قوت فیصلہ اس کا ساتھ چھوڑنے لگی۔ کبھی وہ علی گڑھ جا کر شاہ ولی خاں سے مدد حاصل کرنے کا پروگرام بناتی اور کبھی شاہجہان آباد میں رہ کر لڑائی کے نتیجہ کا انتظار کرنے کا فیصلہ کرتی۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس میں پہلے جیسی قوت فیصلہ نہیں رہی۔

شدید بارشوں کی وجہ سے دریا کناروں سے بہت دور تک پھیل گئے تھے۔ مرہٹوں یا احمد شاہ ابدالی کے لئے اپنا لاؤ لشکر اور توپ خانہ دریا کے پار لے جانا ممکن نہ تھا۔ مرہٹہ فوجیں آگرہ میں جمع تھیں اور احمد شاہ ابدالی علی گڑھ سے انوپ شہر منتقل ہو گئے تھے اور دونوں کے درمیان دریا حائل تھا اور فوری طور پر ان کے درمیان لڑائی کا امکان نہیں تھا لیکن یہ صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ اب کے جو جنگ ہوگی اس سے فیصلہ ہو جائے گا کہ ہندوستان پر ہندو راج قائم ہو یا مسلمانوں کی حکومت برقرار رہے۔ ہندوستان کے آئندہ وزیراعظم کا بھی میدان جنگ میں ہی فیصلہ ہوگا۔ بیگم اتنے وسیع اور الجھے ہوئے سیاسی اور جنگی نقشہ پر پھیلے مہروں کی چالوں کا جائزہ لیتی تو اپنی ہی بنائی چال بھول جاتی تھی۔

***

کنیزوں نے ایک بار پھر اس کے تخت کا مقام بدل دیا۔ نیم کے گھنے درخت کے نیچے صبح جب اس نے تخت پر بچھے قالین پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر ہندوستان کی بساط پر چنے مہروں کی چالوں سے مستقبل کا نقشہ ترتیب دینا شروع کیا تھا تو درختوں کے سائے بہت طویل تھے۔ پھر وہ طویل سائے سمٹنے لگے اور درختوں کے قدموں سے چمٹ گئے۔ وقت گزرتا رہا سائے پھر سے بڑھنا شروع ہو گئے کنیزوں نے دوسری بار تخت کی جگہ بدلی تو وہ سایوں کے گھٹنے بڑھنے کے تماشا پر غور کرنے لگی۔ شاید اس خاندان کا سایہ بھی جس کی چھاؤں میں ہندوستان کے باسی ایک طویل عرصہ گزار چکے ہیں، پھر طویل ہو جائے۔ حکمران اور درخت میں کیا فرق ہوتا ہے؟ جس کی تکلیف وہ دوپہر وہ اسی نیم کے درخت کے نیچے گزارتی تھی، دن بھر کنیزیں پاس کھڑی پنکھا ہلاتی رہتی تھیں اور وہ گم صم بیٹھی رہتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ سائے کی جگہ بدل لینے پر کنیزیں تخت کی جگہ بدلنے کی اجازت چاہتیں تو وہ محسوس کرتی جیسے اسے کسی خواب سے بیدار کر دیا گیا ہو مگر آج صبح سے وہ سایوں کے قدموں کی آواز بھی صاف سن رہی تھی۔ نیم پر سے کوئی رس بھری نمولی گرتی یا پنکھا ہلانے والی کنیز ایک پاؤں سے اپنا وزن دوسرے پر منتقل کرتی تو بھی وہ چونک پڑتی تھی۔ شب گزشتہ جو خبر ملی تھی اس کے بعد سے وہ کوئی ایسی آواز یا قدموں کی چاپ جس کا ان مہروں کی چالوں سے تعلق ہو سننے کے لئے بے تاب تھی۔

سورج غروب ہوگیا مگر سائے کے قدموں اور نیم کے درخت پر نمولیوں کا رس چوسنے والے پرندوں کی آوازوں کے علاوہ کوئی آواز نہ آئی تو مایوسی اور بے یقینی کا بوجھ بڑھنے لگا۔

شاہجہان آباد کے آسمانوں پر بادل کا کوئی ٹکڑا بھی کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا، ہوا اتنی تھمی تھی کہ کسی درخت پر کوئی پتا بھی نہیں ہل رہا تھا۔ ''ہمارے لاہور میں تو شام جب ایسا ہوتا اس شب بارش لازماً ہوا کرتی تھی

اس نے کنیز کو مخاطب کیا۔ ''شاہجہان آباد میں موسم کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا''۔

''حضور کا فرمانا بجا ہے''۔ کنیز نے جھک کر جواب دیا۔

''ٹھنڈے ملک کے باسی افغانوں کے لئے تو علی گڑھ کا موسم بہت ناگوار رہا ہوگا؟'' شاید اس نے اس لئے کنیز سے پوچھ لیا کہ وہ خاموشی سے تھک چکی تھی۔

''اندازاً ایسا ہی ہوگا''۔ کنیز نے محسوس کیا آج ان کی مالکہ باتیں کرنا چاہتی ہیں۔ ''وہ تو ہم سے بھی زیادہ ٹھنڈے ملک سے آئے ہیں''۔

''ہمارا لاہور ٹھنڈا تو نہ ہوتا تھا''۔ اس نے کنیز کو ٹوکا۔

''کنیز کا مطلب لاہور سے نہیں جموں سے تھا''۔ وہ گھبرا گئی۔

''ہمیں جموں بھی پسند نہ آیا، اس کی ٹھنڈک بھی دکھ دینے والی تھی''۔ بیگم کا موڈ بلاوجہ خراب ہونے لگا۔

''حضور عالی کا فرمانا بجا ہے کنیز تو جموں کے دن اور راتیں یاد کر کے پریشان ہونا شروع ہو جاتی ہے''۔ کنیز کو بھی جموں کے موسم کو ناپسندیدہ قرار دینا پڑا۔

''ہم تو سمجھتے ہیں آج شب یہاں بھی بارش ہو گی''۔

''بادلوں پر حضور کی خواہش کا احترام لازم ہے''۔ کنیز نے اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کے لئے جواب دیا۔

زنانہ کے دروازے کے عقب سے میاں خوش فہم نمودار ہوئے تو بیگم موسم، بارش اور لاہور کو بھول گئی اور دور تک روشن شمعوں کے گرد جمع پروانوں کو ایک نظر دیکھ کر دروازہ پر آنکھیں گاڑھ دیں۔

میاں خوش فہم کی رفتار سے اس نے اندازہ کیا کہ جس خبر کے سننے کے لئے وہ صبح سے بے تاب تھی، میاں وہی خبر سنانے کے لئے بے تاب ہے۔ ''حضور مرہٹوں کی فوجیں شاہجہان آباد کے دروازوں تک پہنچ گئی ہیں''۔ اس نے آداب بجا لا کر پریشانی سے اطلاع دی۔

''مرہٹوں کی فوجوں کے ساتھ اور کس کس کی فوجوں کی اطلاع ہے؟'' بیگم نے اطمینان سے پوچھا۔

''حضور سنتے ہیں بھرت پور کے ہندو راجہ کی فوجیں بھی ان کے ہمراہ ہیں''۔

''کسی مسلمان کی فوجیں بھی ہیں؟'' وہ جو پوچھنا چاہتی تھی خوش فہم وہی انہیں بتانا نہیں چاہتا تھا۔

''یعقوب خاں کے سرداروں کا کہنا ہے کہ ابراہیم گاردی کا توپ خانہ بھی مرہٹوں کے ساتھ آیا ہے''۔

''اس طرف کا کوئی مسلمان نہیں آیا ان کے ساتھ؟'' بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

''نواب عمادالملک بھی مرہٹوں کی رہنمائی کے لئے ساتھ آئے ہیں''۔ میاں خوش فہم نے بتایا۔

''ہم چاہتے ہیں شہر کے حالات سے ہمیں باخبر رکھا جائے، شہباز خاں کو فوراً پیش کریں اور افغان فوجوں کے بارے میں ہمیں اطلاع دیں''۔ بیگم نے اسی اطمینان سے حکم دیا۔

میاں خوش فہم فرشی سلام کر کے باہر نکل گیا، وہ حیران تھا کہ مرہٹوں کی فوج کے پہنچ جانے کی خبر سن کر بیگم کے چہرے پر اس فکر کی کوئی علامت دکھائی نہیں دی۔ احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان آنے کے بعد سے بیگم اس کے لشکر کے ساتھ رہی ہے، اب بھی اس کا دیوان اور ہمدم ابدالی کے ہمراہ ہے مگر شہر میں موجود چند ہزار افغانوں کے مقابلے میں مرہٹوں کے اتنے بڑے لشکر کے پہنچ جانے کی اطلاع سن کر اس نے کسی قسم کی پریشانی ظاہر نہیں کی اور افغان فوجوں کے بارے میں جو سننے کے لئے بے تاب ہے۔ نواب عمادالملک کے مرہٹوں کے ساتھ ہونے کے باوجود خواجہ سرا خوش فہم کو ان کی فوجوں کی آمد کی خبر سے دکھ محسوس ہوا تھا۔ بیگم کے ردعمل سے اس کا دکھ بڑھ گیا۔

***

جب خبر آئی کہ احمد شاہ ابدالی کے صوبیدار یعقوب خاں نے قلعہ معلیٰ خالی کر دیا ہے تو بیگم اپنی خوشی چھپا نہ سکی۔ میاں خوش فہم شاہجہان آباد پر مرہٹوں کا قبضہ مکمل ہو جانے کی خبر دے کر سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے عروج اور آزمائش کے ہر مرحلہ میں بیگم کی خوشی کو اپنی خوشی اور اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھا تھا مگر آج اس کی خوشی پر اسے دلی صدمہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سر ڈالے غیر مستحکم قدموں سے چلتا ہوا مردانہ کی طرف جا رہا تھا کہ ڈیوڑھی کے محافظ کا پیغام ملا وہ وہیں سے ڈیوڑھی کی طرف مڑ گیا۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے سامنے سواروں کا ایک دستہ کھڑا تھا۔ شاہجہان آباد پر مرہٹوں کے قبضہ کی جنگ کے دس دنوں میں شہر کی فضا توپوں کی آوازوں سے گونجتی رہی تھی۔ قلعہ معلیٰ کی دیواروں اور شاہجہان آباد کے باسیوں نے اپنی زندگیوں میں پہلی بار توپوں کی تباہ کاریوں کا سامنا کیا تھا۔ مرہٹوں جاٹوں اور عمادالملک کی ٹڈی دل فوج کے مقابلہ میں اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ یعقوب خان قلعہ بند ہو گیا تو شہر مرہٹوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ قلعہ پر قبضہ کے لئے دس روز تک مرہٹہ توپیں گولے برساتی رہیں۔ قلعہ کے گرد خندقیں کھود کر مرہٹہ فوجیں فصیل برجوں اور دروازوں پر قبضہ کی شدید جنگ لڑتی رہی تھیں مگر اس ساری لڑائی اور تباہ کاری کے دوران کسی مرہٹہ یا افغان دستہ نے کبھی بیگم کی حویلی کا رخ نہیں کیا تھا۔ عمادالملک نے مرہٹہ فوجوں کی رہنمائی کرنے یا تسلی دینے کے لئے کبھی کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا۔ شہر سے روانگی کے مرحلہ میں نقاب پوش افغان سوار دستہ دروازے پر کھڑا دیکھ کر میاں خوش فہم کو پریشان ہونا چاہئے تھا مگر اس کے انداز سے پہریداروں نے محسوس کیا کہ وہ خوش ہو رہا ہے۔ اگر وہ اپنی اس خوشی کا تجزیہ کرتا تو شاید اسے خود بھی پتہ چلتا کہ وہ کیوں خوش ہے۔ شاید اس کے دل میں کہیں یہ خواہش بیدار ہونے لگی تھی کہ کوئی آئے اور مغلانی بیگم کی خوشی کو دکھ میں بدل دے۔

''دستہ کے سردار بیگم صاحبہ کے حضور فوری حاضری پر اصرار کر رہے ہیں''۔ ڈیوڑھی کے کماندار نے میاں خوش فہم کو بتایا۔

''ہمارے پاس انتظار کے لئے وقت نہیں''۔ ایک سوار نے آگے بڑھ کر میاں خوش فہم سے کہا۔ ''بیگم صاحبہ کو اطلاع کر دیں کہ سردار قاسم فوری پیغام پہنچانا چاہتے ہیں''۔

قاسم کا نام سن کر میاں خوش فہم تیزی سے دستہ کی طرف بڑھے تمام سواروں نے ایک ہی جیسے لباس اور نقاب پہن رکھے تھے۔ ایک ہی جیسے ہتھیار لگائے وہ ڈیوڑھی سے کچھ فاصلہ پر کھڑے تھے۔ کوشش کے باوجود وہ ان میں ملک قاسم کو پہچان نہ سکے۔ ''کیا ہم سردار قاسم سے خود بات کر سکتے ہیں''۔ خوش فہم نے بلند آواز میں پوچھا۔

''سردار بیگم صاحبہ کے سوا کسی سے بات نہیں کریں گے اگر ہمیں فوری جواب نہ ملا تو ہم مجبور ہوں گے کہ بلا اجازت جواب حاصل کریں''۔ ایک سوار نے تلخ لہجہ میں جواب دیا۔

''ہمارے سردار قاسم اس دستہ میں موجود ہوں تو انہیں کسی اجازت کی ضرورت نہیں تشریف لائیں''۔ میاں خوش فہم نے بیگم سے پوچھے بغیر ہی اجازت دے دی۔

پہریدار ایک طرف ہٹ گئے اور افغان دستہ حویلی میں داخل ہو گیا۔

میاں خوش فہم کے بیگم کو اطلاع دینے سے پہلے ہی چق پردہ کی ڈیوٹی پر متعین کنیز نے نقاب پوش سواروں کے داخلہ سے بیگم کو خبردار کر دیا تھا۔ نامعلوم سواروں کے اس انداز پر پریشانی کو چھپانے کی کوشش میں بیگم میاں خوش فہم کو حاضر کرنے کا حکم دینا بھی بھول گئی جو نو ...

کوئی معاملہ ان کے مشورے کے بغیر طے نہیں کیا کرتے تھے۔

سوار ڈیوڑھی سے زنانہ کی طرف جانے والے راستہ پر پھیل گئے۔ خدام خوف سے سراسیمہ دور ہٹ کر اپنے اور بیگم کے انجام کے بارے میں سوچنے لگے۔ تین سوار زنانہ کے سامنے گھوڑوں سے اترے۔ میاں خوش فہم کو بیگم کے دیوان تک لے جانے کا حکم دے کر ساتھ چلنے لگے۔ میاں بھی پریشان ہو گیا، کیا معلوم یہ کیا کر گزریں؟ مگر اب اس کے پاس ان کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سوار دیوان کے دروازے پر کھڑے ہو گئے اور میاں کو فوری حاضری کی اجازت لینے اندر بھیج دیا دوسرے ہی لمحہ وہ باہر آ کر انہیں ساتھ لے گیا۔

''ہم بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی کے صوبیدار یعقوب خاں کی طرف سے یہ معلوم کرنے آئے ہیں کہ حضور بادشاہ معظم کی لشکر گاہ میں منتقل ہونا پسند فرمائیں گی یا شاہجہان آباد میں مقیم رہ کر بادشاہ معظم کے استقبال کی منتظر رہنا پسند کریں گی''۔ ایک نقاب پوش نے پوچھا۔

''ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ صوبیدار یعقوب خاں کا پیغام ہم تک پہنچانے والے سردار کی شناخت کیا ہے''۔ بیگم کی پریشانی دور ہو گئی تھی۔

''اگر یہ بتانا لازم ہے تو بادشاہ معظم کے اس خادم کو قاسم کہتے ہیں''۔ اسی نقاب پوش نے جواب دیا۔

''بادشاہ معظم کے جاں نثار سردار قاسم اگر ملک قاسم ہیں تو ہمیں ان سے بات کر کے مسرت ہوگی''۔ بیگم نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

''بادشاہ معظم کا یہ سپاہی حضور کو اس مسرت سے محروم نہیں کرے گا''۔ اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''ہم نہیں سمجھتے کہ قاسم ہمیں ہماری مہمان نوازی سے محروم کرے گا''۔ بیگم نے گفتگو کا جال پھینکا۔

''میدان جنگ میں سپاہی اپنے کماندار کے حکم کو ہر حق پر فوقیت دیتا ہے اور اس کا کماندار جہاد کی منزل پر روانگی کی جلدی میں ہے''۔

''کیا کماندار نے یہ بتانے کی اجازت دی ہے کہ فی الوقت وہ کس مقام پر قدم رکھتے ہیں''۔

''بادشاہ معظم کے مجاہد علی مردان خاں کے محل میں اپنے گھوڑوں پر زینیں کس رہے ہیں''۔

''ہمیں افسوس ہے کہ ہم بادشاہ معظم کی قدم بوسی کے لئے تیاری نہ کر سکے ہمیں صوبیدار کے قلعہ معلی چھوڑنے کی خبر نہ تھی''۔ بیگم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ملک قاسم ان کی بات پر یقین نہیں کریں گے۔ یہ ظاہر کیا کہ قلعہ پر مرہٹوں کے قابض ہو جانے سے وہ اب تک لاعلم ہے۔ ''ہم فوری طور پر یعقوب خاں کے ہمراہ روانہ ہونے سے قاصر ہیں''۔

''ہم حضور کے فیصلے سے کماندار کو مطلع کر دیں گے''۔ نقاب پوش نے جواب دیا اور سلام کر کے ساتھیوں سمیت کمرے سے باہر نکل گیا۔

بیگم کروٹ بدل کر ان کے انداز اور الفاظ پر غور کرنے لگی۔ ''حضور بادشاہ معظم کی لشکر گاہ میں منتقل ہونا پسند فرمائیں گی یا شاہجہان آباد میں رہ کر بادشاہ معظم کے استقبال کا انتظار کرنا پسند فرمائیں گی؟''

وہ میاں خوش فہم کی کمرے میں موجودگی اور اس کے نقاب پوشوں کے پیچھے تیزی سے باہر نکل جانے پر بھی غور نہ کر سکی۔

''سردار اپنے دعا گو کو سلام اور سلامتی کی دعاؤں کے حق سے تو محروم نہ کریں''۔ میاں خوش فہم کے انداز میں روایتی طنز کی بجائے التجا کا رنگ غالب تھا۔ ''پورے شاہجہان آباد میں آپ کی سلامتی اور بادشاہ معظم کی کامیابی کے لئے دعا کرنے والا اگر ایک ہی فرد ہوا تو وہ یہ خادم ہوگا''۔

قاسم تیز چلتا چلتا رک گیا۔ ''ہمارے وقت کا ہر لمحہ ملت کی امانت ہے۔ ہم وقت ضائع کر کے گنہگاروں میں شامل نہیں ہونا چاہتے''۔ اس نے میاں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مصافحہ کر کے جلدی سے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

مصافحہ کی گرمی اور ہاتھ کی سختی کا احساس ختم ہونے سے پہلے سوار میاں خوش فہم کی نظروں کے افق سے اوجھل ہو گئے تھے مگر وہ اب بھی وہیں کھڑا تھا۔ گھوڑوں کے اوجھل ہو جانے کے بعد ان کے قدموں کے گرد و غبار کو فضا میں بلند ہوتا دیکھ رہا تھا۔

***

غروب آفتاب سے پہلے ہی شہباز خاں نے اسے بتا دیا تھا کہ یعقوب خان اپنے سواروں اور اسلحہ سمیت دریا سے پار اتر گیا ہے اور اب شاہجہان آباد قلعہ معلیٰ اور شہنشاہ شاہجہان ثانی سب مرہٹوں کے قبضہ میں ہیں مگر عمادالملک کے بارے میں وہ اس سے زیادہ کوئی خبر نہ دے سکا کہ وہ نواب سعد اللہ خاں کے محل میں مقیم ہیں۔ بیگم کو جس خبر کا انتظار تھا وہ ابھی تک سننے کو نہیں مل سکی تھی۔

''ہم سنتے ہیں قلعہ معلیٰ کو توپوں سے شدید نقصان پہنچا ہے؟'' اس نے موضوع بدل دیا۔

''جی حضور نے درست سنا۔ موتی محل شاہ برج اور دیوان خاص کے در و دیوار کو مہلک زخم آئے ہیں''۔ اس نے جواب دیا۔

''کیا ہم مان لیں کہ دس روز کی توپ زنی پر بھی مرہٹہ قلعہ میں داخل نہ ہو سکے؟'' بیگم نے پوچھا۔

''قلعہ بند افغانوں نے انہیں فصیل اور کسی دروازہ کے نزدیک نہ آنے دیا۔ وہ قلعہ سے نکل کر حملہ کرتے اور حملہ آوروں کو تہہ تیغ کر کے واپس لوٹ جاتے۔ بادشاہ معظم کی طرف سے کمک نہ پہنچنے پر انہوں نے خود قلعہ خالی کیا ہے''۔

''شہنشاہ معظم تو خیریت سے ہوں گے؟'' بیگم نے پوچھا مگر ان کا ذہن بادشاہ معظم کے کمک نہ بھیجنے کی وجہ تلاش کر رہا تھا۔

''شہنشاہ معظم اور ان کا محل سلامت ہیں''۔ شہباز خان نے جواب دیا۔

بیگم کو اس اطلاع پر خوشی محسوس ہونے لگی۔ شاہجہان ثانی کو عمادالملک نے تخت پر بٹھایا تھا اس کا مطلب ہے مرہٹے عمادالملک کے فیصلے کا احترام کرتے ہیں۔

جب انہیں بتایا گیا کہ مرہٹہ فوجیں امراء اور شہریوں کے گھر لوٹ رہی ہیں تو اسے پریشانی ہونے لگی۔ اس نے ڈیوڑھی کے محافظوں کو خبردار رہنے کی ہدایت کی اور شمع جلا کر عمادالملک کے بارے میں کسی خوشخبری کا انتظار کرنے بیٹھ گئی۔

اگلی صبح شاہجہان آباد کے امراء کے محلوں اور حویلیوں کے بعد بازاروں اور عام لوگوں کے گھروں کے لٹنے کی خبریں موصول ہونے لگیں پھر خبر آئی کہ مرہٹہ فوجوں کے کمانڈر سداشیو بھاؤ کے حکم پر شہنشاہ محمد شاہ کے مقبرہ میں سے قیمتی جھاڑ فانوس سونے کے شمعدان گلدان اور کھڑکیاں دروازے اتار لئے گئے ہیں۔ ایک سردار کے دستے کے ہمراہ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ میں داخل ہو گیا اور مسجد سے سونے کے بڑے بڑے فانوس اتروا لئے اور وہ مسجد کے اندر گولیاں چلاتے رہے تو بیگم کی پریشانی بڑھ گئی لیکن اس کی اپنی حویلی ابھی تک محفوظ تھی۔ نواب شوالا پوری بیگم کی حویلی کی طرف بھی کوئی مرہٹہ دستہ نہیں آیا تھا۔ اس نے سوچا شاید مرہٹہ فوجیں عمادالملک کی وجہ سے ان کا احترام کر رہی ہیں۔

چند روز بعد شہباز خاں نے قلعہ معلیٰ کے دیوان خاص کی چھت اور دیواروں پر سے چاندی کے تختہ در تختہ غلاف اتار لینے کی افواہ کی تصدیق کی تو اسے شہنشاہ ہندوستان شاہجہان ثانی اپنے سے بھی زیادہ مجبور نظر آنے لگا

بس محسوس ہونے لگا۔ ''جو شہنشاہ اپنا گھر نہ بچا سکا وہ مرہٹوں سے رعایا کو کیا بچائے گا؟'' شہباز خان نے گویا اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

مگر وہ خاموش رہی۔

مرہٹوں کے ہاتھوں امراء شرفاء اور شہر کے لٹ جانے والے مزاروں درگاہوں کی بے حرمتی اور آل تیمور کے شاہکار دیوان خاص کی چھت کی آرائش و زینت کے اتر جانے سے بھی زیادہ دکھ اور صدمہ کی بیگم کے لئے یہ اطلاع تھی کہ میاں خوش فہم کہیں چلے گئے ہیں۔ ایک صبح جب بیگم نے اسے طلب فرمایا تو خادم نے واپس آ کر بتایا کہ اس کی کوٹھڑی خالی پڑی ہے۔

میر منو مرحوم کے وقت سے خواجہ سرا میاں خوش فہم اس کے محل اور حویلی کے نظم کا سربراہ چلا آ رہا تھا۔ جب وہ پنجاب کی سربراہ اور بااختیار حاکم تھی تو اپنے سارے احکامات اور فرمان اسی کے ذریعہ پہنچایا کرتی تھی۔ دربار اور صوبہ کے امراء میاں خوش فہم کو اصل حاکم سمجھتے تھے۔ قید اغواء اور نظر بندی کے ہر مرحلہ میں میاں کی فراست اور وفاداری سے وہ آزمائشوں پر قابو پاتی رہی تھی، میاں کے اس طرح غائب ہو جانے پر اسے بہت دکھ ہوا۔

شہباز خان نے اپنے سارے وسائل اور ذرائع سے اس کی تلاش کی مگر ہیں کوئی سراغ نہ ملا۔

خوشخبری کی منتظر مغلانی بیگم کے مقدر میں ابھی اور بھی صدمات لکھے تھے۔ سدا شیو بھاؤ نے شہنشاہ معظم شاہجہان ثانی کو برطرف کر کے اس کی حویلی میں قید کر دیا اور مقتول شہنشاہ عالمگیر ثانی کے بیٹے شہزادہ عالی گوہر کو تخت ہند کا جائز وارث اور شہنشاہ تسلیم کر لیا اور بہار سے اس کی واپسی تک اس کے بیٹے جواں بخت کو اس کا جانشین تسلیم کر لیا۔ انہوں نے بھی شجاع الدولہ کو وزیر اعظم سلطنت مغلیہ نامزد کرنے کا اعلان کر دیا اور نارو شنکر پنڈت کو شاہجہان آباد کا صوبیدار مقرر کر کے نظم اس کے سپرد کر دیا۔ اس سے پہلے احمد شاہ ابدالی بھی شہزادہ عالی گوہر کے شہنشاہ ہند اور شجاع الدولہ کے وزیر اعظم ہونے کا فرمان جاری کر چکے تھے۔

سدا شیو بھاؤ نے دونوں کو عدم موجودگی میں ایک نام کا شہنشاہ اور دوسرے کو نام کا وزیر اعظم بنانے کا اعلان کر کے شاہجہان آباد پر مرہٹہ اقتدار قائم کر دیا اور عماد الملک کو وزیر اعظم برقرار رکھنے کے وعدے کی پروا نہیں کی اس نے مرہٹوں کی دوستی اور قوت پر بھروسہ کر کے اپنی ملت سے بے وفائی کی تھی۔ مرہٹوں نے اپنے قومی مفاد سے وفا کی خاطر اس سے اور سورج مل سے کئے گئے وعدوں کی خلاف ورزی کی۔

مایوس اور نامراد عماد الملک اپنی فوج کے ہمراہ سورج مل کی پناہ میں واپس چلا گیا۔ اس کے لئے اب نہ کوئی راستہ تھا نہ امید کی کوئی کرن نظر آتی تھی۔ اس کے جانے کے ساتھ ہی بیگم کی آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ مرہٹوں کی کامیابی پر اس کی خوشی ایک ہفتہ بھی باقی نہ رہی تو وہ احمد شاہ ابدالی کی فتح اور مرہٹوں کی شکست فاش کی خواہش کی پرورش کرنے لگی اور احمد شاہ ابدالی کی لشکر گاہ تک پہنچنے کے انتظامات میں مصروف ہو گئی۔

شاہجہان آباد پر اقتدار مستحکم کرنے کے بعد سدا شیو بھاؤ نے دریائے جمنا کے کنارے خیمے گاڑھ دیئے۔ وہ دریا کے گھاٹوں پر قبضہ کر کے نجیب الدولہ کی ریاست تاراج کر کے اسے سزا دینے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ گھاٹوں پر مرہٹوں کے قبضہ سے بیگم کے لئے انوپ پہنچنا دشوار ہو گیا۔

***

سرائے کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں بہت حبس تھا، وہ شمع جلاتی تو اس پر بھنوروں کے جتھے جمع ہو جاتے۔ شمع جلتے ہی موٹے موٹے مچھر جنگی ترانہ گاتے ہوئے حملہ آور ہو جاتے۔ طویل سفر کی تھکن سے اس کا جسم چور چور تھا اور

آنکھیں نیند سے پھٹی جا رہی تھیں۔ مچھر اور حبس کسی کروٹ آرام نہیں لینے دیتے تھے۔ سرہانے کھڑی کنیز اونگھ گئی تو اس کے ہاتھ سے پنکھا گر گیا، فرش پر پنکھا گرنے کی آواز پر کنیز ہڑبڑا کر پنکھا اٹھانے جھکی تو نیم تاریکی میں اس کا سر بیگم کے سر سے ٹکرا گیا۔ لاہور یا شاہجہان آباد میں کسی کنیز سے ایسا سنگین جرم سرزد ہو جاتا تو وہ اس کی چمڑی اتروا دیتی۔ کنیز معافی کے لئے جھکی تو اس نے صرف اتنا کہا۔ ''اس سفر نے خدام سے ادب تک چھین لیا ہے''۔

''کنیز اس گناہ کے لئے ہر سزا پر خوش ہو گی''۔ کنیز نے سر بیگم کے قدموں پر رکھ دیا۔

''ہم سمجھتے ہیں تمہیں بھی آرام کی ضرورت ہے، جاؤ کسی اور کو بھیج دو۔ مقدر میں ہوا تو دو گھڑی نیند نصیب ہو جائے گی''۔

کنیز سلام کر کے کوٹھڑی سے باہر نکل گئی، وہ بیگم کے مزاج اور سوچ کی اس تبدیلی پر حیران تھی۔ اس نے بیگم کو کبھی کسی کا ایسا گناہ معاف کرتے نہیں دیکھا تھا نہ کبھی مقدر پر بھروسہ کا سنا تھا۔ بیگم کے رویہ میں اس تبدیلی پر اسے دکھ ہوا۔

کنیز جا چکی تو وہ بستر میں بیٹھ گئی، اس کا دل چاہتا تھا کہیں سے تازہ ہوا کا کوئی جھونکا آ جائے اسے اپنی سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ کوٹھڑی کی چھت کے قریب چھوٹا سا روشندان بھی بند تھا۔ ''ہم سمجھتے ہیں باہر بھی ہوا معدوم ہے''۔ دوسری کنیز آداب سے فارغ ہو کر پنکھا ہلانے لگی تو اس نے پوچھا۔

''حضور! ہوا تو اپنے وجود کا کوئی پتہ ہی نہیں دے رہی کہیں''۔ کنیز نے جواب دیا۔

''رات ابھی شروع ہی تو ہوئی تھی، اتنی لمبی رات اس کالی کوٹھڑی میں کیسے گزرے گی۔ اس خیال نے حبس اور گرمی کے احساس میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

دروازے کے پیچھے سے شہباز خاں نے حاضری کی اجازت چاہی تو وہ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''حضور! حاکم کے مخبر سرائے کے مالک سے مہمانوں کی شناخت معلوم کرنے پہنچ گئے ہیں''۔ اس نے فکرمندی سے بتایا۔

''مالک کے رجسٹر میں ہماری شناخت درج ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں''۔ بیگم نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''غلام یہی عرض کرنے آیا ہے کہ وہ رجسٹر میں درج شناخت پر یقین نہیں کر رہے اور حضور سے ملنے پر بضد ہیں''۔ شہباز خاں نے وضاحت کی۔

''انہیں کہو کہ ہم کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے''۔ اس نے حاکمانہ انداز اپنایا۔

''حضور کا خادم پوری کوشش کر چکا ہے مگر ان کا تھانیدار بلا اجازت حضور کی کوٹھڑی میں گھس کر شناخت کی تصدیق پر بضد ہے''۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔

وہ باتیں کر رہے تھے کہ سرائے کا مالک اور حاکم کے مخبر کوٹھڑی کے دروازے پر آ موجود ہوئے۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس کر کے بیگم بستر سے اٹھ کر دروازے کے قریب آ گئی۔ ''ہم سمجھتے تھے مرہٹوں کو ہی مسلم روایات اور خواتین کا احترام نہیں، معلوم نہ تھا، اس شہر کا حاکم ابھی سے سب روایات سے دست کش ہو گیا ہے''۔ اس کی آواز میں ناراضگی تھی۔

''حضور کے آرام میں مداخلت پر یہ خادم بہت نادم ہے''۔ مخبر نے ادب سے کہا۔ ''حضور کے خادم رجسٹر میں مغلانی بیگم کی بجائے حضور کا نام مراد بیگم درج نہ کرواتے تو ہم اس گستاخی کی جرأت نہ کرتے''۔

''ہمارے والدین نے ہمارے لئے یہی نام پسند فرمایا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ نجابت خاں کے بعد آپ کا علم اتنا محدود ہے''۔ اپنا نام منکشف کرنے کے لئے اپنی شناخت پوشیدہ رکھنا ممکن نہ رہا۔

مخبر نے ایک بار پھر معافی کی درخواست کی اور آداب عرض کر کے واپس چلا گیا۔

بیگم بستر پر واپس آ کر بیٹھ گئی، اس کے سفر کی ساری رازداری نجابت خاں پر ظاہر ہو گئی تھی۔ حبس گرمی اور مچھر اسے سب کچھ بھول گیا۔ شاہجہان آباد کے قریب کے گھاٹوں پر مرہٹوں کے قبضہ اور مسافروں کی تلاشی کی بناء پر اس نے کنج پورہ کا طویل سفر اختیار کیا تھا۔ وہ اپنی شناخت اور منزل پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ شہر اور حاکم شہر نجیب الدولہ عماد الملک کی مانند بیگم کو بھی مجرم سمجھتا تھا۔ سفر میں کوئی اسے قتل کروادے تو کون اس سے پوچھ سکے گا، کون سزا دے سکے گا۔ شاہجہان آباد کی حویلی سے وہ پالکی میں سوار خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کے احاطہ میں پہنچی تھی اور وہاں سے رات کے اندھیرے میں کنج پورے کے لئے روانہ ہو کر یہاں تک پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ سوچنے لگی نجابت خاں کا ردعمل کیا ہوگا؟ ابھی کوئی روہیلہ دستہ آئے گا اور اسے سرائے سے لے کر جا کر قتل کرا دیا جائے گا یا قلعہ کی کسی اندھیری سرنگ میں بند کر دیا جائے گا۔ اس کا دماغ کئی طرح کے خدشات سے بھر گیا۔

تھوڑی دیر بعد روہیلہ سواروں نے سرائے کا محاصرہ کر لیا اور اس کے ملازمین کے سرائے سے باہر جانے پر پابندی لگا دی سرائے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند وہ کسی پر کٹے پرندے کی مانند تھی جس کے سوراخوں میں سے کھا جانے والی بلی کی خونی آنکھیں اس کو گھور رہی ہوں۔ یہاں اس کا نہ کوئی غمگسار تھا نہ ہمدرد مگر زندگی کے اس کٹھن مرحلہ میں بھی اسے کنیزوں اور خدام کے سامنے جرأت اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرنا پڑ رہا تھا۔ اسے پروانوں اور مچھروں کی آزادی پر بھی رشک آنے لگا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ نجابت خاں کے خدام کھانے کے طباق لے کر حاضر ہوئے تو بیگم ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اس طرز استقبال پر اسے کچھ تسلی ہوئی مگر سرائے کے محاصرہ کا سبب اب بھی اسے پریشان کر رہا تھا۔ ابھی وہ انہی خیالوں میں کھوئی تھی کہ حاکم کا ایلچی پہنچ گیا۔ حاکم نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ وہ اندرون شہر حویلی میں منتقل ہو کر اس پر احسان فرمادیں۔ بیگم نے حاکم کی درخواست قبول کر لی تو کنج پورہ کے کوچہ و بازار میں مغلانی بیگم کی آمد کی خبر پھیل گئی۔ نجابت خاں نے اپنے سرداروں کے ساتھ بیگم کے حضور حاضری دی اور درخواست کی کہ انہیں مہمان نوازی سے سرفراز فرمایا جاوے۔

''ہم جلد بادشاہ معظم کے حضور حاضر ہونا چاہیں گے، یہاں قیام کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں''۔ بیگم نے اس کا شکریہ ادا کر کے جواب دیا۔

''ایک دو روز حضور آرام فرمائیں، ہم حضور کو بادشاہ معظم کی لشکرگاہ پہنچانے کا انتظام کر دیں گے''۔ نجابت خاں نے درخواست کی۔

بیگم نے نجابت خاں کی درخواست قبول کر لی۔

نجابت خاں کے تمام سہولت اور ضرورت فراہم کرنے کے باوجود ہوئے تو بیگم نے سکھ کا سانس لیا مگر حویلی کے دروازے پر روہیلہ دستہ اب بھی موجود تھا۔

شاید نجابت خاں مغلانی بیگم کی مکمل آزادی کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا ورنہ شہر کے اندر اسے کوئی خطرہ درپیش نہ تھا۔

دریا کے مشرقی کنارے پر کنج پورہ احمد شاہ ابدالی کی فوج کے لئے خوراک اور گھوڑوں کے لئے چارہ کی فراہمی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ شاہی فوج کی مستقبل کی ضروریات کے لئے شہر کے گوداموں میں غلہ جمع کیا جا رہا تھا۔ شاہجہان آباد کی طرف سے آنے والے سب مسافر اب اس شہر کا رخ کرتے تھے جس وجہ سے یہ چھوٹا سا شہر بڑی اہمیت حاصل کر گیا تھا۔ مغلانی بیگم نے کئی

دفعہ سفر کا ارادہ ظاہر کیا مگر نجابت خاں کسی نہ کسی بہانہ سے ٹالتا رہا۔ اسے ہر وہ سہولت فراہم کردی گئی تھی جو کسی محبوس حاکم کو فراہم کی جاتی ہے مگر سفر کی سہولت اور اجازت نہ تھی۔ شاہجہان آباد اور شاہ کی لشکرگاہ سے بیگم کا رابطہ محدود ہو چکا تھا۔ شاہجہان آباد سے آئے اسے دو ماہ ہو رہے تھے، موسم گرما کا زور ٹوٹ گیا تھا اور سرما کے ہراول دستوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ دریا کا پانی اتر رہا تھا، مرہٹوں اور شاہ کی طرف سے آگے بڑھنے کے امکانات بڑھتے جا رہے تھے۔ شاہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لئے بیگم کا جلد ان کے حضور پہنچنا لازم تھا مگر روانگی کی کوئی صورت نہیں بن رہی تھی جس سے وہ پریشان رہنے لگی تھی۔

ایک صبح اس کے خدام نے خوشخبری دی کہ حویلی کے دروازے پر متعین روہیلہ دستہ رات کے اندھیرے میں واپس چلا گیا ہے ابھی وہ روہیلہ دستے کی واپسی کے اسباب پر غور کر رہی تھی کہ شہباز خاں گھبرایا ہوا آیا۔ ''مرہٹہ لشکر نے کنج پورہ کا محاصرہ کرلیا ہے''۔

''ہم سمجھتے ہیں مرہٹے کنج پورہ پر بھی قابض ہو جائیں گے''۔ اس نے خبر پر پہلا ردعمل ظاہر کیا۔ ''نجابت خاں کی مختصر فوج زیادہ دیر ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گی''۔ وہ اس خبر سے پریشان نہیں ہوئی۔

شہباز خان اور زیادہ پریشان ہو گیا۔ ''حضور کی اجازت ہو تو غلام لڑائی سے پہلے شہر چھوڑنے کا بندوبست کرے؟'' اس نے پوچھا۔

''ان حالات میں ہم سفر کا خطرہ مول نہیں لے سکتے، سب خدام کو حویلی کے اندر رہنے کو کہہ دیں اور ڈیوڑھی پر پہرہ بٹھا دیں۔ ہماری اجازت کے بغیر کوئی باہر نہیں جائے گا اور نہ کوئی باہر سے حویلی میں آئے گا''۔ بیگم کے چہرے پر اچانک غم قابض ہو گیا۔ شہباز خاں جانے لگا تو اس نے روک لیا۔ ''اپنی سواریوں کی حفاظت کرو، کسی لمحہ بھی ان کی ضرورت ہو سکتی ہے''۔

بیگم کی حویلی میں ہنگامی صورت حال پیدا ہوئی۔ کنیزیں اور خدام ادھر ادھر بھاگنے لگے، مرہٹہ توپوں نے قلعہ پر گولہ باری شروع کردی تھی اور شہر کے در و دیوار لرز رہے تھے۔ بیگم کو اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہ تھا کہ مرہٹے شہر پر قابض ہو جائیں گے اس کے بعد کیا ہوگا وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی۔ توپیں گونجتی رہیں، حویلی کے در و دیوار لرزتے رہے اور بیگم اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سوچتی رہی۔ وہ روہیلہ دستہ کی جگہ مرہٹہ دستہ کا انتظار کرنے لگی، اس نے کئی بار نجابت خاں کو کوسا جس کی وجہ سے وہ کنج پورہ میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

سورج ڈھل چکا تھا، جب بازاروں میں خوف کے مارے لوگ بھاگنا شروع ہو گئے۔ مرہٹوں کی توپوں اور ٹڈی دل فوج کے سامنے مٹھی بھر روہیلے شہر اور قلعہ کا دفاع نہ کر سکے۔ وہ ساری رات کنج پورہ لڑتا رہا۔ قلعہ سے نجابت خاں کے خزانوں سے چھ لاکھ زر نقد دس لاکھ کے مال اسباب گھوڑوں اور توپوں کے علاوہ مرہٹوں کے ہاتھ دو لاکھ من غلہ لگا مگر مرہٹوں کی بھوک اس سے بھی نہ مٹی تھی۔ مرہٹہ فوجیوں نے شہر میں مسلمانوں کے گھر اور دکانیں بھی لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ بیگم نے شہباز خاں کو حکم دیا کہ وہ ڈیوڑھی پہرہ کی خود نگرانی کرے اور اگر کوئی مرہٹہ دستہ ادھر آئے تو اسے بتا دیا جائے کہ اس حویلی میں عمادالملک کی خوشدامن مقیم ہیں۔

اگلی صبح سورج نے مفتوح شہر کا جائزہ لینا چاہا تو اس کے ویران گلیوں اور بازاروں میں نیزوں پر لٹکے انسانی سروں کا جلوس دیکھ کر بادلوں کے پردہ میں چھپ گیا۔ مرہٹہ دستے ڈھول اور شادیانے بجاتے جلوس کی صورت شہر میں گھوم رہے تھے۔ جلوس کے ساتھ حاکم شہر نجابت خان اور ان کے نائب قطب شاہ اور عبدالصمد خاں کے کٹے ہوئے سر نیزوں پر لٹک رہے تھے۔ جو لوگ اپنے

لئے پٹے گھروں کے دروازے بند کرلیتے مرہٹہ سپاہی ان کے گھروں میں گھس کر انہیں باہر نکال لاتے اور جلوس آنے سے پہلے انہیں راستہ کے دونوں طرف کھڑا کر دیتے تھے۔

عبدالصمد خاں اور نجابت خاں میدان جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ قطب شاہ کو لڑائی میں شدید زخمی حالت میں گرفتار کر کے مرہٹہ سالار کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اپنے سامنے اس کا سرتن سے جدا کروایا اور نیزے پر چڑھا کر شہر کی گلیوں اور بازاروں میں جلوس نکالنے کا حکم دیا۔

حویلی کے پہریدار نے مرہٹہ سپاہیوں کو بیگم کے قیام کے بارے میں بتایا تو انہوں نے ہتھیار نکال لئے ایک مرہٹہ سردار نے دیکھ لیا اور بیگم کی موجودگی کی تصدیق کر کے اس نے اپنے سالار کو اطلاع دی تو انہوں نے حویلی کی حفاظت کے لئے اپنا دستہ مقرر کر دیا۔

سداشیو بھاؤ نے عمادالملک کے احسانات کی قیمت ادا کرنے کی کوشش کی۔

مرہٹوں کے لئے یہ کامیابی بہت اہم تھی۔ خوراک کے اتنے بڑے ذخائر، اتنی دولت اور افغانوں اور روہیلوں پر اتنی بڑی فتح جس میں ان کے نامور سالار شہید ہو گئے تھے، ان کی خوشی اور مسرت کا اہم سبب تھے۔ ہند کے دارالحکومت پر قبضہ کے بعد روہیلوں کا اتنا اہم ٹھکانہ ان کے قبضہ میں آ گیا تھا ان فتوحات کے شکرانے کے لئے سدا شیو بھاؤ اپنی فوج کے ساتھ کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان مہا بھارت کی لڑائی کے مقام کوروکشتر کے مقدس تالابوں میں اشنان کے لئے روانہ ہو گیا جہاں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کے خلاف کامیابی کی دعائیں مانگیں اور سب نے بھارت ورش میں ہندو راج کے قیام کے لئے جانیں قربان کرنے کا عہد کیا۔

٭٭٭

مغلانی بیگم کی سوچ ایک بار پھر متزلزل ہونے لگی۔ شاہجہان آباد کے بعد احمد شاہ ابدالی اور روہیلے کنج پورہ کو بچانے کے لئے بھی کچھ نہیں کر سکے تھے۔ شاہجہان آباد کی مانند کنج پورے پر قبضہ کے وقت بھی مرہٹہ سالار نے اس کے احترام کے تقاضوں کی پابندی کی تھی اور انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی تھی لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ شاہجہان آباد کے بعد کنج پورہ میں مرہٹہ فوجوں نے بیس ہزار مسلمان مرد عورتیں اور بچے شہید کئے تھے۔ مسلمانوں کے گھر لوٹ کر خاکستر کر دیئے تھے مگر ہندو، ان کے گھر اور دکانیں سب محفوظ رہی تھیں۔ وہ بھی فیصلہ کرتی کہ اسے کنج پورے میں رہ کر احمد شاہ ابدالی کے ردعمل کا انتظار کرنا چاہئے اور پھر دوسرے ہی لمحہ جمنا عبور کر کے اس کے لشکر کے ساتھ جا کر ملنے کے طریقے سوچنا شروع کر دیتی۔ اگر وہ احمد شاہ ابدالی کی لشکر گاہ کی طرف سفر اختیار کرلے تو گھاٹوں پر متعین مرہٹہ دستے اسے دریا عبور کرنے دیں گے؟ شہر کی بچی کھچی مسلمان آبادی بھاگ رہی تھی مگر وہ بھاگنا بھی چاہے تو بھاگ نہیں سکتی تھی حویلی کے دروازے پر مرہٹہ دستہ خیمہ زن تھا اور صرف اسی کی وجہ سے یہ دستہ کوروکشتہ کے مقدس پانیوں میں اشنان سے محروم رہا تھا۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہئے۔ ایک شام اس نے دیوان حافظ سے فال لینے کا سوچا عشاء کی نماز کے بعد دو رکعت نفل ادا کئے اور دیوان حافظ کھول کر شمعدان کے سامنے جھک گئی۔ ابھی وہ ورق گردانی ہی کر رہی تھی کہ ڈیوڑھی کی طرف سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ جب آوازیں اور شور بڑھتا ہی رہا تو اس نے دیوان حافظ بند کر کے تپائی پر رکھ دیا اور باہر نکل آئی۔ آوازیں ڈیوڑھی سے باہر مرہٹہ سپاہیوں کے خیموں کی طرف سے آ رہی تھیں۔ مرہٹہ سپاہی قہقہے لگا رہے تھے۔ ان قہقہوں میں کسی خاتون کے چیخنے کی آوازیں بھی

شامل تھیں۔ وہ آوازوں کی طرف چلنے لگی۔ بیگم کو ڈیوڑھی کی طرف بڑھتا دیکھا تو کنیزیں اور خدام بھی فکرمندی سے اسی طرف جمع ہونے لگے۔ ڈیوڑھی کے اندرونی دروازہ پر متعین محافظ آداب کے لئے جھک گئے مگر بیگم نے کسی کی طرف دھیان نہیں دیا۔ ڈیوڑھی کے بیرونی دروازہ کے موٹے کواڑ میں ایک بڑا سوراخ تھا جس پر لکڑی کا ایک ٹکڑا گھما کر بند کیا جا سکتا تھا۔ بیگم نے سوراخ پر سے لکڑی ہٹائی اور باہر دیکھنے لگی۔ خدام اور کنیزیں کچھ فاصلہ پر کھڑے دیکھتے رہے۔

''ہماری تلوار لائیں اور سب اپنے اپنے ہتھیار لگا کر فوراً حاضر ہو جائیں''۔ اس نے واپس گھوم کر حکم دیا غصہ سے اس کی آواز لرز رہی تھی۔ اچانک ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے اور شمشیر برہنہ بیگم کے اپنے مسلح محافظوں اور خدام کے ہمراہ باہر آجانے سے مرہٹہ سپاہی پریشان ہو کر اپنے اپنے خیموں کی طرف دوڑے خیموں کے درمیان میں محفل شب سجائے بیٹھے قہقہے لگاتے اور شور مچاتے سپاہیوں کے درمیان میں دو لڑکیاں نیم برہنہ حالت میں کھڑی چلا رہی تھیں اور اپنے ہاتھوں سے اپنے سینے چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نشہ میں دھت کوئی سپاہی ان پر شراب پھینکتا تو کوئی دوسرا انہیں کھینچ کر ناچنا شروع کر دیتا۔ اچانک بیگم اور ان کے محافظوں اور خدام کو اپنے سروں پر تلواریں تانے دیکھ کر ان کا نشہ ہرن ہو گیا۔ دونوں لڑکیاں روتی ہوئی بیگم کی طرف دوڑیں اس نے انہیں حویلی کے اندر بھجوا دیا اور خود وہیں کھڑی رہی۔

مرہٹہ دستہ کے کماندار نے جھک کر سلام کیا اور اس گستاخی کے لئے معافی کی درخواست کی۔

''ہم نے سنا تھا مرہٹہ غیرت مند اور بہادر قوم ہیں اور کسی خاتون کی عزت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ تمہاری موجودگی میں تمہارے سپاہی مجبور لڑکیوں پر قہقہے لگاتے رہے اور تم دیکھ رہے تھے؟'' بیگم نے غصہ سے پوچھا۔

لمبے قد اور بڑی بڑی مونچھوں والے مرہٹہ نوجوان کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ وہ سر جھکائے کھڑا تھا اور اس کے ساتھی خیموں کی اوٹ سے دیکھ رہے تھے۔

''ہم سدا شیو بھاؤ سے پوچھیں گے کہ اس نے ہماری حفاظت کے لئے ایسے مرہٹہ کیوں بھیجے جنہیں ہمارے مقام اور خواتین کے احترام کا علم نہیں''۔

''حضور! اس بار معاف فرما دیں، آئندہ کوئی سپاہی کوئی گستاخی نہیں کرے گا''۔ کماندار نے التجا کی۔

''تم نے وہ جرم کیا ہے جو ہم بھی معاف نہیں کر سکتے، ہمیں یہ گوارا ہوتا کہ اوروں کی طرح ہماری حویلی بھی لوٹ لی جاتی مگر یہ گوارا نہیں کہ ہمارے دروازے پر مجبوروں پر ظلم اور زیادتی ہو اور ہم معاف کر دیں''۔ بیگم کا غصہ اعتماد میں بدلنے لگا۔

کماندار مڑا اور اپنے خیمے سے تلوار لا کر بیگم کے قدموں میں رکھ کر گردن جھکا دی۔ ''خادم اس جرم کی سزا کے لئے حاضر ہے''۔

''جھکی ہوئی گردنوں پر تلوار چلانا بہادروں کا نہیں بزدلوں کا شیوہ ہے''۔ بیگم نے ڈیوڑھی کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''اپنی تلوار اٹھا لیں اور اس کی آبرو کے تحفظ کے آداب سیکھیں''۔

کماندار نے تلوار اٹھائی اور نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''ہمیں اپنی حفاظت کے لئے آپ جیسے بہادروں کی ضرورت نہیں۔ اگر سدا شیو بھاؤ کے پاس مناسب دستے موجود نہیں تو ہم اپنی حفاظت خود کرنا جانتے ہیں۔ صبح اپنے خیمے اٹھائیں اور اپنے لشکر میں واپس چلے جائیں''۔ بیگم نے کہا اور ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔

سدا شیو بھاؤ اپنے لشکر کے ہمراہ تراوڑی پہنچ چکا

تھا، اس کی کچھ فوج دریا کے گھاٹوں کی حفاظت کر رہی تھی اور تھوڑی سی فوج کنج پورے میں رہ گئی تھی۔ اس مرہٹہ فوج کے کماندار کو بیگم کی حویلی پر متعین اپنے سپاہیوں کی حرکت کا علم ہوا تو اس نے خود بیگم کے حضور حاضر ہو کر معافی کی درخواست کی اور نیا دستہ بھیجنے کی پیشکش کی۔ بیگم نے اس کی پیشکش قبول نہیں کی۔ ''ہم سداشیو بھاؤ کے مشکور ہیں کہ اس نے ہمارا خیال کیا، ہمیں تمہارے کسی دستہ کی ضرورت نہیں''۔

کماندار نے اپنے دستہ کو خیمے اکھاڑ کر واپس جانے کا حکم دے دیا۔ ''ہمیں حضور کے ارشاد کی تعمیل کا حکم دیا گیا ہے''۔

بیگم کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ مرہٹہ اس کا اس قدر احترام کرتے ہیں۔

***

شاہجہان آباد پر مرہٹوں کا قبضہ احمد شاہ ابدالی کے لئے بڑا تکلیف دہ تھا مگر دریا کی طوفانی لہریں اس کا راستہ روکے ہوئے تھیں۔ جب کنج پورے کے بازاروں میں اپنے سرداروں کے سروں کا نیزوں پر چڑھا کر جلوس نکالے جانے کی خبر سنی تو اس نے لہروں کے مقابلہ کا فیصلہ کر لیا۔ ''شاہجہان آباد کے مسلمانوں نے اپنے حاکموں کی بے وفائی کی سزا پائی اور ہمارے سرداروں نے ہم سے وفاداری کا حق ادا کیا۔ ہم ان کے سروں کی توہین کا بدلا لینے میں تاخیر کریں تو ان کی وفاؤں کو ہم سے شکوہ ہو گا''۔ اس نے اپنے سرداروں کو جمع کر کے اپنا فیصلہ سنایا۔ ''ہم خدا کے دین اور اس کے ماننے والوں کے تحفظ کے لئے ہندوستان آئے ہیں دریا ہمارا راستہ نہیں روک سکتا، ہمارا خدا ہماری مدد فرما دے گا''۔

سب سرداروں نے بادشاہ کے فیصلہ کے سامنے سر جھکا دیا اور کوچ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اتنی بڑی فوج اس کا ساز و سامان گھوڑوں اور توپوں کے ساتھ جمنا کے پار اتارنا بہت کٹھن مرحلہ تھا۔ دریا کے گھاٹوں اور کشتیوں پر مرہٹوں کا قبضہ تھا۔ دریا میں سیلابی پانی اور طوفانی لہروں کا زور اگرچہ ٹوٹ چکا تھا مگر اب بھی جمنا بڑے جوبن پر تھا اور افغانوں کو ہندوستان کے ایسے بڑے بڑے دریاؤں اور ان کے پانیوں سے لڑ کر پار اترنے کا تجربہ نہ تھا۔ بادشاہ کو اس کا احساس تھا، فیصلہ سنانے کے بعد وہ ساری رات عبادت کرتا اور دن کو روزہ رکھتا۔ اس کے جرنیل وزراء اور سردار اپنے اپنے دستوں اور لشکروں کو تیار کر رہے تھے اور روزہ دار بادشاہ جائے نماز پر سجدے میں سر رکھے خدائے واحد سے مدد کی دعائیں مانگتا رہتا تھا اور اس کے ماہرین کوئی ایسا مقام ڈھونڈ رہے تھے جہاں سے دریا عبور کیا جا سکے۔

باغپت کے قریب دریا کے مغربی کنارہ کی بلندی نیچی تھی اور دریا سے مشرقی کنارے پر چڑھنا ممکن نظر آتا تھا وہاں سے جمنا پار کرنے کا فیصلہ ہو چکا تو بادشاہ اپنے جرنیلوں اور سرداروں کے ہمراہ وہاں پہنچا کنارے پر کھڑے ہو کر قرآنی آیات پڑھ کر ایک تیر پر پھونکیں اور کمان میں چڑھا کر تیر جمنا کے سینے سے پار اتار کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ ملک تجاول اور ان کے ساتھی بادشاہ کے پیچھے دریا میں کود گئے ان کے پیچھے نجیب الدولہ کے روہیلہ سواروں کے دستے دریا میں اترے اور پھر افغان سردار اور سوار سب لہروں سے لڑنے لگے۔ میلوں تک ابدالی کی فوجوں اور جمنا کی لہروں کے درمیان معرکہ جاری ہو گیا۔ دریا کے مشرقی کنارے پر کئی فرلانگ تک دلدل اور کیچڑ تھا۔ سیلابی پانی اتر کر دلدل اور کیچڑ اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ ان کے گھوڑے دلدل میں دھنس دھنس جاتے تھے، ان کے پاؤں کیچڑ پر سے پھسل رہے تھے۔ توپیں اور بھاری سامان اٹھانے والے ہاتھیوں کا اس دلدل میں سے گزرنا ممکن نہ تھا۔ پیادہ سوار اور سردار جو کوئی بھی دریا سے پار اتر چکا تھا وہ اردگرد کے جنگل سے

درختوں کی شاخیں جھاڑیاں گھاس اور سرکنڈا جو کچھ بھی ملا کاٹ کاٹ کر لانے اور دریا کے کنارے کیچڑ گارے پر ڈالنے میں لگ گیا۔ جب پانی سے خشکی تک پھیلے کیچڑ گارے پر شاخوں اور جھاڑیوں کی تین فٹ موٹی تہہ جم چکی تو توپیں ہاتھیوں اور گھوڑوں کے سینوں پر باندھ کر انہیں دریا میں ڈال دیا گیا۔

اگلے روز جب سورج نے اپنا سفر مکمل کر کے منہ پر سیاہ چادر ڈالی تو احمد شاہ ابدالی اور اس کے ساتھیوں کی بہت سی فوج اپنے ساز و سامان اور توپ خانہ سمیت جمنا سے اس پار اتر چکی تھی دو روز میں سب فوجیں دریا سے پار اتر گئیں اور افغان سوار ادھر اُدھر پھیلے مرہٹہ لشکروں کی تلاش میں نکل پڑے اور سونی پت میں مقیم مرہٹہ فوج کا صفایا کر دیا۔

سداشیو بھاؤ کو ابدالی کے جمنا پار اتر آنے کی خبر موصول ہوئی تو اسے یقین نہیں آیا کہ فوج کا جنگی ساز و سامان کے ساتھ اس تیزی سے دریا پار کرنا ممکن نہ تھا۔ جب ہر طرف سے افغان اور روہیلہ فوجوں کی کامیابیوں کی خبریں موصول ہونے لگیں تو اس نے کنج پورہ کی جانب جانے کی بجائے پانی پت کا رخ کیا۔

***

مغلانی بیگم کے لئے یہ ایک نیا منظر نامہ تھا، اس نے اپنی زندگی میں کئی بار لشکر گاہ میں قیام کیا تھا۔ میر منو کی زندگی میں چھوٹی چھوٹی اور احمد شاہ ابدالی کی فوج کے ساتھ بڑی لڑائیوں میں شرکت کی تھی مگر اتنا وسیع جنگی منظر نامہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ بادشاہ معظم کی لشکر گاہ اور ان کے جرنیلوں اور سرداروں کے ڈیروں کے چاروں طرف میلوں تک ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوجیں خیمہ زن تھیں نجیب الدولہ، احمد خاں بنگش، شجاع الدولہ، حافظ رحمت اللہ سب احمد شاہ ابدالی کے جہاد میں شامل ہو گئے تھے اور جس لڑائی کی تیاریاں ہو رہی تھیں وہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی تھی۔ پانی پت کے میدان میں فیصلہ ہونے والا تھا کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت رہے گی یا مرہٹہ راج قائم ہو جائے گا۔ اس جنگی اور سیاسی منظر نامہ میں اس کے اپنے خاندان کا کوئی فرد کہیں بھی موجود نہ تھا، نہ مسلمانوں کے کیمپ میں نہ مرہٹہ لشکر گاہ میں۔ گزشتہ نصف صدی میں ہندوستان میں لڑی جانے والی یہ پہلی لڑائی ہوگی جس میں اس کے خاندان کا کوئی فرد کسی فوج کی قیادت نہیں کرے گا۔ چالیس سال تک ہندوستان پر حکومت کرنے والا اس کا خاندان ہندوستان کے مستقبل کے نقشہ سے خارج ہو گیا تھا۔ عمادالملک سورج مل جاٹ کی حفاظت میں ایک چھوٹے سے قلعہ میں بند تھا اور وہ خود ایک پرگنہ کی جاگیر کی مالک تھی اور اس منظر نامہ میں کچھ بھی حیثیت نہ رکھتی تھی یہ سوچ کر وہ اکثر اس منظر نامہ اور لڑائی کے نتیجہ سے بے تعلق ہو جاتی تھی لیکن جب شاہجہان آباد اور کنج پورہ میں مسلمانوں پر فاتح مرہٹوں کے مظالم اس کی نگاہوں کے سامنے آتے تو وہ مسلمانوں کی فتح کی خواہش پالنا شروع کر دیتی تھی۔ اس خواہش کے پیچھے کہیں اس کی سیالکوٹ کی جاگیر کے تحفظ کا مسئلہ بھی تھا۔ ایک شام جب وہ اپنے خیمے میں تنہا بیٹھی اسی نقشہ پر غور کر رہی تھی کہ کنیز نے شہباز خان کی آمد کی خبر دی تو اس نے ''اجازت ہے'' ایسے کہا جیسے نہ جانتی ہو کہ کس چیز کی اجازت دے رہی ہے۔ شہباز خان سلام کر کے دست بستہ سامنے آن کھڑا ہوا کافی دیر بعد بیگم نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''ہم سمجھتے ہیں تم کوئی اہم خبر لائے ہو۔''

''غلام حضور کے حکم کی تعمیل میں حاضر ہوا ہے''۔ شہباز خان نے سر جھکا کر عرض کیا۔

وہ سوچنے لگی کہ اس نے اسے کیوں بلایا تھا اور یہ بلایا بھی تھا یا نہیں۔ جب کچھ یاد نہ آیا تو پوچھا۔ ''ہم جانا

چاہتے ہیں میاں خوش فہم کا کچھ سراغ مل سکتا ہے؟''

''حضور کا حکم ہے تو غلام اس کا سراغ لگانے کی پوری کوشش کرے گا''۔ شہباز خان نے حیرانی سے جواب دیا۔ میاں خوش فہم کے اچانک غائب ہو جانے پر چند روز تک بیگم نے اس کی تلاش کروائی تھی اور اس کے بعد پانچ چھ ماہ سے کبھی اس کا ذکر نہ کیا تھا، وہ اندازہ نہ کر سکا کہ اپنی بھول چھپانے کو بیگم کے لئے کوئی استفسار لازم ہو گیا تھا۔

''ہم ابھی تک ملک سجاول کی حاضری کے منتظر ہیں''۔ ذہن پر زور ڈالنے سے اسے یاد آ گیا کہ اس نے شہباز خان کو کیوں یاد فرمایا تھا۔

''حضور کے حکم کی تعمیل کے لئے خادم آج بھی سردار سجاول کے ڈیرے پر حاضر ہوا مگر وہ ابھی تک پٹیالہ کی سفارت سے واپس نہیں آئے''۔

''ہم جلد از جلد ملک سجاول سے ملنا چاہتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ ان کے واپس پہنچتے ہی تم انہیں ہماری خواہش سے آگاہ کر دو گے''۔

''غلام نے حضور کے حکم کی تعمیل میں کبھی کوتاہی نہیں کی''۔ شہباز خان نے سرخم کرتے ہوئے جواب دیا۔

بیگم نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اس بارے میں ہمیں دوبارہ استفسار نہ کرنا پڑے جاؤ اور کان کھلے رکھو''۔

شہباز خان آداب عرض کر کے کمرے سے باہر نکل گیا مگر وہ اب تک بیگم کے گھورنے کے انداز سے پریشان تھا، وہ ان کے گھر میں پل کر جوان ہوا تھا، گھریلو خدمت سے سیاسی سفارت کاری تک پہنچا تھا مگر اسے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ بیگم کی نگاہیں اس کے چہرے میں کچھ تلاش کر رہی ہیں۔ کیا بیگم صاحبہ کو میری وفا پر بھی شبہ ہونے لگا ہے؟ اس خیال نے اسے اور بھی پریشان کر دیا، وہ ایک بار پھر ملک سجاول کے ڈیرے کی طرف چل دیا حالانکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ ملک سجاول کا پتہ کر کے آیا تھا۔

افغانستان سے بہار اور دکن تک کی سب فوجیں پانی پت اور اس کے نواح میں خیمہ زن تھیں۔ مرہٹہ سالاروں اور سرداروں کی لشکر گاہ میں ان کے اہل و عیال ان کے ساتھ تھے۔ شاہی لشکر گاہ میں شاہ کے حرم کے سوا سرداروں اور وزراء کے حرم بھی تھے۔ اتنی بڑی سپاہ اور آبادی کے لئے خوراک اور فوجوں کے گھوڑوں کے لئے چارہ کی فراہمی کا مسئلہ بڑا سنگین ہو گیا تھا۔ روہیلہ دستوں نے شاہجہان آباد کے مرہٹہ گورنر کی طرف سے سدا شیو بھاؤ کو غلہ اور جانوروں کی خوراک کی فراہمی کا راستہ کاٹ دیا تھا جس سے مرہٹہ کیمپ میں قحط کی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ بھاؤ نے پٹیالہ کے حاکم سردار آلا سنگھ کے پاس سفارت بھیجی اور مشترکہ دشمنوں کے خلاف لڑائی میں ان سے خوراک اور غلہ کی فراہمی کی درخواست کی تو آلا سنگھ نے ان کی درخواست پر مرہٹہ لشکر کو ضروریات فراہم کرنا شروع کر دیا تھا۔ بادشاہ معظم آلا سنگھ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتے تھے مگر اسے مرہٹوں کو غلہ اور خوراک کی فراہمی سے بھی باز رکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ملک سجاول کو پٹیالہ بھیجا تھا کہ وہ آلا سنگھ کے کمانڈر سردار لکھنا کے ذریعے آلا سنگھ کو اس سے باز رہنے پر آمادہ کریں اس وجہ سے شہباز خان کوشش کے باوجود انہیں بیگم کی خواہش سے آگاہ نہیں کر سکے تھے۔

حالات جیسے جیسے لڑائی کی طرف بڑھ رہے تھے بیگم کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ملک سجاول کے ذریعے عماد الملک کے لئے ایک اور پیغام بھیجنا چاہتی تھی کہ وہ اس لڑائی سے الگ نہ رہے اور بادشاہ معظم کے ساتھ مل جائے اسے امید تھی کہ فتح کے بعد وہ ایک بار پھر اسے بادشاہ معظم سے معافی اور کوئی عہدہ دلانے میں کامیاب

ہو جائے گی۔ ملک سجاول کی واپسی میں تاخیر سے یہ کھیل بھی اسے ہاتھ سے نکلتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے شمعدان کی روشنی تیز کی اور خیمے میں ٹہلنے لگی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے مل رہی تھی۔ پس پردہ سے کنیز نے جھانک کر دیکھا اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اسے بیگم خوفزدہ دکھائی دی۔ کنیز بھی خوفزدہ ہو گئی، خیمے میں ٹہلتے ہوئے بیگم نے محسوس کیا کہ روشنی کم ہو رہی ہے۔ اس نے کنیز کو بلا کر شمعدان کی روشنی تیز کرنے کا حکم دیا اس کے باوجود اسے اندھیرا بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نشست پر واپس آ گئی اور گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور شعور کی سکرین پر اپنے ماضی کے واقعات و حالات کی فلم دیکھنے کی کوشش کرنے لگی مگر سوچ کی شدت سے فلم کا فیتا بار بار ٹوٹ جاتا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں خیمے میں اندھیرا اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ "تم دیکھ نہ سکیں کہ شمع بجھ چکی ہے۔" اس نے کنیز کو ڈانٹا۔

کنیز نے ہاتھ باندھ کر معافی کی درخواست کی اور جھک کر جلتی شمع کو پھر سے جلانے لگی، وہ یہ بتانے کی گستاخی نہیں کر سکتی تھی کہ شمع بجھی نہیں جل رہی ہے۔ بیگم کی اس حالت نے اسے پریشان کر دیا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی پریشانی اور بیگم کی حالت کا کس سے ذکر کرے۔

خیمے سے باہر ڈیرے میں بھی اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ آسمان اور زمین کے درمیان معلق بادل اور بھی گہرے ہو گئے تھے اور ڈیرے میں روشن قندیلوں کے اونچے ستونوں کے سروں سے چھوتے ہوئے معلوم ہونے لگے تھے۔ ٹھنڈی ہوا میں پہریدار خیموں کی اوٹ میں دبک کر اپنے کو گرم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

***

قاضی ادریس کی داڑھی تر ہو چکی تو ان کے آنسو پانی پت کے تاریخی میدان کی مٹی پر گرنے لگے۔ احمد شاہ ابدالی، نجیب الدولہ، شجاع الدولہ فوجی سردار امراء اور وزراء سب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ان کے گرد کھڑے تھے۔ دعا کے لئے اٹھے ان کے بازو تھک گئے مگر قاضی ادریس کی التجا ابھی جاری تھی، ان کی دستار ان کے سر سے کندھوں پر گرنے لگی تو نجیب الدولہ نے آگے بڑھ کر پکڑ لی۔ قاضی ادریس چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اہل حق کی فتح و کامرانی کے لئے گڑگڑا کر دعا مانگ رہے تھے۔ لشکر گاہ کے گرد افغان اور ہندوستانی فوجی دور دور تک کھڑے تھے، ان کے بیلچے اور کدالیں ان کے سامنے پڑے تھے اور ہاتھ آسمانوں کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ دعا کے لئے اٹھے ہاتھ آنسوؤں سے بھیگی ریش مبارک پر پھیر کر قاضی ادریس نے کدال اٹھائی، آسمان کی طرف دیکھا اور بسم اللہ پڑھ کر دھرتی کے سینے میں اتار دی۔ اس کے ساتھ ہی اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ ہزاروں بیلچے زمین کے سینے میں پیوست ہو گئے۔ احمد شاہ ابدالی نے آگے بڑھ کر قاضی ادریس کے ہاتھ سے کدال پکڑی اور خود بھی زمین کھودنے لگے۔ بادشاہ سے خادم تک سب خندق کھود رہے تھے مٹی اٹھا رہے تھے اور بلند آواز میں درود پڑھ رہے تھے۔ ایک طرف سے نعرۂ تکبیر کی آواز بلند ہوتی اور چاروں طرف گونج جاتی سب نعرے لگا رہے تھے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"بت پرست ہمیشہ اہل حق سے تعداد میں زیادہ رہے ہیں۔ اہل حق خیبر میں بھی کم تھے، احد میں بھی اور جنگ خندق میں بھی۔ خدا کے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پیٹ پر پتھر باندھ کر چٹانوں کو اپنے دست مبارک سے توڑا تھا۔ ہم آج آسودہ حال اور پُرشکم ہیں، ہمارے پاؤں کے نیچے پتھر نہیں مٹی ہے، آؤ ہم بھی اپنے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت پوری کرنے والوں میں اپنے نام لکھوا لیں"۔ اہل کفر کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری

کرنے کے بعد قاضی ادریس نے کہا اور بادشاہ اور امراء کے ہمراہ لشکر گاہ سے پیدل چل کر سر میدان آئے اور اپنے ہاتھوں سے مٹی کھود کر خندق کھودنے کی سنت کی ابتدا کی۔ مٹی کھودنے والوں کا جوش دیدنی تھا۔

مرہٹہ لشکر گاہ میں جب اطلاع پہنچی کہ مسلمانوں نے ساٹھ ہزار فوج کے خیموں کے گرد خندق تیار کر لی ہے تو اس کے سرداروں کو اس معجزہ پر یقین نہیں آیا۔ جاسوسوں نے اطلاع کی تصدیق کر دی تو بھاؤ نے بھی اپنی لشکر گاہ کے گرد خندق کھودنے کا حکم دے دیا۔ وہ ہفتوں خندق کھودنے اور توپوں کے دمدمے تیار کرنے میں مصروف رہے۔ مرہٹہ چھاپہ مار جنگ میں مہارت رکھتے تھے، افغانوں کے لئے بھی خندق کے اندر بند ہونے کا تجربہ نیا تھا۔ شاہ نے اپنے ہندوستانی اتحادیوں کے مشورہ پر لشکر گاہ کے گرد خندق کھودنے کا حکم دیا تھا۔

دونوں فریق ایک دوسرے کے آمنے سامنے مورچہ بند ہو چکے تو لڑائی کا بے قاعدہ آغاز ہو گیا جس کی سالی بھرتے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گشت کے دستوں میں جھڑپیں رسد کے راستوں کی ناکہ بندی خوراک کے قافلوں پر حملے اور رات کے پہرہ والوں پر شب خون شروع ہو گئے۔ افغان سردار رات کے وقت سوار دستوں کے ساتھ لشکر گاہ سے نکلتے اور مرہٹہ لشکر گاہ کے گرد چکر لگاتے رہتے تاکہ باہر سے آنے والوں کا راستہ روک سکیں اور شب خون کے لئے نکلنے والوں پر نگاہ رہے۔

احمد شاہ ابدالی اور اس کے اتحادیوں کی افواج کے لئے خوراک اور رسد نجیب الدولہ کی ریاست سے فراہم کیا جاتا تھا۔ مرہٹہ سالار نے اپنے ایک سردار کو حکم دیا کہ وہ نجیب الدولہ کی ریاست ویران کر دے تاکہ شاہ کے رسد کے وسائل ختم ہو جائیں۔ گوبند پنڈت دس ہزار سواروں کے ہمراہ لشکر گاہ سے نکلا اور روہیلہ علاقہ میں لوٹ مار شروع کر دی اس نے ہندو ساہوکاروں اور بیوپاریوں کے مذہبی جذبہ کو بیدار کیا کہ دھرم کی اس لڑائی میں ہندوؤں کا ساتھ دیں اور مسلمانوں کے ہاتھ غلہ فروخت نہ کریں۔ احمد شاہ ابدالی کو مسلمانوں کے دیہات اور گھر لوٹنے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے ایک افغان سردار کو حکم دیا کہ وہ گوبند پنڈت کا سر پیش کرے۔ عطائی خان دو ہزار سواروں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اس نے رات کے اندھیرے میں دریا عبور کیا اور پینسٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے سورج نکلتے ہی مرہٹہ فوج پر حملہ کر دیا۔ ایک افغان نے بھاگتے گوبند پنڈت کا تعاقب کر کے اس کا سر کاٹ کر عطائی خان کو پیش کیا تو اس نے وہ سر دوسری صبح بادشاہ معظم کو پیش کر کے ارشاد کی تعمیل کر دی۔

بھاؤ کے لئے اپنے سردار اور اس کے لشکر کا نقصان بہت بڑا تھا، اس نے پھر کبھی روہیلہ ریاست کی طرف کوئی مہم نہیں بھیجی۔

پوہ کی ایک سرد اور اندھیری رات میں ملک تمام ایک دستہ کے ساتھ جنگل میں گھات لگائے بیٹھا تھا کہ ایک سوار نے شاہجہان آباد کی طرف سے ایک قافلہ کی آمد کی اطلاع دی۔ ملک نے چند سواروں کو جائزہ لینے بھیجا۔ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ ایک ہزار کے قریب مرہٹہ سوار ہیں وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اتنی سرد اندھیری رات میں جنگل کے راستہ سے سفر کرنے والے قافلہ کے پاس کیا ہو سکتا ہے؟ اس کے پاس چند درجن سوار تھے، ساتھیوں سے مشورہ کے بعد اس نے مرہٹی بولنے والے سپاہیوں کو ساتھ لیا اور مرہٹہ قافلہ کے رہنما کے پاس پہنچ گیا اور اسے بتایا کہ جنگل میں افغان دستے چھپے ہوئے ہیں اور بھاؤ نے انہیں بھیجا ہے کہ وہ انہیں محفوظ راستہ سے ابراہیم گاردی کے ڈیرہ کی طرف سے لشکر گاہ تک لے آئیں کیونکہ گاردی کی توپوں کے خوف سے افغان ادھر نہیں آ سکتے، وہ مرہٹہ قافلہ کی قیادت کرتے ہوئے انہیں نجیب الدولہ کی لشکر گاہ میں لے آئے پہریداروں کو پہلے

ہی پیغام بھیج دیا گیا تھا مرہٹہ قافلہ کیمپ کے اندر پہنچ چکا تو اس کے کمانڈار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا مرہٹوں نے تلواریں اور نیزے نکال لئے وہ لڑتے ہوئے لشکرگاہ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے ایک ہزار کے قافلہ میں سے صرف ایک سوار بچ کر مرہٹہ لشکرگاہ میں پہنچ سکا۔ قافلہ کے سامان کی تلاشی لی گئی تو ان کے گھوڑوں کی خورجیاں اشرفیوں سے بھری تھیں جو شاہجہان آباد کے مرہٹہ گورنر نے بھاؤ کو خوراک اور سامان رسد کی خریداری کے لئے بھیجی تھیں۔

بھاؤ مسلمانوں کی اس ناکہ بندی اور مسلسل کامیابیوں سے طیش میں آگیا اس نے اپنے سرداروں کو غیرت دلائی۔ ''میں سوچتا ہوں تمہارے لئے پالکیاں اور کہار فراہم کروں تاکہ افغان تمہارے قافلوں پر ہاتھ نہ ڈالیں''۔

ایک صبح جب مشرقی افق سے سورج طلوع ہو رہا تھا تو احمد شاہ ابدالی اپنے وزراء اور محافظ دستہ کے ہمراہ ڈھاک کے گھنے جنگل میں داخل ہو رہے تھے مرہٹہ لشکرگاہ سے گنگ و جمن کے دوآبہ کی طرف پھیلے اس جنگل میں افغان سردار کبھی کبھی رات کے شکار کی تلاش میں آجاتے تھے۔ شاہ پسند شب رفتہ اسی امید پر اس جنگل میں داخل ہوا تھا اور کامیابی کی خوشی میں رات ہی بادشاہ معظم کی خدمت میں ایلچی دوڑا دیئے تھے بادشاہ معظم نے تہجد کی نماز سے فارغ ہوتے ہی برق رفتار گھوڑا منگوایا اور وزراء کے ہمراہ جنگل میں پہنچ گئے۔ راہنما بادشاہ اور امراء کے لئے درختوں اور جھاڑیوں میں سے راستہ بناتے آگے آگے جا رہے تھے۔ شاہ پسند بادشاہ کو اس جگہ لے گئے جہاں دور دور تک لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ جنگل کی گھاس اور جھاڑیاں خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بادشاہ نے لاشوں کا جائزہ لیا اور شاہ پسند کو حکم دیا کہ وہ اپنی تلوار [illegible] کے حوالے کردے اور کلاہ اتار کر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ شاہ پسند نے حکم کی تعمیل کی اور سر جھکا کر بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''تمہارے دستہ میں کتنے سوار تھے؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''کل پانچ ہزار سوار بادشاہ معظم''۔ شاہ پسند نے سر خم کر کے جواب دیا۔

''مرہٹہ سواروں کی تعداد کتنی تھی؟'' بادشاہ نے دوسرا سوال کیا۔

''جنگل میں بیس ہزار کفار کی لاشیں بکھری پڑی ہیں''۔

''تمہارے شہداء کی تعداد کیا ہے؟''

''آٹھ دس سے زیادہ نہیں''۔

''بادولت یقین کرلیں کہ تم نے حملہ سے پہلے کفار کو تلوار اٹھا لینے کا موقعہ دیا تھا اور سوتے دشمن پر حملہ نہیں کیا تھا''۔ بادشاہ نے پوچھا۔

''یہ خادم خدائے بزرگ اور اس کے ماننے والوں کے عادل بادشاہ کے روبرو جھوٹ بولنے کے جرم عظیم کا ارتکاب نہیں کر سکتا''۔ شاہ پسند نے دست بستہ جواب دیا۔

بادشاہ نے گھوڑے سے اتر کر شاہ پسند کو سینے سے لگا لیا اور اپنا قیمتی جبہ اور کلاہ اسے پہنا دیئے۔

شاہ پسند ہرن کے شکار کی تلاش میں جنگل میں داخل ہوا تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس کے کھوجیوں نے جنگل میں مرہٹوں کے گھوڑوں کی موجودگی سے آگاہ کیا تو وہ محتاط ہو گیا۔ مرہٹوں کے گھوڑے ہیں تو سوار کہاں ہیں؟ اچھی طرح جائزہ سے معلوم ہوا کہ دور دور تک مرہٹہ سوار جنگل میں پڑے گہری نیند سو رہے ہیں اور گھوڑے درختوں سے باندھ رکھے ہیں۔ اتنی بڑی مرہٹہ فوج کو دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ چپکے سے واپس ہو جائیں، ایسا نہ ہو دشمن جاگ جائے اور غالب رہے۔ کچھ دوسروں نے کہا۔ ایسا کرنا میدان جہاد سے فرار ہے۔

وہ دشمن کی تعداد سے ڈر کر واپس نہیں جائیں گے۔ پھر یہ سوال اٹھایا گیا کہ سوئے ہوئے دشمن سواروں پر حملہ جائز ہے یا نہیں۔ سرداروں نے کہا۔ سوتے دشمن پر تلوار اٹھانا مسلمان کا شیوہ نہیں، پہلے سب سواروں کو اپنے اپنے ہتھیار اٹھا لینے کا موقعہ دیا جانا چاہئے چنانچہ افغان سواروں نے سوئے ہوئے مرہٹوں کو چاروں طرف ... گھیر لیا اور جنگل میں آگے بڑھنے لگے۔ قریب پہنچ کر یک آواز نعرہ تکبیر بلند کیا تو جنگل گونج اٹھا۔ خوفزدہ مرہٹہ فوجیوں نے ہتھیار اٹھائے اور بدحواسی میں ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ شاہ پسند کے سوار ہر طرف سے حملہ آور ہوئے۔ رات کے اندھیرے میں گھنے جنگل میں مرہٹہ سوار کچھ اپنے ساتھیوں کی تلواروں سے کٹ گئے اور زیادہ تر افغان سواروں کے نیزوں کے سامنے دم توڑ گئے۔

بہت کم جان بچا کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو سکے۔

یہ مرہٹہ لشکر بھی سامان رسد کے سفر پر تھا، دن بھر کے سفر سے تھکے ماندے سوار جنگل کو محفوظ جان کر آرام کرنے کے لئے لیٹے تو نیند نے غلبہ کر دیا۔

ان پے در پے حیران کن کامیابیوں سے مسلمان سپاہیوں کو یقین ہونے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے قاضی ادریس کے آنسوؤں کو شرف قبولیت بخشنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

***

سدا شیو بھاؤ کے دربار میں مرہٹہ سالار اور سردار اپنے اپنے منصب و مقام کے مطابق تشریف فرما تھے۔ ایک حسین و جمیل کم سن برہمن بچہ بالک رام خیمے میں داخل ہوا اور بڑی شان سے سب کے درمیان سے چلتا ہوا بھاؤ کے سامنے پہنچ کر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اس نے سونے کی طشتری میں رکھی پان کی گلوری اٹھا کر بھاؤ کو پیش کی۔ بھاؤ نے گلوری منہ میں رکھ لی تو بالک رام نے ریشمی رومال سے اس کا ہاتھ پونچھا طشتری سے دوسرا رومال اٹھا کر بھاؤ کے ہونٹ صاف کئے اور اسی شان سے الٹے قدموں پر چلتا ہوا دربار سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد خدام سنہری طشتریوں میں پان کی گلوریاں سجائے داخل ہوئے اور مرہٹہ سرداروں اور سالاروں کو گلوریاں پیش کرنے لگے۔ اگلی نشست پر ایک نوجوان مرہٹہ سردار بیٹھا تھا، خادم اس کے پاس سے ہو کر گیا اور اسے گلوری پیش نہیں کی۔ نوجوان سردار نے اس توہین پر نگاہیں جھکا لیں، سب سرداروں نے اس کی طرف دیکھا مگر کسی نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ نوجوان نے کھڑے ہو کر بھاؤ کو فرشی سلامی کیا۔ ''ہماری التجا ہے کہ ہمیں دربار کی حاضری سے مستثنیٰ فرمایا جاوے''۔

سب نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

''جب تک دربار برخاست نہ ہو تمہیں یہیں رہنا ہوگا''۔ بھاؤ نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

''پیشوا کے مقرر کردہ سیناپتی کا حکم ماننا میرا فرض ہے'' نوجوان نے کہا۔ ''مگر میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا، میری رگوں میں بھی وہی برہمن خون دوڑ رہا ہے جو سیناپتی کی رگوں میں ہے''۔ وہ غصہ سے کانپ رہا تھا۔

بھاؤ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''تیری رگوں میں ایک ملیچھ ماں کا دودھ دوڑ رہا ہے اور ہم اجازت نہیں دے سکتے کہ تم کسی برہمن کو ہاتھ لگا کر ہمارا اور ہمارے پوتر سرداروں اور سالاروں کا دین بھرشٹ کرو''۔

''میری ماں مسلمان تھی تو یہ میرا جرم نہیں، میں نے بھی انہی پنڈتوں سے دھرم سیکھا ہے جن سے تم نے اور پیشوا نے سیکھا ہے۔ اگر اس میں کسی کا قصور ہے تو وہ میرے اور اس پیشوا کے باپ کا ہے جس نے آپ کو سیناپتی بنایا ہے''۔ نوجوان بھی غصہ میں سرخ ہو گیا۔

دربار میں موجود سب مرہٹہ سردار اور سالار دم بخود تھے اور دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے جن میں سے ایک ان کے پیشوا کا باپ جایا بھائی تھا اور دوسرا اس کا چچازاد

اور سیناپتی۔

''میں بھی برہمن ہوں مگر چچا بشن سنگھ کے ساتھ کھانا کھانے سے میرا دین تو بھرشٹ نہیں ہوتا''۔ پیشوا کے نوعمر بیٹے وشواس راؤ سے اپنے چچا کی توہین برداشت نہ ہو سکی۔

''جنگی مہم میں بشن سنگھ ہمارے حکم کے ماتحت ہیں اور ہم حکم دیتے ہیں کہ آج سے ان کا کھانا مسلمانوں کے ساتھ ہوگا، وہ نہ ہمارے لنگر میں داخل ہو سکتا ہے نہ کسی برتن کو چھو کر اسے بھرشٹ کرے گا''۔ بھاؤ کو جوش آ گیا۔

''ہم اپنا اور اپنے ساتھیوں کا دین خراب کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے''۔

''ہم پتاجی کو خط بھیج کر ان کا حکم حاصل کر لیں گے، جواب آنے تک چچا بشن سنگھ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے''۔ وشواس راؤ نے تنک کر جواب دیا۔

بھاؤ کی آنکھوں میں خون اتر آیا وہ برداشت نہ کر سکا کہ ایک لڑکا اس سے دلیل بازی کرے۔ ''ہم حکم دیتے ہیں کہ بشن سنگھ مسلمان ہو جائے، مسلمانوں جیسا لباس پہنے، ہمارے مسلمان سواروں کے لشکر کے ساتھ کھانا کھائے اور ان کے ڈیرے پر قیام کرے تاکہ کوئی غلطی سے بھی اسے ہندو نہ سمجھ لے اور کسی کا دین بھرشٹ نہ ہو''۔

وشواس راؤ نے بولنا چاہا تو دو تین بوڑھے سردار بول پڑے۔ ''تم ابھی بچے ہو تم دین کو کیا جانو۔ پونا پہنچ کر پتاجی سے بات کر لینا۔ یہ جنگی مہم ہے اور یہاں سب کو سیناپتی کا حکم ماننا ہے''۔

وشواس راؤ خاموش ہو گیا۔

نوجوان نے کھڑے ہو کر غصہ سے کہا۔ ''مجھے واپس پونا جانے کی اجازت دی جائے''۔

''تم افغانوں کی شکست تک سینا کے ساتھ رہو گے''۔ بھاؤ نے اور بھی غصہ سے حکم دیا۔ ''ہم ابراہیم گاردی کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اسے اپنے ڈیرے پر لے جائے اور مسلمان کر لے''۔

کسی بھی مرہٹہ سردار یا سالار نے بھاؤ کے حکم کی مخالفت نہیں کی۔

نوجوان غصہ سے کانپ رہا تھا اس کی آنکھوں سے شعلے اٹھ رہے تھے ایک بوڑھا سردار اٹھا اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے گیا۔

''ہم نے حکم دیا ہے کہ آپ جائیں اور اسے مسلمان کر لیں''۔ بھاؤ نے ابراہیم گاردی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابراہیم بھی چپکے سے باہر نکل گیا۔

دربار میں سب خاموش تھے، بھاؤ کوئی بات شروع کرنا چاہتا تھا مگر غصہ کی وجہ سے خاموش تھا۔ ہیرے جواہرات سے مزین لباس میں بالک رام پھر داخل ہوا، سیدھا چلتا ہوا بھاؤ تک پہنچا اور دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر سر جھکا دیا۔ بھاؤ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ میں سنہری طشتری سے گلاس اٹھایا، ایک گھونٹ لے کر اس میں جھانکا تھوڑے توقف کے بعد ایک اور گھونٹ لیا اور گلاس اوپر اٹھا کر ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ ''گئو ماتا کی قسم جس کا دودھ ہر برہمن تک دھرم اور شریر کو پالتا ہے، پیشوا بالا جی راؤ کے عہد کو پورا کرنے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی دھرتی ماتا کی نذر کر دیں گے۔ پیشوا بالا جی راؤ نے آپ سب کے سامنے سارے ہندوستان کو مسلمانوں کے وجود سے پاک کرنے کا عہد کیا تھا اور ہمیں کابل پر قبضہ کر کے شمال سے آنے والے افغانوں کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کا حکم دیا تھا۔ ابدالی اور اس کے ہندوستانی ساتھیوں کو ختم کرنے کے بعد ہم کابل اور قندھار پر قبضہ کر کے غزنی میں محمود کی قبر کھود کر اس کے دانت توڑ کر اس کی ہڈیوں کو آگ لگائیں گے اور دنیا والوں کو دکھا دیں گے کہ ہندو بے غیرت نہیں ہوتا۔

اس وقت بھی پونا کے دربار میں موجود تھا، جب پیشوا نے ہمیں اس کے ہم قوم افغانوں کو ختم کر کے اس کے ملک افغانستان پر قبضہ کرنے کا حکم دیا تھا اور میں نے مہارانی جی سے اورنگ زیب کے باپ کی بنائی جامع مسجد کے منبر پر سومنات کی مورتی سجانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے تب بھی سب مرہٹہ سالاروں اور سرداروں کی تقریریں سنی تھیں مگر اس کی غیرت نہیں جاگی تھی۔ گاردی نے پونا کے دربار میں مرہٹہ نمک حلال کرنے کا عہد کیا تھا۔ آج کے معمولی واقعہ سے اس کی مسلمانی غیرت کے بیدار ہو جانے کا کوئی خدشہ نہیں کہ جب وہ پیسے کے لالچ میں مرہٹوں کے لئے جان قربان کرنے کے لئے تیار ہیں تو ہمیں ان کے ایمان کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بشن سنگھ کی ماں خواہ طوائف بھی مگر تھی تو مسلمان، ہم مہا بھارت کی جنگ کے میدان میں کسی ایسے شخص کو ہندو کی حیثیت سے تلوار اٹھانے اور ''ہر ہر مہادیو'' کا نعرہ لگانے کی اجازت نہیں دے سکتے جس کا خون گئو ماتا کے شیر کی مانند پوتر نہ ہو''۔

بھاؤ کے بات ختم کرنے پر فاصلہ پر بیٹھا ملہار راؤ ہولکر کھڑا ہوا تو سب حاضرین اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کے چہرے پر دانش کی گہری لہریں تھیں، آنکھوں میں چمک تھی، اس نے پیشوا کی فراست اور دینداری کی تعریف کی مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے اپنے کمسن بیٹے کو میدان جنگ میں بھیجنے کو سراہا اور پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی شاندار فتح کی امید ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے ماضی میں سکھوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہندوؤں کو بچانے کے لئے میدان میں آئے ہیں۔ ہم نے رگھوناتھ راؤ کو پنجاب میں بھیج کر سکھوں کو لوٹا اور برباد کیا اور انہیں مسلمانوں سے بھی زیادہ ستایا حالانکہ ان کا اور ہمارا دھرم ایک ہے اور [illegible]

جتھیدار آج ہمارے ساتھ نہیں۔ اگر آج سکھ ہمارے ساتھ ہوتے تو ہماری طاقت بہت زیادہ ہوتی اور ہمیں غلہ اور خوراک کی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم سکھ جتھیداروں کے پاس سفارت بھیج کر انہیں یقین دلائیں کہ ہماری فتح ہوگی، مشترکہ دھرم کی فتح ہوگی۔ ہمیں ان سے عہد کرنا چاہئے کہ مسلمانوں پر فتح پانے کے بعد ہم سکھوں کی آزادی کا احترام کریں گے اور ان کے دین دھرم کے تقدس کو ماضی کی طرح پامال نہیں کریں گے۔ اس میں ہندوؤں کا بھی بھلا ہوگا اور سکھوں کا بھی''۔

ملہار راؤ نے اپنی بات ختم کی اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ بھاؤ نے مرہٹہ سردار کی تجاویز کے بارے میں خود کچھ کہنے کی بجائے دربار میں موجود دھت سادھو کی طرف دیکھا۔ سادھو اٹھا تو سب نے احترام میں نگاہیں جھکا لیں۔ سادھو کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگے۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ کافی دیر تک وہ منہ میں کچھ پڑھتا رہا پھر آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں اور سامنے بیٹھے سرداروں کی بجائے خیمہ کی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''ہندو دھرم اور سکھ دھرم کو ایک کہنا ہندو دھرم کی توہین ہے ایسا کہنا مہا پاپ ہے۔ میدان جنگ میں ایسا پاپ دیوتاؤں کے غضب کا سبب بن سکتا ہے۔ سکھ دھرم ہندو کا نہیں مسلمانوں کا دھرم ہے۔ مسلمان اور سکھ دونوں ہمارے دیوی دیوتاؤں سے انکار کرتے ہیں دونوں ہمارے بتوں کو برا کہتے ہیں۔ مسلمان مسجد میں مورتی رکھنا پاپ جانتے ہیں تو سکھ اپنے دربار صاحب میں مورتی رکھنے کو پاپ سمجھتے ہیں مسلمان نیچ ذاتوں کو سب کے برابر جانتے ہیں۔ سکھوں کے گورو نانک بھی کہتے ہیں۔ ''ایک ہیں سب رب کے بندے'' ہم مہا بھارت دیش کی مسجدوں میں بھی مورتیاں رکھیں گے اور سکھوں کے دربار [illegible]

کسی ہندو رشی یا پنڈت نے نہیں رکھا۔ سکھ دھرم کو ہندو دھرم قرار دے کر جو پاپ کیا گیا ہے اس کے لئے سب کو دیوتاؤں سے معافی مانگنا چاہئے۔ دھرم پوتر ہے، ہم نے اسے نجس سے ملا کر پاپ کیا ہے"۔

شاہجہان آباد کا سادھو دھت ہندوستان میں ہندو راج کا بڑا پرچار کر تھا اور مرہٹہ فوج کے ساتھ مل کر کئی لڑائیوں میں حصہ لے چکا تھا۔ سادھو کی تقریر کے دوران کسی نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا اس نے بات ختم کی تو بھاؤ نے کھڑے ہو کر انہیں پرنام کیا، وہ بیٹھ چکے تو بھاؤ بھی اپنی مسند پر بیٹھ گیا اور کہا۔

"جو بھی ہماری مورتیوں کا دشمن ہے وہ ہندو دھرم کا دشمن ہے اور ہماری جنگ دھرم کے سب دشمنوں کے خلاف ہے خواہ وہ داڑھی والا دشمن ہو یا داڑھی اور کیسوں والا دشمن ہو۔ جس طرح ہندو دھرم پوتر ہے اس میں نجس کی ملاوٹ نہیں ہو سکتی اسی طرح ہندو دیش بھی پوتر ہے اس میں کوئی سکھ ریاست نہیں ہو گی لیکن لڑائی میں سکھوں سے مدد اور خوراک حاصل کرنا دھرم کی ضرورت ہے اور ہم اس کی کوشش کر رہے ہیں اور پٹیالہ کے آلا سنگھ کے پاس ہماری سفارت کامیاب آئی ہے۔ اسے پیسے کی ضرورت ہے اور ہمیں خوراک کی، ہم ایک دوسرے کی ضرورت پوری کریں گے مگر یہ میدانِ جنگ کی مجبوری اور چال ہے جس کی دھرم نے اجازت دی ہے۔ ہم سکھوں کے ارادوں سے واقف ہیں وہ خالصہ راج چاہتے ہیں ہم ہندو راج کے لئے لڑ رہے ہیں۔ نہ خالصہ راج ہندو راج ہو سکتا ہے نہ ہندو راج خالصہ راج ہو سکتا ہے"۔

سادھو نے سکھوں کے دھرم اور بھاؤ نے ان کے خالصہ راج کے ارادوں کی وضاحت کر دی تو کسی اور کو ان کی حمایت کی جرأت نہ ہوئی اور وہ اب تک کی جھڑپوں کے نقصانات کے اسباب اور مستقبل کے بارے میں غور کرنے لگے۔ آلا سنگھ سے غلہ اور خوراک کی خریداری کے علاوہ دیگر ذرائع پر تبادلہ خیال میں مصروف ہو گئے۔ وہ سب بشن سنگھ کا واقعہ بھول چکے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ابراہیم گاردی خیمے میں داخل ہوا تو بھاؤ نے اس کی طرف دیکھا۔ "حضور بشن سنگھ ہمارے مذہب میں داخل ہو گیا ہے اور آج سے اس کا نام شمشیر بہادر ہے"۔ گاردی نے بھاؤ کے کچھ پوچھنے سے پہلے اطلاع دی تو بھاؤ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

***

پٹیالہ اور اس کی حدود بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ "سردار اجازت ہو تو ہم ایک رات آپ کے ڈیرے پر گزار لیں"۔ سردار لکھنا نے اپنا گھوڑا ملک سجاول کے قریب کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

ملک سجاول اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "میرے ڈیرے کی نسبت آلا سنگھ کے دربار میں آپ کی زیادہ ضرورت ہے"۔

"آلا سنگھ کو میری زیادہ ضرورت ہے یا مجھے، آلا سنگھ کی ضرورت ہے ہم نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا اور نہ ہی مجھے کبھی آلا سنگھ سے کسی کام کی اجازت حاصل کرنے کی ضرورت پڑی ہے"۔ سردار لکھنا نے جواب دیا۔

"آپ کی نہیں یہ ہماری ضرورت ہے کہ آپ اس کے قریب رہیں اور اسے مرہٹوں کی چال میں آنے سے باز رکھیں، آپ کو پانی پت ساتھ لے جا کر میں اپنا نقصان نہیں کرنا چاہتا"۔

"سردار! آپ اپنے بھائی کو اس قابل نہ سمجھتے ہوں کہ وہ آپ کے ڈیرے اور افغان لشکر میں قیام کرے تو الگ بات ہے۔ آلا سنگھ نے جو وعدہ کر لیا ہے اسے اس سے روگردانی کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ آپ کا بھائی اتنا کمزور اور بے اثر نہیں"۔ سردار لکھنا نے مسکرا کر جواب

''میرے بھائی کی طاقت میری اپنی طاقت ہے اور مجھے اس پر فخر ہے''۔ ملک سجاول نے محسوس کیا کہ سردار لکھنا نے احمد شاہ ابدالی کے دربار میں اس کے اپنے بے اثر ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ''اسی تعلق کی وجہ سے بادشاہ معظم نے اس سفارت کے لئے آپ کے بھائی کو منتخب کیا تھا''۔

''آلا سنگھ نے مجھے دوست کہا تھا، مذہب کے اختلاف کے باوجود وہ دوستی نبھاہ رہا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے نقصان کو اپنا نقصان اور فائدے کو اپنا فائدہ سمجھتے ہیں۔ مغل فوجوں سے لڑائی ہو یا کسی سکھ جتھیدار سے، ہماری تلواریں ایک ساتھ میان سے نکلتی اور ایک ساتھ واپس جاتی ہیں۔ افغان بادشاہ میرا دوست ہے تو دشمن اگر مجھے یقین ہو کہ اس کی تلوار بھی میرے مشورہ سے نیام سے نکلے گی اور واپس جائے گی اور وہ پہلے کی مانند واپس قندھار نہیں چلا جائے گا تو میں آپ کے دوسرے حکم کی تعمیل کے بارے میں بھی سوچ سکتا تھا اور آلا سنگھ سے کہہ سکتا تھا کہ آج سے میرے اور تمہارے راستے الگ ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ اس کا برا نہ مانتا''۔ سردار لکھنا نے وہی بحث شروع کر دی جو وہ کئی روز سے کرتے رہے تھے۔

ملک سجاول نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو کچھ فاصلہ پران کے پیچھے آ رہے تھے اور گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ ''احمد شاہ ابدالی اپنی مرضی سے تلوار نیام سے نکالتا ہے اور جب مناسب سمجھے واپس نیام میں ڈال لیتا ہے۔ ہندوستان آنے یا واپس قندھار جانے کے بارے میں بھی اس نے کبھی مجھ سے مشورہ نہیں کیا اس کے باوجود میں اپنے کو اس کے حکم کا پابند سمجھتا ہوں کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جب وہ واپس قندھار چلا جائے گا تو مجھے یہیں رہنا ہو گا جہاں آلا سنگھ اور اس کے ہم مذہب سکھ جتھیداروں کو رہنا ہے اس کے باوجود میں کسی سکھ جتھیدار کے کندھے سے کندھا ملا کر نہیں لڑ سکتا نہ احمد شاہ ابدالی کے نہ ہی کسی دوسرے سکھ کے خلاف''۔

سردار لکھنا نے بھی اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی تھی، اس نے سرداروں کو دیکھا جو ان کے ساتھی کچھ فاصلہ پر رک گئے تھے۔

''جب آسمانوں پر سورج دیوتا کی رتھ نمودار ہوتی ہے تو اس کی روشنی اور گرمی کو زمین پر پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا''۔ سردار لکھنا نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اپنے کو سورج دیوتا کی آنکھ کے شعلوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کوئی انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ اپنے سر پر کسی طرح سایہ کرلے''۔ ملک سجاول نے سردار لکھنا کی آنکھوں میں جھانکا تو لکھنا نے نگاہیں جھکالیں۔

''میں آپ کی مانند پہاڑیوں کی بلندیوں اور سمندروں کی وسعت سے آگے تک نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اپنی کوتاہ بینی کا اعتراف ہے آپ سے میری خودغرضی بھی کہہ سکتے ہیں لیکن جب میں شاہجہان آباد کے تخت پر سر پر ہیرے سجا کر بیٹھنے والے شہنشاہوں کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے تو وہ بھی اپنے جیسے ہی نظر آتے ہیں کہ کوتاہ نظر اور خودغرض اگر ان کے پاس آپ جیسی نظر اور فکر ہوتی تو آج ہم دونوں دو مختلف کیمپوں میں نہ ہوتے، میں سر جھکا کر آنکھیں بند کر کے آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوتا''۔

''ہمارے قدموں میں ان لوگوں کے فکر و عمل کی زنجیریں پڑی ہیں جو مختلف اوقات میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں بااختیار رہے۔ ہم چاہیں بھی تو ان زنجیروں سے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنی انہی زنجیروں کے ساتھ قدم اٹھانا ہیں اور جہاں تک جا سکتے ہیں جانا ہے۔ حالات کے دھارے کے ساتھ بہتے ہوئے کوئی اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا ہے، کوئی ساتھ بہنے والے کا بازو پکڑ کر اسے بھی بچانے کی ناکام کوشش کرتا

ہے۔ میں دونوں کو کوئی الزام نہیں دیتا اصل میں دونوں معصوم اور مجبور ہیں"۔

سردار لکھنا ملک سجاول کی بات کی گہرائی میں اترنے کی کوشش میں آسمانوں پر رواں سورج دیوتا کے رتھ کی تیزی کی بھول گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا اور دور کھڑے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا، ایک سوار آگے نکل کر اس کے قریب آیا اور سنہری نیام میں مقید ایک تلوار اس کی طرف بڑھا دی۔ سردار لکھنا نے گھوڑے کی لگام چھوڑ دیں اور دونوں ہاتھوں میں تلوار پکڑ کر ملک سجاول کو پیش کر دی۔ "سردار اس تلوار کی دھار اتنی باریک ہے کہ غیر محسوس ہوا کے چینے سے بھی پار اتر جاتی ہے، اپنے بھائی کی طرف سے یہ تلوار قبول فرما دیں۔ جب آپ حکم دیں گے تو آپ کا بھائی اپنا سر بھی اس تلوار کے نیچے رکھ دے گا"۔

ملک سجاول نے تلوار قبول کر کے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "سردار لکھنا ایک بھائی کے ہاتھ میں تلوار دوسرے بھائی کے سر کی حفاظت کے لئے ہوتی ہے۔ آپ نے اپنا فرض میرے ذمہ ڈال دیا ہے، میں زندگی بھر اس فرض کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا"۔

سردار لکھنا نے شکریہ کے لئے سر جھکا دیا۔

ملک سجاول نے گھوڑے کا رخ موڑا اور "خدا حافظ" کہہ کر ایڑ لگا دی اس کے ساتھیوں کے گھوڑے بھی ہوا میں اڑنے لگے۔ سردار لکھنا دیر تک ان کے گھوڑوں کے قدموں کی اڑائی گرد دیکھتا رہا اس کے ساتھی خاموش کھڑے تھے جیسے دریا کی لہروں کی ایک دوسرے سے جدائی کا منظر دیکھ رہے ہوں۔

جب گرد راہ بھی معدوم ہو گئی تو سردار لکھنا نے گھوڑے کا رخ پٹیالہ کی طرف موڑ دیا، سردار آلا سنگھ کے پٹیالہ میں اپنی لشکر گاہ کی طرف۔

***

لال قلعہ کے دیوان خاص میں جشن کا منظر تھا، میاں خوش فہم تخت شہنشاہی پر تشریف فرما تھے اور امرائے شاہجہان آباد انہیں مبارکباد اور نذرانے پیش کر کے اپنی اپنی وفا شعاری اور فرمانبرداری کا عملی مظاہرہ کر رہے تھے۔ زرق برق لباسوں والے درباری تخت کے سامنے سر جھکائے دست بستہ کھڑے تھے۔ میاں بڑے وقار اور پر جلال طریقہ سے نذرانے وصول کر رہے تھے۔ مظلوموں اور فریادیوں کی عرض داشتوں پر احکامات جاری فرما رہے تھے۔ عریضے ختم ہو چکے تو وکیل دربار نے سابق وزیر اعظم ہند عماد الملک کے خلاف فرد جرم پیش کرنے کی اجازت چاہی۔

شہنشاہ نے وزیر اعظم سے کچھ کہا اور چوبدار نے بلند آواز میں اعلان کیا۔ "شہنشاہ معظم جہاں پناہ عالی مرتبت خوش فہم کا ارشاد عالی ہے کہ ملزم کو پیش کیا جائے تاکہ کارروائی انصاف کے اصولوں کے مطابق مکمل کی جا سکے"۔

اعلان ختم ہوتے ہی عمال شہنشاہی عماد الملک کو لے کر نمودار ہوئے اس کے پاؤں میں بھاری بیڑیاں تھیں اور ہاتھ آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ امراء شرفاء اور درباری سب دم بخود کھڑے دیکھ رہے تھے۔ عماد الملک کی نگاہیں نیچی تھیں وہ وزراء امراء اور درباریوں کے درمیان سے ایسے گزر رہا تھا جیسے کوئی نیم مردہ اور نیم خوابیدہ انسان گزرے اپنے اردگرد سے بے خبر جب اسے ملزموں کے کٹہرے میں پہنچایا جا چکا تو وکیل دربار نے فرد جرائم پڑھنا شروع کیا جس میں عماد الملک کے خلاف شہنشاہ ہندوستان عالمگیر ثانی اور وزیر اعظم خان خاناں انتظام الدولہ کو قتل کروانے دشمنان دین سے ساتھ مل کر ہندوستان کی مسلم سلطنت کو کمزور کرنے جیسے الزامات لگائے گئے تھے۔ جب وکیل دربار فرد جرم پڑھ چکا تو

عمادالملک کو اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کہا گیا مگر وہ خاموش کھڑا رہا، اسے تین بار صفائی پیش کرنے کو کہا گیا مگر وہ پھر بھی خاموش رہا، لب بستہ درباری سابق وزیراعظم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شہنشاہ کے حکم پر چوبدار نے بلند آواز میں اعلان کیا کہ ملزم کی خاموشی اقرار جرم ہے اور وہ ان سب الزامات کو تسلیم کرتا ہے۔ عمادالملک اس اعلان پر بھی خاموش رہا۔

شہنشاہ معظم نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر چوبدار نے حکم شہنشاہ پر ملت کے مجرم کی سزا کا اعلان کیا۔

''شہنشاہ معظم جہاں پناہ عالی مرتبت خوش فہم کا حکم عالی ہے کہ ملت اسلامیان ہند کے مجرم شہنشاہ اور وزیراعظم ہند کے قاتل عمادالملک کو دربار عام میں شکنجے میں جکڑ کر تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا جائے تا کہ آنے والی نسلیں عبرت پکڑیں اور آئندہ کوئی ملت کے دشمنوں سے مل کر سازش نہ کرے''۔

چوبدار کی آواز دیوان خاص کے دروازوں سے نکل کر قلعہ کے در و دیوار میں گونجی عمادالملک نے پھر بھی سر نہیں اٹھایا، وہ بدستور اپنے سامنے زمین میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

عمال شہنشاہی دیوان خاص کے سامنے آہنی شکنجہ جما چکے تو سپاہی عمادالملک کو اس کی طرف لے چلے، وہ اب بھی نیم مردہ اور نیم بے ہوش تھا۔ سپاہیوں نے اس کے ہاتھوں سے زنجیریں کھول کر اسے شکنجے پر کس دیا۔ اس کی گردن اس انداز سے باندھی گئی کہ چہرہ نیچے کی طرف تھا اور گردن اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور باقی جسم پیچھے کی طرف لٹکا ہوا تھا۔

سب حاضرین دم بخود تھے، جلاد شاہی نے تلوار نیام سے نکالی اس کی دھار کا جائزہ لیا اور ہوا میں لہرا کر مجرم کی طرف بڑھا۔

مغلانی بیگم چیخیں مارتی شکنجے کی طرف دوڑی۔

پس پردہ کی ڈیوٹی پر کھڑی کنیز بیگم کی چیخیں سن کر بھاگتی ہوئی اندر آئی تو بیگم لحاف ایک طرف پھینک کر بستر میں بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا رکھا تھا۔

سکوت شب میں بیگم کی چیخیں خیمے سے نکلیں اور پہریداروں تک پہنچ گئیں۔

صبح تک بیگم کے ڈراؤنا خواب دیکھنے اور چیخیں مارنے کی خبر ڈیرے کے ہر فرد تک پہنچ چکی تھی۔

***

جب سورج نے آنکھ کھولی تو پانی پت کا آسمان سیاہ ہو رہا تھا، روہیلوں اور مرہٹوں کی توپیں ایک دوسرے پر آگ برسا رہی تھیں، شاہجہان آباد اور کنج پورہ پر قبضہ سے مرہٹوں کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے۔ احمد شاہ ابدالی ڈیڑھ ماہ سے ان کے سامنے مورچہ بند تھا لیکن اس نے اب تک باہر نکل کر لڑنے یا مرہٹوں پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مرہٹہ کمانداراسے شاہ اور اس کے ساتھیوں کی بزدلی سمجھا اور ایک صبح کے اندھیرے میں اپنی توپیں روہیلہ فوج کے سامنے نصب کر کے ان پر گولہ باری شروع کر دی، جواب میں روہیلے بھی اپنی توپیں میدان میں نکال لائے۔ آگ کا یہ کھیل سارا دن جاری رہا۔ جب سورج مغرب کی گھاٹیوں میں روپوش ہو گیا تو روہیلے اپنے مورچوں سے نکل کر مرہٹوں کی توپوں پر یلغار کر دی۔ مرہٹے توپیں چھوڑ کر پسپا ہونے لگے تو سدا شیو بھاؤ نے اپنے نائب کماندار بلونت راؤ کی قیادت میں بھاری لشکر ان کی مدد کے لئے میدان میں اتار دیا۔ مرہٹوں کے توپ خانہ کے کماندار ابراہیم خاں گاردی نے گولہ باری کرنے والوں کی کمان خود سنبھال لی۔ رات کے اندھیرے میں زبردست لڑائی ہوئی بلونت راؤ منڈیل مارا گیا۔ روہیلہ فوج کے ہزاروں سپاہی اور سوار شہید ہوئے مگر انہوں نے حملہ آوروں کو بھگا کر ان کی

بہت سی توپوں پر قبضہ کرلیا۔

پانی پت کے میدان میں اب تک یہ سب سے بڑا مقابلہ تھا اس میں مرہٹوں کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

روہیلہ دستے ساری رات اپنے زخمی اٹھاتے اور شہداء کو دفناتے رہے۔

بیگم نے ساری رات خیمے میں بیٹھ کر گزاری۔ وہ لڑائی کے بارے میں تازہ خبریں معلوم کرتی رہی۔ صبح جب اسے میاں خوش فہم کی شہادت کی خبر ملی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے تو اسے شاہجہان آباد کے تخت شہنشاہی پر تاج سجائے دیکھا تھا، اس کو شہادت کا تاج مل گیا۔ اس نے جس کی گردن اڑا دینے کا حکم دیا تھا، اس کا کیا انجام ہوگا؟ وہ اپنے ارادے نے خواب کی نئی تعبیریں سوچنے لگی۔

***

شاہ ولی خاں کے خیمے میں افغان سردار نئی صورت حال پر غور کر رہے تھے اس کے مخبروں نے اطلاع دی تھی۔ مرہٹہ سالار شجاع الدولہ سے رابطہ قائم کر کے ان کے ذریعے بادشاہ معظم کو واپس جانے پر آمادہ کرنے کی سازش کر رہے ہیں اب تک مرہٹہ سالار کا خیال تھا کہ افغان زیادہ عرصہ ہندوستان میں نہیں ٹھہر سکیں گے اور ان کی فتوحات اور قوت دیکھ کر لڑنے کی بجائے صلح کر کے واپس جانے پر راضی ہو جائیں گے۔ احمد شاہ ابدالی انہیں شاہجہان آباد کا حاکم تسلیم کرلے گا اور وہ پنجاب اور کشمیر کو ابدالی کی سلطنت کا حصہ مان کر ان سے معاہدہ کرلیں گے۔ نجیب الدولہ کی قوت کمزور کرنے کے لئے انہوں نے حافظ رحمت اللہ کو ان سے علیحدہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور کہا کہ ابدالی کے واپس جانے کے بعد وہ روہیلوں کی ریاست کی آزادی اور خودمختاری کا احترام کریں گے اور نجیب الدولہ کو ہٹا کر انہیں روہیلہ ریاست کا حکمران بنانے میں مدد دیں گے۔ حافظ رحمت اللہ سے مایوس ہو کر انہوں نے شجاع الدولہ کو نجیب الدولہ سے الگ کرنے اور ہندوستان کے مستقبل کی حکومت میں شراکت کے مذاکرات شروع کر دیئے۔ شجاع الدولہ کو دونوں فریقوں نے ہندوستان کی وزارت عظمیٰ کی پیشکش کر رکھی تھی اس لئے وہ لڑائی کی بجائے مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی میں سمجھوتہ کے حق میں تھے تاکہ انہیں نجیب الدولہ اور شاہجہان آباد کے علماء کی قوت اور اثر و رسوخ کا خوف نہ رہے اور وہ مغل شہنشاہ کے نام پر ہندوستان کا حاکم بن سکے۔ افغان وزیراعظم کو ایسا سمجھوتہ پسند نہیں تھا، وہ افغان سرداروں اور نجیب الدولہ سے مرہٹوں کی پیشکش کے بارے میں مشاورت چاہتے تھے۔ خادم نے نجیب الدولہ کی آمد کی اطلاع دی تو شاہ ولی خاں نے خیمے سے باہر نکل کر ان کو خوش آمدید کہا۔

نجیب الدولہ کے چہرے پر فکر کے سائے چھا رہے تھے خیمے میں موجود سب افغان سرداروں نے چہرے سے ان کے دل کی حالت کا اندازہ کرلیا۔

"ہندوستان میں ہمارے دو دشمن ہیں، کفار اور موسم۔ خدائے بزرگ نے ہمیں موسم کو پسپا کرنے کی ہمت دی، کفار اپنے مورچوں میں مستعد ہیں۔ بادشاہ معظم چاہتے ہیں کہ موسم کے پھرنے سے ان کے ساتھ آملنے سے پہلے کفار کی قوت کا خاتمہ کر دیا جائے"۔ شاہ ولی خاں نے نجیب الدولہ کو سنجیدہ دیکھ کر کہا۔

"سردار مکرم! آپ خوش بخت ہیں کہ آپ کے سامنے ایک ہی دشمن ہے، ہم ہندوستان کے مسلمانوں کے کتنے دشمن ہیں، خود ہمیں بھی علم نہیں"۔ نجیب الدولہ نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مگر ان سب دشمنوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن خود ہندوستان کے مسلمان ہیں"۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کے سب دشمن بادشاہ معظم کے دشمن ہیں"۔ شاہ ولی خاں نے نجیب الدولہ کے

چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے ان سب کے خلاف جہاد کی تلوار نیام سے نکالی ہے اور اس وقت تک تلوار واپس نیام میں نہیں ڈالیں گے جب تک ان کو نابود نہ کر دیں''۔

خدائے واحد بادشاہ معظم کے جذبہ جہاد میں برکت دے، ہمیں ان کے عزم اور جذبہ پر یقین کامل ہے مگر وہ پھر کے بتوں کے پوجنے والوں کے خلاف تو جہاد کر سکتے ہیں ان مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے جنہوں نے اپنے اپنے بت اپنے دلوں میں چھپا رکھے ہیں۔ ہندوستان کی مسلم سلطنت کو ایسے ہی بت پرست مسلمانوں نے اس حال کو پہنچایا ہے، خدا نہ کرے یہی بت پرست اس کو برباد کریں گے، یہ ہوس، حرص اور ذاتی مفاد کے بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں''۔

تمام افغان سردار نجیب الدولہ کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''ہندوستان کے مشرقی ساحلوں پر فرنگیوں کی صلیبت بردار فوجیں قابض ہو چکی ہیں۔ شاہجہان آباد کے مرکز پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ پنجاب میں سکھوں کی شورش بپا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان مرہٹوں کے کیمپ میں بھی موجود ہیں۔ فرنگیوں کے ساتھ بھی ہیں اور سکھوں کے ساتھ بھی مل جائیں گے لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے وجود کے تحفظ کے لئے جمع ہونے والے لشکر میں آپ کو کوئی سکھ نظر آتا ہے، نہ فرنگی اور نہ کوئی مرہٹہ۔ ہماری صفوں میں ہوس اور حرص کے بتوں کے پجاری ایسے مسلمان بھی اہل ہیں جو جہاد کے لئے نکلنے والی تلوار کو واپس نیام میں ڈالنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

''نجیب الدولہ نے اپنی تلوار نیام سے نکال کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر یہ تلوار بھی نیام میں واپس نہیں جائے گی''۔

شاہ ولی خان نے اپنے سرداروں کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ نجیب الدولہ نے تو اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا ہے جو بات بتانے کے لئے انہیں بلایا گیا تھا وہ تو انہیں پہلے ہی معلوم ہے، اب کیا کیا جائے؟ شجاع الدولہ کی ترغیب کے بارے میں ان سے مشورہ کریں یا نہ کریں کسی سردار کی نگاہ اس کے خاموش سوال کا کوئی جواب نہ دے سکی تو اس نے نجیب الدولہ کی تلوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بادشاہ معظم نے ہندوستان کے علمائے کرام اور حضور کی دعوت پر جہاد کا یہ سفر اختیار کیا ہے اور جب تک شاہجہان آباد کے علماء کا حکم نہ ہوا اور حضور نے اتفاق نہ کیا، بادشاہ معظم اپنی تلوار نیام میں نہیں ڈالیں گے۔ ہم سب کی تلواریں آپ کے ساتھ ہیں مجھے امید ہے کہ کوئی افغان سردار میدان جہاد سے منہ نہیں موڑے گا''۔

شاہ ولی خاں نے بات ختم کی تو خیمے میں موجود افغان سرداروں نے باری باری کھڑے ہو کر اپنی اپنی تلوار نیام سے نکال کر عہد دہرایا کہ میدان جہاد میں وہ کسی سے پیچھے نہیں ہوں گے۔

نجیب الدولہ نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

سرداروں کی بے نیام تلواریں سب کے سامنے رکھی تھیں لیکن شاہ ولی خان اور ملک سجاول کی تلواریں اب تک نیام میں تھیں۔ شاہ ولی کی تلوار خیمے میں ان کے دائیں ہاتھ لٹک رہی تھی اور ملک سجاول کی تلوار ان کے پہلو میں قالین پر رکھی تھی۔ شاہ ولی نے ہاتھ بڑھا کر تلوار اٹھائی نیام سے نکال کر اس پر لکھا کلمہ طیبہ بلند آواز میں پڑھا اور کہا۔ ''اس جہاد میں مجھے شہادت نصیب ہو تو آپ گواہ رہیں کہ میں کلمہ پڑھ کر شہید ہوا''۔

ملک سجاول نے اپنے چغہ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر حمائل سائز کا قرآن کریم نکال کر اسے بوسہ دیا اور کلامہ شہادت پڑھ کر اسے بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاد

کے لئے روانہ کرتے وقت میری والدہ محترمہ نے کائنات کا یہ سب سے عظیم ہتھیار مجھے سونپ کر حکم دیا تھا کہ شہادت ہو یا فتح اسے اپنے سے الگ نہ کرنا میری زندگی اس کی عظمت پر قربان ہو جائے تو اس سے بڑی خوش بختی کوئی نہ ہو گی"۔

شجاع الدولہ کی ترغیب اور تجویز کا ذکر کئے بغیر سب شرکائے مشاورت نے اسے مشترکہ طور پر مسترد کر دیا۔

***

مغلانی بیگم کے ڈیرے میں رات کی سردی اور سیاہی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جنگی جھڑپوں کی شدت کے بعد سفارت کاری اور پیغام رسانی کی شدت نے ماحول میں پُراسراریت پیدا کر دی تھی۔ اپنے مخبروں سے حاصل کردہ معلومات کی بنیاد پر اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس لئے ملک سجاول کی آمد پر اس کا دماغ ماضی سے نکل کر حال میں واپس آ گیا تھا۔ ملک سجاول اور ملک قاسم بیٹھ چکے تو بیگم دونوں کی خیریت دریافت کر کے رک گئی۔ وہ دونوں بھی جواب دے کر خاموش ہو گئے۔ بیگم کی خواہش تھی کہ ملک سجاول سیاست کاری اور سفارت کاری کے بارے میں بات شروع کریں تا کہ وہ اسے اپنے موضوع کی طرف لا سکیں مگر ملک اپنی طرف سے اسے کوئی ایسا موضوع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انہیں خاموش دیکھ کر بیگم نے خود پہل کر کے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ "ہم نے بہت پیغام ارسال کئے مگر ہر بار یہی اطلاع ملی کہ آپ کسی سفارت پر گئے ہیں ہم خوش بھی ہوئے کہ بادشاہ معظم نے آپ کی صلاحیتوں کو پہچان لیا ہے اور مایوس بھی کہ اتنی مدت ملاقات سے محروم رہے"۔

"حضور کی مہربانی ہے کہ اس خادم کے بارے میں خوش خیالی سے کام لیا ورنہ بندہ کسی سفارت کاری کا اہل نہ ہے نہ ایسی کوئی بڑی مصروفیت تھی۔ شاہی کیمپ کے گرد بہت سے امراء مقیم ہیں کبھی کوئی کام پڑ ہی جاتا ہے"۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

بیگم کو امراء کی موجودگی کے ذکر سے بات اپنے موضوع کی طرف موڑنے میں آسانی میسر آ گئی۔ "ہم خوش ہیں کہ ہندوستان کے بیشتر مسلم امراء اور سردار بادشاہ معظم کے پرچم تلے جمع ہو گئے ہیں۔ یہ کام آپ کی کوششوں کے بغیر دشوار ہوتا"۔ وہ ملک سجاول کو جانتے ہوئے بھی اس کے خلاف تعریف کا ہتھیار آزمانے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہ سب اللہ کا کرم اور بادشاہ معظم کے خلوص اور کوششوں کا ثمر ہے۔ اس خاکسار کی حیثیت تو وہی ہے جو سلیمان کی فوجوں کے سامنے بے پایہ چیونٹی کی تھی"۔ ملک سجاول نے وار بچانے کے لئے کہا۔

"ہم سمجھتے ہیں آپ کے بغیر علماء کرام کو متحد کرنا ممکن نہ ہوتا"۔

"علماء کا اتحاد ان کے خلوص کا ثبوت ہے اس کے لئے اگر کسی نے کام کیا تو وہ قبلہ شاہ ولی اللہ دہلوی ہیں، بندہ تو ان کا ایک ادنیٰ خادم ہے"۔ ملک اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا تھا تا کہ بات عمادالملک تک نہ پہنچ جائے۔

"ہماری خواہش تھی کہ آپ عمادالملک کو پیغام بھیجتے وہ آپ کی بات پر ضرور غور کرتا ہم خود اسے مراسلہ بھیجنا چاہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی طاقت کا حصہ بن جائے آپ ہمارا مراسلہ اس تک پہنچانے کا بندوبست کر دیں"۔ بیگم نے ملک کو بات ٹالتے دیکھ کر براہ راست مطلب کی بات کہہ دی۔

"بندہ اپنے کو ہرگز اس قابل نہیں سمجھتا کہ نواب عمادالملک جیسے جہاندیدہ اہل فراست کو اس بات پر آمادہ کر سکے۔ نواب صاحب نے ہندوستان کے جملہ مسلم امراء سرداروں اور مسلمانوں سے کٹ کر جو اپنی الگ راہ

اختیار کی ہے تو اس کا کچھ سبب تو وہ جانتے ہیں''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

''ہم عمادالملک کی اس حماقت کا سبب نہیں سمجھ سکے، اسی لئے ہماری خواہش ہے کہ آپ خود اس سے بات کریں''۔ بیگم نے اپنا مدعا اور بھی کھل کر بیان کیا۔

''حضور کی خواہش میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے، اس کی تعمیل مجھ پر لازم ہے مگر میں اپنے کو اس کا اہل نہیں سمجھتا''۔ ملک سجاول نے بھی صاف جواب دے دیا۔

بیگم کی پریشانی نمایاں ہونے لگی۔ ''ہندوستان کی مسلم ملت سے کٹ کر عمادالملک خود بھی برباد ہوگا اور ہمیں بھی رسوا کرے گا۔ ہم نہ جانتے تھے آپ ہماری رسوائی اور بربادی پر خاموش رہیں گے''۔ بیگم نے دوسرا ہتھیار نکال لیا۔

''خدائے بزرگ حضور کی عظمت و مرتبہ میں اضافہ کرے، یہ خاکسار تو ہمیشہ آپ کی سرفرازی کے لئے کوشاں رہا ہے''۔ ملک سجاول نے بیگم کی بجائے شمع دان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہماری شاید یہ آخری درخواست اور خواہش تھی اور ہم امید کرتے تھے کہ آپ اسے مسترد نہیں کریں گے لیکن شاید وقت اور حالات کی کوئی مجبوری ہو اگر ایسا ہے تو ہم اپنی خواہش اور درخواست واپس لیتے ہوئے خوش ہیں کیونکہ ہم نے ہمیشہ آپ کی خوشی چاہی ہے''۔ بیگم نے زہریلا تیر چھوڑ دیا۔

''بادشاہ معظم ہندوستان کے مسلمانوں کو متحد کرنا چاہتے ہیں، کفر کے مقابلے کے لئے وہ سب کو ماضی کی غلطیاں اور کوتاہیاں معاف کرنے پر تیار ہیں''۔ ملک سجاول بات کرتے کرتے رک گیا پھر کچھ سوچ کر بتایا۔

''وہ نواب عمادالملک کو معاف کرنے پر تیار ہیں اس کے لئے انہوں نے چند روز قبل نواب صاحب کے پاس پیغام بھی بھیجا تھا مگر نواب صاحب نے حق اور باطل کے فیصلہ کن معرکہ میں بھی کفر کا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں فرمایا''۔

مغلانی بیگم کے لئے یہ انکشاف حیران کن تھا۔

''ہم نے ہمیشہ آپ کی بات پر یقین کیا ہے، کیا اس حقیقت پر بھی ایمان لے آئیں؟''

''اگرچہ یہ حقیقت بہت تلخ ہے مگر اس سے انکار ممکن نہیں۔ بادشاہ معظم نے اس پیغام کے لئے بھی حضور کے اس خادم کو ہی منتخب فرمایا تھا اور اس نے پوری دردمندی سے نواب صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ مسلمانوں کے اتحاد میں شامل ہو جائیں''۔

بیگم نے بے چینی سے کروٹ بدلی، ان کی موٹی موٹی آنکھیں حیرانی سے اور بھی پھیل گئیں۔ ''عمادالملک نے اپنی اور ہماری بربادی پر مہر ثبت کر دی ہے، ہم مشکور ہیں کہ آپ نے ہمیں حقیقت سے آگاہ کر دیا''۔ اس کی آواز لرزنے لگی تھی۔

ملک سجاول خاموش رہا۔

''مقدر کی زنجیر کا حلقہ ہماری شاہ رگ کے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے مگر اس آزمائش کی گھڑی میں ہم اپنے خاندان کی نمائندگی کا فرض ادا کریں گے اور ان شاء اللہ کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے''۔ مغلانی بیگم نے کہا۔ ''ضرورت پڑی تو لڑائی میں اپنے دستہ کی ہم خود کمان کریں گے''۔

''خدا کے فضل سے وہ گھڑی نہیں آئے گی جب حضور کو تلوار اٹھانا پڑے''۔ ملک سجاول نے قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''قاسم کو ایک ضروری مہم کی قیادت کرنا ہے، ہم حضور سے رخصت کی اجازت چاہیں گے''۔

''خدا آپ کے عزم اور ارادوں کو بلندی عطا فرماوے''۔ بیگم نے اپنی مسند سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھے اور اجازت لے کر تیزی سے خیمے سے نکل گئے۔

***

پانی پت کے میدان پر چھائے گھپ اندھیرے میں کہیں سازش کے سنپولئے رینگ رہے تھے تو کہیں سفارت کے دیے میں سیاست کی بتی اونچی کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ مرہٹہ سالار کا وکیل گنیش پنڈت اپنے آقا کی پگڑی اور مراسلہ لے کر شجاع الدولہ کے حضور پیش ہوا اور بھاؤ کا پیغام دیا۔ ''آپ ہمارے بھائی ہیں، مرہٹے جس کو اپنے سر کی پگڑی پیش کر کے اپنا بھائی بنائیں زندگی اور موت میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے سپاہی بھوک سے مرنے لگے ہیں، احمد شاہ ابدالی سے صلح کرا دیں تو مرہٹہ قوم ہمیشہ آپ کے احسان کے سامنے سرنگوں رہے گی''۔

شجاع الدولہ نے جواب میں بھاؤ کو اپنی پگڑی بھیج کر بھائی بندی پر مہر ثبت کر دی اور احمد شاہ ابدالی کو صلح پر آمادہ کرنے کا پختہ وعدہ کر لیا۔ ٹھنڈی رات کے اندھیرے میں شجاع الدولہ اپنے وکیل کاشی راؤ سے اب تک کی صلح کی بات چیت پر تبادلہ خیال کر رہا تھا کہ خادم نے بھاؤ کے ایک اور ایلچی کی آمد کی اطلاع دی۔ اس نے فوراً ایلچی کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور کاشی راؤ کو باہر بھیج دیا۔ کم سن بالک رام خیمے میں داخل ہوتے ہی سلام کے لئے جھک گیا اور پھر دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر اپنے آقا کا مراسلہ پیش کیا۔ شجاع الدولہ نے جلدی سے کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ بھاؤ نے سفید کاغذ پر زعفرانی رنگ کی سیاہی سے اپنی مذہبی کتب گئو ماتا اور مقدس مورتیوں کی قسمیں اٹھا کر لکھا تھا آپ تاخیر نہ کریں، صلح کی جو شرائط بھی آپ طے کریں گے، ہمیں منظور ہوں گی''۔

کاغذ پر بھاؤ کے ہاتھ کا نقش دیوی دیوتاؤں کی قسمیں اور احمد شاہ ابدالی سے ہر شرط پر صلح پر آمادگی دیکھ کر شجاع الدولہ نے اپنی کمر کے گرد بندھا قیمتی پٹکا اتار کر بالک رام کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے بائی کو ہمارا پٹکا پیش کریں اور بتائیں کہ یہ ہم دونوں کو بھائی بندی کے رشتہ میں باندھے ہوئے ہے، اس کا تقدس ہمارے رشتہ کا تقدس ہے، ہم اس تقدس کی حفاظت میں جان لڑا دیں گے''۔

بالک رام نے شجاع الدولہ کا کمر بند چوم کر آنکھوں سے لگایا اور آداب عرض کر کے تیزی سے خیمے سے باہر نکل گیا۔

شجاع الدولہ نے کاشی راؤ اور پرچہ نویس کو طلب فرمایا۔

''اس خط اور بالک رام کو بھیجنے کے بعد بھاؤ کے خلوص میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں''۔ کاشی راؤ نے زعفرانی مقدس سیاہی سے لکا خط اور پنجہ دیکھ کر رائے دی۔

شجاع الدولہ خاموش تھا پرچہ نویس ایک بھر پھر مراسلہ دیکھ چکا تو شجاع الدولہ نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ ''اب آپ کا کیا خیال ہے؟''

''معاملات کی گہرائی اور شدت کا حضور نواب صاحب سے زیادہ کوئی اور اندازہ نہیں کر سکتا''۔ پرچہ نویس رائے دینے سے کترا رہا تھا۔

''ہم کاشی راؤ کی رائے کو حقیقت سے قریب تر سمجھتے ہیں''۔ شجاع الدولہ نے مراسلہ طے کرتے ہوئے کہا۔

''بادشاہ معظم حضور کی رائے کی جتنی قدر کرتے ہیں کسی اور کی رائے کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ حضور! مراسلہ بادشاہ معظم کے حضور پیش کر دیں، نواب نجیب الدولہ کے دلائل کا زور ٹوٹ جائے گا''۔ کاشی راؤ نے مشورہ دیا۔

''عمادالملک کا ماضی اور مرہٹوں کے عزائم نجیب الدولہ کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں، کل ہم خود نجیب الدولہ سے بات کریں گے۔ اس خطہ کے بعد انہیں بھاؤ کے خلوص پر یقین آ گیا تو بادشاہ معظم کو واپسی پر راضی کرنا آسان ہو جائے گا''۔ شجاع الدولہ نے اپنے مشیروں کو

اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا۔

''یہ غلام بھاؤ کا ہم مذہب اور ہم قوم ہے لیکن نواب حضور کا نمک خوار ہے، حضور کا اعتماد اور مفاد اس کا مقصد حیات ہے۔ حضور نے اس غلام پر اتنا اعتماد کیا کہ نواب نجیب الدولہ سے مذاکرات کے لائق جانا یہ اس غلام کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔ حضور اپنے غلام کی نیت پر شبہ نہ کریں اور وہ بات کہنے کی اجازت دیں جو یہ غلام کئی دنوں سے محسوس کر رہا ہے تو غلام کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور اس کا ضمیر ملامت نہیں کرے گا کہ اس نے جو کچھ محسوس کیا اپنے آقا کو کیوں نہ بتایا''۔ کاشی راؤ نے دونوں ہاتھ باندھ کر درخواست کی۔

''ہمارا اعتماد ہمارے یقین کی دلیل ہے ہم نے آپ کی بات پر کبھی شبہ نہیں کیا۔ آپ جو محسوس کرتے ہیں بلاخوف کہہ دیں''۔ شجاع الدولہ نے کاشی راؤ کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

کاشی راؤ نے ہاتھ باندھ کر ایک بار پھر نواب شجاع الدولہ کو پرنام کیا۔ ''بادشاہ معظم اور نواب نجیب الدولہ حضور کے ہم مذہب ہیں۔ یہ غلام اس مذہب کا ماننے والا ہے جس کے خلاف حضور جہاد کرنے میدان میں آئے ہیں۔ غلام ڈرتا ہے کہ اگر اس نے سچ کہہ دیا تو اسے کسی اور رنگ میں نہ دیکھا جائے''۔

''ہم کہہ چکے ہیں کہ آپ جو کہنا چاہتے ہیں بلاخوف کہیں ہم بات کو اسی رنگ میں دیکھنے کے عادی ہیں جس میں ہمارا نمک خوار پیش کریں''۔

''حضور کے حکم پر نواب نجیب الدولہ سے طویل مذاکرات اور روہیلہ سرداروں کی باتوں سے حضور کا یہ غلام اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ نواب نجیب الدولہ حضور کے عروج اور کمال سے حسد رکھتے ہیں۔ بادشاہ معظم نے حضور کو ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کا وزیراعظم مقرر کر دیا ہے۔ مرہٹہ پیشوا نے بھی حضور کو ہی ہندوستان کا سلطنت کا وزیراعظم نامزد کیا ہے۔ اگر حضور مرہٹوں اور بادشاہ معظم میں صلح کرانے میں کامیاب ہو گئے تو ہندوستان میں آپ کے مقابلہ میں کسی کا دیا نہیں جلے گا۔ یہ بات نجیب الدولہ کو پسند نہیں سنی مذہب کے ماننے والے افغان اور روہیلہ سردار اور امراء حضور کی صلح کی کوششوں کی اس لئے مخالفت کر رہے ہیں کہ حضور شیعہ ہیں۔ سنی علماء نے جہاد کا فتویٰ جاری کر کے حضور کو ناکام بنانے کی کوشش کی ہے''۔ کاشی راؤ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پرچہ نویس کے چہرے پر اس کے تاثرات پڑھ کر پھر سے بات شروع کی۔ ''حضور کا کوئی مشیر اس نمک خوار غلام کی نیت پر شبہ کر سکتا ہے، کہہ سکتا ہے کہ اس نے ہندو اور مرہٹہ ہونے کی وجہ سے شیعہ سنی اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش کی ہے''۔

کاشی رام کی بات جاری تھی کہ خادم نے مداخلت کی معافی کی درخواست کی اور ایک ایلچی کی طرف سے سر دربار پیغام کی اطلاع دی۔

''اجازت ہے''۔ شجاع الدولہ نے کاشی راؤ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''حضور کے درجات کی بلندی کی دعا کے ساتھ ایلچی نے تخلیہ میں اطلاع دینے کی درخواست کی ہے''۔ خادم نے مرحبا کر کہا۔

شجاع الدولہ نے پرچہ نویس اور کاشی راؤ کی طرف دیکھا تو وہ آداب عرض کر کے خیمہ سے باہر نکل گئے۔

ایلچی کے ساتھ خیمہ سے باہر آتے ہی شجاع الدولہ نے فوراً سواری پیش کرنے کا حکم دیا اور ہتھیار لگا کر رات کے اندھیرے میں احمد شاہ ابدالی کی لشکرگاہ کی طرف سرپٹ گھوڑا دوڑا دیا۔ اس کے ہمراہ اس کا درباری پرچہ نویس اور محافظ دستہ کے سوار تھے۔

(اگلے ماہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

پاکستان کا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟

جب تک پاکستان میں ایسے جہلاء اور غلامانہ ذہنیت کے حامل سیاستدانوں سے نجات حاصل نہیں ہوتی ملک خوشحالی اور ترقی کی طرف گامزن نہیں ہوسکتا۔

☆ سید ریاض الحسن
سکواڈرن لیڈر (ریٹائرڈ)

پاکستان کو معرض وجود میں آئے تقریباً تین چوتھائی صدی مکمل ہونے کو ہے لیکن اس کے مسائل روز بروز فزوں تر ہورہے ہیں اور عوام کے حالات بدتر سے بدترین کی طرف گامزن ہورہے ہیں۔ بڑے بڑے تجزیہ نگار، کالم نویس، قانون دان، انتظام و انصرام کے ماہر، مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز نامور اور ایماندار منتظم، جدید و قدیم علوم کے حامل نابغہ روزگار خواتین و حضرات اور مختلف شعبوں کے ماہرین اپنی تجاویز اور آراء سے قوم کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ بے شمار مذہبی و سیاسی لیڈر دن رات ملک و ملت کی اصلاح، ترقی، فلاح و بہبود اور اسے ایشین ٹائیگر بنانے کے لئے تگ و دو کررہے ہیں لیکن

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

بنیادی مسئلہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے ''مناسب تعلیم کا فقدان''۔ جس چیز کا نام ہم نے تعلیم رکھا ہے وہ دراصل ڈگریاں ہیں جن میں مہارت حاصل کرکے لوگ مناسب روزگار حاصل کرلیتے ہیں پھر جو زیادہ دولت حاصل کرسکتا ہے وہ زیادہ کامیاب انسان خیال کیا جاتا ہے اگر اپنے ملک میں کسی مال و زر کی نظر آئے تو وہ دوسرا ملک دھارتا ہے اور وہاں سے اپنے خاندان کو پونڈز، ڈالرز، یورو، ریال اور روپیہ وغیرہ سے مالا مال کرتا رہتا ہے۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ملک و قوم کی خدمت کررہے ہیں اور ملک کے زرمبادلہ کے ذخیرہ میں اضافہ کررہے ہیں۔ بعض حضرات نے تو مال و زر کو اپنے دماغ پر اتنا حاوی کرلیا ہے کہ وہ اس کے باقاعدہ پجاری بنے ہوئے ہیں

اے زر! تو خدا نہ ہی لیکن
بخدا قاضی الحاجاتی و مشکل کشائی

اب ان ہنرمند افراد کو اسلامی نقطہ نظر سے اگر دیکھیں ان پڑھ کہیں تو دوسرا کیا کہیں گے۔ دراصل وہ تعلیم یا

ہنر جس کی بنیاد قرآن و سنت پر نہ ہو وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں بے فائدہ بلکہ نقصان دہ ہے۔ دولت کمانا اور اس کی مقدار لامحدود حد تک بڑھاتے چلے جانا بغیر اس احساس کے کہ اس کے ذرائع جائز ہیں یا ناجائز اور اس کا تصرف ٹھیک ہے یا غلط بہت ہی ضرررساں اور تباہ کن ہے۔ افراد اور اقوام کی ترقی کا راز دولت میں نہیں کردار میں ہے

سبب کچھ اور ہے جسے تو سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن بے زری سے نہیں
(علامہ اقبالؒ)

قرآن مجید میں دولت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔ مفہوم: ''لعنت ہے ایسے لگائی بجھائی کرنے والوں پر جو مال جمع کرتے ہیں اور اس کی ترقی کا حساب کرتے ہیں، اس خیال سے کہ مال انہیں ہمیشہ کی زندگی عطا کرے گا''۔

ایسے لوگوں کو سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ دنیا میں ہی حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ آخرت کا عذاب تو برحق ہے ہی۔ لگائی بجھائی کرنے والوں میں ہمارے سیاستدان بھی شامل ہیں جو اکثر ایک دوسرے کی کردار کشی کرتے رہتے ہیں۔ زبان درازی اور الزام تراشی کے تو یہ سپیشلسٹ ہیں اور دین و دنیا کی رسوائی بھی ان کا مقدر معلوم ہوتی ہے۔ لوٹ کھسوٹ کے بھی یہ ماہر ہیں اور اسراف و تبذیر کے بھی دلدادہ ہیں۔ قرآن حکیم نے ایسے لوگوں کو سخت ناپسند فرمایا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے۔ مفہوم: ''یقیناً فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے''۔

فضول خرچی کفرانِ نعمت ہے اور ایسا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے سخت عذاب کی وعید سنائی ہے۔ ہمارے اکثر حکمران ناجائز ذرائع سے مال بنانے اور اسے فضول خرچ کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ہمارے ایک وزیراعظم نے اپنے ایک سیاسی حریف جو درپردہ دوستانہ حلیف ہے کو ساتھ ملانے کے لئے دعوت کی جس میں اکانوے قسم کے کھانے پکائے گئے اور وہ میزبان کو ڈنک مار کر بیرونِ ملک براجمان ہے۔ اس قسم کی عظیم الشان اور بے مقصد دعوت تو شیطان سے بھی آگے نکلنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ سچ فرمایا تھا حکیم الامت نے:

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

ہمارے یہ وزیراعظم عرصہ دراز تک حجاز مقدس میں براجمان رہے۔ انہوں نے کئی حج ادا کئے اور عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کا تو شمار ہی نہیں۔ کئی دفعہ پیش نماز کا فریضہ بھی ادا کیا۔ بقول محترم گوہر ایوب وہ شاندار انداز میں تلاوت قرآن کرتے ہیں جو کسی بھی عالم دین سے کم نہیں۔ شاید جناب نے سورہ بنی اسرائیل کی مذکور بالا آیت پڑھی نہیں یا اس کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ ہر صورت میں یہ کوتاہی ناقابل برداشت ہے۔ شاید ان کو اس بات کا احساس نہیں کہ کتنی بڑی لاپرواہی ہے جس کا خمیازہ وہ پہلے بھی کئی دفعہ بھگت چکے ہیں۔ آج کل پھر انگریزی محاورے کے مطابق ہاٹ واٹر میں ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ کسی وقت بھی گہرے اور طویل غوطہ کی نذر ہو سکتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں لیکن ایک بنیادی وجہ اسراف و تبذیر ہے جو شیطان سے بھائی چارے کا شاخسانہ ہے اور اسلامی تعلیمات سے عدم توجہی کی بناء پر ہے۔ اسلامی علوم کو اہمیت نہ دینا ایک مسلم فرد اور مملکت کے لئے بہت ہی نقصان کا باعث ہے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
ہم خوار ہوئے ہیں تارکِ قرآں ہو کر
(علامہ اقبالؒ)

تحریک پاکستان اور تشکیل پاکستان کے دوران ہمارے بزرگوں نے یہ بات نظرانداز کردی کہ پاکستان تو اسلام کے نام پہ حاصل کیا جارہا تھا اور راہنما ان خواتین و حضرات کو بنالیا گیا جو قرآن وسنت کی تعلیمات سے بے بہرہ تھے۔ وہ لیڈر مغربی تہذیب اور تعلیم سے شغف رکھتے تھے۔ اب ایسے لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اس ملک میں خلفائے راشدین والا نظام نافذ کریں گے اسے حد سے زیادہ خوش فہمی ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ مسلم لیگ کے پہلے صدر سر آغا خان تھے جو دنیا کے سب سے بڑے سرمایہ دار تھے اور ان کے عقائد بھی خلفائے راشدین کے حق میں اچھے نہیں تھے۔ مسلم لیگ کے اکثر راہنما بڑے بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار تھے جن کے لئے اسلامی نظام حکومت کسی طرح بھی مفید نہیں تھا۔

علامہ مشرقی جیسے جدید وقدیم اور اسلامی علوم کے ماہرین کے خلاف سازشیں کر کے اُن کو مسلم لیگ سے بدظن کیا گیا۔ سرمایہ پرست اور علم دشمن لوگوں کو آگے لایا گیا جنہوں نے اسلام کو نعرے کے طور پر استعمال کیا اور عملی طور پر سیکولرازم اور جمہوریت کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب اسلامی تعلیمات کی کمی بلکہ فقدان کا نتیجہ تھا کہ عوام نے اندھے جذبات کا مظاہرہ کیا اور عوام نے ایسے راہنماؤں کو اپنے اوپر مسلط کرلیا جنہوں نے اسلام کے نام پر قوم کو دھوکا دیا اور ایسے نامکمل پاکستان پر اکتفا کیا جس کا بڑا حصہ اس کے دوسرے حصے اور مرکز سے ایک ہزار میل دور دشمن ملک میں گھرا ہوا تھا اور اس تک پہنچنے کا کوئی زمینی راستہ ہی نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہوگیا اور ہمیں ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اس سانحے کے کئی اسباب تھے لیکن سب سے بڑا

مملکت اور قائد عوام اکثر نشے میں دھت رہتے تھے اور بنگلہ بندھو قبل از وقت ہی اقتدار کے نشے میں من مانی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان تین عظیم ذمہ داروں نے انتہائی غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا جس کی بنیادی وجہ قرآن وسنت سے عدم واقفیت اور اس پر عملدرآمد میں انتہائی کوتاہی کا مظاہرہ تھا۔ اگر ان کو علم ہوتا کہ حضورؐ نے اس انگور کی بیٹی کو ام الخبائث قرار دیا ہے اور قرآن حکیم نے اسے ناپاک شیطانی عمل قرار دیا ہے تو وہ اس انتقال اقتدار کے نازک موقع پر اتنی لاپروائی اور خرمستی کا مظاہرہ نہ کرتے۔ قرآن مجید میں بڑے واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مفہوم: ''اللہ تعالیٰ یہ حکم فرماتے ہیں کہ امانتیں اہل لوگوں کے سپرد کرو اور جب فیصلے کرو تو عدل کے ساتھ کرو''۔ ملکی حکومت سب سے بڑی امانت ہے۔

اگر ہمارے عوام کو قرآن وسنت کا کچھ علم ہوتا تو وہ کبھی عیاش اور خودغرض افراد کو ملک وملت پر مسلط نہ کرتے۔ اگر لیڈران کرام کو اسلامی علوم کی کچھ شد بد ہوتی تو وہ کبھی ایسی بھاری ذمہ داری کو قبول کرنے کی تگ ودو نہ کرتے۔

جس چکر بازی سے انہوں نے اقتدار حاصل کیا اور عملی طور پر نااہلیت کا جو ثبوت دیا اس کی وجہ سے ان تینوں کا انجام دنیا میں ہی عبرتناک ہوا۔ آخرت میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا اس کا ہم صرف تصور ہی کرسکتے ہیں۔ اندرا گاندھی اور روس نے اس سلسلہ میں جو گھناؤنا کردار ادا کیا اس کی وجہ سے ان کا انجام بھی شرمناک ہوا۔ امریکہ کے بھی حصے بخرے ہو کر رہیں گے۔ اس کی کئی سٹیٹس نے علیحدگی کا عندیہ دے دیا ہے۔ بہرحال اسلام کا نام غلط طور پر استعمال کرنے والوں اور ان کے معاونوں کا حشر انتہائی افسوسناک ہے۔

یہ تو تشکیل پاکستان سے ربع صدی بعد کے

دلدادہ تھے۔ ہماری پارلیمنٹ جس میں زیادہ تر جاگیردار بھرے ہوئے تھے ان میں سے کسی نے اس بات پر احتجاج نہیں کیا کہ یہ اعلان کہ پاکستان میں سیاسی طور پر کوئی مسلمان، مسلمان نہیں رہے گا اور ہندو، ہندو نہیں رہے گا۔ سب برابر کے پاکستانی ہوں گے۔ یہ تو صریحاً سیکولرازم ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا سسٹم تو بھارت میں بھی ہے پھر اس سے علیحدہ ہونے کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ انتقال آبادی کے سلسلہ میں بدانتظامی کی وجہ سے جو جانی و مالی نقصان ہوا اور جس بے حسی کا مظاہرہ کیا گیا اس کا ذمہ دار کون ہے۔

قائداعظمؒ کو ان کی انتہائی کمزور صحت کے باوجود گورنر جنرل اور پارلیمنٹ کا صدر بنا دیا گیا۔ پھر ان کی بے کسی کی حالت میں وفات کے بعد وزیراعظم نے تمام اختیارات خود سنبھال لئے اور قائداعظمؒ کے خصوصی معتمد ساتھیوں کو اعلیٰ عہدوں سے ناجائز حربوں سے برطرف کرنا شروع کر دیا۔ اگر ان میں اسلامی علم و کردار کا شائبہ بھی ہوتا تو وہ اس قسم کی حرکات کے مرتکب نہ ہوتے بلکہ قائد کے ساتھیوں کے ساتھ عزت سے پیش آتے اور اقتدار کے سلسلہ میں ان کے بنائے ہوئے اصولوں کی پابندی کرتے۔ جناب قائد ملت نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے دھونس، دھاندلی اور جھرلو کا اس انداز سے مظاہرہ کیا کہ اسلامی اصولوں کی پابندی تو بہت دور کی بات ہے، وہ تو معاشرتی قدروں کو بھی پامال کرنے لگے۔ اس کی وجہ سے اپنے ساتھی ان سے بدظن ہو گئے اور کسی نامعلوم سازش کے تحت وہ قائد ملت سے شہید ملت بن گئے۔

اب باقی حکمرانوں نے بھی اسلامی اصولوں سے عدم واقفیت کی بنا پر فرنگیوں والی ابلیسی چالیں چلنا

قیادت کا فیصلہ پارلیمنٹ کو کرنا چاہئے تھا لیکن طاقتور اور ہوشیار وزیرخزانہ نے خود ہی کابینہ کا اجلاس طلب کر لیا۔ وہ خود گورنر جنرل بن گئے اور گورنر جنرل کو وزیراعظم بنا دیا حالانکہ اقدامات غیر قانونی تھے۔ سیاستدان کیونکہ بہت زیادہ بدعنوان تھے لہٰذا کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد ملک نے اپنی مرضی کا وزیرخزانہ چوہدری محمد علی کو بنا لیا۔ جب جی چاہتا وزیراعظم کو ڈسمس کرتا اور کسی کو بھی اس گدی پہ بٹھا دیتا۔ سیاستدان اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے کیونکہ اس نے آرمی چیف کو وزیر دفاع بنایا ہوا تھا اور جنرل (ر) سکندر مرزا کو وزیر داخلہ بنا دیا تھا۔ اب پوری سول و ملٹری اسٹیبلشمنٹ اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر مفلوج ہو چکا تھا لیکن ذہنی طور پر بہت الرٹ تھا۔ جو لیڈر بھی اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات کرتا اسے گندی گالیاں دیتا۔ اگرچہ وہ عملی طور پر بہت ایماندار تھا لیکن اگر اسے اسلامی علوم پر بھی کچھ دسترس ہوتی تو کبھی بداخلاقی کا مظاہرہ نہ کرتا۔ حضور کے ارشاد کے مطابق گالی گلوچ کرنا منافق کی نشانی ہے۔ پارلیمنٹ نے گورنر جنرل کے اختیارات پر پابندی لگانے کا بل پاس کیا تو اس نے پارلیمنٹ ہی ختم کر دی اور بالواسطہ طور پر نئی پارلیمنٹ بنائی۔ سپریم کورٹ نے بھی نظریہ ضرورت کے تحت اس کو جائز قرار دیا۔

جب گورنر جنرل کی من مانیاں اور لن ترانیاں حد سے بڑھ گئیں اور ہر کسی پر گالیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی تو اس کے معتمد خصوصی نے جو اس کا بنایا ہوا وزیرخزانہ تھا، اس کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دھوکے سے اس کی طویل رخصت اور جنرل (ر) سکندر مرزا کو قائم مقام گورنر جنرل تعینات کرنے کے لیٹر پر دستخط کرا لئے۔ حیرت کی بات ہے کہ تقریباً ایک سال تک اسے

بیٹھا رہتا تھا اور اس کو کچھ دفتری امور سے بھی آگاہ کیا جاتا تھا اور قائم مقام گورنر جنرل عقبی دروازے سے دفتر میں داخل ہوتا تاکہ اصلی گورنر جنرل کو پتہ نہ چل سکے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سربراہ کے ساتھ یہ فراڈ حیرت انگیز اور اخلاقی دیوالیہ پن کا نقطۂ عروج ہے۔

چوہدری محمد علی اگرچہ بڑے قابل، نیک، پرہیزگار اور تہجد گزار قسم کے انسان تھے لیکن قرآن و سنت کی حقیقی تعلیمات سے نابلد معلوم ہوتے تھے اس لئے اس قسم کی سیاسی سازشوں کو برا نہیں گردانتے تھے۔ اسی عظیم الشان سازش کے صلے میں سکندر مرزا نے انہیں وزیراعظم بنا دیا۔ بعدازاں یہ فرنگی نظام کے پروردہ لوگ پاکستان کو سیاسی سازشوں کی آماجگاہ بنانے میں اسی قسم کا کردار ادا کرتے رہے۔ علماء کرام مختلف انداز میں ایسے سیاستدانوں کو متنبہ کرتے رہے لیکن ان پر پاکستان دشمنی کا لیبل لگ چکا تھا اور عوام بھی تعلیم کی کمی اور جذباتی پن کی بناء پر چکر باز سیاستدانوں کے چکروں میں پھنسے رہے۔

پاکستان سیاستدانوں کی خودغرضی، سازشوں اور آئے دن کی بے مقصد سیاسی اور انتظامی اکھاڑ پچھاڑ کی بناء پر مختلف قسم کے مسائل کا گڑھ بن چکا تھا تو گیارہ سال کی بدنظمی کے بعد فوج نے ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ جنرل ایوب خاں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور بعدازاں صدر مملکت کے عہدہ پر بھی براجمان ہو گئے۔ انہوں نے ملک میں امن وامان قائم کیا اور ہر شعبے میں دوررس اصلاحات کیں۔ انہوں نے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور سیاستدانوں کو سات سال کے لئے نااہل اور بدعنوان قرار دے کر ان پہ پابندی لگا دی، ملک کو نیا آئین دیا اور مقامی حکومتوں کے ذریعے عوام کے مسائل نچلی سطح پر حل ہونے لگے لیکن یہ بات بعض علماء اور سیاستدانوں کو پسند نہ آئی اور وہ اسلامی جمہوریت کا رونا

وک گئے

بڑا گرم بازار سی زندگی دا
ایتھے جو آئے میری جان وک گئے
وک گئے ایتھے جوبن یوسفاں دے
ایتھے بڑے فرعوناں دے مان وک گئے
ایتھے داج وِکے مُڑ عاجزی دے
ایتھے کفر دے پاد ایمان وک گئے
ایناں زور پیا آن گاہکاں دا
مالک آپی سنے دکان وک گئے

صوفی تبسم — مرسلہ: عبدالرحمٰن۔ لاہور

روتے رہے۔ ان پر صدر پاکستان نے اسلامی نظام کے دعویداروں کو یہ دعوت دی کہ سب مل کر متفقہ آئین بنا کر لائیں تو صدر مملکت اس کو منظور کر کے ملک میں نافذ کر دیں گے لیکن کیونکہ سیاستدان اسلامی علوم سے نابلد تھے اور علماء جدید تقاضوں سے آگاہ نہیں تھے اس لئے کسی نے اس پیشکش پر توجہ نہ دی اور یہی واویلا کرتے رہے کہ حکومت اسلامی نظام کے نفاذ میں مخلص نہیں۔

صدر مملکت نے ایک اور کوشش کی کہ اسلامی نظام کے سلسلہ میں سب سے زیادہ فعال دینی و سیاسی جماعت، جماعت اسلامی کے سربراہ جناب سید ابوالاعلیٰ مودودی کو دعوت دی کہ وہ رنگا رنگ بے شمار سیاسی جماعتوں کی موجودہ گندی سیاست سے اجتناب کرتے ہوئے قوم کے نوجوانوں کو اسلامی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے لئے ایک خودمختار اسلامی یونیورسٹی بنائیں جس کے لئے حکومت ان سے بھرپور مالی تعاون کرے گی اور یونیورسٹی کے انتظامی امور میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی لیکن سید صاحب نے اس عظیم الشان پیشکش کو

حقارت اور طنزیہ انداز میں ٹھکرا دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ
سیاسی میدان میں رہ کر سیاست کے گند کو صاف کریں
گے۔ اگر سید صاحب اس آفر کو قبول کر لیتے تو صدر
مملکت جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی کو تیرہ ہزار ایکڑ زمین
بہترین علاقے میں الاٹ کی تھی وہ اسلامی یونیورسٹی کے
لئے بھی ہزاروں ایکڑ جگہ اور کروڑوں کے فنڈز دے سکتے
تھے۔ سید صاحب جدید وقدیم [illegible] علاوہ کافی انتظامی
امور کے ماہر تھے اگر وہ اس وقت اسلامی یونیورسٹی کا کام
شروع کر دیتے تو آج نصف صدی کے بعد لاکھوں جدید
وقدیم علوم کے ذہین اور قابل ماہرین ملک میں موجود
ہوتے اور ہر شعبہ حکومت میں معاملات اسلامی تعلیمات
کے مطابق چلا رہے ہوتے لیکن سید صاحب نے اپنی اعلیٰ
مہارتیں مختلف فروعی امور کے سلسلہ میں حکومتوں سے محاذ
آرائی میں ضائع کر دیں اور کوئی قابل قدر سیاسی یا دینی
کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ ان کا لٹریچر بے شک جامع
اور قابل قدر ہے لیکن ان کے جانشین زیادہ تر اسلامی
تعلیمات سے کماحقہ ماہر نہیں ہیں اس لئے زیادہ تر
سمجھوتوں کی سیاست کر رہے ہیں۔ کبھی ولی خان جیسے
سیکولر سیاستدانوں سے مل کر قومی اتحاد تشکیل دیتے ہیں
اور عمران جیسے اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ لوگوں کے
ساتھ مل کر حکومت بناتے ہیں۔ کبھی (ن) لیگ اور (ق)
لیگ جیسے سرمایہ پرستوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔
قائد عوام کا نام نہاد اسلامی آئین بنانے کے لئے بھی ان
کی مدد بہت اہم ثابت ہوئی۔ اس طرح ایک سیکولر اور
ناقابل عمل آئین پر اسلامی لیبل لگا کر سیکولرازم اور اسلام
دونوں کو بدنام کیا گیا۔ اس قسم کی دوغلی پالیسی اختیار کر
کے ملک وملت کو بہت نقصان پہنچایا گیا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانِ حق و باطل نہ کر قبول

اب اگر ملک کے مسائل کو حل کرنا ہے تو خالص
اسلامی تعلیم کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ اسلامی آئین کی
تشکیل اور اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کے لئے ایسے
ذہین اور قابل افراد کی ضرورت ہے جو جدید علوم اور
اسلامی تعلیمات پر مناسب عبور رکھتے ہیں اور اسلامی
اخلاق وکردار کے سلسلہ میں اعلیٰ معیار کے حامل ہوں۔
ہمارے ہاں اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ جو نوجوان
اعلیٰ صلاحیتوں اور بہترین ذہانت کے حامل ہوتے ہیں وہ
ڈاکٹر یا انجینئر بن جاتے ہیں۔ ان سے ذرا کمتر معیار کے
افراد فوج میں کمیشن حاصل کر لیتے ہیں یا مقابلے کے
امتحانات پاس کر کے انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو
جاتے ہیں اور پہلی قسم کے لوگوں پر فوقیت حاصل کر لیتے
ہیں۔ جو معمولی قسم کی ذہانت کے حامل ہوتے ہیں وہ
استاد یا وکیل بن جاتے ہیں اور جن کی وکالت کامیاب نہ
ہو وہ جج بن جاتے ہیں۔ جو لوگ جدید تعلیم کے بالکل اہل
نہیں ہوں وہ مذہبی مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر ہمارے
دینی پیشوا بن جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ایسا پیشہ ور
طبقہ بھی پایا جاتا ہے جو دینی ودنیوی ہر قسم کی تعلیم کے لئے
نااہل ہوتا ہے وہ مختلف امتحانات میں بُری طرح ناکام ہو
کر اپنی چرب زبانی، ناجائز دولت اور دھونس دھاندلی میں
مہارت حاصل کر کے سیاستدان بن جاتا ہے اور ہر قسم
کے ذہین، قابل، اعلیٰ تعلیم وتربیت یافتہ اور مختلف شعبوں
کے ماہرین کے سروں پر سوار ہو جاتا ہے۔ سیاستدان
دراصل فرنگی ابلیسی نظام کی پیداوار ہیں جو ہر قسم کے
حکمرانوں کی کاسہ لیسی اور چاپلوسی کے ماہر ہیں۔ یہ لوگ
دوسرے درجہ کی حکومت پر قناعت کرتے ہیں۔ پرلے
درجے کے جاہل اور گنوار ہوتے ہیں باہم الزام تراشی اور
بدکلامی کے ماہر ہوتے ہیں اور ہر شعبہ میں دخل اندازی
کے دلدادہ ہوتے ہیں اور کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اپنے
آپ کو ہرفن مولا گردانتے ہیں۔

ہر کس کو نداند و بداند کہ او داند

ابد الدہر جاہل مرکب بماند!

یعنی جو شخص نہیں جانتا اور سمجھتا ہے کہ وہ جانتا ہے وہ ابد تک جاہل مرکب رہتا ہے۔ ایسا شخص نا قابل اصلاح ہے۔ یہ وطیرہ ہمارے سیاستدانوں کا ہے جو ہر لحاظ سے نااہل ہوتے ہیں لیکن چالاکی اور چاپلوسی کی بدولت اقتدار کے ایوانوں میں براجمان رہتے ہیں۔ یہ لوگ نسل در نسل مختلف حکمرانوں کی غلامی کرتے چلے آ رہے ہیں اور کسی قسم کی تبدیلی یا انقلاب سے سخت مخالف ہوتے ہیں۔

ایں غلام ابن غلام ابن غلام

حریت اندیشہ اور احرام

جب تک پاکستان میں ایسے جہلاء اور غلامانہ ذہنیت کے حامل سیاستدانوں سے نجات حاصل نہیں ہوتی ملک خوشحالی اور ترقی کی طرف گامزن نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ کوئی اچھا کام کرنے کی صلاحیت تو نہیں رکھتے لیکن مراعات حاصل کرنے اور ملکی دولت کو لوٹنے کے ماہر ہیں۔ ملکی حفاظت اور فلاح و بہبود کے کام تو سول اور ملٹری افسران کرتے ہیں اور افراتفری مچانے کے لئے یہ ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ لوگ مختلف اداروں کو بدعنوان بنانے اور تباہ و برباد کرنے پہ تلے بیٹھے ہیں۔ صرف افواجِ پاکستان ان کی دست برد سے محفوظ ہیں۔ اس سلسلہ میں ملک غلام محمد، جنرل سکندر مرزا اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے ان کے کالے کرتوت کا بہت قریب سے جائزہ لیا اور ان کے محاسبے کی وجہ سے سیاستدان فوج سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اگر ان کو فوج کا خوف نہ ہو تو یہ پاکستان کو بیچ کھائیں اور خود دوسرے ملکوں میں سدھاریں جہاں ان کی سیاہ دولت جمع ہے۔

موجودہ آرمی چیف نے سیاستدانوں کے بکھیرے ہوئے کانٹے بڑی محنت اور قربانیوں کے ساتھ صاف کئے

ہیں۔ مختلف اداروں کو بھی یہ ہمت حاصل ہوتی ہے کہ وہ بدعنوان سیاستدانوں کے گرد گھیرا تنگ کریں اور بڑے بڑے مگرمچھوں کی گردنیں ناپیں۔ جنرل حمید گل نے یہ مشورہ دیا ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے آئین کو ایک طرف رکھیں اور فوج براہ راست ملکی اصلاح اور ترقی کا کام اپنے ہاتھ میں لے۔ پیر پگاڑا مرحوم کے ایک بیان کے مطابق یہ عرصہ پچاس سال پہ محیط ہونا چاہئے۔ بدعنوان سیاستدانوں کا ایسا سخت محاسبہ ہونا چاہئے کہ ان کی آئندہ نسلیں اس طرف رخ نہ کریں۔

اصلاح احوال کے لئے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست کرنا بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں موجودہ وزیراعظم صاحب نے اردو کو قومی زبان بنانے کا آرڈر تو کردیا ہے لیکن اس پر عملدرآمد مشکل نظر آتا ہے۔ اگر آرمی چیف چاہیں تو نہ صرف اردو قومی زبان بن سکتی ہے بلکہ انگلش میڈیم تعلیمی اداروں کو ختم کر کے اردو میڈیم والوں کا معیار بلند کیا جا سکتا ہے۔ عربی زبان کی تعلیم کا بھی مناسب بندوبست ہونا چاہئے تاکہ میٹرک پاس کرنے والے نوجوان عربی زبان میں مناسب حد تک مہارت حاصل کر سکیں۔ بی اے تک عربی لازمی اور انگریزی اختیاری ہونی چاہئے۔ مقابلے کے تمام امتحانات میں مکمل قرآن حکیم اور حدیث وفقہ کا معتد بہ حصہ شامل ہونا ضروری ہے تاکہ ہر شعبہ کے افسران اسلامی تعلیمات کا معقول حد تک مطالعہ کریں۔ مختلف سول اور ملٹری اکیڈمیز میں اسلامی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ انتظام لازمی ہے۔ اگر افسران اس سلسلہ میں مثالی کردار ادا کریں تو عوام خودبخود اسلام کی طرف راغب ہوں گے۔ مختلف سطحوں پر اسلامیات کے اساتذہ مدینہ یونیورسٹی اور جامع ازہر سے فارغ التحصیل ہونے ضروری ہیں تاکہ وہ فرقہ واریت سے بلند و بالا رہیں اور جدید تعلیم کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تشریح و تفسیر کا اعلیٰ معیار قائم کریں۔ اگر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد اپنے کیمپس پشاور، لاہور، کوئٹہ اور کراچی میں قائم کرے تو وہاں مختلف محکموں کے افسران کی ایک سال کا تعلیم و تربیت کا مناسب بندوبست کیا جا سکتا ہے۔

بظاہر تو یہ بہت مشکل نظر آتا ہے کہ مختلف محکموں کے لئے منتخب کئے جانے والے سائنس اور آرٹس کے گریجوایٹ یا پوسٹ گریجوایٹ نوجوانوں کو قرآن و حدیث اور فقہ پر عبور حاصل ہو جائے لیکن اگر بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ کام کافی آسان ہو جائے گا۔ قرآن حکیم میں دیئے گئے بنیادی اصول تو بہت تھوڑے ہیں اگر ان کو سمجھنے کے لئے ہر اصول کے متعلق دو یا تین آیات یاد کر لی جائیں تو باقی ان کی تشریحات اور تاریخی واقعات آسانی سے ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر روزانہ دو احادیث کا بھی مطالعہ کیا جائے تو ایک سال کے اندر تقریباً پانچ صد احادیث یاد ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح ''آسان فقہ'' کے نام سے ایک مختصر سی کتاب بازار میں دستیاب ہے جو بہت جامع ہے اور روزمرہ کے مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے بے شمار مسائل بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ پھر جب عملی زندگی میں ان کا نفاذ ہوگا تو مختلف مسائل بار بار سامنے آئیں گے تو بہت جلد ذہن میں محفوظ ہو جائیں گے۔ مختلف محکموں کے افسران بہت ذہین اور قابل ہوتے ہیں اس لئے ان کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہیں۔ چند ہی سالوں میں وہ نہ صرف خود ان پر عبور حاصل کر لیں گے بلکہ دوسروں کی بھی راہنمائی کر سکیں گے۔ اسلامی تعلیمات بہت جامع، دلچسپ اور حالات حاضرہ کے مختلف مسائل کا مناسب حل بیان کرتی ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت پُرلطف اور ان پر عملدرآمد دینی و دنیوی کامیابی کا ضامن ثابت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان پر عملدرآمد کی توفیق فرمائے۔

***

اردو ادب کے نامور قلمکار ممتاز مفتی کی خصوصی تحریر

پاکستان
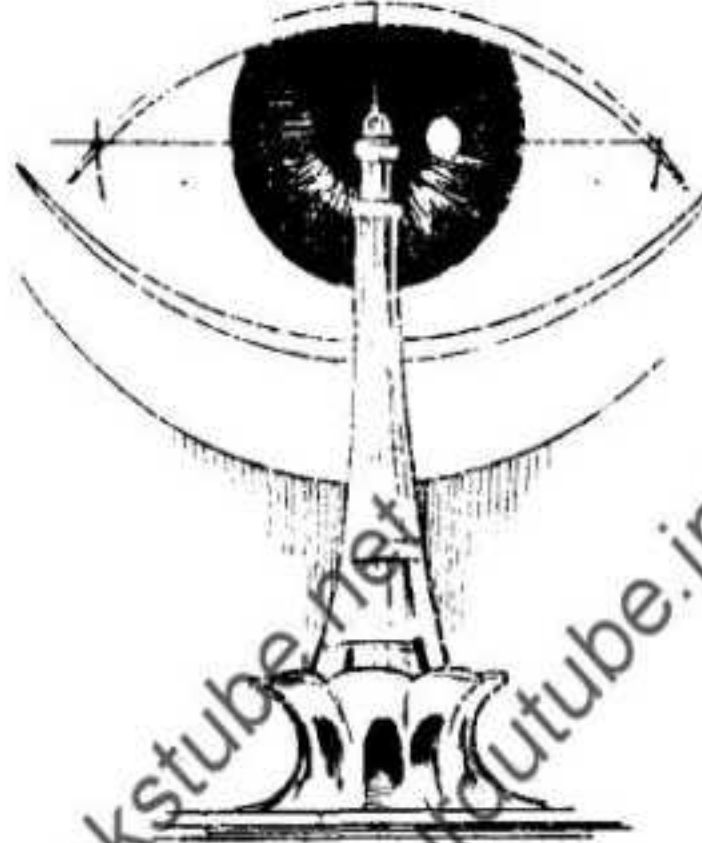
مفتی جی اللہ کا کام اللہ کے لئے چھوڑ دو۔ اللہ کا کام اپنے ذمے نہ لو۔ پاکستان کا فکر کرنے والے آپ کون ہیں جی۔ آپ اپنی سوچیے، اپنے فکر کھائیے۔ واہ مفتی جی اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ سکے۔

☆ ممتاز مفتی

انتخاب: دستگیر شہزاد

سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس موضوع پر کیوں لکھ رہا ہوں...... لیکن...... یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ آج تک میں نے اس موضوع پر کیوں نہیں لکھا۔ جبکہ کئی ایک سال سے یہ موضوع میرے کندھوں پر جزیرے کے بڈھے کی طرح سوار ہے جبکہ عرصہ سے میں ایک ویران گھر کی مصداق ہوں...... آسیب زدہ گھر...... آسیب پاکستان ہے۔

میرے لئے پاکستان ایک معمہ ہے، ایک پُراسرار سایہ ہے۔ پاکستان کے شانے پر کس کا پُراسرار ہاتھ ہے، پاکستان کی ناؤ کو کون کھے رہا ہے، پاکستان کی باگ کس کے ہاتھ ہے، کس کے ہاتھ میں...... کیوں؟ بیٹھے بٹھائے میں محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے ساتھ ایک چوتھی سمت ملحق ہے۔ پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ میرے دل میں سوال اٹھتا ہے...... پاکستان کیا ہے؟ اسے کیا خصوصیت حاصل ہے؟ کیوں خصوصیت حاصل ہے؟ اس کے ساتھ چوتھی سمت کیوں وابستہ ہے...... کیوں؟......

میرے کسی سوال کا آج تک جواب نہیں ملا۔ دور بہت دور ایک مبہم مسکراہٹ، پُراسرار مسکراہٹ، طنز بھری مسکراہٹ اور بس...... خوف کی ہلکی ہلکی لہریں چاروں طرف سے اٹھتی ہیں۔ میری طرف بڑھتی ہیں، ایک

گرداب بن جاتی ہیں اور میں ڈوبنے لگتا ہوں۔ ڈوبے جاتا ہوں۔ ہاں مجھے پاکستان سے ڈر آتا ہے۔

لیکن آخر میں اس موضوع پر کیوں لکھ رہا ہوں، کیسے لکھ سکتا ہوں۔ آپ اس موضوع پر لکھ سکتے ہیں جس سے آپ دور کھڑے ہوں، جس کا آپ احاطہ کر سکیں لیکن اگر آپ کسی موضوع میں ڈوب چکے ہیں تو آپ اس پر کیسے لکھ سکتے ہیں۔ کنارے پر کھڑے ہو کر آپ جھیل کو دیکھ سکتے ہیں لیکن اگر آپ جھیل میں ڈوب رہے ہیں تو آپ جھیل کو دیکھ نہیں سکتے۔ نہیں اس موضوع پر لکھنا میرے بس کا روگ نہیں۔ عجز کا احساس مجھے شل کر رہا ہے اگر میں دو ایک جھلکیاں دکھانے میں کامیاب ہو ہی جاؤں تو بھی بےکار ہے، آپ میری بات کو سنیں گے مگر نہیں سنیں گے، سمجھیں گے مگر نہیں سمجھیں گے۔

میں نے اپنے قریبی دوستوں سے اس موضوع پر بات کر دیکھی ہے، وہ بات غور سے سنتے ہیں، اثر سے بھیگ جاتے ہیں لیکن صرف ایک ساعت کے لئے۔ دوسری ساعت میں ان کے پر یوں خشک ہو جاتے ہیں جیسے کبھی بھیگے ہی نہ تھے، جیسے انہوں نے میری بات کہی ہی نہ ہو۔ ان کا رویہ دیکھ کر مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ آپ راز سے پردہ اٹھا سکتے ہیں لیکن راز فاش نہیں کر سکتے۔ آپ شمع جلا سکتے ہیں لیکن اندھیرا دور نہیں کر سکتے، آپ راز سے پردہ اٹھائیں گے نا! دیکھنے والے کی آنکھ سے پردہ کون اٹھائے گا؟ معلوم ہوتا ہے افشائے راز کو وقت سے تعلق ہے۔ کون سا وقت، کیسا وقت، وہ وقت کب آئے گا، کب؟

چھوڑیئے، یہ تحریر بالکل بےکار ہے۔ جسے خود کچھ علم نہیں، جو خود نہیں جانتا وہ بتائے گا کیا، لکھے گا کیا؟ جس پر خود بھید آشکار نہیں، وہ کیسے پردہ اٹھائے گا؟ کس حقیقت پر سے پردہ اٹھائے گا؟ عبث ہے، یہ تحریر بالکل عبث ہے لیکن اس کے باوجود میں اس موضوع پر لکھنے پر مجبور ہوں۔

جس زمانے میں پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد ہو رہی تھی ان دنوں میرے دل میں پاکستان کے لئے کوئی جذبہ نہ تھا، نہ مثبت نہ منفی۔ میرے لئے پاکستان کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا، سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسلمان الگ ملک کیوں مانگ رہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسلمانوں کے اس مطالبے پر ہندو کیوں چراغ پا ہوتے ہیں؟ حصول پاکستان کی جدوجہد میرے لئے ایک ایسا ڈرامہ تھا جو سامنے مگر دور، بہت دور کھیلا جا رہا تھا۔ اس ڈرامے کو میرے جذبات سے کوئی تعلق نہ تھا، ایسے ہی جیسے کسی چیز کو آپ دیکھتے ہیں، اس پر سوچتے ہیں، ذہنی طور پر اسے سمجھتے بھی ہیں لیکن وہ آپ کی زندگی کا جزو نہیں بنتی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اسلامی جذبے سے قطعی طور پر کورا تھا۔

اسی دور کی بات ہے، میرا ایک دوست مجید تھا۔ تھا تو معترض، لیکن قیام پاکستان کی جدوجہد میں پیش پیش تھا۔ ایک روز میں نے مجید سے پوچھا۔ بھئی سمجھ میں نہیں آتا کہ قیام پاکستان کے لئے تم اتنے دھی کیوں ہو رہے ہو؟

مجید ہنسا، بولا۔ ظاہر ہے۔

میں نے کہا ظاہر تو کچھ بھی نہیں۔

بولا۔ بھئی، اس لئے کہ میں مسلمان ہوں۔

اس پر میری ہنسی نکل گئی، میں نے کہا۔ بھائی میرے نہ تم نماز پڑھتے ہو، نہ روزہ رکھتے ہو، نہ تمہارے رہن سہن میں اسلامی جھلک ہے پھر تم مسلمان کیسے ہوئے؟

مجید نے کہا۔ اس طرح کہ اگر میں گھر سے باہر نکلوں، دیکھوں کہ بازار میں ایک ہندو اور مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں۔ تو میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ بات کیا ہے؟ یہ نہیں سوچوں گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ یا

قصور کس کا ہے؟ پوچھے بغیر میں ہندو کو پیٹنا شروع کر دوں گا، مسلمان ہونے کی یہی تو ایک نشانی ہے اور میں تو بھئی خالی مسلمان نہیں بلکہ پکا مسلمان ہوں...... پکا۔

کیا مطلب؟ میں نے پوچھا۔

ایک ساعت کے لئے اس نے سوچا پھر بولا۔ مثلاً اگر ابھی اس کمرے کی چھت پھٹ جائے اور اوپر سے ایک تخت اتر آئے، تخت پر ایک فرشتہ بیٹھا ہو، فرشتہ مجھ سے کہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ فرمایا ہے کہ جاؤ مجید پر اس حقیقت کا انکشاف کر دو کہ اسلام سچا مذہب نہیں ہے۔ تو میں فرشتے کو جواب دوں گا کہ اللہ تعالیٰ سے میرا اسلام کہنا اور عرض کرنا کہ حضور کا پیغام مل گیا، شکریہ! لیکن مجید مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔

مجید کی اس بات نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ کئی روز میں گہری سوچ میں پڑا رہا۔ شاید بنیادی طور پر مذہب جذبے ہی کا نام ہے۔ اس کے باوجود میرے دل میں جذبہ پیدا نہ ہوا۔ نہ اسلام کے لئے نہ پاکستان کے لئے۔

پاکستان کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے جب چھرا بازی کے واقعات عام ہو گئے تھے۔ میں بمبئی میں مقیم تھا۔ ان تشدد بھرے واقعات کو دیکھ کر مجھے ہندوؤں پر غصہ آنے لگا۔ آخر قیام پاکستان پر وہ اس قدر مشتعل کیوں ہو رہے تھے۔ کیوں تشدد پر تلے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر اور گلیوں میں نہتے راہ گیروں کو خنجر مارنے سے کیا پاکستان کے قیام کو روکا جا سکتا ہے۔ پاکستان میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

انہی دنوں بمبئی کی سٹیج پر پاکستان کے قیام کے خلاف کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ان کھیلوں کے روح رواں پرتھوی راج تھے۔ پرتھوی راج کو میں ایک عظیم فنکار سمجھتا ہوں۔ ان دنوں بھی میرے دل میں ان کے لئے بے پناہ عزت تھی۔ ایک روز میں کھیل دیکھنے گیا۔ پیشکش اعلیٰ تھی، اداکاری عمدہ تھی لیکن پراپیگنڈہ بھونڈا تھا۔ کھیل ختم ہوا تو تھیٹر کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے تماشائیوں کے باہر نکلنے کے لئے ایک خصوصی راستہ کھولا گیا۔ یہ راستہ ایک تنگ اور گھومتی ہوئی گلی پر مشتمل تھا جس میں صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا، اس لئے تماشائی ایک دوسرے کے پیچھے لمبی قطار میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ گلی کے ایک فراخ گوشے میں پرتھوی راج تھیٹر والے میک اپ میں کھڑا تھا۔ اس کا سر عجز و احترام سے جھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دامن کو جھولی بنا کر تھام رکھا تھا۔ جھولی نوٹوں سے بھری ہوئی تھی جس میں چند ایک چیک بھی تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ قیام پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا کرنے کے لئے ''دان'' مانگ رہا تھا۔ پرتھوی راج کو عجز کی تصویر بنے دیکھ کر میرے دل میں پیار کا ایک ریلا اٹھا لیکن جھولی دیکھ کر غصہ آ گیا۔ کیا یہ شخص توقع رکھتا ہے، مجھ سے؟ جی چاہا کہ جیب سے ہاتھ نکال کر پرتھوی کو مکا دکھاؤں اور دانت پیس کر کہوں۔ ''اتنی جسارت'' لیکن طبعاً میں ایک کمزور آدمی ہوں اور محفل کے رنگ سے ہٹ کر بات کرنے سے ہچکچاتا ہوں۔ میرا ہاتھ مکا نہ بن سکا، الٹا اس نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر پرتھوی راج کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس رات غصے کی وجہ سے مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے پاکستان کے خلاف چندہ کیوں دیا، کیوں؟ میں نے پرتھوی راج کو مکا کیوں نہ دکھایا۔ اس کے بعد جب بھی خبر آتی کہ غنڈے نے راہ گیر مسلمان کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا ہے تو میں محسوس کرتا کہ وہ غنڈا میرے ان پانچ روپے کے عوض کرایہ پر لیا گیا تھا۔ میرے اس پانچ روپے کے نوٹ کی وجہ سے ایک مسلمان کا پیٹ چاک ہو گیا تھا۔ غنڈے کے چھرے کے دستے پر میرا نام کندہ تھا۔

چھرا چلانے کی وارداتیں بڑھتی گئیں۔ نفرت کے

جذبات کی وجہ سے میں غنڈوں کی طرف سے پیچھے ہٹتا گیا، پاکستان کے قریب اور قریب اور قریب۔ بھارت سے میری یہ پسپائی نفرت اور ڈر کی وجہ سے تھی جس میں نفرت کا عنصر ڈر پر غالب تھا اور یہ نفرت بھی کبھار اتنی شدت اختیار کر لیتی کہ میرا جی چاہتا بھرے بازار میں نعرہ لگاؤں۔ اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد۔

اس روز احمد بشیر اور میں بمبئی کے ایک ہندو علاقے سے گزر رہے تھے۔ ذاتی طور پر میں کبھی اس علاقے سے گزرنے کی جسارت نہ کرتا مگر میرا ساتھی احمد بشیر طبعاً خطرے سے دوچار ہونے کا دلدادہ تھا۔ وہ پیدائشی پاکستانی تھا۔ ڈر اور خوف سے بے پرواہ خطرے کا پروانہ...... وہ مجھے زبردستی ایسے مقامات پر لے جاتا تھا۔ دفعتاً ٹریفک رک گئی چوک میں ہندوؤں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ "سب پیدل چلنے والے بائیں ہاتھ کی پٹڑی پر ہو جائیں"۔ کسی نے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کیا۔ تمام لوگ پٹڑی پر اکٹھے ہو گئے اور باری باری قطار میں آگے بڑھنے لگے۔ میں نے گھبرا کر احمد بشیر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں، ہونٹوں پر تبسم تھا۔ پٹڑی پر ایک میز رکھا تھا، ایک آدمی رجسٹر سامنے رکھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، ہر راہ گیر رجسٹر پر اپنا نام اور ولدیت لکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ نام لکھنے کا مقصد مسلمانوں کو چھانٹنا ہے۔ آرتھر میں نے باآواز بلند احمد بشیر سے کہا۔ پہلے تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر سمجھ گیا۔ آرتھر یہ سب کیا ہے؟ میں نے دہرایا۔ کچھ بھی نہیں مائیکل اس نے باآواز بلند کہا اور ہنسنے لگا۔ گورنمنٹ کے نام کوئی Representation بھیجی جا رہی ہے جس پر دستخط کرا رہے ہیں۔ کیوں مسٹر اس نے ساتھ کھڑے لالہ جی سے پوچھا۔ اوکے؟

جب میں رجسٹر میں دستخط کرنے لگا تو مجھ پر ایک وحشت سی سوار ہو گئی۔ جی چاہا کہ چیخ چیخ کر کہوں۔ میں محمد ممتاز ہوں، محمد ممتاز۔ میں مسلمان ہوں، پاکستانی ہوں۔ میرے پیٹ میں چھرا بھونک دو، وہی چھرا جسے ان پانچ روپوں سے خریدا گیا ہے جو میں نے چندے کے طور پر دیئے تھے۔ میں نے پاکستان کے خلاف جرم کیا ہے، یہی میری سزا ہے۔ میں نے چیخ چیخ کر اعلان کیا لیکن میرے حلق میں آواز نہ تھی۔ کسی نے میرا اعلان نہ سنا اور میں نے چپکے سے مائیکل موفٹی ولد جان موفٹی بقلم خود رجسٹر میں لکھ دیا اور آگے چل پڑا۔

یہ سچ ہے کہ مجھ میں جرأت نہ تھی لیکن پاکستان اور میرے درمیان اب قطعی طور پر کوئی فاصلہ نہیں رہا تھا۔ پاکستان میرے جذبات میں داخل ہو چکا تھا۔ بظاہر ایک دیوار حائل تھی، جرأت کی دیوار۔

پھر جو میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا تو کسی میں بھی جرأت نہ تھی۔ کانگرس مسلمانوں اور دنیا کو دھوکا دے رہی تھی۔ پرتھوی راج اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ سب جھوٹے تھے، صرف دو افراد سچے تھے، صرف دو۔ ان میں ایک وہ شخص تھا، وہ پاکستانی جو اللہ ہو اکبر کے نعرے لگاتا تھا اور وہ غنڈہ جو مسلمان راہگیر کے پیٹ میں چھرا بھونکتا تھا اور میں...... بے شک میں بزدل تھا۔ میرا دل جذبے سے خالی تھا لیکن جھوٹا نہ تھا، نہ دوسروں کو فریب دیتا تھا نہ اپنے آپ کو۔

14 اگست 1947ء کا دن آ گیا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ پاکستان کے لئے مثبت جذبہ محسوس کیا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے، ہم ریڈیو سیٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ ریڈیو پر سگنیچر ٹیون بج رہی تھی، دف کی گمک عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی جیسے طبل جنگ بج رہا ہو اونچے سُروں میں تو تی للکار رہی تھی لیکن میرے لئے اس سگنیچر ٹیون کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ میں کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھا، دفعتاً اعلان ہوا۔ ریڈیو پاکستان...... میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی، سارے جسم پر چیونٹے

رینگنے لگے، دل میں ایک ہوائی سی چھوٹی، سارے وجود میں رنگین ستارے ناچنے لگے۔ پاکستان کے لئے یہ پہلا مثبت جذبہ تھا جس نے انجانے میں میرے بند بند کو جھلا دیا جیسے چودھویں کا چاند سوئے ہوئے سمندر کو چابک مار کر جگا دیتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد بمبئی میں شہرت اور امارت کے واضح امکانات مہمل دکھائی دینے لگے۔ ساز و سامان جس کے حصول کے لئے ہم بمبئی گئے تھے، اپنی اہمیت کھو چکا تھا لہٰذا احمد بشیر اور میں جوں توں پاکستان آ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر صرف ایک فکر دامنگیر تھا کہ اپنے عزیز و اقربا کو ضلع گورداسپور سے نکال کر پاکستان لے آئیں۔

پاکستان ہمارے لئے دارالسلام بن گیا تھا۔ پاکستان میں ہمارے لئے مسلمانوں کے لئے سلامتی تھی۔ اب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں مسلمان ہوں۔ چاہے میرے دل میں ایمان کی روشنی تھی یا نہیں، چاہے میری زندگی اسلام کے رنگ میں رنگی تھی یا نہیں، چاہے میرے قلب میں اسلامی جذبہ تھا یا نہیں... بہرحال میں مسلمان تھا۔

قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کے کیمپوں میں مسلمانوں کی حالت زار دیکھ دیکھ کر مشرقی پنجاب میں کشت و خون کے واقعات کے بارے میں سن سن کر، بھارت کے رویے کو دیکھ دیکھ کر یہ خیال مستحکم ہو گیا کہ پاکستان سے ہماری زندگی اور سلامتی وابستہ ہے لیکن ابھی تک یہ جذبہ خام تھا۔ یہ جذبہ تحفظ ماتقدم کے لئے تھا، اپنی ذات کے لئے محدود تھا۔ ضرورت وقتی کی پیداوار تھا۔ بھارت کے طرز عمل کا رد عمل تھا۔ یہ جذبہ اسلام کی عظمت کا حامل نہ تھا۔ آٹھ سال گزر گئے۔

اس عرصہ میں ایک ایسے ادیب سے میری راہ و رسم ہو گئی جو اسلامی جذبہ سے سرشار تھے اور جن کی زندگی میں عملی طور پر اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ ایک روز میں ان کے ہاں گیا تو وہاں ایک معمر آدمی خواجہ صاحب بیٹھے تھے۔ ہمارا تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کئی ایک بار خواجہ صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ صاحب کم گو تھے، اپنی بات کہنے کے بجائے دوسرے کی بات سننے کے عادی تھے۔ ذہین اور باریک بین تھے، دوسروں کی مدد کرنے کے دلدادہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راست گو تھے۔ ایک روز میرے دوست نے مجھے کہا کہ خواجہ صاحب اچھے بزرگ ہیں لیکن خواجہ صاحب میں بزرگ کی کوئی خصوصیت دکھائی نہ دیتی تھی۔ میرے نزدیک بزرگ وہ ہوتے ہیں جو جٹا دھاری ہوں، جن کی ہر بات سے ذاتی اہمیت مترشح ہوتی ہو، جو ذاتیں بنا کر بیٹھنے کے عادی ہوں اور پند و نصیحت سے شغف رکھتے ہوں۔ خواجہ صاحب میں کوئی بات بھی تو نہ تھی۔ ان کی گفتگو میں روحانیت کی طرف کوئی اشارہ نہ ہوتا تھا بلکہ عام دنیاوی مسائل پر وہ بڑے زیرک انداز میں دنیاوی نقطہ نظر سے بات کرنے کے عادی تھے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر میں نے خواجہ صاحب سے ملنا جلنا جاری رکھا ورنہ اگر مجھے ذرا بھی شبہ پڑ جاتا کہ وہ بزرگ ہیں اور روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں تو میں یقیناً ان سے پیچھے ہٹ جاتا۔ چونکہ مجھے بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک روز میں قبرستان کی طرف جا نکلا۔ دیکھا کہ ایک معمولی سی چار دیواری کے اندر خواجہ صاحب ایک مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ میں رک گیا۔ فارغ ہونے کے بعد خواجہ صاحب حسب دستور بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے۔ کہیے، کیا حال چال ہے؟ میں نے کہا۔ جی، کوئی خاص اچھا نہیں، بس غم کھائے جا رہا ہے۔ بولے۔ کیوں؟ غم کس بات کا؟ میں نے کہا۔ خواجہ صاحب، پاکستان کا کیا بنے گا، یہ کشتی تو ڈوب رہی ہے۔ میں نے یہ بات تفریحاً کہہ دی تھی۔ یہ درست ہے کہ مجھے پاکستان کے ڈوبنے کا احساس تھا لیکن پاکستان کے لئے کوئی خاص

تگن میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

خواجہ صاحب میری بات سن کر دفعتاً سنجیدہ ہو گئے۔ مفتی صاحب! وہ بولے۔ پاکستان کا غم آپ کیوں کھاتے ہیں، جب پاکستان کا غم کھانے کے لئے بڑی بڑی ہستیاں موجود ہیں۔ آپ کو اور مجھے غم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک ساعت کے لئے وہ رک گئے پھر بولے۔ اس بڈھے کو دیکھتے ہیں آپ؟ میں نے اس جانب دیکھا جدھر خواجہ صاحب اشارہ کر رہے تھے۔ وہاں کوئی بڈھا نہ تھا۔ کیا وہ اس قبر کی طرف اشارہ کر رہے تھے جس پر وہ ابھی ابھی فاتحہ پڑھ کر آئے تھے، خواجہ صاحب بولے۔ اس بڈھے نے اپنی تمام تر زندگی قیام پاکستان کے لئے وقف کر دی تھی، یہ بوٹا اس بڈھے کا لگایا ہوا ہے۔

مفتی صاحب! وہ مسکرانے لگے۔ پاکستان کے لئے بہت عظیم ہستیاں کام کر رہی ہیں، آپ کیوں غم کھاتے ہیں؟

تو پھر میں کیا کروں؟ میں نے از راہ مذاق کہا۔

آپ صرف اتنا کریں کہ ہر کام سے پہلے سوچیں کیا آپ پاکستان کے مفاد کے مطابق کام کر رہے ہیں، آپ کا قدم پاکستان کے مفاد کے خلاف تو نہیں۔ اس میں آپ کا اپنا فائدہ ہے۔ پاکستان تو بہر صورت پھلے پھولے گا، اس کی بہار دیکھ کر لوگ عش عش کریں گے۔ ان شاء اللہ!

خواجہ صاحب کی بات سن کر مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی، انہوں نے تو کبھی بڑ نہ ہانکی تھی۔ ان کی بات بڑی زیرک ہوتی جو عملی دنیا سے متعلق ہوتی تھی۔ وہ پیر پرستی کے حق میں نہ تھے پھر بڈھا کون تھا جس نے پاکستان کا بوٹا لگایا تھا۔ وہ بڑی ہستیاں کون تھیں جو پاکستان کا غم کھانے پر مامور تھیں۔ پاکستان میں کیا خصوصیت ہے کہ بڑی ہستیاں اس پر مامور ہیں۔ پاکستان ایک چھوٹا سا ملک ہے، اس میں ابھی تک کوئی اسلامی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی اور اسلامی ملک تعداد میں بیسیوں ہیں۔ سب کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ خواجہ صاحب کی بات مہمل نظر آتی تھی۔ بات کی طرف توجہ کرتا تو وہ بے معنی معلوم ہوتی۔ خواجہ صاحب کے کردار کی طرف نظر جاتی تو از سر نو شش و پنج میں پڑ جاتا۔ خواجہ صاحب کی زیرکی، ان کی راست گوئی...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

خواجہ صاحب میں ایک عجیب سی خصوصیت تھی۔ جب بھی وہ اللہ کا نام لیتے تو کچھ ایسے انداز میں بات کرتے جیسے اللہ ان کے پاس ہی بیٹھا ہو اور اللہ کا ایک خصوصی پروگرام ہو اور وہ کن کہہ کر تخلیق کرنے والا اللہ نہ ہو بلکہ ہر لمحہ محنت مشقت اور مزدوری کرنے والا ہو۔ جس کے ہاتھ محنت کرتے کرتے بھدے ہو چکے ہوں اور جو ہر بات میں دوسروں کا ہاتھ بٹانے کا دلدادہ ہو۔ ان کی یہ بات مجھے کھلتی تھی۔ خواجہ صاحب نے اللہ کو مزدور بنا رکھا تھا۔

اللہ کا میں بھی قائل تھا۔ میرے ذہن میں اللہ کی دو خصوصیات نمایاں تھیں۔ اس کی عظمت اور بے نیازی۔ اللہ کی عظمت کا احساس فلکیات اور جمادات کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا اور اس کی بے نیازی میرا اپنا تاثر تھا۔ میں اسے رب العالمین سمجھتا تھا، رب المسلمین نہیں۔ میرے نزدیک اللہ ایک عظیم شہنشاہ تھا جس کی ریاست سیکولر (Secular) تھی۔ اسلام میرے نزدیک ایک ضابطہ عمل تھا جو صرف بنی نوع انسان کے لئے باعث فلاح تھا جس کے لئے اللہ کو اپنے طرز عمل میں رد و بدل گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ میرے اللہ کو افراد سے دلچسپی نہ تھی۔ مذہب کے نقطۂ نظر سے رعایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ پھر پاکستان کی امتیازی حیثیت کے کیا معنے ساری بات ہی بے ہنگم تھی۔ اس کے باوجود چونکہ وہ بات خواجہ صاحب

نے کی تھی۔ میرے دل میں گومگو کا عالم پیدا ہو گیا، دل میں اک پھانس سی لگ گئی۔

پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یہ پہلا تذکرہ تھا۔

چار سال بیت گئے۔

میرا تبادلہ ہو گیا اور مجھے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میرے نئے افسر میں چند ایک خصوصیات نمایاں تھیں۔ وہ بے حد ذہین تھا، کم گو تھا۔ اس میں برداشت کا عنصر اس قدر زیادہ تھا کہ دیکھنے والے کو غصہ آ جاتا اور اس میں ذات کا خیال قطعی طور پر مفقود تھا۔

صاحب نے مجھے بلایا۔ بولے آپ کا شروع کر دیں۔ میں نے کہا، یس سر! بولے اس صندوقچی میں پچھلے ہفتے کے خطوط ہیں۔ ان سب خطوط کو غور سے پڑھیں، موضوع کے لحاظ سے کلاسیفائی (Classify) کریں اور ایک سمری (Summary) بنا دیں۔ جو خط خصوصی توجہ کے قابل ہو اسے الگ کر دیں۔ یس سر! انہوں نے کہا۔ چپڑاسی صندوقچی لے آئے گا۔ وہ بولے۔ آل رائٹ سر! میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے پہلا خط کھولا، لکھا تھا۔ اے شاہ تو کتنا خوش نصیب ہے کہ تجھے پاکستان کی بادشاہی کی عزت ملی۔

خط پڑھ کر میں سوچنے لگا عجیب خط ہے۔ دوسرا خط کھولا تو اور بھی حیران ہوا۔ لکھا تھا خبردار، دیکھ پاکستان میں آٹا مہنگا نہ ہونے دیجئو۔ تیسرے خط میں لکھا تھا، وہ وقت دور نہیں جب پاکستان میں ایسا عالم ہو گا کہ مدینے کے رہنے والے دیکھ کر کہیں گے سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

ان خطوط کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے یہ خط کیوں لکھے تھے، ان کا مقصد کیا؟ بہرطور ایک بات واضح تھی کہ مکتوب الیہ کا توجہ حاصل کرنا مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ زیادہ تر خطوں میں لکھنے والوں کے نام بھی مرقوم نہ تھے۔ یہ خط دعا گو خادم یا عاجز پر ختم ہوتے تھے۔ بیشتر خطوط کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوئے تھے۔ تحریر اور انداز بیاں دونوں ہی خام تھے۔ اثر ڈالنے کا عنصر مفقود تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے پیسے کیوں خرچ کئے تھے۔ وقت کیوں صرف کیا تھا۔

پھر میں نے ایک طویل خط اٹھایا۔ یہ خط جنوبی ہند کے کسی شہر ملائم سے موصول ہوا تھا۔ لکھنے والا سب جج تھا جو 20 سال پیشتر ایک حادثہ کی وجہ سے اپاہج ہو چکا تھا اور گزشتہ بیس برس سے صاحب فراش تھا۔ ان 20 برس میں اس کا واحد کام عبادت تھا۔ خط میں تحریر تھا کہ میں یہ خط تمہارے لئے نہیں لکھ رہا بلکہ پاکستان کے لئے لکھ رہا ہوں۔ جلد ہی پاکستان ایک عظیم مملکت بن جائے گی۔ ایک عظیم فتح حاصل ہو گی اور پھر پاکستان دنیائے اسلام کا ایک عظیم مرکز بن جائے گا۔

ان خطوط نے مجھے پاگل کر دیا۔ یہ کون سی دنیا تھی۔ یہ کس قسم کے لوگ تھے۔ خط لکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا۔ کیا یہ سب مذہبی جنون یا کے مریض تھے (Fanatics) تھے۔ مجذوب تھے یا (Wishful Thinkers) تھے۔ لیکن ان میں کئی ایک خطوط پڑھے لکھے لوگوں کے بھی تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ان خطوط میں کسی فرد کا تذکرہ نہ ہوتا تھا، کسی کی توقیر و تعظیم نہ ہوتی تھی۔ یہ خط قصیدہ گوئی سے خالی تھے۔ ان خطوط میں کسی ظل الٰہی کو خطاب نہ کیا گیا تھا۔ ان کا موضوع پاکستان تھا۔ پاکستان کی خصوصی عظمت، پاکستان سے رسول اللہ کا التفات پاکستان پر اللہ کی برکت و رحمت۔ ان خطوط کو پڑھ کر میں پاگل ہو گیا۔ مجھ پر ایک عجیب سی وحشت سوار ہو گئی۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ لوگ کون لوگ ہیں، یہ دنیا کون سی دنیا ہے۔ پاکستان کیا ہے۔ اسے کیا امتیاز حاصل ہے۔ کیوں حاصل ہے۔

طبیعت کے لحاظ سے میں ایک مجذوب واقع ہوا ہوں۔ عام حالات میں مجھ پر کسی واقعہ کا اثر نہیں ہوتا

لیکن جب اثر ہو جائے تو میں شل ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے اندر لاوا کھولنے لگتا ہے اور پھر گویا آتش فشاں جاگ اٹھتا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر پہلے تو میں سوچتا رہا پھر نہ جانے کیا ہوا گویا عقل و خرد کے دونوں کنارے ٹوٹ گئے، جذبے کا دھارا بہہ نکلا اور میری "میں" ڈگمگانے لگی۔

دو روز میں دیوانوں کی طرح اپنے گھر میں صحرا نوردی کرتا رہا پھر طوفان تھما تو میں پھر سے سوچنے لگا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ صاحب سے مل کر کہوں کہ جناب عالی یہ خط میرے بس کا روگ نہیں۔ مجھے کوئی سنجیدہ کام دیجئے جس کا عقل سے تعلق ہو۔

تیسرے روز میں تیار بیٹھا تھا کہ جب بھی صاحب اکیلے ہوں تو میں جا کر ان سے بات کروں۔ لیکن اس وقت صاحب کا چپڑاسی آ گیا۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہوا اس سے کہہ دیتا ہوں کہ صاحب اکیلے ہوں تو مجھے اطلاع کر دے۔ چپڑاسی نے آ کر کہا جی صاحب بلا رہے ہیں۔ صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے سوچا کہ صاحب اپنی بات کر لیں تو پھر میں اپنی درخواست پیش کر دوں گا۔

اس وقت صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ آپ گیٹ پر سکیورٹی کے کمرے میں چلے جائیں۔ وہاں ایک شخص مجھ سے ملنے کے لئے مصر ہے۔ آپ اس سے بات کریں۔ کہیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ اگر وہ آپ سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس سے بات پوچھ لیں کہ کیا کہنا چاہتا ہے لیکن اگر وہ مجھ سے ملنے پر مصر رہے تو اسے جانے نہ دیں بلکہ مجھے اطلاع دیں، میں اس سے ملوں گا۔

لیس سر! صاحب کی بات سن کر میں دروازے کی طرف مڑا اور دیکھئے، صاحب بولے۔ سکیورٹی کے کمرے میں بات نہ کریں۔ اسے باہر لے جائیں، علیحدگی میں سمجھے۔

لیس سر! اس وقت صاحب سے اپنی بات کرنے کا موقعہ نہ تھا، میں نے سوچا واپسی پر بات کروں گا۔

سکیورٹی کے کمرے میں ایک دہقان قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ میں اسے باہر باغیچے میں لے گیا۔ صاحب کام میں مصروف ہیں۔ میں نے کہا۔ انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر آپ یہ بتا دیں کہ آپ انہیں کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو......

میں ابھی جملہ ختم بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ بولا۔ بابو جی! میں نے صاحب سے مل کر کیا لینا ہے۔ مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں۔ میں اپنے گاؤں سے آ رہا تھا۔ اس سڑک کے پاس مجھے ایک سانڈھنی سوار ملا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں پاس گیا تو وہ کہنے لگا۔ میاں اس مکان کے اندر جاؤ۔ صاحب سے ملو اور ہمارا ایک پیغام اسے دے دو۔ سانڈھنی سوار بزرگ آدمی تھا، میں نے اس کی بات مان لی اور ادھر آ گیا لیکن یہ پولیس والے دوسرے کی بات ہی نہیں سنتے، اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔

میں نے کہا آپ پیغام مجھے دے دیں میں صاحب تک پہنچا دوں گا۔ سانڈھنی سوار نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ بولا۔ جا کر اس سے کہہ دو کہ جو کاغذ وہ لکھ رہا ہے وہ غلط ہے اور جو وہ لکھ کر پھاڑ چکا ہے وہ صحیح ہے۔

عجیب مہمل سا پیغام ہے، میں نے سوچا۔ نہ سر نہ پاؤں۔ سانڈھنی سوار کو صاحب کے نوٹ سے کیا واسطہ اور پھر سانڈھنی سوار یہاں کہاں۔ میں نے تو کبھی اس علاقے میں کوئی سانڈھنی سوار نہیں دیکھا یقیناً یہ دہقان پاگل ہے۔

مجھے یقین تھا کہ صاحب بات سن کر مسکرا دیں گے اور پھر کام میں مصروف ہو جائیں گے لیکن ایک ساعت کے لئے وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ذرا یہ ویسٹ پیپر باسکٹ تو اٹھایئے۔ میں نے

ٹوکری اٹھا کر میز پر رکھ دی وہ بڑی توجہ اور احتیاط سے کاغذ کے ٹکڑے ٹوکری میں سے چننے لگے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت سی ہوئی۔ کیا صاحب سانڈھنی سوار کی بات سچ مان بیٹھے ہیں۔

صاحب نے وہ پرزے میری جانب بڑھا دیئے اور بولے اگر آپ کو فرصت ہو تو ذرا انہیں جوڑ دیجئے۔

یس سر، میں نے کہا۔ صاحب نے وہ نوٹ اٹھالیا جو وہ لکھ رہے تھے اور اسے پھاڑ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ شخص جو اس قدر ذہین اور زیرک ہے کہ ہم ابھی بات کرنے کے لئے منہ کھولتے ہیں تو ہمارا عندیہ بھانپ جاتا ہے۔ یہ شخص جو ہر ایک کی بات سننے کے باوجود اپنی رائے رکھتا ہے جس کے خیالات میں انفرادیت اور ندرت ہے جو پٹے ہوئے رکی خیالات سے دور رہتا ہے۔ جسے (Fanaticism) سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ یہ شخص ایک مبہم سانڈھنی سوار کی بات کو یوں اپنا رہا ہے جیسے ہمیشہ ہی سے اسے ایسے سانڈھنی سواروں سے واسطہ رہا ہو جیسے اس قسم کے پیغامات سے مانوس ہو، یہ کیا بھید ہے۔

میں نے کاغذ کے پرزے جوڑے۔ وہ نوٹ پاکستان کے مجوزہ آئین کی ایک اہم شق تھی جسے اسلام سے تعلق تھا۔

اس کے بعد صاحب سے خطوں کی بات کرنا بے معنی نظر آنے لگا اور میں از سر نو ان خطوں کی الف لیلہ میں کھو گیا۔ وہ خط روز موصول ہوتے تھے جگہ جگہ سے موصول ہوتے تھے لیکن عام طور سے ان کا موضوع ایک ہی ہوتا۔ پاکستان، پاکستان کا امتیاز۔ پاکستان کی آنے والی عظمت۔ درخشندہ مستقبل۔ آہستہ آہستہ میں اس طوفان میں بہہ گیا۔ میرے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے شاید یہ چوتھی سمت بھی حقیقت ہو۔ شاید اللہ میاں کسی ملک یا فرد میں خصوصی دلچسپی لینے سے گریز کرتے ہوں آخر وہ مالک ارض و سما ہیں اگر وہ کوئی بات کرنا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔

ایک روز صاحب نے مجھے بلایا اور ایک کام دے کر اپنے ہی کمرے میں بٹھالیا تاکہ وہیں بیٹھ کر ختم کر دوں۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کر کام کر رہا تھا کہ چپڑاسی آیا صاحب سے کہنے لگا۔ سر میرا ایک چچا اب کی بار حج کرنے گیا تھا۔ وہ مدینہ شریف سے آپ کے لئے ایک پیغام لایا ہے حکم ہو تو اسے بلالوں۔

صاحب نے بڑی سنجیدگی سے چپڑاسی کی بات سنی بولے بلالو انہوں نے اپنا کام ایک طرف رکھ دیا۔ اٹھ کر بڈھے سے مصافحہ کیا اور بڑے غور سے احترام سے بڈھے کی بات سننے لگے۔

تمہید کے بعد بڈھے نے کہا جناب وہ جہلم کے رہنے والے ہیں۔ فوج میں سپاہی تھے۔ بڑی جنگ میں لام پر گئے تھے۔ وہاں سے مدینہ شریف میں سلام کے لئے حاضر ہوئے بس وہیں بیٹھ گئے۔ آج تک وہیں بیٹھے ہیں۔ اب وہ چابی بردار ہیں۔ یہ بہت بڑا عہدہ ہے جناب۔

صاحب نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

بڈھے نے بات شروع کی۔ انہوں نے فرمایا کہ سن 46ء میں ہم نے خواب دیکھا کہ مسجد نبوی سے ایک بیل پھوٹی اور بڑھتے بڑھتے دور نکل گئی اور اس کے پرلے سرے پر سبز پتیاں نکل آئیں۔

صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

چار ایک سال کے بعد خواب میں پھر اسی بیل کو دیکھا۔ شاخ جوں کی توں قائم تھی لیکن پتیاں مرجھا گئی تھیں۔ اب پھر خواب میں ہم نے وہی بیل دیکھی ہے۔ وہ پھر سے سرسبز ہو رہی ہے پھر سے کونپلیں نکل رہی ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا ہماری طرف سے جا کر مبارکباد دینا اور ہمارا پیغام دینا۔ کہنا۔ بھیڑوں کے رکھوالے خود

سائے میں نہیں بیٹھتے۔

جب تک وہ بڈھا بات کرتا رہا کوشش کے باوجود میں اپنے کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ جب اس نے کہا۔ ہماری طرف سے مبارک باد دینا۔ تو میں نے محسوس کیا جیسے مجھے مبارک باد دی جا رہی ہو۔ اس روز مجھے پاکستان کا ہر بوٹا مزید ہرا ابھرا نظر آنے لگا اور ہر سوکھی شاخ سے نئی کونپلیں پھوٹتی نظر آنے لگیں۔ لاکھ لاحول پڑھتا۔ اپنے آپ کو قائم کرنے کی کوشش کرتا لیکن بے سود۔ الف لیلہ کی اس دنیا میں ایک عجب کیفیت تھی۔ عجب نشہ تھا۔ میری عقل مجھے ملامت کرتی لیکن مجھے اس نشے کی لت پڑ رہی تھی۔ پھر اللہ میاں میرے روبرو ایک سٹول پر آ بیٹھے۔ ان کے ہاتھوں میں اوزار تھے وہ کام میں منہمک تھے۔ محنت کے پسینے سے شرابور تھے ان کے ہاتھ کام کرتے کرتے بھدے ہو گئے تھے۔ وہ تعمیر میں منہمک تھے۔ پاکستان کی تعمیر۔ یہ میرے اللہ تعالیٰ تو نہ تھے یہ تو خواجہ صاحب کے اللہ تعالیٰ تھے۔ میرے اللہ تعالیٰ جو دور بہت دور، اوپر بہت اوپر تخت پر بیٹھ کر کن کہا کرتے تھے جو عظیم تھے بے نیاز تھے دور تھے اونچے تھے وہ اللہ میاں پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جسے دیکھ کر میرا بند بند لرز گیا خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ صاحب کے ایک دوست نے فون کر کے انہیں بلایا۔ کہنے لگے ایک درویش آئے ہیں۔ پہلے یہ حیدرآباد میں آئی جی پولیس تھے پھر بلاوا آ گیا سب کچھ چھوڑ کر الگ ہو گئے، بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔

صاحب درویش سے ملنے جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اس درویش کی شکل بڑی ڈراؤنی تھی۔ سیاہ رنگ، ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ خوفناک آنکھیں کرخت آواز۔ صاحب کا تعارف کرانے کے بعد صاحب خانہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور صاحب اور وہ درویش جو مجھے سڑی ہوئی مرچ دکھائی دے رہا تھا اکیلے رہ گئے۔ میں ملحقہ کمرے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار پڑھ رہا تھا۔

دفعتاً اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا ملحقہ کمرے میں مرچ انگریزی بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا (Flay you alive put bran on you and place you in the sun.) ارے یہ کیا صاحب سے کہہ رہا تھا۔ یہ درویش تھا یا قصائی تھا۔

''میں یہاں صرف اس مقصد کے لئے آیا ہوں''۔ اس کی کرخت آواز پھر گونجی کہ تمہیں وارننگ دوں۔ تمہیں پتہ ہے کہ اس سلسلے میں وارننگ نہیں دی جاتی۔ جو کوتاہی کرے اسے ہٹا دیا جاتا ہے۔ رد کر دیا جاتا ہے لیکن پاکستان کو خصوصی رعایت حاصل ہے۔ اس لئے وارننگ دی جا رہی ہے۔ اگر اب بھی کوتاہی ہوئی تو کھال ادھیڑ دی جائے گی اور نمک لگا کر دھوپ میں رکھ دیا جائے گا''۔

اس بات سن کر خوف سے میرا خون جم گیا اور میں دیوانہ وار باہر نکل گیا۔ تین گھنٹے صاحب اور مرچ اس کمرے میں بند رہے۔

جب صاحب باہر نکلے تو ان کا منہ زرد تھا جیسے تمام خون چوس لیا گیا ہو۔ وہ بصد مشکل چل رہے تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

دو سال بعد ایسی ہی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہوا۔ صاحب اور میں دورے پر کراچی گئے ہوئے تھے۔ ایک شام ہم سینٹرل جیل گئے صاحب کو وہاں کچھ کام تھا۔ ابھی وہ کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ جیل کے ایک گارڈ نے آ کر سلیوٹ مارا بولا حضور ایک قیدی آپ کا نام لے لے کر پکار رہا ہے۔ کہتا ہے اسے بلاؤ۔

ہم اس گارڈ کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ ایک چھوٹے سلاخ دار کمرے میں ایک پنجرا بند تھا۔ صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، تالہ کھولو صاحب

بولے۔ تالا کھلا تو وہ اندر داخل ہوگئے اور گارڈ سے بولے تم جاؤ۔ گارڈ چلا گیا۔ میں اوٹ میں کھڑا رہا۔

ہیجڑے نے صاحب کو دیکھتے ہی چلا کر غصے میں کہا۔ تجھے خبردار کرنے کے لئے ہمیں قید ہونا پڑا۔

یہ سنتے ہی مجھ پر خوف طاری ہوگیا اور میں وہاں سے بھاگا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب صاحب وہاں سے نکلے تو ان کی وہی حالت تھی جیسے مرچ سے ملاقات کرنے کے بعد ہوئی تھی۔ یا اللہ، یہ کیا اسرار ہے، میرے ذہن میں پھر سے ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اگلے روز میں اکیلا جیل پہنچا لیکن وہ قیدی وہاں نہیں تھا میں نے اِدھر اُدھر سے اس کے کوائف پوچھے پتہ چلا کہ وہ باقاعدہ قیدی نہ تھا۔ جیل کے قریبی بازار میں شور اٹھ رہا تھا کہ جیل کے ایک گارڈ نے اٹھا کر اس کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ صاحب کے جانے کے بعد اس کے کمرے کو مقفل کر دیا گیا تھا۔ کسی گارڈ کو علم نہ تھا کہ کس نے اسے رہا کیا ہے۔

ان واقعات نے مجھے پاگل کر دیا۔ پاکستان کی امتیازی حیثیت کا بھید اور بھی پُراسرار ہو گیا لیکن ان جانے میں مجھے پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یقین ہو گیا۔ چوتھی سمت کی بات میرے لئے عجوبہ بن رہی اور اللہ تعالیٰ اپنے مشقت زدہ ہاتھوں سے پاکستان میں جگہ جگہ بیٹھے، لکھتے ہوئے نظر آنے لگے۔

پھر میرا تبادلہ ہو گیا اور میری خدمات ایک اور محکمہ کو پیش کر دی گئیں۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ لگتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے مجھے وہ دور یاد آ جاتا۔ میرے جسم پر [illegible] ایک عجیب کیفیت مجھے اپنی آغوش میں [illegible] صاحب [illegible] دیکھا تھا [illegible] لکیریں باقی تھیں اور وہ لکیریں [illegible] روز بروز روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔

ان لکیروں [illegible] میرا راستہ [illegible] تھا۔ [illegible] باوجود [illegible] میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا۔ [illegible]

کا۔ پھر بھی، پاکستان کے لئے میرے دل میں ایک عقیدت سی پیدا ہو چکی تھی۔ میں پاکستانی ہونے پر ناز محسوس کرنے لگا تھا اور پاکستان کے مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھائے انتظار کر رہا تھا۔ کس کا انتظار..... یہ مجھے علم نہیں۔

ان زمانے میں ڈاکٹر لاب سینگ ریمپا (Dr. Lob Sang Rampa) سے متعارف ہوا۔ لاب سینگ ایک تبتی راہب لاما ہے۔ جسے تبت میں خصوصی طویل اور کٹھن تعلیم و تربیت دی گئی تھی۔ تبت کے بڑوں کو علم تھا کہ فلاں سن میں تبت پر چین کا تسلط ہو جائے گا اور تبتی علم، کلچر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا انہوں نے بیس تیس سال پیشتر تبتی علوم کے تحفظ کے لئے لاب سینگ کو خصوصی تربیت دی۔ لاب سینگ اس وقت کینیڈا میں مقیم ہے۔ اس کی یہ انوکھی روئیداد چھ جلدوں میں مرقوم ہے جس میں چوتھی سمت کا تذکرہ عام ہے۔ لاب سینگ کا کہنا ہے کہ یہ چوتھی سمت مادی دنیا سے ہٹ کر نہیں بلکہ اسی کا ایک حصہ ہے اور اس پر بھی مادی اصول حاوی ہیں۔ چھٹی جلد میں لاب سینگ نے اسباق درج کیے ہیں جن میں عمل مشقیں لکھی ہیں جن کی مدد سے ہم چوتھی سمت سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

اگرچہ لاب سینگ نے میرے سامنے ایک نئی راہ کھول دی پھر بھی پاکستان کی امتیازی حیثیت کا عقدہ حل نہ ہوا۔

ایک روز جب میں اسلام آباد کے گردونواح میں گھوم رہا تھا۔ ایک ٹیکسی میرے قریب آ کر رک گئی۔ میرے ایک پرانے دوست احمد نے ٹیکسی سے سر نکالا۔ اسے دیکھ کر میں چلایا ارے تم تو یورپ گئے ہوئے تھے۔ میں اسی ہفتے واپس آیا ہوں۔ احمد بولا۔ یہاں کیسے گھوم رہے ہو میں نے پوچھا۔ بری شاہ لطیف جا رہا ہوں وہ بولا۔ احمد کی زبان سے بری شاہ لطیف کا نام سن کر مجھے حیرت

ہوئی چونکہ احمد تہذیب جدید کی پیداوار تھا۔ تم وہاں جا کر کیا کرو گے میں نے پوچھا۔ آؤ یار۔ وہ بولا۔ میرے ساتھ چلو، ابھی واپس آ جائیں گے۔

جب ہم مزار میں پہنچے تو فاتحہ خوانی کے بعد احمد بولا۔ یار بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا یہ لوگ اس قدر صاحب نظر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں میں یورپ کی متعدد لائبریریوں میں گیا۔ وہاں ایک نسخہ ملا جس میں درج تھا کہ شاہ لطیف نے نہ جانے کتنے سو سال پہلے فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک ایک اسلامی شہر آباد ہوگا جو دنیائے اسلام کا مرکز بنے گا اور یہ نسخہ ڈھائی سو سال پرانا تھا۔ دیکھ لو اسلام آباد نور پور سے ایک آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ صرف آدھ میل۔ حد ہوگئی۔

جب ہم نور پور سے واپس آ رہے تھے تو ٹیکسی رک گئی۔ کیوں بھائی رک کیوں گئے۔ احمد نے پوچھا۔ ڈرائیور بولا۔ جناب نور پور کی سڑک یہاں سے ٹوٹ گئی ہے۔ ہم نے باہر دیکھا۔ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ پندرہ گز کا ٹکڑا کچا تھا۔ احمد نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ دیکھ لو مفتی اسلام آباد نے سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ بری شاہ لطیف کو جانے والی سڑک کاٹ دی ہے اور یہ شہر دنیائے اسلام کا مرکز بننے والا ہے۔ اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

نور پور کے تانگے کو اسلام آباد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں، ڈرائیور نے کہا۔

سنتے ہو احمد پھر ہنسنے لگا۔

پھر جنگ چھڑ گئی۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔ عجیب وغریب نوعیت کی خبریں آنے لگیں۔ یہ خبریں مافوق الفطرت عنصر سے بھری ہوئی تھیں۔ قدم قدم پر معجزات کے تذکرے تھے۔ اخباروں کے کالم ایسے بیانات سے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ ان خبروں کو سنتے اور سر دھنتے تھے۔

حضور اعلیٰ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عجلت میں گھوڑے پر سوار ہو کر پاکستان کے جہاد میں شامل ہونے کے لئے تشریف لا رہے تھے۔ جنگ بدر کے شہدا محاذوں پر پہنچ چکے تھے۔ حضرت علی، امام حسن اور امام حسین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سفید ملبوسات پہنے سیالکوٹ کے قرب و جوار میں محاذ کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ ایک محاذ کے بھارتی قیدی کا بیان تھا کہ سفید پیراہن والی پاکستانی فوج بھارتیوں کو تہس نہس کر رہی تھی۔ ان کی تلواروں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دوسرے محاذ کے قیدی کا بیان تھا کہ سرخ ٹوپیوں اور چھوٹے قد والے پاکستانی توپچیوں نے بھارتی سینا کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ بھارتی توپچی نے کہا گولے پھینکنا بے کار تھا ایک سفید ریش بڈھا میرے گولے کیچ کر کے پرے پھینک دیتا تھا۔ بھارتی ہوابازوں کا بیان تھا کہ جب وہ گولے پھینکتے تھے تو سفید ریش بڈھے انہیں ہاتھوں میں پکڑ کر زمین پر یوں رکھ دیتے کہ وہ پھٹتے نہ تھے۔

سارا پاکستان ان معجزوں کے تذکروں سے گونج رہا تھا۔ ایک دانشور نے ٹھٹھا مار کر قہقہہ لگایا۔ یار یہ پاکستانی قوم معجزے گھڑنے میں کمال رکھتے ہیں وہ بولا۔ آج کل ایسا ایسا معجزہ ایجاد ہو رہا ہے جس کا جواب نہیں۔

لیکن۔۔۔ دوسرا بولا۔ یار اگر ان معجزوں سے ہٹ کر حقائق کی روشنی میں بات سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات نہیں بنتی۔

کیا مطلب ہے۔۔۔ نے کہا۔

مطلب یہ کہ اگر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمیں جنگ ہار جانی چاہئے تھی اور بھارت کو پاکستان پر قابض ہو جانا چاہئے تھا۔

ہاں، ایک اور دانشور بولے۔ بھارتی حملہ کا پلان فوجی اصولوں کے لحاظ سے عین پرفیکٹ تھا اس میں کوئی سقم نہ تھا۔

لیکن یہ مافوق الفطرت داستانیں...... چھوڑو یار۔ ایک نے کہا خالص جدت طرازی۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

نہیں یار ایک رپورٹر بولا۔ وہ ایک باتیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں۔

وہ ایک باتیں ہر کسی نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں پہلے دانشور نے تضحیک بھرا قہقہہ لگایا۔

میں ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا لیکن مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان سب کے دلوں میں ایک ضدی خیال ابھرتا ہے اور وہ اسے بھولنے کے لئے قہقہوں کا سہارا لے رہے ہیں۔

جنگ نے پاکستان کے معمے کو از سر نو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا لیکن اب مجھ میں (Resistance) کی طاقت نہ رہی تھی۔ اب مجھ میں اس بات کو شدت سے رد کرنے کی ہمت نہ رہی تھی جسے میں اپنی عقل و خرد کے مطابق سمجھ نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے دوران ان محیر العقل باتوں نے پاکستان کی امتیازی حیثیت پر مہر لگا دی تھی۔ اب میرا اللہ ستول پر بیٹھ کر ایٹمیں نہیں رکھ رہا تھا۔ وہ سفید گھوڑے پر سوار تھا اس کے ہاتھ میں ایک لمبی زنگ آلود تلوار تھی، وہ پاکستان کے محاذوں پر گشت کر رہا تھا اور اس کا چہرہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔

جنگ کے دوران میرا ایک ہم کار مجھ سے ملنے آیا۔ ملاقات کے بعد میں نے پوچھا کیا گھر جاؤ گے۔ بولا نہیں۔ قاضی صاحب سے مل کر گھر جاؤں گا۔ میں نے پوچھا۔ وہ کون ہیں۔ بولا۔ وہ ایک عابد آدمی ہیں بہت اچھے لوگ ہیں۔ میں نے کہا۔ مجھے بھی لے چلو۔

قاضی صاحب کے کمرے میں جا بجا مکہ مدینہ کی تصاویر آویزاں تھیں جائے نماز پر تسبیحیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ہمیں بڑے اخلاق سے ملے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے آپ بھی کوئی بات کریں۔

میں نے کہا جی پاکستان کے لئے دعا فرمائیں۔
دفعتہً وہ سنجیدہ ہو گئے۔ بولے میں تو بہت چھوٹا آدمی ہوں، بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ میری کیا حیثیت ہے کہ میں پاکستان کے لئے دعا کروں۔ نہیں مفتی صاحب میں اتنی حیثیت کا مالک نہیں۔

میں نے کہا جناب قاضی صاحب دعا تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔

وہ بولے ٹھیک ہے لیکن پاکستان کی اور بات ہے۔ آپ کو پتہ نہیں۔ مجھے بھی تھوڑی سی خبر ہے بہت تھوڑی۔ میں چھوٹا آدمی ہوں بہت چھوٹا۔ پاکستان پر بڑوں کا ہاتھ ہے۔ بہت بڑے تو ہیں ان کا۔ وہ پاکستان کے محافظ ہیں اس کے نگہبان ہیں، آپ پاکستان کا فکر نہ کریں۔

قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے چھیڑ دیا۔

یا اللہ، یہ بڑے کون ہیں۔ کیا وہی ہیں جو جہاد میں شامل ہونے کے لئے عجلت سے گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ کیا وہی ہیں جو سیالکوٹ کے گرد و نواح میں سفید پیراہن دیکھے گئے تھے۔

کیا یہ وہی تھے جو بھارتی توپچیوں کے گولے کیچ کرتے تھے۔ ہوائی جہازوں سے گرائے ہوئے بموں کو اٹھا اٹھا کر دور پھینکتے تھے۔ کیا انہی بڑوں میں سے کسی نے بھارتی پائلٹ کی نظر بندی کر دی تھی اور اسے دریائے راوی پر چھ پل نظر آنے لگے تھے۔ کیا انہوں ہی نے بھارتی پائلٹ کو حکم دیا تھا۔ ''بیل آؤٹ بیل آؤٹ'' اور وہ پاکستانی مزاحمت کے بغیر بڑوں کی آوازیں سن سن کر گھبرا کر بیل آؤٹ کر گیا تھا۔ کیا پاکستان کے لیڈروں کو اس بات کا شعور تھا کہ بڑے قدم قدم پر پاکستان کی امداد کر رہے ہیں۔ کیا انہوں نے بھی یہ سوچا تھا کہ پاکستان کی مثالی ترقی میں ہماری جدوجہد کو ان نتائج سے کیا مناسبت ہے جو بظاہر ہماری کوششیں پیدا کر رہی ہیں۔ کیا انہیں اس حقیقت کا شعور ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جو مقام پاکستان کو حاصل ہوا ہے وہ کس کا مرہون منت ہے۔ کیا پاکستان کے سربراہوں کو کبھی شک پڑا ہے کہ پاکستان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور کیا انہوں نے اس بات کی عملی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی کشتی کو کھے کر اس امتیازی حیثیت کی طرف لے جائیں۔ کیا انہوں نے ان بڑوں سے رابطہ پیدا کرنے کی خواہش محسوس کی ہے جو پاکستان کی فلاح و بہبود اور اس کے تحفظ کے لئے پیہم مصروف عمل ہیں۔

ہاں، قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے چھیڑ دیا تھا۔

جنگ ختم ہو گئی لیکن بھڑوں کا چھتہ ابھی تک بھن بھن کر رہا تھا۔ پھر سے جنگ ہونے کا خدشہ لگا ہوا تھا۔ قبرستان کے قریب ایک ننگ دھڑنگ مست اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ابھی کیا ہے۔ ابھی تو خون کی ندیاں چلیں گی۔ بہت مریں گے بہت۔ لاشیں ہی لاشیں۔ پھر بڑی فتح ہو گی اور پھر سبحان اللہ سبحان اللہ۔ وہ جوش میں تالیاں بجا رہا تھا۔ جیسے مجھے کہہ رہا ہو۔

خواجہ صاحب کو مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں رک گیا۔

کیا حال ہے، مفتی صاحب وہ بولے۔
فکر میں گھل رہا ہوں، خواجہ صاحب، میں نے کہا۔
کس کے فکر میں گھلنے لگے، انہوں نے پوچھا۔
پاکستان کا فکر لگا ہے میں نے کہا۔
وہ سنجیدہ ہو گئے ان کے چہرے پر غصے کے اثرات تھے۔ بولے مفتی جی اللہ کا کام اللہ کے لئے چھوڑ دو۔ اللہ کا کام اپنے ذمے نہ لو۔ پاکستان کا فکر کرنے والے آپ کون ہیں جی۔ آپ اپنی سوچئے، اپنے فکر کھایئے۔ واہ مفتی جی اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ سکے۔

❖❖❖

ایک سپاہی کا خط

آپ کی کرسی کا توازن اس کی کٹی ہوئی ٹانگ سے ہی قائم ہے

یہ خط ستمبر 1965ء کی جنگ کے بعد ایک عام فوجی نے محترم عنایت اللہ کو لکھا تھا..... کیا کوئی اس حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے؟

12-1-66

محترم عنایت اللہ صاحب، السلام علیکم!

آج اتفاق سے آپ کی فکر انگیز تحریر ”آج کی حقیقت کل افسانہ نہ بن جائے“ پر نگاہ پڑی۔ خدا جانے کیوں اسے پڑھ کر دل بھر آیا۔ یقین کیجیے آپ کی تجاویز بہت اچھی ہیں اور مجھے ان کی دل سے قدر ہے۔ مگر نجانے کیوں مجھے اپنے وہ ساتھی یاد آ گئے جن کو اپنے ہاتھ سے سپرد خاک کر دیا ہے۔ وہ شہیدان وطن جو صرف جام شہادت کے شوق میں شریک جہاد ہوئے تھے، اس وقت میرے پیچھے مٹی کے وہ تودے ہیں جن میں چند شہید آرام کر رہے ہیں۔ ان کو کوئی لالچ نہ تھا اور کوئی طمع نہ تھی وہ انتہائی سیدھے سادے لوگ تھے جو حکم ملنے پر سیسہ پلائی ہوئی ایک ایسی دیوار بن گئے جن کو شیطانی قوتیں مجبور نہ کر سکیں۔

سچ بتائیے میرے محترم کہ کیا آپ نے کبھی کسی جوان کو اوندھا لیٹے ہوئے مشین گن چلاتے دیکھا ہے؟ اور یہ وہی جوان تھے جو اپنی کہنیوں کے بل جب زمین پر لیٹ گئے تو دشمن کی بے پناہ قوت بھی ان کو نہ اٹھا سکی۔ یہ لیٹے رہے اور شیطان کی غول در غول فوج پر فائر کرتے رہے۔ حتیٰ کہ جس مقدس زمین کی حفاظت کے لئے لیٹے

تھے اس کا ہی پیوند ہو گئے اور شام کے جھٹپٹے میں ہم نے اپنے عزیز ساتھیوں کے جسم کے حصے بہت محبت سے اکٹھا کر کے سپرد خاک کر دیئے۔ ان کا کوئی جنازہ نہ نکلا اور نہ کوئی صف ماتم بچھی۔ فوج کے کمبل میں جسم کے حصے لپیٹ کر ایک گڑھے میں رکھ دیئے۔ مٹی ڈال دی اور فاتحہ پڑھی گئی۔ وقت اتنا ہی ملا تھا اور پھر فوراً ہی گولہ باری شروع ہو گئی۔ جلد از جلد اپنے مورچوں پر پھر جم گئے اور ایک بار پھر شیطانی قوتیں مزید کمک کے ساتھ امڈ آئیں اور ایک بار پھر انہیں پسپا کیا جانے لگا اور رات کو چاندنی میں وہ جگہ جہاں پر شہیدوں کے جسم ایک دیوار کا حصہ بن گئے تھے چمکنے لگی اور سب بے حد دلیر تھے، بے حد غیور تھے اور بہت بہادر تھے۔ ان میں بچوں کی سی شوخی تھی۔ فرشتوں کی معصومیت تھی اور شیروں کا دل تھا۔

کاش میں ادیب ہوتا تو آپ کو صحیح بتا سکتا کہ یہ سب میدان جنگ میں کس طرح لڑے مگر افسوس میرے پاس الفاظ نہیں ہیں صرف تجربہ اور مشاہدہ ہی ہے۔ شدید بمباری میں جب آسمان سے لوہے کے ٹکڑوں کی بارش ہو رہی ہو اور گھن گرج سے زمین کانپ رہی ہو اس وقت کسی پیڑ کی آڑ میں ایک جوان بیٹھا ہوا چائے بنا رہا تھا۔ خدا کی قسم موت کا مضحکہ اڑایا جا رہا تھا اور یا مشین گن کی لگاتار آواز میں جب بھی وقفہ ہوا تو اذان کی آواز آ جاتی تھی۔ اس قیامت کے دوران بھی اللہ کی بزرگی اور برتری یہ بانگ دہل کہی جا رہی تھی اور اب جب بھی آپ کسی فوجی جوان کو دیکھیں جو کلف لگی ہوئی صاف وردی پہنے ہو اور اکڑ اکڑ کر چل رہا ہو تو یہ ضرور یاد رکھیں کہ یہی جوان جس کے جوتے پر گرد کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے حکم ملنے پر اپنے مورچہ میں ڈٹ جائے گا اور پھر کیچڑ اور دھول میں بھرا ہوا، پسینہ میں نہایا ہوا اور انتہائی متعفن ہوا میں ڈٹا رہے گا۔ تاکہ ملک کی سڑکیں آباد رہیں، معصوم بچوں کی معصومیت برقرار رہے، دوشیزاؤں کی آبرو محفوظ رہے اور اللہ کا نام قائم رہے اور جب تک یہ دشمن کو پسپا نہ کر لے گا یا اسی زمین کا حصہ نہ بن جائے، بھوکا پیاسا زخموں سے چور لڑتا رہے گا اور جما رہے گا۔

اور ڈر یہ ہے کہ اب کچھ وقت گزارنے کے بعد ملک کے عوام خاکی وردی سے پھر عاجز ہو جائیں گے اور آج کا ''جانباز بہادر اور فاتح'' کل کہیں ''جاہل سپاہی'' نہ کہلائے۔ ہاں تو کہنا یہ چاہتا تھا کہ شہیدوں نے کسی صلے یا نام کے لئے جام شہادت نہیں پیا۔ وہ صرف شوق شہادت سے سرشار تھے۔ ان کی یاد میں اسپتال بنایئے یا گاؤں آباد کیجئے سب ہی درست ہیں اور اگر ممکن ہو سکے تو ان کو اپنے دلوں میں دفن کر دیجئے اور یہ ایک بے پایاں انعام ہو گا اور یہی ان کی صحیح قدر ہے اور ہاں کچھ وقت گزرنے کے بعد اگر کبھی آپ کے دفتر میں کوئی غلطی سے ایسا آدمی آ جائے جس کا ایک ہاتھ کٹا ہو یا مصنوعی لکڑی کی ٹانگ ہو اور وہ صرف آپ کے چپڑاسی کی جگہ کا طلبگار ہو تو خدارا اسے دھتکاریئے گا نہیں۔ آپ کی کرسی کا توازن اس کی کٹی ہوئی ٹانگ سے ہی قائم ہے۔ اس نے اپنے جسم کے حصے بھی زمین میں دبا دیئے ہیں وہ انتہائی پاکیزہ زمین ہے اور اب وہ معذور ہے مگر پھر بھی اس کا ایک ہاتھ سلامت ہے جو بخوشی آپ کی خدمت کے لئے وقف ہو گا۔ مجھے افسوس ہے کہ جنگی ضرورتوں کی وجہ سے اپنا نام اور پتہ تحریر نہیں کر سکتا اور صرف یہ التجا ہے کہ اگر یہ خط ناگوار خاطر بھی گزرا تو معاف کر دیجئے، صرف اسے پڑھ لیجئے اور یہ یقین ہے کہ یہ آپ کو یاد ہمیشہ رہے گا کیونکہ یہ خط لکھتے وقت کئی شہیدان وطن میرے چاروں طرف آرام کر رہے ہیں اور وہ بڑے ہی خوش قسمت تھے انہوں نے اپنی عاقبت سنوار لی۔

خدا حافظ!

ایک سپاہی

✲◆✲

آپ بیتی

لہو کا رنگ ایک ہے

انسانی جذبے بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں، کبھی سمجھ کر بھی سمجھ میں نہیں آتے اور کبھی چند لمحوں کے تلاطم عمروں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر مبشر حسن ملک 0345-6875404

لندن جانا بہت ضروری تھا۔

میرا جدید سرجری کے بارے میں دس روزہ تربیتی کورس تھا، جس میں دنیا بھر سے ڈاکٹروں نے دلچسپی ظاہر کی تھی۔ بظاہر میرا چناؤ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

لندن، جہاز سے اترا تو موسم سرد اور گھٹا گھٹا محسوس ہوا مگر جلد ہی بارش شروع ہوگئی۔ وہ سرما کی بارشوں کا شدت بھرا دور تھا۔ مجھے اس دم ایسٹ لندن جانا تھا جہاں میری رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ گھبراہٹ میں کمی واقع ہوئی، جب دو غیر ملکی کورس میٹ ہوائی اڈے پر ہی متعارف ہوگئے۔

ٹیکسی پر بازاروں سے گزرا تو کرسمس کی رونقیں عروج پر نظر آئیں۔ تئیس دسمبر کی شام تھی اور لندن کے خوش باش باسیوں کی کھلنڈری حدیں پھلانگ رہی تھی۔

''جو خریدنا ہے آج ہی خرید لو''۔ دوستوں نے ٹیکسی مصروف بازار میں رکوالی۔ اندازہ ہوا کہ کلیئرنس سیل کی وجہ سے ملبوسات کی قیمتیں اپنی کم ترین سطح پر آگئی تھیں اور عوام کی کثیر تعداد اس سے استفادہ کر رہی تھی۔

''تربیتی کورس چار پانچ روز بعد شروع ہوگا''۔ ایک دوست نے مجھے راستے میں بتایا۔ منزل پر پہنچا تو معلوم ہوگیا کہ کورس کے تمام شرکاء ایک ہی بڑی سی عمارت میں مقیم تھے۔ رات، ڈنر پر اکثر جمع ہوئے تو کئی اجنبی شرکاء فرینڈز کو اپنی گرل فرینڈز بھی مل گئیں، مگر اس عارضی تعلق کا اہم پہلو مختلف اقوام کے بیچ انتہا کی انسانی کشش تھی جس نے مجھے حیران کیا۔ خصوصاً جب گھانا کی سب سے کالی ''ملکہ حُسن'' ایک وجیہہ سفید فام کی دوست بن گئی اور کھانے کے بعد ایسا ناچی کہ بدن پر لباس برائے نام رہ گیا۔ حاضرین نے افریقہ پر مہذب دنیا کے اثرات کو خوب پسند کیا اور سراہا۔ اس شب اس طرح کے اور بھی تماشے پیشِ نظر رہے۔

کھانے کے بعد میں قدرے الگ تھلگ بیٹھ گیا تھا اور جسمانی تھکاوٹ کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اچانک کسی نے مجھے مخاطب کر لیا۔ تخاطب نسوانی آواز میں تھا۔

''ایکس کیوز می!'' وہ بولی اور میرے پہلو میں کرسی پر براجمان ہوگئی۔ میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دل کا چمن نوید بہار سے مہک اٹھا اور پھر یہ تاثر بدن کے روئیں روئیں میں پھیل گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ محترمہ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی تھی، مگر یہ بدگمانی جلد ہی ٹل گئی۔ احساس ہوا کہ کسی خیر خواہ کی دعائیں مجھے لگ گئی تھیں کیونکہ سچ کہیں تو پری وش مہ لقاء تھی۔

اس نے موتیا رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا جو اس کے سرخ و سپید روپ پر بچ گیا تھا۔ میں متوجہ ہوا تو اس کی مسکان کا سحر گلابی لبوں پر مچلنے لگا اور پھر جھیل سی نیلگوں آنکھوں میں نکھرتا گیا۔ اس کی خوش نوائی حُسنِ ادائیگی سے مرصع ہو کر میرے دل میں اتر گئی۔

''مجھے لز کہتے ہیں''۔ اس نے اپنا تعارف کرا دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ پورا نام ''الزبتھ فرائیڈ'' تھا اور وہ امریکن تھی۔ ان سرجنز کا ساتھ دینے امریکہ سے آئی تھی جو تربیتی کورس کروا رہے تھے۔ پیشے کے لحاظ سے وہ آپریشن تھیٹر کی سینئر نرس تھی۔

''چھوٹی سی عمر میں آپ نے ذمہ داری کا کوہِ گراں کیسے اٹھا لیا؟'' میں نے سوال کیا تو وہ ہنس پڑی، پھر بولی۔

''اس کورس کی ذمہ داری کے لئے اوّلین انتخاب تو فریڈرک کا ہوا تھا مگر وہ گول مٹول بوڑھا کثرتِ مے نوشی کے باعث اسائنمنٹ سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ عجیب شخص ثابت ہوا، پوور فیلو۔ مجھے اس سے بہت ہمدردی ہے''۔ یہ کہہ کر خلاف توقع وہ مسلسل ہنسنے لگی۔ احمریں رنگ اس کے گالوں میں جھلکنے لگا۔ اسی دوران ڈاکٹر یانگ بھی بغیر تکلف کے، قریبی کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ میں اسے

جانتا تھا، وہ چینی تھا۔ ہم پہلے بھی مل چکے تھے۔ دوست اسے پیار سے مسٹر ینگ کہا کرتے تھے۔ شاید کبھی ینگ بھی رہا ہوگا مگر بقول اس کے، وہ بال بچپن ہی میں سفید کر بیٹھا تھا، پھر وسیع مطالعے اور دنیا کے طویل تجربے نے اسے ان بالوں سے بھی نجات دے ڈالی تھی۔ کم از کم وہ یہی کہتا تھا۔ اب کبھی وہ وگ پہن لیتا مگر عموماً اپنا سر روشنی میں چمکنے کے لئے ننگا چھوڑ دیتا۔ مسٹر ینگ کہے جانے پر سرخی اس کے پچکے گالوں میں دوڑنے لگتی۔

''فریڈرک تو نشہ کیا کرتا تھا بے چارہ، مگر تم تو خیر سے بذاتِ خود سراپا......'' ڈاکٹر یانگ کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔ لز نے قہقہہ لگایا، اس کی آنکھوں میں بھی شوخی ناچنے لگی۔

اس شب وہ میری جانب کیوں متوجہ ہوئی تھی؟ یہ میں نہیں جان سکا تھا۔

''چلیں پکاڈلی چلتے ہیں''۔ اس نے انکھیوں سے مجھے ٹٹولا، ساتھ ہی فرمائش بھی کر دی۔ ''آج شب وہاں رونق جوبن پر ہوگی''۔ اس نے سیر کا جواز بھی پیش کیا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ غیر ملکی طویل مسافتیں طے کر کے منزل پر پہنچے تھے، اکثر پر جسمانی تھکاوٹ کے آثار نظر آتے تھے۔ لز کا عزم البتہ قوی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر یانگ کی طرف دیکھا تاکہ مروت کا کوئی پہلو تلاش کر سکوں کیونکہ گاڑی صرف اسی کے پاس تھی۔

''میں وہاں جاؤں گا مگر تنہا''۔ ڈاکٹر یانگ نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔

''لز کو ہمراہ لے جاؤ''۔ میں نے اسے رائے دی۔

''بشرطیکہ تم بھی ساتھ چلو''۔ وہ بلا کا احمق نکلا۔

''میں صرف آپ کے ہمراہ جاؤں گی''۔ لز نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس طرح عورت اور باوفا ہونے کا ثبوت دے دیا۔

میں اور ڈاکٹر یانگ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے، جبکہ لز بادلِ ناخواستہ پچھلی نشست پر لڑھک گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم سینٹرل لندن کے پاش علاقوں سے گزر رہے تھے۔

پکاڈلی سرکس میں افراد کی بھیڑ اس دم انتہا پر تھی۔ نوع انسانی کی افراط کے باعث کھوئے سے کھوا چھلتا تھا۔ کرسمس پر پیسہ لٹانے کے تمام لوازمات وہاں موجود تھے۔

''میں تو فلم بھی دیکھوں گی''۔ لز کے ذہن میں جیسے پروگرام پہلے سے مرتب تھا، اب وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔

''اس دوران میں قریبی بک شاپ پر کتابوں کی ورق گردانی کر لوں گا''۔ ڈاکٹر یانگ نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ مجھے بھی فلم بینی کا شوق نہیں تھا لیکن لز کی خاطر ہم دونوں کو آخر یہ پرہیزی غذا کھانا ہی پڑی۔

تمام سینما ہاؤس فل تھے، ہم مایوس واپس لوٹنا چاہتے تھے کہ ایسے میں ایک سردار جی بہت کام آئے، انہوں نے ہماری مدد کی اور ایک سینما کے ٹکٹ دلوا دیئے جس میں داخلہ بظاہر ناممکن دکھائی دیتا تھا، یہ اور بات کہ انہوں نے ٹکٹوں کے دام منہ مانگے لے لئے۔

لندن میں بارش کی بوچھاڑ آتے دیر نہیں لگتی۔ اس رات تو یخ بستہ ہوائیں بھی بے رحم تھیں۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا، جب پکچر ہاؤس کی تمازت نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وسیع ہال کے ایک کونے میں تین نشستیں خالی تھیں۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ہمیں بے شمار جوان دلوں کے قریب سے گزرنا پڑا، جو رومانوی فتنہ انگیزی کے مختلف مراحل میں تھے، مگر جلد ہی ان کی یہ کیفیات خوف و ہراس کی نذر ہوتی گئیں۔ کیونکہ فلم ایگزارسسٹ بلا کی خوفناک تھی، پکچر ہاؤس میں بار بار نسوانی چیخیں ابھرنے لگی تھیں۔

لز میرے دائیں طرف بیٹھی ہوئی تھی اور فلم کے

مناظر پر خوف کے مارے لرز رہی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ قوت سے تھام رکھا تھا اور یوں قریب تر آ گئی تھی۔ جب وہ زیادہ ڈرنے لگی تو میں نے اسے آنکھیں بند کر لینے کا مشورہ دیا، مگر وہ کچھ اور بھی خوفزدہ ہو گئی اور آنکھیں موند لینے کا حوصلہ بھی کھو بیٹھی۔

فلم دیکھ کر ہم پکچر ہاؤس سے نکلے تو لز پر مسلسل کپکپی طاری تھی۔ اس کی دگرگوں حالت میں اب سرد رات بھی حصہ دار بن چکی تھی۔

''میرے سپر کا ٹائم ہو گیا ہے''۔ ڈاکٹر یا تگ نے گاڑی مزید چلانے سے انکار کر دیا۔

نزدیک ہی سڑک کے کارنر پر فاسٹ فوڈ کی چھوٹی سی سہولت موجود تھی، جہاں نوجوان نسل آئس کریم اور ڈیزرٹ کا لطف اٹھا رہی تھی۔ رات کی یخ بستگی میں آئس کے بھرے باؤل دیکھ کر مجھ پر بھی کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ ڈاکٹر یا تگ اور لز اپنی من مانیوں پر اتر آئے۔ انہوں نے فوڈ پوائنٹ سے ہاٹ ڈاگ خرید لیے۔ میں فقط ان کا منہ تکتا رہ گیا۔ وہاں میں صرف اپنے تجسس کی بھوک مٹا سکتا تھا۔

''آپ کے اس گرم آئٹم میں جو قیمہ بھرا ہوا ہے، وہ کس قدر غصیلے کتوں کی پیداوار ہو سکتا ہے؟'' میں نے ریسٹوران میں ریسپشن سے دریافت کیا۔ بات سن کر وہاں موجود لڑکی میرا منہ دیکھنے لگی۔

''ہاٹ ڈاگ میں ہم کتوں کا قیمہ استعمال نہیں کرتے''۔ وہ جھلا کر بولی۔ ''ان میں گائے کا قیمہ پکا کر بھرا جاتا ہے''۔ اس نے مجھے مزید بتایا اور چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھنے کی کوشش کی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایک ویجی ٹیبل سینڈوچ مل گیا جس میں سبزی کی پہچان بڑی مشکل تھی۔ لز نے ایک دوسرے سٹور سے سکاچ خرید لی اور سرد رات کے اثرات زائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ڈاکٹر یا تگ نے مجھے کوکا کولا کی فراخدلانہ پیشکش کر دی لیکن خود وہ بیئر کو منہ مارتا رہا۔

لز کے ساتھ المیہ یہ ہوا تھا کہ وہ بُری طرح ڈر چکی تھی اور فلم اس کے حواس پر پوری طرح سوار لگتی تھی۔ راہ چلتے ہوئے افراد میں اسے پُر ہیبت فلمی کردار نظر آنے لگے تھے، جو اس کا پیچھا کرنے لگتے اور وہ پریشان ہو جاتی۔ ایسے میں اگر کوئی کھانس پڑتا یا اونچی آواز میں بولتا تو لز کی چیخ نکل جاتی۔ رہائش گاہ پر پہنچ کر بھی وہ ان خیالی جنات سے ڈرتی رہی بلکہ رات اس نے اپنی روم میٹ کو فلم کی مرکزی چڑیل سمجھ لیا اور بہانے سے طویل وقت تک ریسپشن پر ہی بیٹھی رہی، اپنے وجود پر بار بار کراس بناتی رہی۔

اگلے روز میں اپنے چند پرانے دوستوں کے ساتھ مصروف رہا، جو لندن میں مقیم تھے۔ ہم نے کھانا مل کر ایج ویر کے علاقے میں کھایا۔ مجھے یاد ہے، وہ کوئی لبنانی ریسٹوران تھا جو عرب کھانوں کے لئے بہت مشہور تھا۔ رہائش گاہ پہنچا تو لز کا منہ پھولا ہوا تھا، نیلی آنکھوں سے گلے ٹپک رہے تھے۔

''جناب کہاں تھے؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے پوچھنے کا کلی حق رکھتی ہو۔ میں سوچوں کے تیز بہاؤ میں گولے کھانے لگا، بمشکل سنبھلا تو معاملہ سچ بتا دیا۔

''دوستوں کے ساتھ تعلقات کی تجدید کرنے باہر نکل گیا تھا''۔ اس کی تیز نگاہوں کا تریاق میری پیار بھری نظروں میں موجود تھا۔

''میری تنہائی کا بھی خیال کر لیا ہوتا''۔ اس کے لہجے میں اپنائیت، شکوے اور جذبوں کی سچائی کا امتزاج تھا۔ میں نے قصداً مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو جذبوں کا گلستان اس کے رخساروں پر بھی کھل گیا۔ میرا دل انجانے ڈھنگ سے دھڑکنے لگا۔ اگلے پل اس کے جذبے مجھے شبنم کی طرح فرحت افزاء بھائی دینے لگے۔ وہ میرے ساتھ کمرے میں چلی آئی۔ میں حیران ہوا،

آغاز کلام پر اس نے برصغیر کی لوک داستانوں پر سوال شروع کردیئے۔

''میں لوک داستانوں میں دلچسپی رکھتی ہوں''۔ وہ بولی۔ ''اس ناتے ورلڈ لٹریچر کے انجانے گوشے بھی کھنگالتی رہتی ہوں''۔ اس نے کہا۔ اس دم میری طرح اس کے رویے بھی اس پر بھاری تھے۔

''شغل اچھا ہے، اس سعی بے کار پر کیا تمہیں کچھ ملا بھی؟'' میں نے سرسری سا سوال کیا۔ کوشش تھی کہ بشمول اس کے تمام صورتِ حال سنبھال لوں۔

''انواع انسانی کے بیچ حقیقی جذبوں کی یکسانیت، ہر پہلو یہی ملا''۔ اس نے جواب دیا تو میں حیران ہوگیا۔

''مجھے تمہیں سنجیدگی سے لینا پڑے گا''۔ میں نے اسے کہا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ خاموش رہی مگر اس کی جھیل سی نیلگوں آنکھوں سے چھلکتے چاہت بھرے تاثر نے مجھے گہرے تذبذب میں مبتلا کردیا تھا۔ میرے وجود میں نرم جذبوں کے کنول کھلا دیئے تھے۔

سہ پہر کی چائے ہم نے رہائش گاہ کی ٹی اینڈ کافی شاپ میں پی۔ عام امریکیوں کی طرح لز کو ہر وقت منہ چباتے رہنے کی عادت تھی۔ وہاں اس وقت اسے مطلب کی غذا بھی مل گئی، فریش بیکڈ فش۔ وہ جانتی تھی کہ اس کھاجے میں میں بھی اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔

میری اس سے مشرقی اقدار اور مغربی تمدن پر بات ہوئی تو بحث میں تبدیل ہوگئی۔ میں نے انداز مغرب میں بغیر نکاح، بطور فرینڈز رہنے پر اعتراض کیا تو وہ بھی ہمارے اطوار واقدار پر حیران نظر آئی۔

''کیا انصاف ممکن ہے کہ دو ایسے افراد کو شادی کے بندھن میں یکجا کردیا جائے جنہوں نے اس سے پہلے ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھی ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

جواباً میں نے اسے مختلف روایتوں اور رسوم ورواج سے آگاہ کیا۔ اس سلسلے میں دینی ہدایات پر بھی بات کی تاکہ درست نقطہ نظر اس کے سامنے آجائے۔

''ہمارے ہاں لڑکی اگر مناسب عمر میں ڈیٹنگ شروع نہ کرے تو والدین اسے ماہرین نفسیات کے پاس لے جاتے ہیں''۔ لز نے مجھے بتایا۔ ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ ہمارے فیملی سسٹم کی دلدادہ دکھائی دینے لگی۔ کمرے سے باہر نکلے تو کرسمس نائٹ کی رونقیں شروع ہو چکی تھیں۔ مسیحی افراد عمارت کے ہال میں موزوں تقریب منعقد کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے مجھے عمارت کے بیرونی برآمدے میں بیٹھ جانا اچھا لگا۔ یخ بستہ ہوا کے جھونکے سبزہ زاروں میں مچل رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً برسنے والی بارش نے نباتاتِ ارضی کو سنوار دیا تھا اور قرب وجوار میں آویزاں برقی روشنیوں نے شام کے مناظر کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ میرا دھیان سبزہ زار میں نصب بھاری فاؤنٹین میں کھب کر رہ گیا جس کی آغوش سے ابھرتے ہوئے آبی قطرے بارش کی بوندوں میں ادغام پارہے تھے اور فاؤنٹین کے اطراف میں سجی رنگ برنگ روشنیوں کے ہالے ان نقرئی موتیوں میں رنگ برسا رہے تھے، تمام سماں رنگ ونور کی بارات بن کر رہ گیا تھا۔

یکا یک فلک برفانی گالے سوئے زمین برسانے لگا جو فوراً ہی لاتعداد نظر آنے لگے۔ گہری شام عمارت کے بیرونی گوشوں میں آنکھوں کو خیرہ کرتی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ برفانی رنگ نکھرے تو اس تابناکی میں بڑھ کر جلا پانے لگے، پھر آسمانی برف تہہ در تہہ زمین پر فرش بچھانے لگی۔ میں نے یخ بستگی بدن پر محسوس کی تو جسم پر لپٹے لباس کا جائزہ لیا، پھر فوراً ہی اوورکوٹ کے بٹن بند کرلئے۔ انواع انسانی کے مختلف افراد ادھر اُدھر کھڑے فطرت کے مناظر سے یکساں لطف اندوز ہو رہے تھے۔

عمارت کی اندرونی اطراف میں بھی سجاوٹ نمو پا

رہی تھی۔ کرسمس کا بڑا سا مصنوعی درخت انٹرنس میں ایستادہ کر دیا گیا تھا جس میں ہمہ رنگ برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ ایک بڑا سا ستارہ درخت کی اوپری سمت جھلملا رہا تھا۔ آراستہ راہداریوں میں بھی سج دھج کم نہیں تھی۔ چند خصوصی کاسٹیوم بھی دکھائی دے رہے تھے جن کا تعلق کسی طور کرسمس نائٹ سے بنتا تھا۔ کرسچین ساتھیوں نے عمارت کے تمام مکینوں کو کرسمس کی تقریب میں مدعو کر رکھا تھا۔

گزرتی ہوئی رینا کے ساتھ تہوار کی رونق بڑھ رہی تھی۔ نصف اللیل کے وقت یہ گہما گہمی اپنے عروج پر پہنچ گئی اور مرکزی ہال میں جشن کا سماں برپا ہو گیا۔ رات کے بارہ بجتے ہی سنگا کلارا بھی تقریب پر پہنچ گیا۔ لز مجھے اپنے مخصوص انداز میں ملی۔ وہ موقعے کے مطابق پُروقار دکھائی دے رہی تھی۔ سنورنا وہ جانتی تھی۔ لباس کے چناؤ میں اس کا ذوق انفرادی اور جداگانہ تھا۔ سفید رنگ اپنی اقسام میں اس پر جچتا بھی تھا۔ اس رات اس کا بناؤ سنگھار بظاہر ادھورا نظر آتا تھا مگر تمام تر دھیمے رنگوں کے ساتھ مکمل تھا۔ ان رنگوں میں اس کی فطری خوش رنگی اور شوخیاں بھی شامل تھیں۔ اس نے ہال میں بنا مرکزی سٹیج سنبھال لیا اور مدھ بھری طرز میں خوبصورت نغمات سنائے۔ اس بیچ اس کا انداز ہر کسی کو پُرزیبائش لگا۔ میں انگریزی نغموں کی شیرینی اور لز کی خوش نوائی میں کھویا رہا۔ حاضرین نے بعد ازاں تقریب کی کامیابی میں بھرپور حصہ لیا، جس کے بعد کیک کاٹا گیا، پھر ضیافت کا مرحلہ آ گیا۔ نوعمر خواتین و حضرات نے ایک دوسرے پر پھولوں کی کلیاں بھی نچھاور کیں۔ موقع پا کر میں نے لز کو اپنی پسندیدہ خوشبو، لی روز کا تحفہ دیا، جو اس نے مخصوص ادا کے ساتھ قبول کر لیا اور گرمجوشی سے اظہارِ تشکر کیا۔ ہنسی کھیل کچھ دیر جاری رہا، پھر رقص و سرود کی محافل برپا ہو گئیں۔ میں جب اپنے کمرے میں لوٹا تو رات بھیگ چکی تھی۔ کئی افراد اس وقت جشن منانے باہر بھی جا رہے تھے۔

عمارت کا اندرونی ماحول بہت گرم تھا، مگر کھڑکی کے راستے میں نے باہر جھانکا تو ہر طرف برف کی تہیں لگ چکی تھیں اور کئی من چلے سفید سنو جیکٹیں پہنے مختلف انواع کے سنو مین بنا رہے تھے۔ ان منچلوں میں نوعمر لڑکیاں بھی شامل تھیں جن کے ہاتھوں میں آئس کریم کے من پسند فلیور تھے، آگ پر سلگتے گوشت کئی دوسروں کے جی للچا رہے تھے۔

اگلے روز سو کر اٹھا تو لوگ چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ آسمان پر سے برف گرنا بند ہو چکی تھی جبکہ سورج کی ہلکی تمازت برفانی ماحول کو سہلا رہی تھی۔ تیز یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں اور مزید برفباری کی توقع تھی۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سڑک کے پار قریبی چرچ پہنچ گیا جس کے سبزہ زار میں جگہ جگہ بنچ آویزاں کئے گئے تھے اور لوگ ان پر بیٹھے دھوپ تاپ رہے تھے۔ چرچ کے اندر لیکچر شروع ہو چکے تھے۔ اسی وجہ سے اکثر بنچ تیزی سے خالی ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد فادر کے تقریری میسج طول و عرض میں گونجنا شروع ہو گئے۔

''پیار انسانی خمیر کا جزو لازم ہے''۔ فادر نے کچھ اس طور میسج شروع کیا، پھر کہا۔ ''پیار انسانی جبلت بھی ہے، پھر تمام نوع انسانی میں پیار کا اظہار یکساں ہے۔ ممتا کا جذبہ خاتون کے ماں بنتے ہی نمو پانے لگتا ہے۔ وہیں سے بچے کے اندر پیار و محبت کے جذبے پروان چڑھتے ہیں۔ ماں کے بدن کا لمس نومولود کو پیار کی پہچان کراتا ہے۔

بچہ اپنے نمو کی منازل طے کرتا ہے تو اس کی کائنات میں کئی نئے ناطے جنم پاتے ہیں۔ اسی قدر اس کا انسانوں کے لئے پیار بھی بڑھتا جاتا ہے۔ تمام نوعِ انسانی کا لہو سرخ رنگ رکھتا ہے، اسی طرح میں رجا بسا

جذبہ الفت بھی یک رنگ ہے۔ یہ دلوں میں گھر کرتا ہے تو رنگ ونسل انسانی کونہیں دیکھتا، بلکہ اپنی راہیں دلوں میں استوار کرتا ہے، نوع انسانی کو ایک ہی طرح متاثر کرتا ہے اور اپنے ہر انگ میں ہر طمع سے بے نیاز رہتا ہے''۔

فادر کی ڈھیر ساری باتیں سن کر مجھے احساس ہوا کہ ہماری دنیا میں رائج مذاہب اور مارل کوڈ ایک ہی درس دیتے ہیں، وہ ہے انسانی پیار اور اخوت کا۔

کرسمس کی شام مجھے لز نظر آئی تو حسب معمول تر و تازہ اور خوشگوار دکھی۔ رات بھر کے جشن کی تھکاوٹ اس پرنہیں تھی۔ میں اس کے شخصی اعتماد پر کسی حد تک حیران تھا کیونکہ اس کی ذمہ داری ہسپتال میں انتہائی اہم تھی، مگر اس کے منفرد شخصی اوصاف نے اسے اس کا اہل بنا دیا تھا اور اس کی بالغ نظری نے اسے شاید زیادہ ممتاز کر دیا تھا، اتنا کہ وہ سینئر سرجنز کے ساتھ بھی اپنا باہمی تعلق استوار رکھتی تھی۔ امریکن ہونا شاید اس کی گھٹی میں شامل ہو چکا تھا اور اس کی عادات میں چغلی کھاتا تھا۔

''آج ہائیڈ پارک چلتے ہیں''۔ اس نے مجھے رائے دی۔ میں اپنی جانب اس کی بڑھتی ہوئی رغبت پر بہکنے لگا۔ کسی نتیجے پر پہنچنا میرے لئے مشکل تھا۔ اس کے اردگرد کچھ دیگر لوگ میری نسبت کہیں زیادہ ممتاز تھے۔ اس کی فرمائش پر بہرحال سوچنا ضروری تھا۔

میں نے فون پر ریڈیو کیب سے رابطہ قائم کرلیا اور تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد ہم سینٹرل لندن کی جانب محوِ سفر تھے۔ اس دم بھی ماحول پر برف کا عنصر غالب تھا۔

گاڑی سے اترے تو لز میرے پہلو میں چلنے لگی۔ مغرب میں لڑکیوں کے ساتھ اس طرح چلنے میں ایک منفرد انداز اختیار کیا جاتا ہے، ورنہ رفقاء میں باہمی اجنبیت کا پہلو نظر آنے لگتا ہے، جو لز کو پسند نہیں تھا۔ ہم تھوڑی دیر پارک کی پگڈنڈیوں پر چلتے رہے۔ اس بیچ دنیا کے متعدد جوڑے زندگی کی پگڈنڈیوں میں گم دکھائی

دیئے، کچھ تو گمراہ بھی تھے اور رومانس کی حدیں چھوڑ رہے تھے۔

''ایسے مناظر ہمارے ہاں دکھائی نہیں دیتے''۔ میں نے لز سے کہا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''باہم محبت ہو جائے تو پھر اظہار میں تکلف کیسا؟''

''سمجھ لو کہ یہاں اگر اظہار روز روشن کی طرح عیاں نظر آتا ہے تو ہمارے ہاں یا تو وہ شب کی تاریکی اوڑھ لیتا ہے، یا پھر تنہائی کی ردا''۔

''میں جانتی ہوں آپ کے ہاں جوان دلوں کا کھلے بندوں ملنا معیوب خیال کیا جاتا ہے''۔

''جائز حدود میں رہ کر مل سکتے ہیں۔ اس میل جول میں بوالہوسی شامل نہیں ہونی چاہئے''۔

''آپ کے ہاں محبت کے انجام انتہائی تلخ بھی ہو جاتے ہیں''۔

''ہاں، ہمیں اپنی روایتیں کم عزیز نہیں ہیں''۔

''میں نے برصغیر کے ادب میں چند لوک داستانیں پڑھی ہیں۔ انارکلی سے بھی واقف ہوں''۔

''بہت پہلے غالباً مغرب میں بھی یہی روایتیں رائج ہوا کرتی تھیں''۔

کیا اب بھی مشرقی لڑکیاں محبت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں؟''

''ہاں''۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''طبقاتی تفریق ایک بڑی وجہ ہوسکتی ہے''۔

''اور مذہب؟''

''آپ کا مذہب بھی اس کھلے میل جول کی اجازت نہیں دیتا، جو آپ کے ہاں رائج ہے۔ ہمارا مذہب شادی کا طریقہ واضح کرتا ہے''۔

''میں نے سنا ہے کہ مشرقی عورت کسی دوسرے کا

پیار دل میں سجائے زندگی اپنے مجازی خدا کے ساتھ وفا شعاری سے بسر کردیتی ہے"۔

"میرے خیال میں عورت نوع آدم میں بے بسی کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ میں نے جدید مغربی شاعری بھی پڑھی ہے، جس میں عورت مرد ذات کی منت کرتی نظر آتی ہے کہ وہ اس سے یوں پہلوتہی نہ کرے۔ وہ اسے گزرے ہوئے اوقات کے واسطے دیتی ہے اور اس بیچ اس کے لئے آنسو بھی بہاتی ہے"۔

"مرد فطرتاً ہرجائی کیوں ہے؟"

"شاید وہ دماغ سے زیادہ سوچتا ہے اور عورت دل سے"۔ میری اس بات پر لز نے قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی رہی۔

ہم نے لکڑی کا ایک بنچ صاف کیا اور درختوں کے جھنڈ میں قدرے بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ لز نے اپنی بات جاری رکھی۔

"کیا آپ پہلی نظر میں محبت کے قائل ہیں؟"

"ہاں"۔

میرا اقرار سن کر لز نے پرس سے ٹی روز کا پرفیوم نکالا اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھا، پھر مائع اپنے بدن پر سپرے کرلیا۔ بعدازاں وہ اپنے سیل فون سے کھیلنے لگی۔

"کیا آپ کو بھی کوئی پہلی نظر میں اچھا لگا؟"

"ہاں، ایک لڑکی اچھی لگی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھا دیر تک باتیں کرتا رہا۔ وہ بھی میری شخصیت میں کھوسی گئی تھی"۔

"پھر کیا ہوا؟"

"ہم دونوں جب ایک دوسرے کے شخصی حصار سے باہر نکلے تو احساس ہوا کہ میرے وہاں سے جانے کا وقت آچکا تھا"۔

"ایسا اچانک کیوں ہوا؟"

"لز! ہم کسی کام کے سلسلے میں ملے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی شادی شدہ تھی"۔

بات سن کر لز نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا، ہنسی پھر توقف کے بعد بولی۔ "کوئی مغربی لڑکی آپ کو دل دے بیٹھے تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟"

"مجھے اس کی ذہنی صلاحیتوں پر رشک گزرے گا"۔

لز پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ اس بیچ وہ میرے اتنا قریب آچکی تھی کہ اس کے سانسوں کی حدت میں اپنے وجود پر محسوس کررہا تھا۔

موسم کی خرابی میں گزرتے وقت کے ساتھ اضافہ ہورہا تھا۔ تھوڑی دیر میں آسمان پر سے برف پھر گرنا شروع ہوگئی۔ اب لز کو کافی کی حاجت بھی محسوس ہورہی تھی مگر ہائیڈ پارک میں کسی ریستوران کا وجود نہیں تھا۔ جلد ہی برفانی طوفان میں شدت آگئی۔ ہم مجبوراً تیز قدموں سے چلتے ہوئے پارک کے اس حصے میں جا پہنچے، جو شخصی آزادی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا اور اس میں کوئی بھی شخص، جو چاہے بول سکتا تھا۔ اس وقت ایک ادھیڑ عمر خاتون وہاں مجمعے سے خطاب کررہی تھی، ساتھ وہ رو بھی رہی تھی۔ ہم ایک طرف کونے میں بیٹھ گئے۔ وہ خاتون آنسو بہاتے ہوئے فریاد کررہی تھی۔

"میں نے میری سے سچی محبت کی تھی۔ ہم دونوں نے شادی کی، پُرمسرت گھروندے کی داغ بیل ڈالی اور بڑے سہانے دن گزارے۔ خدا نے ہمیں دو بیٹے بھی عطا کئے۔ میں اپنے خاوند سے ہمیشہ باوفا رہی، مگر وہ بے وفا نکلا۔ ہمارے بیچ تھوڑے بہت جھگڑے ہوئے تو اس نے مجھے چھوڑ دیا اور اپنی سابقہ گرل فرینڈ کے ساتھ رہنے لگا۔ ایک روز اس نے خود مجھے یہ بتا دیا اور باہمی طلاق کی رائے دی۔ میں نے اپنی تمام تمنائیں بچوں کی خاطر قربان کردیں اور انہیں پروان چڑھایا۔ ان کی شادیوں میں مدد کی۔ آج وہ کسی قابل ہو چکے ہیں تو مجھے اولڈ

ہاؤس میں پھینک دینا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ مجھے گھر سے نکال کر میری بہتر نگہداشت کر سکتے ہیں۔ کوئی بتائے کہ میرا قصور کیا ہے، جو مجھے اب یہ سزا ئیں بھگتنی ہیں؟''
یہ کہہ کر وہ خاتون زور زور سے رونے لگی۔

میں نے لز کی طرف دیکھا۔ وہ بھی پریشان نظر آئی۔ ہم عمارت سے باہر نکل آئے اور یخ بستہ ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے برف کے گالوں میں باہر کی طرف قدم بڑھانے لگے، پناہ کی خاطر قریبی ریسٹوران سے کھانا کھایا، کافی پی اور وقت گزارنے کے لئے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

نئے دن کا آغاز ہوا تو تمام دوستوں نے نت نئے پروگرام بنا لئے۔ ہمارے پاس چھٹیوں کا یہ آخری روز تھا۔ لز ویسٹ لندن جانا چاہتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس طرف زیادہ تر انڈین آباد ہیں۔ بادل نخواستہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ سکھوں کے سٹور سے اس نے مختلف اچار اور میوہ جات خریدے، پھر اسے قیمہ کریلے کھانے کا شوق چرایا مگر میں نے اسے اس تجربے سے منع کیا کیونکہ کریلوں کی نت نئی قسمیں اگانے کے باوجود سفید فام افراد اسے اپنا لینے سے قاصر رہے ہیں۔ متبادل کے طور پر میں نے اسے چکن تکہ کھانے کی ہدایت کی اور ممبئی والوں کے ریسٹوران لے گیا جہاں انہیں مصالحے ہلکے رکھنے کی درخواست کی پھر بھی کھانے کے دوران لز کی ناک اور آنکھوں سے مسلسل پانی بہتا رہا۔ بعدازاں اس نے اعترافاً کہا کہ کریلہ اگر اس سے بھی خطرناک ہے تو اس سے تو یہ ہی بھلی۔

اس شام لز نے مجھے اپنی طرف سے دعوت دی اور آغازِ شب ہی سے میرے میزبان بن گئی۔ اسے کسی نے دریائے ٹیمز کے کنارے ایک ریسٹوران کے بارے میں بتایا تھا، جہاں سنیکس بڑے عمدہ تیار کئے جاتے اور ان میں گوشت بھی حلال استعمال کیا جاتا تھا، لز کو اس بارے

میں یقین تھا۔ میں نے اس کے اصرار پر وہاں جانے کی ہامی بھرلی۔

تھوڑی دیر ہم دریا کے کنارے گھومتے پھرے اور موسم کے حُسن کا لطف اٹھاتے رہے، ہلکی گرج چمک کے ساتھ بوندا باندی شروع ہوگئی اور دریا کی سطح پر وہی محیط بننے لگے، جن کا عکس ہماری حیات کے قرطاس پر بھی موجود تھا۔

ہم ریسٹوران پہنچے تو میگھا میں تسلسل کا عنصر جاگزیں ہو چکا تھا۔ سبزہ زار میں پانی مچل رہا تھا۔ موسمی پھول سبزے کے گلدستے میں لہک رہے تھے۔ عمارت کے وسیع برآمدے میں بیٹھ گئے وہاں سے دریا کی سطح پر روشنیوں کا کھیل مسحور کن دکھائی دیتا تھا۔ آگ کے الاؤ برآمدے میں جابجا بھڑک رہے تھے۔ شعلے لز کے گالوں میں رقصاں نظر آنے لگے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور لو صوفہ پر میرے پہلو میں براجمان ہوگئی۔ اس دن مجھے اس کے وجود میں تلاطم خیز جذبوں کا احساس ہوا جو نمایاں صورت اس کے چہرے پر عیاں ہوتے گئے تھے۔ میں نے پہلی بار اس کی یہ کیفیت دیکھی تھی۔ اظہار کی شدت میں توازن لاتے ہوئے وہ جذبوں کو صوت دے رہی تھی۔

''ڈاک، کیا آپ یقین کریں گے کہ اپنی زندگی میں نہ کبھی میں نے پدرانہ شفقت دیکھی اور نہ کبھی اپنے باپ کو دیکھ سکی۔ باپ میرا والد ہو کر بھی میرا نہیں تھا'' لز نے کہا، پھر نظریں جھکا لیں۔ ذرا دور پانیوں میں ہلچل سی مچی، پھر میگھا شدتِ جوش میں دریا پر برسنے لگی۔ میری نگاہ لز کے چہرے پر مرکوز ہوگئی۔ وہ جذبوں کی بے قراری میں ٹھہراؤ کے لئے سعی کر رہی تھی۔

''واقعی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا، اس کی بات پر توجہ دی۔

''یس ڈاک، میں نے اپنے باپ کی تصویر دیکھی تھی، صرف لمحہ بھر۔ میری ماں مجھے یہ چہرہ دکھانا چاہتی تھی مگر میں زیادہ نہ دیکھ سکی۔ پھر بھی وہ تصویر میرے ذہن کی گہرائیوں میں اتر گئی اور کسی نہاں خانے میں محفوظ ہوگئی۔ میں نے بہت کوشش کی مگر چاہ کر بھی اس عکس کو اپنے دماغ سے نہ اکھاڑ سکی'' لز بولی، پھر تھوڑی دیر لمحوں کے الجھاؤ میں گم رہی۔ اس بیچ اس کے چہرے پر تغیر منڈلاتے رہے، وہ دوبارہ اس طرح گویا ہوئی۔

''پہلی نظر آپ کو دیکھا تو دل جیسے پھٹنے لگا تھا۔ اس دم میں بمشکل سنبھلی تھی۔ میرے خدا! یقین کریں، آپ کو دیکھ کر میری نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہی صورت تھی، جو ماں کی دکھائی فوٹو نے میرے ذہن میں نقش کر دی تھی، وہی قد بت تھا، ہو بہو وہی چہرہ، وہی ہیئر سٹائل، وہی آنکھیں اور مسکان میں وہی شرارت۔ میں نے آپ کو دیکھا تو بُری طرح چونکی، پھر یک دم ماضی کے اس دور میں جا پہنچی جہاں میں ایک ننھی بچی تھی، تصور میں بڑے پیار سے ان بانہوں میں جھولنے لگی جو میری پہچان ہو سکتی تھیں۔ مگر یہ لمحے وضعی تھے، حقیقی نہ تھے، طوالت نہ پا سکے۔ میں نے وقت کا سفر واپس طے کیا تو بے اختیار آپ کی بانہوں کی مضبوطی میں کھوگئی جہاں میری محبت نمو پا سکتی تھی اور مجھے وہ مردانہ پیار اور سہارا مل سکتا تھا جس کے لئے میں برسوں ترستی رہی تھی۔ اہم یہ کہ میری خواہش حقیقت بھی بن سکتی تھی'' لز نے کہا اور نظریں جھکا لیں۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، وہ نفسیاتی جذبوں کے بوجھ تلے اپنی انگلیاں چٹخا رہی تھی اور چاہت کی اس معراج سے میری طرف متوجہ تھی، جو اس کے لہو میں موجزن تھی۔ وہ دوبارہ بولنے لگی۔

''میں اپنے والد کا نام نہیں جانتی'' وہ یکدم میری آنکھوں میں جھانکنے لگی تھی، پھر گفتگو میں آگے بڑھی۔ ''میری ماں نے مجھے میرے والد کا نام بتانے کی کوشش کی تھی، مگر میں یہ پہچان نہیں جاننا چاہتی تھی، میں نے

کانوں میں انگلیاں داب لیں اور زور زور سے چیخنے لگی۔ والد کو دھوکہ باز کہا۔ آج بھی مجھ سے متعلقہ تمام کاغذوں میں میری ولدیت کا خانہ خالی رہتا ہے۔ دکھ ہے کہ میرا والد میری ماں کا بوائے فرینڈ تھا، جو میرا وجود نہیں چاہتا تھا، نہ ہی میری تولید پر مجھے دیکھنے آیا۔ میری پیدائش کے بعد وہ میری ماں سے علیحدہ ہو گیا اور کہیں دور چلا گیا۔ میرے ساتھ اس کا تمام تعلق محض ایک پکار کا تھا جو اس نے ایک روز میرے لبوں سے اتفاقاً سن لی تھی۔ ماں کہتی ہے کہ وہ رومانوی شہزادہ تھا، اچھا انسان نہیں تھا۔ اس کا تعلق سپین سے تھا اور ہسپانوی ہونے کے ناطے اس کی آنکھیں سیاہ تھیں اور رنگ کھلتا ہوا تھا۔ مذہبی طور پر وہ کٹر یہودی تھا۔ کبھی اس میں انسانیت کا فقدان واضح دکھائی دینے لگتا تھا'' لز مسلسل بول رہی تھی۔

''ڈاک، میری ماں ایک فاحشہ عورت تھی۔ اس نے اپنے حسن کا ناجائز استعمال کیا اور کال گرل کے طور پر مشہور ہوئی لیکن میرا کیا دوش تھا، جو اس کا وجود میرے نصیب کے ساتھ نتھی ہو گیا''۔

''کیا تم اپنی ماں کے ساتھ نہیں رہتیں؟'' سوال میرے ذہن میں آیا۔

''نہیں، میں اپنی ماں کے نظریات سے متفق نہیں ہو سکی، اس لئے میں نے اسے چھوڑ دیا تھا''۔ لز نے جواب دیا۔

بارش زور پکڑ چکی تھی۔ برآمدے میں بھڑکتے ہوئے آتشیں شعلے یخ بستہ ہواؤں کے مقابل لہرا رہے تھے۔ تپش میں الجھتے سرد جھونکے کبھی جسموں کی حرارت بھڑکانے لگتے۔ لز اپنے لمس میں گرمجوشی اور پیار کی حدت سے مالا مال تھی۔

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ اس درمیان میں نے یا میں ایپل جوس پیا تو لز کو سکاچ کی حاجت ہونے لگی۔ شوخی اس پر چھانے لگی۔ بنیادی طور پر وہ شوخ مزاج تھی مگر سچ تو یہ ہے کہ اس کی داستان نے مجھے بھی افسردہ کر دیا تھا۔ اب میرا قلب ذہن کے پہرے توڑ کر اس کی طرف مائل تھا۔ تمناجی میں گھر کر آئی تھی کہ کسی طور اس کے زخموں پر باہمی پیار اور اعتماد کے پھاہے رکھ دوں۔ اس کی وجہ یہ احساس بھی تھا کہ عورت ہر معاشرے میں خونچکاں کہانیاں لئے پھرتی ہے، جو مرد اسے عطا کرتا ہے۔ مرد کے بولوں سے زخم زخم ہو جانے کے باوجود وہ اسی کا سہارا تلاش کرتی ہے، پھر اس سفرِ نو میں بھی اس کا ہم سفر اسے کبھی مزید لوٹ لینے سے بھی اجتناب نہیں کرتا۔

اگلی صبح ہمارا تعلیمی پروگرام شروع ہو گیا۔ توقع کے عین مطابق مصروفیت حدیں چھونے لگی۔ یکدم اتنا بوجھ پڑا کہ الاماں۔ سکھانے والے ڈاکٹر زیادہ تر یورپین تھے۔ چند برطانوی سرجن بھی ان میں شامل تھے۔ ہم صبح سویرے آپریشن تھیٹرز پہنچ جایا کرتے تھے اور رات گئے تک مشغول رہتے۔ مغربی اقوام میں تربیت اور کام کے معاملے میں رعایت نہیں ہوتی۔ لز آپریشن تھیٹر میں سینئر نرس تھی۔ اپنی ذمہ داریاں بہ درجہ اتم نبھاتی تھی۔ وہ سرجنز کو آپریشنز کے مطابق نرسنگ سٹاف مہیا کیا کرتی تھی۔ اس وجہ سے تمام دن مصروف کار رہتی، کیونکہ ہسپتال میں ایک ہی وقت میں کم از کم دس سرجیکل آپریشن وقوع پذیر ہو رہے ہوتے تھے۔ معمول تھا کہ وہ کسی ایک جراحت میں اپنی ڈیوٹی میرے ساتھ بھی رکھتی تھی۔ اس دوران مجھے اس کی پیشے سے وابستگی اور کام میں انہماک کا بھرپور احساس ہوتا تھا۔

ایک صبح مجھے یاد ہے، اس روز علی الصباح ایسٹ لندن میں ٹریفک کا ہولناک حادثہ ہوا تھا، ایک ہندوستانی فیملی کی کار بے قابو ہو کر بڑے ٹرک سے ٹکرا گئی تھی جس

مر گئے۔ ڈاکٹروں نے انہیں بچانے کی ناکام کوشش کی۔ اس غم میں شام لز اتنا روئی کہ اس کے ہم زبان سرجن بھی پریشان ہو گئے۔ آخر کار دل کو تشفی دینے کے لئے اس نے ایک نائجیرین لڑکی کو اپنا خون دیا، جس کا زندہ بچ جانا بظاہر مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ یہ نوعمر لڑکی اپنے ''سویٹ ڈیڈی'' کے ساتھ موٹر سائیکل پر سفر کر رہی تھی کہ ٹریفک حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس کے ''سویٹ ڈیڈی'' نے خون دینے سے انکار کر دیا تھا۔

ایک شام معلوم ہوا کہ لز کی ماں برطانیہ آ رہی تھی۔

''تم اپنی ماں سے کس قدر محبت کرتی ہو؟'' میں نے لز سے پوچھ لیا۔ بعد ازاں اپنے سوال پر شرمندہ بھی ہوا۔ لز میری طرف دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''کبھی مجھے اس پر پیار آتا ہے تو کبھی ترس۔ بعض اوقات نفرت بھی ہونے لگتی ہے مگر یہ رشتہ ایسا ہے جو بدلا نہیں جا سکتا''۔ اس کی ماں فرانس سے آ رہی تھی، بذریعہ ریل، اس زیر سمندر چینل ٹنل کے راستے جو دونوں ملکوں کو ملاتا تھا۔ ملی تو بڑی پُر وقار دکھائی دی۔

ہم سینٹرل پارکس کے لیک ویو ریوالونگ ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے تھے، جہاں لوگ کورسز میں کھانا کھایا کرتے تھے۔

''مجھے لندن کے لوگ پسند نہیں''۔ لز کی ماں میری بولی۔ ''ان کے دل یہاں کی گلیوں کی طرح تنگ ہیں''۔ اس نے ناگواری کے عالم میں کہا، پھر اپنی کہانی سنانے لگی۔ اس بابت چند تعارفی جملوں کے بعد گویا ہوئی۔

''لز کا والد نین سٹائین مجھے بہت چاہتا تھا۔ مجھے بے کسوں کے گلشن کا پھول کہا کرتا تھا۔ خود وہ امیر تھا اور وجیہہ بھی، اپنا بزنس بڑھا رہا تھا''۔ میری نے بتایا، کہا کہ ''سچ تو یہ ہے کہ میں اس پر جان چھڑکتی تھی، وہ بھی میرے حُسن پر فریفتہ تھا' بچی پیدا ہوئی تو وہ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ غربت کے باعث میرے والدین نے بھی مجھے یہودی سے شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی''۔

وہ توقف کے بعد بولی، پھر پیار سے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آپ نے اس سے شادی کیوں نہیں کی؟'' میں نے سوال کیا تو وہ غمگین ہو گئی۔

''کر لیتی، مگر وہ سپین ایسا گیا کہ کبھی واپس نہ لوٹا۔ میں نے اس کا انتظار کیا، پھر مایوس ہو گئی۔ میں نوکریوں کی عادی نہیں تھی۔ حُسن حدوں سے بڑھے تو کبھی دھج میں بے قابو ہو جاتا ہے، ایسے میں خطاکاری منزل بن جاتی ہے۔ پیسے کی چمک غربت میں بہت کچھ کروا دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں امراء میں بے حد مقبول ہو گئی۔ دنیا کے مختلف ممالک میں بھی جانے لگی''۔ میری نے کہا، پھر طویل سانس لی جو سسکی میں تبدیل ہو گئی۔

''اور بیٹی؟'' میں پوچھا۔

''ڈے کیئر سینٹر کی ایک سہیلی اسے راتوں کو بھی اپنے ہمراہ رکھ لیا کرتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اسے میری ماں نے سنبھال لیا''۔ میری نے لز کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے بدن پر تھپکیاں دیتی رہی۔

''مغرب میں سیکس اس قدر عام ہے کہ مجھے تو کال گرل کا تصور بھی بے معنی لگتا ہے''۔ میں نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے''۔ وہ بولی۔ ''مرد ذات نے اپنی تسکین کے راستے کم نہیں کئے، بلکہ بڑھا لئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرتِ انسان بنیادی طور پر اختراعوں کا مجموعہ ہے''۔ میری نے جواب دیا۔

لز اس دم بھوک سے بے قرار ہو رہی تھی۔ اس نے شکر کیا جب لنچ کے کورسز کا آغاز ہوا۔ ''میری بیٹی نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا''۔ میری نے گفتگو جاری رکھی۔ ''آپ واقعی نین سٹائین کے ہم شکل ہیں۔ اس حقیقت نے لز کی کئی حسوں پر گہرا وار کیا ہے اور اسی ناطے وہ آپ کو چاہنے بھی لگی ہے۔ انسان بے شک

پیچیدہ مخلوق ہے، کبھی چاہت اور نفرت کی ارتقائی بنیادوں پر خود بھی پریشان ہو جاتا ہے، کبھی جذبوں پر اس کا اختیار بھی نہیں رہتا''۔ میری نے وضاحت کی۔

''یہی کیفیت میں جانتا ہوں''۔ میں نے جواب دیا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ لز کو اپنا لیں۔ وہ یقیناً باوفا لڑکی ثابت ہو گی''۔ میری نے رائے دی۔ لز کی آنکھوں میں اقرار کی چمک مچلنے لگی تھی، پھر حیا کی کرن اس کے گالوں میں نکھر گئی۔ اب وہ میری آنکھوں میں مسلسل جھانک رہی تھی۔ اگلے پل اس نے میرا بازو تھام لیا۔

''میں اپنے احباب سے مشورہ کروں گا''۔ میں نے ہر دو کو یقین دہانی کرا دی۔

اگلا روز ہفتے کا تھا، لز کی چھٹی تھی جبکہ مجھے شام کے وقت ہسپتال جانا تھا۔ ویڈیو لنک پر تعلیمی سیشن تھا جو چار گھنٹے پر محیط ہو سکتا تھا مگر میں نے آخری ایک گھنٹہ چھوڑ دیا۔

ویک اینڈ کی شام لندن کی سڑکوں پر رش تھا۔ رہائش گاہ پہنچا تو لز میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی ماں امریکہ کے لئے روانہ ہو چکی تھی۔

میں اور لز سیاحت کے لئے نکل کھڑے ہوئیں پہلے بگ بین کے سامنے تصاویر بنائیں، پھر ملینیم برج کی راہ لی۔ ٹیٹ ماڈرن آرٹ میوزیم کے کیفے میں کافی پی۔ دریائے ٹیمز کے گرد یہ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ بعد ازاں مجھے لز کی خاطر لندن آئی کا پروگرام بنانا پڑا۔ وہاں دنیا کا سب سے بڑا فیرس وہیل ہے۔ مجھے ہر قسم کے جھولوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے مگر لز ان سب خرافات کی دیوانی تھی۔ فیرس وہیل سے رات دریا میں جھلملاتی روشنیوں کا منظر انتہائی خوبصورت نظر آتا ہے۔

رات بھیگ چلی تھی جب ہم نے ایک قریبی ریزارٹ کی راہ لی۔ وہاں کے کھانوں کی بہت تعریف سنی تھی۔

ویسے بھی اس رات ہماری ترجیح سی فوڈ تھا۔ ہم نے مختلف قسم کی سمندری خوراک منگوالی۔

''ڈاک! آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟'' لز نے مجھ سے پوچھا۔ انداز سرسری رکھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے گالوں میں سرخی دوڑ گئی۔

''بس، فرصت ہی نہیں ملی''۔ میرے اس جواب پر اس نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

''زندگی میں کیا کیا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے شرارتاً دریافت کیا۔

''لز! سچ پوچھو تو عمر عزیز تعلیم کی نذر ہو گئی''۔ میں نے اپنی ان جائز خواہشوں پر بات کی جو عموماً بے قابو رہی تھیں۔

''کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی؟'' اس نے دوبارہ ذاتی سا سوال کر دیا۔

''کمی تو اس ہستی کی محسوس ہوتی ہے جسے کسی مرحلے پر کوئی پا کر کھو دے، جو ملا ہی نہ ہو اس کی کمی کیسی؟'' میں نے جواب دیا۔ مجھے بھی گفتگو میں لطف آنے لگا تھا۔

''کیا زندگی میں کبھی کوئی اچھا نہیں لگا؟'' لز نے تجسس کا اظہار کیا۔

''اس طرف کبھی دھیان نہیں گیا''۔ میں نے سچ بیان کر دیا۔

''آپ کسی کو تو اچھے لگے ہوں گے؟'' وہ شرارتوں پر اتر آئی۔

میں نے مسکرا کر لز کی طرف دیکھا۔ عادتاً اس دم اسے سکاچ مرغوب دکھائی دی تھی۔ ہم دونوں ہال کے کونے میں بچھے بنچ پر بیٹھ گئے جہاں موسیقی کی تانوں میں روشنیاں بھی مدھم تھیں۔

''ڈاک! کیا آپ نے کسی سے پیار کیا؟''
''نہیں، میں اس نعمت سے محروم رہا''۔
''کوئی آپ پر جان چھڑ کنے لگا ہو تو؟''
''ہمیں حقائق پسند رہنا چاہئے''۔
''کبھی دل پر قابو نہیں رہتا''۔
''کیا تم اجنبی معاشرے میں زندگی گزر سکو گی؟''
''آپ کا ساتھ نصیب رہا تو کوئی مشکل نہیں''۔
''جذباتی فیصلے پچھتاوے کا سبب بنتے ہیں''۔
''میں جذبوں میں بہت آگے نکل آئی ہوں''۔
''آئندہ کبھی واپس لوٹ آنا چاہو تو کیا کرو گی؟''
''ڈاک! میں شادی کروں گی تو آپ سے، ورنہ کبھی شادی نہیں کروں گی''۔
''تم نے وثوق سے وہ کچھ کہا ہے جو ممکن نہیں''۔
''امید ہے کہ آپ مجھے ٹھکرانے کی کوشش نہیں کریں گے''۔
''زندگی لوک کہانیوں سے مختلف ہوتی ہے''۔
''کہانیاں مختلف ہوں، تبھی لوک کہانیاں بنتی ہیں''۔

دیر گئے ہم باہر نکلے تو چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔ سردی تھی مگر موسم صاف تھا۔ لز میرا ہاتھ پکڑ کر چل رہی تھی۔ میں نے پہلے چاند کی طرف دیکھا پھر اس کی جانب تو وہ شرما گئی۔ میرے قریب سمٹ آئی۔ اس وقت اس کی پلکیں جوانی، نیند اور سکاچ کے خمار سے بوجھل ہو چکی تھیں۔ اس کی جسمانی کیمیا میں عناصر غیر متوازن دکھائی دے رہے تھے۔

''زندگی میں کچھ لمحے امر ہو جاتے ہیں''۔ اس نے کہا۔ پھر میرے ہاتھ میں اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ذرا فاصلے پر ریڈیو کیب میں مستعد ڈرائیور ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ لز چاہ کر بھی اسے تنہا واپس نہ بھیج سکی۔ اگلے روز اتوار تھا، مجھے اپنے کورس کے سلسلے میں انٹرنیٹ سے استفادہ کرنا تھا، جو چند گھنٹوں پر محیط رہا۔ اس کے بعد لز نے فرصت بھری شام میرے ساتھ گزاری۔ ہم اس روز سی لائف اکوریم کی سیر کرنے نکل گئے اور پانی کی مخلوق کو اسی کے ماحول میں دیکھ کر لطف اٹھایا۔ لز شارک قسم کی مچھلیاں دیکھ کر سہم گئی۔ اسے اپنی خالہ یاد آ گئی۔

''میری خالہ سعودی عرب سے لندن آ رہی ہیں''۔ میں نے لز کو بتایا تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

''کیا میں ان سے مل سکوں گی؟'' اس نے دریافت کیا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اس پر وہ کچھ اور بھی سہم گئی۔

''میری زندگی کے بڑے فیصلوں میں خالہ ہمیشہ شامل رہی تھی''۔ میں نے لز کو یہ اشارہ بھی دے دیا۔

خالہ کو لندن کے تھیٹرز بہت پسند تھے۔ عادتاً اپنی اولین فرصت میں ڈرامہ دیکھنے پہنچ جاتی تھی۔ مڈایویل انگلینڈ کے کلاسیکل ڈراموں پر وہ جان چھڑکتی تھی۔ میں نے ایک انڈین ہوٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیا تھا۔ شام اسے لز سے ملوایا۔ پھر ہم تینوں نے شیکسپیئر گلوب کی راہ لی۔ کھانوں میں خالہ کو صرف مشرقی کھانے پسند تھے۔ ویسے بھی وہ مشرقی تہذیب و تمدن کی دلدادہ تھی۔

''وہ چڑیل کون تھی؟'' خالہ نے ہوٹل پہنچ کر مجھ سے سوال کیا۔ لز اس وقت جا چکی تھی۔

''کون سی؟'' میں نے بھی جواباً سوال کر دیا۔

''زیادہ چالاک مت بنو۔ جان لو کہ میں نے ہی تمہاری پرورش کی ہے؟''

''بے چاری معصوم سی لڑکی ہے، مدد کی طلبگار''۔

''مسلمان ہے؟''

''نہیں، باپ اس کا یہودی تھا، ماں مسیحی ہے۔ خود کو کرسچین کہتی ہے''۔

''تم سے مدد مانگنے کی وجہ؟''

''انسانی ہمدردی اور میری وجاہت''۔

"مدد نہیں کی جاسکتی"۔
"سچ ہے کہ عورت ہی عورت سے دشمنی کرتی ہے"۔
"تمہاری اور اس کی معاشرتی اقدار میں نمایاں فرق ہے"۔
"پیار کے انسانی جذبے تمام اقدار میں یکساں ہوتے ہیں"۔
"یہ جذبے مشرقی لڑکی میں بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں"۔
"خالو اگر موجودہ خاندانی تمدن میں جدت نہیں لا سکے تو اس میں بے چاری لز کا کیا قصور؟"
"شٹ اپ"۔
میری خوشامد بھی خالہ کا دل نرم نہ کر سکی۔ بعد ازاں میں نے اس کی منت سماجت بھی کی مگر خالہ ہمیشہ کی طرح اپنی دھن کی پکی نکلی۔ میں پریشان ہو گیا مگر خالہ نے میری یاس کو کریلوں میں قیمے سے زیادہ اہمیت نہ دی۔
"وطن واپس آجاؤ، اس بار ضرور میں تمہارے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دوں گی"۔ خالہ نے رخصت ہوتے وقت مجھے ائرپورٹ پر کہا۔
مجھے اپنی خاندانی اقدار کا علم تھا، پھر بھی میں نے لز کو اپنانے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر احباب کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکا۔ اگر میں اسے کسی طرح اپنا سکتا تو شاید راہِ حیات میں وہ میرے ہمرکاب چل پڑتی۔
اس شام موسمی رنگ ڈھنگ نے اداسی اوڑھ لی تھی۔ عمارت میں افراتفری کا ماحول تھا۔ ہمارا تربیتی پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ شرکاء باری باری اپنے اپنے اوطان کو لوٹ رہے تھے۔ مجھے بھی رات گئے واپسی کے لئے ائرپورٹ جانا تھا۔ لز کی روانگی اگلے روز تھی۔
اس روز سردی بڑھ گئی تھی۔ سہ پہر کے بعد رم جھم شروع ہو گئی تھی۔ اب بارش کی شدت میں معمول کی سرد ہواؤں کا امتزاج بھی رنگ دکھا رہا تھا۔ لز افسردہ دکھائی دیتی تھی۔ بے بسی کے قطرے اس کی نیلگوں جھیل آنکھوں سے چھلک پڑے تھے۔ اس کے اصرار پر میں پہلی بار اس کے کمرے میں آیا تھا۔ مدھم روشنی میں بھی معمول کا سکون نہیں تھا۔ میں قالین پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس شب لز نے میرے ساتھ گفتگو نہیں کی۔ لگا، تمام جذبے اس کی خاموشی میں مرکوز ہو گئے تھے۔ وہ وقت مجھ پر بھی بھاری تھا۔ پھر افسردگی نے اپنا اظہار تلاش کر ہی لیا۔ لز نے نغمہ سرائی کی۔ بارش کے ماحول میں اس کی مترنم نوا نے سماں باندھ دیا۔
"آسماں بھی شاید میرے گیتوں پر رو پڑا ہے"۔ اس نے آخر میں کہا اور میری آغوش میں اپنا سر رکھ دیا۔ وہ ہلکی ہلکی سسکیاں بھر رہی تھی۔
"یہ وقت لوٹ کر نہیں آئے گا"۔ اس نے انتہائی اداس لہجے میں تبصرہ کیا۔
"میں اس معاشرے کا حصہ ہوں جس میں افراد اپنے بڑوں کی متعین کردہ راہوں پر چلتے ہیں"۔ میں نے اسے یاد دلایا۔
"مگر ان پابندیوں سے بغاوت بھی تو ممکن ہے"۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔
"شاید نہیں"۔ میں نے اسے جواب دیا۔
"کبھی انسانی جذبے سمجھ میں نہیں آتے، بہت پیچیدہ ہوتے ہیں"۔ وہ مایوسی کے عالم میں بولی۔
الوداعی کھانا لز نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اس کا سگھڑپن حسن کار میں اس کی لگن کی غمازی کرتا تھا۔
"آج کا یہ کینڈل لائٹ ڈنر ہماری یادوں میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا"۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا اور بُری طرح رونے لگی۔
"تم درست کہتی ہو لز! انسانی جذبے بہت پیچیدہ ہوتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتے"۔ میں نے کہا لیکن میری

اس بات میں اس کے لئے کوئی تشفی نہیں تھی۔
میں اپنے کمرے میں واپس لوٹ آیا۔ تسلی تھی کہ چند سہیلیاں اس کے پاس موجود تھیں۔ کچھ دیر بعد اس کے کمرے سے ایک بار پھر مترنم صدا ابھرنے لگی۔ غالباً اپنی ہمجولیوں کے کہنے پر وہ میری ہوپکن کا سدا بہار نغمہ گا رہی تھی۔ ''دوز ور دی ڈیز'' یہ اس خوبصورت نغمے کے شاعرانہ بول تھے۔ وطن واپسی کے لئے اپنا سامان باندھتے ہوئے میں بے اختیار اس کے ساتھ گنگنانے لگا۔ احساس ہوا کہ جدائی کی چوٹ مجھے بھی لگی تھی۔

OOO

وطن واپس لوٹ کر میں ایک بار پھر غم دوراں میں کھو گیا۔ کارِ جہاں کا سلسلہ وہیں سے دراز ہوا، جہاں سے چھوڑ کر پردیس گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد لز سے وابستہ یادیں بھی دوراں کے بوجھ تلے دبنے لگیں۔ سوچنے کی فرصت ملتی تو ماضی کی کہانیاں بھی ذہن میں عود کر آتیں یا تشنہ خوابوں کی صورت خیالوں میں بھٹکنے لگتیں۔ ایسے میں آشائیں مجھے روابط پر اکساتیں مگر معاشرتی مجبوریاں دامن تھام لیتیں۔ کبھی میری ہوپکن کا نغمہ انٹرنیٹ پر سنائی یا دکھائی دیتا تو ماضی کے زخم تازہ ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ یہ بازگشت بھی زندگی سے منہا ہوگئی۔ میری شادی ہوگئی۔

لندن میں ایک نجومی سے مجھے بتایا تھا کہ میرا بندھن شاید کسی لز نامی لڑکی سے انجام پائے گا۔ اس کی یہ بات درست ثابت ہوگئی۔ میری بیوی روزینہ کا نک نیم بھی لز تھا۔ شادی کے بعد دستور کے مطابق ہم میاں بیوی نے ایک دوسرے سے نبھاہ کرنے کی کوشش شروع کردی۔

شادی کے بعد میری پہلی سالگرہ ویلنٹائن ڈے پر آئی۔ اس روز عرصہ بعد مجھے اپنے مصروف شب و روز سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ہوٹل میں تقریب میری بیوی نے ترتیب دی تھی جو ہماری خاندانی اقدار میں جدت کی عکاسی کرتی تھی۔

اس روز روزینہ کی تمام سہیلیوں نے رنگ برنگ لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ عید کا سماں دکھتا تھا۔ اکثر لڑکیوں کے لباس و انداز مغربی تھے۔ خود روزینہ نے بھی مغربی طرز کا پیرہن پہن رکھا تھا۔ تمام سہیلیاں رقص کر رہی تھیں، پھر ان میں چند نوخیز لڑکے بھی شامل ہوگئے۔ مجھے بھی رقصاں جتھے میں محصور کرلیا گیا۔ رقص کے بعد محفل موسیقی کا آغاز ہوا۔ روزینہ نے خوبصورت آواز میں مغربی گلوکاروں کے نغمات سنائے۔ بالآخر کیک کاٹنے کی رسم شروع ہوگئی۔ سالگرہ کا مخصوص نغمہ گایا گیا۔ اس شور میں مجھے اپنی رفیقہ روزینہ لز کی کاربن کاپی دکھائی دینے لگی، خصوصاً جب تقریب کے اختتام پر اس نے تازہ گلاب کی ادھ کھلی کلی میرے کالر میں سجا دی اور ساتھ ہی رومانوی سا انداز اپنا لیا، پھر مجھ سے گویا ہوئی۔ ''بی مائی ویلنٹائن، ڈارلنگ!''

میں نے گھوم کر خالہ کی طرف دیکھا جو میری آنکھوں میں نوشتہ کہانی پڑھ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر ابھرتا ہوا تغیر یہی بتا رہا تھا۔ ''سٹے بلیسڈ'' میں نے روزینہ کو جواباً کہا اور دھیرے سے کوٹھی کے لان کی طرف نکل گیا۔ ابھی ڈنر میں وقت باقی تھا۔ انبوہ سے پہلوتہی کرتے ہوئے میں تنہائی میں اپنے منتشر خیال جمع کرنے لگا۔

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ میں اور روزینہ مل کر زمانے کے جھمیلوں کا مقابلہ کرنے لگے، پھر خدا نے ہمیں چاند سی بیٹی بھی عطا کردی لیکن زندگی میں ایک نعمت مجھ سے ہمیشہ پہلوتہی کرتی رہی، وہ تھی فرصت۔
یہ وہ دور تھا جب میں ایک کینٹ کے بڑے ہسپتال میں کام کر رہا تھا۔ وہاں میرے پاس غیر ملکی بھی آجایا کرتے تھے، جو عارضی طور پر ہمارے وطن میں مقیم تھے۔ مشنری بھی چلے آتے۔ کئی میرے ساتھ مانوس ہو چکے تھے۔
ایک صبح میں اپنے دفتر میں مریض دیکھ رہا تھا کہ نرس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! نن

خواتین، جنہوں نے معائنہ کرانے کے لئے ٹائم لیا تھا، ویٹنگ روم میں آ چکی ہیں۔ میں نے گھڑی دیکھی اور تھوڑی دیر بعد خواتین کو اندر بلالیا۔ ایک خاتون اپنے چند مسائل پر طبی مشورہ حاصل کرنا چاہتی تھی، جو میں نے دے دیا۔

یکا یک ایک مانوس چہرہ میری نظروں میں معلق ہو گیا۔ لز میرے پہلو میں ذرا پیچھے کی طرف بیٹھی ہوئی تھی اور یوں مجھ سے ارادتاً چھپ سی گئی تھی۔ اب وہ اپنی شرارت پر مسکرا رہی تھی۔

''آپ اور یہاں؟'' میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ دل پوری شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ بھی لمحہ بھر کے لئے نروس ہوئی، مگر فوراً سنبھل گئی۔

''ڈاک! میرا یقین ہے کہ دل کے باسیوں کو کبھی الوداع نہیں کہنا چاہئے''۔ وہ بولی۔ ''دنیا سمٹ چکی ہے اور باہم ملنے کے حوادث ہوتے رہتے ہیں''۔ اس نے بات مکمل کی، پھر پھیکے سے انداز میں ہنس پڑی۔

''تم نے مجھے خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا ہے''۔

''کیا آپ کی حیرت واقعی خوشگوار ہے؟''

''شاید نہیں، تمہارے یوں اچانک آ جانے سے قلب کے بحر میں کنکر سا گر پڑا ہے''۔

''اس قلب کا بھی سوچ لیں، جس میں ایک مدت سے طوفان برپا ہے، ہوں''۔

''تم نے شادی نہیں کی؟''

''نہیں، آپ کو یاد ہوگا، میں نے کبھی کہا تھا کہ اگر آپ کے دل میں گھر نہ کر سکی تو کسی اور کو اپنے من میں نہیں بسنے دوں گی''۔ دو آنسو لز کی نیلگوں آنکھوں سے لپکے اور گالوں پر پھسلنے لگے۔ ایک ہوک سی میرے دل میں اٹھی اور وجود میں بکھر گئی۔

''ڈاک! انسانی جذبے بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں، کبھی سمجھ کر بھی سمجھ میں نہیں آتے۔'' اور کبھی چند لمحوں کے تلاطم عمروں پر حاوی ہو جاتے ہیں''۔ میرے ذہن میں جاگزیں والد کی جھلک شاید کسی شکوے کا انجانا روپ تھا، شکوہ مرد ذات سے تھا، جو میری کائنات میں مردانہ پیار کی کمی نے لاشعوری طور پر جنم دے دیا تھا اور میں انجانے میں اس شخص کی متلاشی رہی تھی، جو میری کایا اپنے انمول پیار میں رنگ دے اور اگر میں اس کی ہستی پر اپنا بوجھ ڈال دوں تو وہ اسے سہار لے اور مجھے یوں اپنا لے کہ میں ہر پہلو اس کی حیات کا حصہ بن جاؤں''۔

''میں شرمندہ ہوں، لز!''

''آپ یہ کہیں گے تو مجھے دکھ ہوگا''۔

لز نے آنسو پونچھ لئے اور صبر کے پیمانوں میں الجھ گئی، بظاہر مسرور دکھائی دینے کی کوشش کرنے لگی۔

''میں نے مذہب میں سکون پالیا ہے، ڈاک!'' وہ کہنے لگی۔ ''میں اپنی قوم میں مذہبی شعور اجاگر کرنے کی کوشش کروں گی۔ لادین، بھٹکے ہوئے افراد کو خدا کی پہچان کراؤں گی اور ان ارفع مقاصد کے حصول میں زندگی صرف کروں گی، جن کو پانے کی جدوجہد میں صالحین برگزیدہ ہوئے اور معتبر ٹھہرے۔ میں اپنی نفسانی خواہشوں کو کچل چکی ہوں۔ خدا کرے کہ میں انسان سے پیار کرنا سیکھ سکوں اور اپنی منازل میں سرخرو ٹھہروں''۔ اس نے کہا۔

میں نے خاموشی سے لز کی باتیں سنیں مگر کوئی تبصرہ نہ کر سکا۔

وہ دھیرے سے اٹھی اور اپنی ہمجولیوں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد میں اس کے تعاقب میں دروازے پر آیا۔ وہ دو رویہ گل بھری کیاریوں میں آراستہ راستے پر تسلسل سے قدم بڑھا رہی تھی۔ اس کے اس تنہا سفر میں تیقن موجود تھا۔ لگا کہ اب وہ کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ پائے گی۔

***

کچھ یادیں کچھ باتیں

کامریڈ موہن سنگھ بجلی

''ان ہندوؤں سے جا کر کہہ دیں کہ ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کو اپنی عزت، جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے''۔

☆ اے حمید

یہ واقعہ مجھے کامریڈ موہن سنگھ بجلی نے سنایا۔
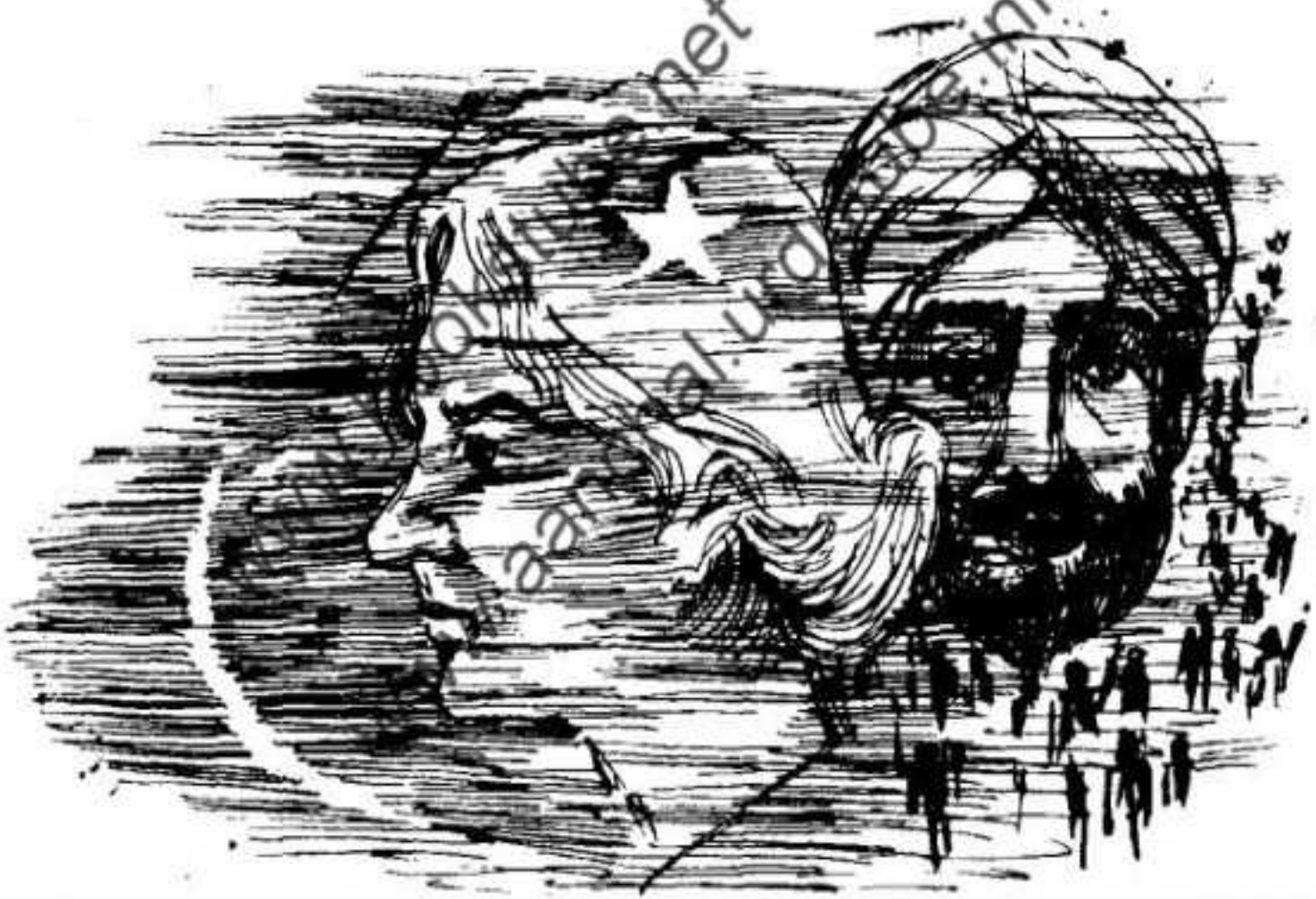
کامریڈ بجلی آل انڈیا سوشلسٹ پارٹی کی امرتسر شاخ کا ممبر تھا۔ پارٹی کا دفتر ہال بازار میں سندھ شکار پور ہوٹل کے سامنے، مسجد خیرالدین کے پہلو میں تھا۔ نیچے گراموفون ریکارڈوں کی دکان تھی جہاں سے دن بھر کبھی کملا جھریا، کبھی اختری بائی فیض آبادی، کبھی پیارو قوال اور کبھی سہگل کانن اور پنکج کے گیتوں کی آواز آیا کرتی۔ اسی دکان کی بغل میں تنگ سیڑھیاں اوپر پارٹی کے دفتر کو جاتی تھیں۔ سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں ہی امرتسر تانگہ ڈرائیور یونین کا دفتر بھی تھا جس کا سیکرٹری کامریڈ چمن اور جنرل سیکرٹری ظہیر کاشمیری تھا۔ ناٹے قد اور گٹھے ہوئے بدن والا کامریڈ چمن کوچوانوں کے چندے کی

شراب پی کر شام کو پارٹی کے دفتر میں آ کر خوب اودھم مچاتا۔ کامریڈ اللہ رکھا ساجد جناح کیپ اور گھر دھلی شلوار قمیص میں بڑا مخلص معلوم ہوتا۔ وہ پنجابی کا شاعر بھی تھا۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتا۔ ایک روز میں اور احمد راہی دفتر کی بالکونی میں کرسیاں ڈالے بیٹھے ہال بازار کی رونق دیکھ رہے تھے کہ کامریڈ ساجد ہمارے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ بازار میں ہندو سکھ لڑکیاں بڑی تعداد میں گزر رہی تھیں۔ غالباً اس روز کوئی تہوار تھا۔

ظہیر کاشمیری نے پارٹی دفتر کے اوپر والے کمرے پر قبضہ جما رکھا تھا۔ چاروں طرف کتابوں کے ڈھیر پڑے رہتے۔ دری پر ایک صندوقچی رکھی تھی۔ کونے والی میز پر سیاہ پتھر کا ایک چوڑا ٹکڑا پڑا تھا جس پر نیگرو کے نقوش ابھرے ہوئے تھے۔ کامریڈ سجاد، کامریڈ یحییٰ، کامریڈ شریف متین، کامریڈ چمن اور کامریڈ کنول...... یہ لوگ سوشلسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے۔ ظہیر کاشمیری خانساماں یونین اور تانگہ ڈرائیور یونین کے لئے کام کرتا۔ میں اور احمد راہی بھی کبھی اس دفتر میں جا کر گپ بازی میں وقت گزارا کرتے۔

مجلس احرار کا ان دنوں امرتسر میں بڑا زور تھا۔ مسجد خیرالدین اور انجمن پارک کی فضائیں، سید عطا اللہ شاہ بخاری اور شیخ حسام الدین کی جوشیلی بھڑکیلی تقریروں سے گونجا کرتی تھیں۔ اس جماعت میں بڑے مخلص کارکن بھی تھے مگر حکومت الہیہ کے پروگرام کی تفصیلات کو یہ واضح صورت میں امرتسری مسلمانوں کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ میرے خیال میں اس جماعت کا سارا جوش، شعلہ فشاں تقریروں، ہنگامہ خیز جلسوں، پُرہجوم جلوسوں اور فلک شگاف نعروں میں صرف ہوتا تھا۔ جو کچھ بھی تھا امرتسر کی سیاسی فضا کو پُرجوش، گرم اور بیدار رکھنے میں مجلس احرار بھی بڑا کام کر رہی تھی۔ اس جوش کو بعد میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی نیلی پوش تحریک نے بھی خوب گرمایا اور جب مسلم لیگ پاکستان کا مشن لے کر سامنے آئی تو امرتسری مسلمانوں کو پہلی بار اندھیرے کے سمندر میں دور روشنی کا ایک مینار ٹمٹماتا دکھائی دیا۔ پاکستان کے قیام کا پروگرام ایک بڑا واضح اور مثبت پروگرام تھا۔ اس پروگرام کی قیادت ایک پُرعزم، بے لوث اور مردِ آہن کے ہاتھ میں تھی جس نے برہمنی سامراج کے مکر و فریب کے پردے کو چاک کر کے اسلام کا پرچم بلند کیا تھا۔ پنجاب کے مسلمان اور خاص طور پر امرتسر کے مسلمان سیاسی طور پر 1857ء سے لے کر اس وقت تک سیاسی بے یقینی کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے تھے۔ ہندوؤں کی تہذیب، کلچر اور مذہب الگ تھا۔ ان کے ساتھ مل کر وہ رہ نہیں سکتے تھے۔ ان سے الگ ہو کر رہنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

امرتسر میں ہر محرم اور عید میلاد پر ہندو مسلم فساد ہو جاتا تھا۔ پٹ رنگوں کا تعزیہ گورو بازار میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ جو کہ ہندو سکھوں کا گڑھ تھا۔ غیر مسلم اس تعزیے پر پتھر پھینک کر بھاگ جاتے۔ ایک بار محرم پر کرموں ڈیوڑھی کے ہندو حلوائی نے کھولتا ہوا گھی مسلمانوں پر پھینک دیا جس کا بدلہ اسی وقت ہندو حلوائی کی دکان کو نذر آتش کر کے لیا گیا۔ امرتسر کا مسلمان، بہادر، دلیر اور نڈر تھا۔ ہندو سکھ ہمیشہ انہی سے دب کر رہتے تھے۔ پھر بھی غیر مسلم اپنی فرقہ وارانہ شرارتوں سے باز نہ آتے اور ہر مذہبی تہوار پر فساد کھڑا کر دیتے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے درشنی ڈیوڑھی میں عید میلادالنبیؐ کے جلوس پر ہندو لڑکوں کو پتھر پھینکتے اور پھر بھاگتے دیکھا ہے۔ میں ان دنوں ایم اے او ہائی سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ عید میلاد کا جلوس شہر میں سے ہوتا ہوا اسکتری باغ کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے چاند تارے والا سبز پرچم اٹھا رکھا تھا۔ ہمیں ان دنوں جلوسوں میں جھنڈے اٹھانے کا بڑا شوق تھا۔ پرچم اٹھائے جب ہم سینہ تانے اپنے محلے میں سے

گزرتے تو ہمیں محسوس ہوا کرتا گویا ہم دشمن پر فتح پا کر آ رہے ہیں۔ جب یہ جلوس درشنی ڈیوڑھی میں پہنچا تو ایک ہندو کے مکان سے چند اینٹیں ہمارے آگے پڑیں۔ میں نے مکان کی طرف دیکھا تو وہاں مٹی پر سے دو چار ہندو لڑکے دوسرے مکان میں کود رہے تھے۔ ہم نے اس مکان کا بند دروازہ توڑ دیا۔ مگر پولیس نے مداخلت کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ ہندو ہمیشہ چھپ کر مسلمانوں کے جلسوں اور جلوسوں پر پتھر پھینکتے اور دُم دبا کر بھاگ جاتے۔ وہ کھل کر کبھی میدان میں سامنے نہیں آتے تھے۔ جب امرتسر کے شیر مسلمان میدان میں آتے تو میدان خالی ہوتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ غیر مسلموں کی یہ اشتعال انگیز حرکتیں کب تک جاری رہیں گی اور مسلمانوں کی آنے والی نسلیں برہمنوں کی فتنہ پرور اور منافقانہ ذہنیت کے ساتھ اپنا مستقبل کیسے سنوار سکیں گی؟

چنانچہ اسی تذبذب اور عدم اطمینان کے عالم میں جب پاکستان کی قرارداد سامنے آئی تو مسلمانوں کو پہلی بار اپنی منزل کا سراغ ملا اور انہوں نے اس منزلِ درخشاں تک پہنچنے کے لئے جان و مال کی قربانیاں دینے کا عزم بالجزم کر لیا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ابھی تک ہندو لیڈروں کے دام میں گرفتار تھے اور کانگریس کی برہمنی جماعت کو ہی ہندوستان کی واحد جماعت سمجھتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب برہمنی سامراج اور مسلم دشمنی کے شعلے ان کے گھروں تک پہنچ گئے تو ان پر ہندو کا منافقانہ اور اسلام دشمن اندازِ فکر کھل کر سامنے آ گیا۔ میں ان دنوں میٹرک کا امتحان دے رہا تھا لیکن میری خانہ بدوشیاں مجھے اتنی عمر میں ہی بمبئی سے کلکتے، ناگ پور سے مدراس، ترچنا پلی، رامیشور اور وہاں سے لنکا اور پھر وہیں سے رنگون تک گھما پھرا لائی تھیں۔ میں نے مدراس کے موپلا مسلمانوں کو اسلامی شعار پر انتہائی پابندی سے عمل کرتے دیکھا تھا۔ میں نے وزیگا پٹم میں مرہٹے مسلمانوں کو سرخ آنکھیں لئے سلطان شہید ٹیپو کے مزار پر نامعلوم خلاؤں میں گھورتے دیکھا تھا۔ میں نے رنگون کی سورتی جامع مسجد میں مسلمانوں کو نماز جمعہ کے بعد دین اسلام کی مرکزیت اور عالم اسلام کی ترقی و خوشحالی کی دعائیں مانگتے سنا تھا۔ میں نے رنگون کے زیر بادی برمی مسلمانوں کے محلوں میں صبح کے وقت قرآن کریم کی تلاوت کی پُرشکوہ آوازیں سنی تھیں اور میں کولمبو کی ٹیپو مسجد میں ہر نماز پر مسلمانوں کے اجتماع عظیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ پھر میں نے اجین اور ناگ پور کے برہمنوں کو مسلمانوں کے ساتھ چھوت چھات کرتے اور دامن بچا کر نفرت سے گزرتے دیکھا تھا۔ میرے سامنے ہندو کلکتے کی زکریا سٹریٹ والی مسجد ناخدا کے آگے سے باجے بجاتے اور مسلمانوں کو مشتعل کرتے گزرا کرتے تھے۔ اس عمر میں ہی مجھے سیاسی بصیرت نہ سہی مگر اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے ہندو، مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان کے جھوٹے برتنوں کو ہاتھ لگائے بغیر کتوں کے آگے پھینک دیتے ہیں۔ امرتسر کے ہندو محلوں میں جگہ جگہ پانی کی سبیلیں لگی ہوتیں۔ ان سبیلوں پر ہندو اور سکھ یا تو شیشے یا تانبے کے گلاس میں پانی پیتے اور یا کسی غریب سبیل پر اوک سے پانی پی لیتے لیکن مسلمان کو ہر ہندو سبیل پر بانس کی نلکی میں پانی ڈال کر جانوروں کی طرح پینا پڑتا۔ گویا مسلمان کو ہندو اچھوتوں سے بھی کمتر سمجھتے تھے۔ یہ وہ ذلت انگیز رویہ تھا جسے کوئی بھی غیور قوم برداشت نہیں کر سکتی اور مسلمان ایک بہادر اور غیور قوم ہے۔ اس نے کئی سو برس تک ہندوؤں پر حکومت کی تھی۔ وہ بھلا اس ذلت کو کیونکر زیادہ دیر برداشت کر سکتی تھی۔ قرارداد پاکستان نے مسلمانوں کو ان کی عزت نفس، دین، کلچر اور غیرت کے تحفظ کا پیام دیا تھا۔ چنانچہ امرتسر کے تقریباً ہر مسلمان کے دل میں پاکستان کی شمع روشن ہو گئی اور وہ آندھیوں اور طوفانوں کے مقابلے کے لئے سینہ سپر

ہو گئے۔

دوسرے مسلمان گھروں کی طرح ہمارے گھر میں بھی مسلم لیگ اور پاکستان کا چرچا رہنے لگا۔ ہمیں اور تو کچھ علم نہیں تھا، ہاں اتنا ضرور معلوم تھا کہ پاکستان بن گیا تو مسلمانوں کو ایک علیحدہ ملک مل جائے گا جس میں وہ آزادی اور عزت کے ساتھ رہیں گے اور ایک مسلمان کے لئے آزادی اور عزت سے بڑھ کر اور کوئی شے اس دنیا میں نہیں ہے۔

شہر میں لیگ کے جلسے منعقد ہونے اور جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ ایک بار انجمن پارک میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا، میں اپنے چھوٹے بھائی مقصود کے ساتھ جلسہ سننے گیا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ جب راجہ غضنفر علی خان تقریر کے بعد تالیوں کے شور میں سٹیج سے نیچے اتر رہے تھے تو ایک لیگی کارکن نے نعرہ لگایا۔

''راجہ غن ظفر علی خان...... زندہ باد۔''

اور میں نے اپنے بھائی کو بتایا کہ یہ لفظ اصل میں غضنفر ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ جنگ شروع ہو کر ختم ہو گئی اور شہر میں سیاسی ہنگامے زیادہ تیز ہو گئے۔ گول باغ، انجمن پارک، مسجد خیرالدین، سکتری باغ اور مسجد جان محمد میں ہر جمعے کو جلسے ہونے لگے۔ شاید انہی دنوں لندن سے کیبنٹ مشن آیا۔ شملہ کانفرنس ہوئی، پاکستان کی منزل قریب آ رہی تھی اور امرتسری مسلمانوں میں جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔ عورتوں کے جلوس ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگاتے نکلنا شروع ہو گئے۔ پولیس ان پر آنسو گیس پھینکنے لگی۔ امرتسر کی کوئی دکان، کوئی ہوٹل، کوئی بیٹھک ایسی نہ تھی جہاں پاکستان اور قائداعظمؒ کے بارے میں بات نہ ہوتی ہو۔ مارکیٹ حکم سنگھ میں صوفی غلام محمد ترک کا ترک ہوٹل اور کامریڈ ہوٹل، امرتسری شاعر اور ادیبوں اور دانشوروں کے ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس تھے۔ یہاں صبح و شام گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ سوشلسٹ پارٹی کے دفتر میں بھی ''پاکستان زندہ باد'' کے نعروں کی گونج پہنچ چکی تھی۔

ایک روز مجھے کامریڈ موہن سنگھ بجلی نے کہا۔

''یار تم لوگ تو معلوم ہوتا ہے پاکستان بنا لو گے لیکن ہمارا کیا بنے گا؟ ہم لوگ ہندوؤں کے ساتھ کیسے گزاریں گے؟''

''بہرحال اسلام کے مقابلے میں تم لوگ ہندو مذہب کے بہت قریب ہو، تمہارا گزارا ہو جائے گا''۔ میں نے کہا۔

اس پر کامریڈ موہن سنگھ بجلی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا اور اس کے بالوں بھرے ادھیڑ عمر کے بھبکے سے چہرے پر لگی عینک کے شیشے ماند پڑ گئے تھے۔ کامریڈ بجلی بڑا مخلص سکھ تھا۔ اسے نہ اسلام سے دلچسپی تھی، نہ ہندوازم سے اور نہ سکھ مت سے۔ مگر کڑا کرپان وہ ضرور پہنتا تھا اور کیس بھی اس نے رکھے ہوئے تھے۔ یہ حقیقت اس زمانے میں ہی میرے تجربے میں آ چکی تھی کہ ہندو اور سکھ کیمونسٹ ہو کر، دہریہ ہو کر بھی اپنے مذہبی شعائر پر کسی نہ کسی طور پر قائم رہتے تھے۔ ہمارے محلے کے رامگوھیا ہائی سکول میں ہمارا حساب کا ماسٹر موتا سکھ تھا اور دہریہ تھا یعنی اس نے ڈاڑھی مونچھ اور بال صاف کر رکھے تھے پھر بھی وہ صبح کے وقت شبد کیرتن بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر سنتا اور ہر بات میں گورو نانک اور گورو ارجن کے کسی قول کا حوالہ ضرور دیتا اور اندر سے وہ دین اسلام کا کٹر دشمن بھی تھا۔

لیکن کامریڈ موہن سنگھ بجلی بڑا مرنجاں مرنج سکھ تھا۔ جب امرتسر میں 1946ء کے بعد ہندو مسلم فسادات کی آگ زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھی پھر بھی کامریڈ بجلی کرفیو کھلنے کے بعد پارٹی کے دفتر کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ پارٹی کا دفتر مسلم اکثریت کے محلوں میں گھرا ہوا تھا۔ ہم نے اسے کئی بار سمجھایا کہ وہ یوں کھلے بندوں نہ آیا کرے مگر اس نے ہر بار مسکرا کر یہی کہا۔ ''کامریڈ! مجھے مار کر

کوئی کیا لے گا''۔

مگر لاہور اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر ماسٹر تارا سنگھ نے ننگی تلوار لہرا کر اعلان کر دیا تھا کہ سکھ پاکستان کبھی نہیں بننے دیں گے اور مسلمان ہر قیمت پر پاکستان بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور امرتسر کے گلی کوچے پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے تھرا رہے تھے۔ چنانچہ ایک روز کامریڈ موہن سنگھ بجلی پر حملہ ہو گیا۔ کامریڈ بجلی نے بڑی مشکل سے جان بچا کر پارٹی کے دفتر میں آ کر پناہ لی۔ اس کے بعد اس نے ہال بازار میں دفتر کی طرف آنا بند کر دیا۔ موہن سنگھ بجلی محلہ بمبے والا کھوہ میں، تاروں والے باغ کے سامنے ایک گلی میں رہتا تھا۔ یہ محلہ ہندو اکثریت کا محلہ تھا۔ اس سے آگے جا کر چوک لونگڑھ آتا تھا جہاں دروازہ لونگڑھ کے آس پاس دو چار محلے مسلمانوں کے تھے۔

جو واقعہ مجھے کامریڈ موہن سنگھ بجلی نے سنایا اس کا تعلق اگست 1947ء کے اواخر سے ہے۔ یہ بڑے آگ اور خون میں لتھڑے ہوئے دن تھے۔ کٹڑہ جیمل سنگھ چوک گولی ہٹی سے لے کر پھم والے بازار تک اور وہاں سے لے کر مسجد قاصداں تک سارے کا سارا جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ ادھر بازار رامگوھیاں، کٹڑہ کرم سنگھ، بازار سرائے راماں، بازار بھنگیاں، محلہ اہلواہیاں اور ہندو اکثریت میں گھرے ہوئے اسی قسم کے دوسرے محلوں میں مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ ضلع گورداسپور اور امرتسر ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے تھے۔ ہندوؤں نے مکانوں پر ترنگے لہرا دیئے تھے۔ وہ فوج کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خالی مکانوں کو لوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ ہندو محلوں سے مسلمان محلوں پر مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ امرتسر کے گلی کوچوں، بازاروں، پارکوں، باغوں اور نالوں میں پڑی ہوئی لاشوں کو گدھ اور کتے نوچ رہے تھے۔ شہر کے وسط میں مسلمانوں کے محلوں کے محلے ویران ہو چکے تھے۔ مسلمان اپنا سب کچھ لٹوا کر مہاجر کیمپوں میں دم بخود بیٹھے شہر کی چار دیواری سے اٹھتے سیاہ دھوئیں اور سرخ شعلوں کو تک رہے تھے۔ شریف پورہ کی مسلم آبادی کو مہاجر کیمپ قرار دیا جا چکا تھا۔ اس کے باہر ہماری مشہور بلوچ رجمنٹ مشین گنیں لئے بیٹھی تھی۔ اسے جی ٹی روڈ عبور کر کے شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ شہر میں گورکھا، ڈوگرہ اور سکھ رجمنٹوں کا راج تھا۔ سوائے ہمارے محلے کٹڑہ مہاں سنگھ کے امرتسر کی ساری زخم خوردہ مسلم آبادی کیمپوں میں کوچ کر گئی تھی۔ کٹڑہ مہاں سنگھ کے مسلمان سمٹ سمٹا کر ہماری گلی کوچہ ڈبگراں میں آ گئے تھے اور ہم ان ٹرکوں کا انتظار کر رہے تھے جو ہمیں اس گلی سے اٹھا کر شریف پورے کے کیمپ میں پہنچانے والے تھے۔ کرفیو کے کھلنے اور نکلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سوائے ہمارے محلے کے سارا امرتسر ہندو فوج کی تحویل میں تھا۔ اتنے بڑے شہر میں رہنے والی مسلم اکثریت کے مکانوں کو لوٹ لوٹ کر آگ لگا لگا کر ہندو سکھ تھک چکے تھے۔ ہماری گلی کے منہ پر لوہے کا مضبوط دروازہ چڑھا دیا گیا تھا۔ پکی گلی، کیری باغ، محلہ بکرواناں، چوڑا کھوہ، پیلا ہسپتال اور کوچہ رنگریزاں کے سارے مسلمان گھرانے ہماری گلی میں پناہ لے چکے تھے۔ یہ لوگ ننگے سر، ننگے پاؤں اپنے مکانوں سے بھاگے تھے۔ ہندو فوج نے دستی بموں اور سٹین گنوں سے ان کے گھروں پر حملہ کر دیا تھا۔ ان میں سے کسی کا سارا خاندان سامنے قتل کر دیا گیا تھا، تو کسی کے جوان بچے کے سینے میں گولی ماری گئی تھی۔ کوئی بچہ اپنی ماں کو پکار رہا تھا تو کوئی اپنے شہید ہو چکے باپ کو رو رو کر آوازیں دے رہا تھا۔

''پاکستان ٹائمز'' کے مشہور آرٹسٹ اور پاکستان کے نامور باکسر محمود بٹ کا بڑا بھائی حامد بٹ میرا کلاس فیلو تھا۔ اونچا لمبا جوان خوبصورت اور ہاکی کا بہترین

کھلاڑی۔ اس کی منگنی بھی ہو چکی تھی۔ جب ہندو فوجیوں نے ان کے محلے پر حملہ کیا تو اس نے ایک پل کے لئے کھڑکی کی چق اٹھا کر باہر دیکھا۔ تھری ناٹ تھری کی ایک گولی اس کی گردن پر آ کر لگی اور وہیں شہید ہو گیا۔ اس ہنگام قیامت میں غم نصیب گھر والے حامد کی لاش بھی اپنے ساتھ نہ لا سکے۔ حامد بٹ اگر زندہ رہتا تو آج ہماری قومی ہاکی ٹیم کے اہم ستونوں میں سے ہوتا۔ پیر احمد شاہ--- کشمیری کڑیل جوان تھا۔ سرخ و سپید رنگت، چہرے پر شرعی ڈاڑھی مونچھ، پانچ وقت کا نمازی، پرہیزگار، نیک سیرت اور خوبصورت ہماری گلی سے یہ پتہ کرنے نکلا کہ کوچہ رنگریزاں کے سارے مسلمان آ گئے ہیں، درباری پنساری کی دکان کے سامنے چوک میں ہندو تھانیدار مہتہ نے اسے گولی مار کر شہید کر دیا۔ اس کی لاش بھی وہیں پڑی رہی۔ یہ آنکھیں کس کس مسلمان کی شہادت پر اشکبار ہوں؟ یہ سینہ کس کس کے ماتم میں خوں چکاں ہو؟ ہزاروں ماؤں کے لعل مشرقی پنجاب کے شہروں میں بے گور و کفن رہ گئے۔ جن بھائیوں کو ان کی بہنوں نے سہرے باندھنے تھے انہیں کفن بھی نصیب نہ ہو سکے۔ بے شک ہم نے پاکستان اپنے پیاروں کا خون دے کر حاصل کیا ہے اور اپنی جانیں دے کر بھی اس کی حفاظت کریں گے۔

امرتسر آگ اور خون میں نہا رہا تھا۔ فائروں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ فضا میں جلی ہوئی لاشوں اور جلے ہوئے مکانوں کی بو تھی۔ ویران سڑکوں پر راتوں کو کتے روتے رہتے۔ ہر طرف خوف اور دہشت کا دورہ دورہ تھا کہ کامریڈ موہن سنگھ بجلی مجھ سے ملنے میرے محلے میں آیا۔ میں گلی کے کونے والے مکان میں کھڑکی کے ساتھ لگا پہرہ دے رہا تھا۔ میں نے آہنی جنگلے میں سے نیچے جھانک کر دیکھا کہ کامریڈ بجلی ایک پولیس جیپ سے نیچے اترا اور گلی کے آہنی دروازے کو آہستہ آہستہ کھٹکھٹانے لگا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ خیالی پھیکی دھواں آلود دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے بجلی کو دیکھ کر اوپر سے آواز دی۔ ''کامریڈ بجلی! کس لئے آئے ہو؟''

مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ شاید وہ ہندو سکھ پولیس کو ساتھ لے کر ہمارے محلے پر حملہ کرانے آیا ہے۔ میں نے سوچا اگر ایسی بات ہوئی تو میں اوپر ہی سے بندوق کا فائر کر کے اسے ڈھیر کر دوں گا۔ میری آواز پر کامریڈ بجلی نے چہرہ اوپر اٹھا کر ہاتھ سے عینک درست کی اور بولا۔ ''کامریڈ! نیچے آؤ، مجھے تمہیں ایک امانت دینی ہے''۔

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کس کی امانت کامریڈ بجلی؟''

''تم نیچے آؤ''۔ بجلی بولا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتائے دیتا ہوں''۔

''مجھے تمہارے ارادے ٹھیک معلوم نہیں ہوتے''۔ میں نے کہا۔ ''تم فوج کو لے کر ہمارے محلے میں کیوں آئے ہو؟''

اتنا سن کر کامریڈ بجلی نے پولیس سے کہا کہ وہ جیپ لے کر کوتوالی چلے جائیں وہ اپنے آپ وہاں پہنچ جائے گا۔ جیپ وہاں سے چلی گئی۔ اب بجلی محلے میں اکیلا رہ گیا۔ سامنے دکانیں ٹوٹی پڑی تھیں اور ان کا سامان باہر بکھرا ہوا تھا۔ ذرا دور چوک میں ایک بیل کی پھولی ہوئی لاش مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بجلی اوپر منہ کر کے کہنے لگا۔ ''کامریڈ! میں اب بالکل نہتا اور اکیلا ہوں۔ اب تو نیچے آ جاؤ یا مجھے اپنے پاس اوپر بلا لو۔ واہگورو کی قسم! مجھے ایک ضروری امانت تمہیں دینی ہے''۔

اب میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس مکان میں اکیلا ہی بندوق لئے پہرہ دے رہا تھا۔ پہرہ کیا تھا بس اتنی ہی ڈیوٹی پر تھا کہ اگر ہندو فوجی حملہ کرنے آتا دیکھوں تو فوراً اطلاع کر دوں تاکہ گلی کے مسلمان وہاں سے بھاگ کر شریف پورے والے کیمپ میں پہنچ جائیں۔ اس مکان کا

ایک دروازہ بازار میں بھی کھلتا تھا اور بجلی بازار میں کھڑا تھا۔ خدا جانے کیوں مجھے کامریڈ بجلی کی بات پر اعتبار آ گیا۔ پھر بھی میں نے محلے کے مسلمانوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کیا۔ میں نے چوبارے کے اوپر والے دروازے کو بند کر کے تالا لگا دیا اور سیڑھیاں اتر کر بازار والے دروازے پر آ کر رک گیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے کی کنڈی کھول دی۔ بندوق میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا رخ اگرچہ براہِ راست بجلی کی طرف نہیں تھا لیکن وہ میرے نشانے کی زد سے باہر بھی نہیں تھا۔

''کون سی امانت ہے کامریڈ بجلی؟''

موہن سنگھ بجلی کا چہرہ اترا ہوا تھا اور ڈاڑھی کے بالوں میں ہلکی ہلکی مٹی پڑی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ جیسے اسے بندوق کا ذرہ برابر بھی خوف نہ ہو۔ میرے پاس آ کر بولا۔

''کامریڈ! یہاں سیڑھیوں میں بیٹھ کر ہی مجھ سے دو چار باتیں سن لو اور پھر اپنی امانت لے لو۔ واہگورو کی کرپا ہے کہ تم مل گئے ورنہ یہ بوجھ جانے کتنی دیر مجھ پر رہتا''۔

ہم دونوں سیڑھیوں میں بیٹھ گئے اس کے دونوں ہاتھوں میں کوئی چیز رومال میں لپٹی ہوئی تھی جسے اس نے اپنی صدری کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ رنگ اس کا بھی اڑا ہوا تھا۔ میں نے سیڑھیوں کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ سلاخ دار روشندان میں سے مٹیالی، فساد زدہ دھوپ کی ہلکی ہلکی روشنی اور نہال سنگھ کی جلی ہوئی دکان میں سے گندے بیروزے کی بو اندر آ رہی تھی۔ موہن سنگھ بجلی نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جلدی جلدی جو دردناک واقعہ مجھے سنایا اسے میں آج آپ کو اپنی زبانی سناتی ہوں۔

جس روز کامریڈ موہن سنگھ بجلی پولیس جیپ میں بیٹھ کر مجھ سے ملنے آیا یہ اس سے ایک روز پہلے کا ذکر ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں موہن سنگھ پیسے والا کھوہ میں رہتا تھا جو کہ ہندو اکثریت کا محلہ تھا اور 15 اگست کے بعد تو ان علاقوں میں کسی مسلمان کے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان علاقوں سے مسلمانوں کی ساری آبادی دائم گنج اور ریگو برج کی جانب نکل کر مہاجر کیمپوں میں یا ریفوجی ٹرینوں میں بیٹھ کر پاکستان کی طرف کوچ کر چکی تھی۔ ان مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے ویران محلوں میں ہندو سکھ لوٹ مار میں مصروف تھے۔ وہ مکانوں کو لوٹ لوٹ کر آگ لگا رہے تھے۔ امرتسر کا مشہور پنجابی شاعر اور ادبی محفلوں کا جان جاں، چاچا عیسیٰ اسی علاقے میں شہید ہوا۔ وہ ہندوؤں کی بنائی امن کمیٹی کے ارکان کے ساتھ امن کی بات چیت کرنے گیا کہ اسے گولی مار دی گئی۔ ہم نے اس کی لاش حاصل کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک بھنگی نے ہمیں ترک ہوٹل میں آ کر بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے چاچا عیسیٰ کو گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا۔

اب ان ویران دہشت زدہ گلی کوچوں میں ہندو سکھ غنڈے فوج اور پولیس کے ساتھ مل کر دندناتے پھرتے تھے۔ کہیں جل بجھے مکان سلگ رہے تھے اور کہیں تازہ لگی آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ مسجدوں کے منبر توڑ کر ہندوؤں نے وہاں مورتیاں لا کر رکھ دی تھیں اور دروازوں پر کھریا مٹی سے ''اوم'' لکھ دیا تھا۔ موہن سنگھ بجلی کے بیان کے مطابق وہ شام کے وقت کرفیو لگنے سے کچھ دیر پہلے گول باغ کی طرف سے ہاتھی گیٹ کی جانب آ رہا تھا کہ سیتلا مندر کے پاس اسے اس علاقے کی نام نہاد امن کمیٹی کا چیئرمین بلرام مل گیا۔ بلرام کبھی کبھی پارٹی کے دفتر میں بھی آیا کرتا تھا۔ ہمیشہ جھک کر ملتا۔ بڑا انکسار دکھاتا۔ اس روز بلرام نے شراب پی رکھی تھی اور وہ موہن سنگھ بجلی کو زبردستی اپنے ساتھ سیتلا مندر کے پچھواڑے تالاب کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی

کوٹھڑیوں میں سے ایک کوٹھڑی میں لے گیا۔ یہاں بلرام کے چھ سات ہندو دوست شراب پی رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ موہن سنگھ ان سب کو جانتا تھا۔ اس نے بہت کہا کہ اسے گھر جانا ہے۔ کرفیو کا وقت ہو رہا ہے لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ بلرام نے شراب کا گلاس اٹھا کر کہا۔

''بجلی! کون سا کرفیو؟ کیسا کرفیو؟ امرتسر میں اب ہمارا راج ہے۔ آج ہم تمہیں سورگ کی سیر کرائیں گے''۔ اور قہقہہ لگا کر وہ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اب موہن سنگھ بجلی کو علم ہوا کہ ان ہندوؤں نے شہر کے اندر سے کسی مسلمان لڑکی کو اغوا کر کے ساتھ والی کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے اور شراب ختم کرنے کے بعد اسے اپنی درندگی اور وحشت کا نشانہ بنانے والے ہیں۔ موہن سنگھ بجلی کا کہنا تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ خدا جانے وہ کس شریف باپ کی بیٹی تھی اور یہ لوگ اسے اٹھا لائے تھے۔ موہن سنگھ نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اس لڑکی کو ان درندوں سے ضرور بچائے گا۔ مگر بلرام اور اس کے غنڈے دوستوں کی آنکھیں شراب پی کر خونی ہو رہی تھیں۔ یہ بھوکے بھیڑیئے کے جبڑوں سے اس کا تر نوالہ جھپٹنے والی بات تھی۔ پھر بھی موہن سنگھ بجلی کہتا ہے کہ میں نے اس بے کس و مجبور مسلمان بیٹی کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس مقصد کے حصول کے لئے خود بھی بلرام کے ساتھیوں کی ہاؤ ہو میں شریک ہو گیا۔ ایک ہندو غنڈہ تھوک کر اسے پاؤں سے مسل کر بولا۔

''میں مسلمانوں کو یوں ہی مسل دوں گا..... ہاہاہاہا..... بلرام! چلو اس مُسلی (مسلمان عورت) کے پاس چلو..... سالی کو اب ہوش آ گیا ہوگا''۔

''بھرا تا جی! میری مانو''۔ دوسرا بولا۔ ''اس نے بے ہوشی کا بہانہ بنایا ہے''۔

بلرام اپنے گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے جھکولے کھا رہا تھا۔

''ہت..... چپ رہ رام مورتی! ان مسلمانوں کی عورتوں کو ہم الٹا لٹکا دیں گے، کیا سمجھتا ہے''۔

''بل جی! وہ سالی جے ہند نہیں کہہ رہی تھی''۔

موہن سنگھ نے پوچھا۔ ''کیا کہتی تھی وہ؟''

بلرام میز پر مکا مارتے ہوئے چیخا۔ ''کہتی تھی پاکستان زندہ باد..... ہت ہت..... مزا چکھا دوں گا''۔

کامریڈ موہن سنگھ کہتا ہے کہ میں نے موقع غنیمت جان کر بلرام سے کہا تھا۔ ''یار بل! میں جا کر اس مسلمان عورت سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کس طرح جے ہند نہیں کہتی اور فکر نہ کرو، میں اسے راضی بھی کر لوں گا''۔

موہن سنگھ نے آنکھ ماری جس پر بلرام قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ سارے ہندو غنڈوں نے موہن سنگھ کی بات کو پسند کیا۔ رام مورتی بولا۔

''بل جی! موہن سیوں کو بھیج دو، بوڑھا آدمی ہے اس کی بات وہ مُسلی مان جائے گی''۔

چنانچہ موہن سنگھ بجلی ساتھ والی کوٹھڑی کا تالا کھول کر اندر آ گیا۔ اندر طاق میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ اندر گوبر کی بو پھیلی ہوئی تھی کونے میں ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر ایک لڑکی پڑی تھی۔ دیئے کی دھیمی روشنی میں موہن سنگھ نے دیکھا کہ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ بال یوں کھلے تھے جیسے کسی نے زبردستی نوچے ہوں۔ وہ بمشکل سترہ اٹھارہ برس کی زردی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ موہن سنگھ اس مسلمان لڑکی کے قریب گیا تو اس نے تڑپ کر گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ مسلمان لڑکی کی آنکھوں میں خونخوار چیتے کی چمک تھی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ ''خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا''۔

موہن سنگھ بجلی کہتا ہے کہ میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''بیٹی! میں تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آیا بلکہ میں

تمہیں ان درندوں سے بچانا چاہتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تیرے لئے کیا کروں۔ وہ لوگ شرابیں پی رہے ہیں، ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔ اگر میں نے تمہیں یہاں سے بھگا دیا تو وہ میرے ساتھ تمہاری بھی تکا بوٹی کر دیں گے اور پھر اگر تُو یہاں سے بھاگ کر نکلی بھی تو کسی دوسرے ہندو غنڈے یا ہندو سپاہی کے ہاتھ آ جائے گی"۔

مسلمان لڑکی نے جب موہن سنگھ کے منہ سے بیٹی کا لفظ سنا تو اسے ذرا حوصلہ ہوا۔ ایک پل کے لئے اس نے موہن سنگھ کو غور سے دیکھا اور پھر اچانک گلے میں سے ایک موٹا سا تعویذ نکال کر اسے دیتی ہوئی بولی:

"میری یہ امانت اپنے پاس رکھ لیں اور کسی بھی مسلمان کو دے دیں۔ میرا نام رضیہ بانو ہے، میں ایم اے او گرلز ہائی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ ہندوؤں نے میرے دونوں بھائیوں اور ابا جان کو اور امی جان کو میرے سامنے شہید کر دیا اور مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔ ان ہندوؤں سے جا کر کہہ دیں کہ ایک مسلمان گھرانے کی لڑکی کو اپنی عزت جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے"۔

بقول موہن سنگھ بجلی اس مسلمان لڑکی نے اچانک موہن سنگھ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور موٹا تعویذ اسے دے کر چشم زدن میں موہن سنگھ کی کرپان نیام سے کھینچی اور دیکھتے دیکھتے اسے اپنے دل میں اتار لیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور وہ مسلمان لڑکی ایک ہلکی سی سسکی بھر کر چارپائی پر گر پڑی۔ موہن سنگھ ایک پل کے لئے تو پتھر سا ہو کر رہ گیا۔ لڑکی کے سینے سے خون جاری تھا اور وہ تڑپ رہی تھیں پھر اس نے شور مچا دیا۔ ساتھ والی کوٹھڑی سے سارے ہندو غنڈے لڑکھڑاتے گرتے پڑتے اندر آ گئے۔ اس وقت تک وہ مسلمان لڑکی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

موہن سنگھ نے کہا۔

"اس نے میری کرپان سے خودکشی کر لی۔ میں اسے سمجھا رہا تھا کہ اس نے میری کرپان کھینچ کر دل میں گھونپ لی"۔

ہندو غنڈوں نے وحشی ہو کر بڑھکیں ماریں اور بلرام نے کہا۔ "مر گئی ہے تو مرنے دو، ہم کوئی دوسری لڑکی اٹھا لائیں گے"۔

"رام مورتی! چلو...... چلو یارو...... کوئی دوسری عورت اٹھا لاتے ہیں۔ مُسلی نہیں تو ہندو عورت ہی سہی ہاہاہا......"

اور وہ سارے شرابی شور مچاتے، بڑھکیں مارتے کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔ موہن سنگھ اس مسلمان لڑکی کی لاش کے پاس اکیلا رہ گیا۔ بقول موہن سنگھ اس لڑکی کی لاش کے چہرے پر ایک عجیب سکون اور نور تھا۔ دیئے کی دھیمی روشنی میں خون آلود کپڑوں میں اس کا سفید چہرہ ایسے لگ رہا تھا جیسے گلاب کے پھولوں میں موتیئے کا سفید گجرا پڑا ہو۔ موہن سنگھ بجلی کتنی ہی دیر رضیہ بانو کی لاش کے پاس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"کامریڈ! ایک مسلمان لڑکی اتنی غیرت مند بھی ہو سکتی ہے یہ مجھے اب معلوم ہوا تھا۔ سچ کہتا ہوں میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کا دیا ہوا تعویذ میرے ہاتھوں میں تھا۔ میں کتنی دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی تھی۔ شہر کی جانب سے کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز آ جاتی تھی۔ پھر میں نے اس بہادر مسلمان بچی کی لاش کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور باہر لے آیا"۔

سیتلا مندر والے تالاب کے عقب میں کھلا میدان ہے جو ذرا دور فتح شاہ بخاری اور حضرت شنکر شاہ کے مزار تک چلا گیا ہے، یہاں کہیں کہیں کیکروں کے جھنڈ ہیں۔ موہن سنگھ بجلی نے انہی کیکروں کے ایک جھنڈ میں زمین میں گڑھا کھودا اور رضیہ بانو کی لاش کو دفن کر دیا۔ موہن سنگھ بجلی کہنے لگا۔

''کامریڈ! مجھے مسلمانوں کی طرح فاتحہ پڑھنا نہیں آتا تھا لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے رب سے کہا تھا کہ ''اے سب کے پالن ہار! اس غیرت مند مسلمان بچی کی آتما کو شانتی دے''۔

میں سیڑھیوں میں دم بخود بیٹھا تھا۔ موہن سنگھ بجلی نے رضیہ بانو کی امانت وہ تعویذ میرے حوالے کیا اور خشک سی آواز میں بولا۔

''کامریڈ! یہ بچی جہاں دفن ہے وہاں میں اس کی قبر نہیں بنا سکتا کیونکہ مجھے معلوم ہے ہندو اسے ڈھا دیں گے۔ میں وہاں مسلمانوں کے رواج کے مطابق جمعرات کو دیا بھی نہ جلا سکوں گا۔ اس پر پھول بھی نہ ڈال سکوں گا لیکن کامریڈ! یقین کرو میں جب تک زندہ رہا، ہر جمعرات کو وہاں جا کر اپنے آنسوؤں کے پھول ارپن کرتا رہوں گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ میں نے اس بچی کی امانت تجھے دے دی ہے اب میرے دل سے بوجھ اتر گیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ کسی مسلمان کو یہ تعویذ دے دینا۔ شہر میں کوئی مسلمان نہیں رہا تھا۔ میں نے سنا کہ تمہارے محلے میں مسلمان ابھی ہیں۔ چنانچہ میں تمہارے پاس آ گیا۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ میں جاتا ہوں۔ کوتوالی میں سپاہی میرا انتظار کر رہے ہوں گے''۔

اس کے ساتھ ہی کامریڈ بجلی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر دبایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ میں حیرت زدہ سا ہو کر رضیہ بانو شہید کا تعویذ ہاتھوں میں لئے سیڑھیوں میں بیٹھا رہا۔

کامریڈ بجلی کی باتیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اچانک بازار میں فائر کی آواز آئی۔ میں چونکا۔ جلدی سے دروازے کو اندر سے تالا لگایا اور چوبارے میں آ گیا۔ جنگلے میں سے نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک فوجی ٹرک چوک میں کھڑا تھا اور سکھ ہندو فوجی چھلانگیں لگا کر نیچے کود رہے تھے۔ میں چشم زدن میں سیڑھیاں اتر کر گلی میں آ گیا اور محلے والوں کو ہندو فوجیوں کی آمد کی خبر سنائی۔ اتنے میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گلی کا آہنی دروازہ ایک طرف سے جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی گلی میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگوں نے گلی کی دوسری جانب لال حویلی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ پیچھے ایک اور دھماکہ ہوا۔ اب آہنی گیٹ ایک طرف سے اڑ چکا تھا اور ہندو سکھ غنڈے تلواریں اور بلمیں لئے اچھلتے کودتے شور مچاتے گلی میں آ گئے تھے لیکن اس وقت گلی میں سوائے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے گھریلو سامان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ گلی کے سارے مسلمان لال حویلی اور گوجروں کے ڈیرے میں سے گزر کر پاتھی گراؤنڈ کے ساتھ والی دیوار سے ہوتے شریف پورے والے مہاجر کیمپ کے قریب پہنچ چکے تھے اور کیمپ میں متعین بلوچ رجمنٹ کے جوان ان کے عقب میں کور فائرنگ کر رہے تھے۔

شریف پورے پہنچ کر میں ایک تھڑے پر بیٹھ گیا اور جیب میں سے رضیہ بانو شہید کے تعویذ کو نکال کر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا بٹوہ نما تعویذ تھا۔ میں نے اس کا بٹن کھولا تو اندر بادامی رنگ کا خستہ سا کاغذ نکلا جس پر قلم اور سیاہ روشنائی سے پوری سورہ فاتحہ لکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس مقدس امانت کو اپنی آنکھوں کے ساتھ لگا لیا اور میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میری آنکھوں میں فتح شاہ بخاری کے میدان والے کیکروں کا وہ جھنڈ پھر گیا جہاں اسلام کی ایک غیور بیٹی دفن تھی اور جس کی کوئی قبر نہ تھی۔ جہاں کبھی کوئی دیا نہیں جلے گا۔ جہاں کبھی کوئی پھول نہیں ڈالے گا لیکن رضیہ بانو کبھی نہیں، مر سکتی۔ اس نے اپنی لاکھوں بہنوں، بھائیوں اور بیٹیوں کے خون سے اس باجبروت قلعے کی بنیادیں استوار کی ہیں جس کی چوٹی پر پاکستان کا پرچم لہرا رہا ہے۔ زندہ باد! رضیہ بانو!

○✻○

ضربِ سکندری

جنگ ستمبر: کچھ یادیں، کچھ باتیں

☆ سکندر خان بلوچ

ستمبر کا مہینہ پاکستان کی تاریخ میں اتنا ہی اہم ہے جتنا اگست۔ اگست کے مہینے میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت کا ظہور ہوا۔ تو ستمبر وہ مہینہ ہے جس میں پاکستان کے وجود اور پاکستان کی سالمیت کو بچالیا گیا۔ پاکستان نے اپنے سے تین گنا بڑے دشمن کے بھرپور حملے کا کھل کر مقابلہ کیا دشمن نے 6/ستمبر کی شام کو لاہور جمخانہ میں جشنِ فتح کا اعلان کیا یہ خبر بی بی سی سے نشر بھی ہوئی لیکن اسے منہ کی کھانی پڑی۔

میں اُس وقت پاکستان ملٹری اکیڈمی میں زیرِ تربیت کیڈٹ تھا۔ مارچ 1965 سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان چپقلش شروع ہو چکی تھی اور یہ مسئلہ رن آف کچھ سے شروع ہوا۔ رن آف کچھ کی جھڑپوں میں فوجی نقطۂ نگاہ سے بہت سی چیزیں سامنے آئیں۔ ہمارے پلاٹون کمانڈر کیپٹن ظفر مسعود (بعد میں بریگیڈیئر) نے رن آف کچھ کا مکمل نقشہ سامنے لگا کر ہمیں جھڑپوں کی تفصیل سمجھائی اور پاکستانی دستوں کے حملوں کا راستہ اور ہندوستانی حملوں اور مقابلوں کی تفصیل بتائی۔ جنگی تفصیل کچھ اس طرح سمجھائی گئی کہ ہم سب اپنے آپ کو تصوراتی طور پر جنگ کا حصہ سمجھنے لگے اور اپنے طور پر ہم نے اپنا پلان تیار کیا کہ اگر ہمیں موقع ملا تو ہم کیسے دشمن پر حملہ آور ہوں گے۔ اسی دوران پوری اکیڈمی کو اکٹھا کر کے جس میں تمام آفیسرز بمعہ کمانڈنٹ (مرحوم بریگیڈیئر سلطان) سب شامل تھے نقشے اور ماڈل بنا کر رن آف کچھ کا سیاسی پس منظر اور فوجی جھڑپیں، ایئر فورس کا کردار جنگ میں حصہ لینے والی یونٹیں اور ہتھیاروں کی تفصیل بتائی گئی جو فوجی نقطۂ نظر سے ہمارے لئے بہت اہم اور ایمان افروز تھیں۔

رن آف کچھ کا معاملہ جب ذرا ٹھنڈا ہوا تو جس کردار نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا وہ لیفٹیننٹ نادر پرویز کا ایکشن تھا۔ نادر پرویز ہم سے سینئر تھا اور کچھ ہی عرصہ پہلے پاس آؤٹ ہو کر گیا تھا اس کی یونٹ نے جھڑپوں میں حصہ لیا اور نادر پرویز نے اتنے دلیرانہ حملے

کیے کہ دشمن کی پوری کمپنی کو بے بس کر دیا اور اس علاقے میں دشمن کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس دلیرانہ ایکشن پر اسے ستارہ جرأت سے نوازا گیا۔ نادر پرویز کا کردار ہم سب کے لئے افسانوی حیثیت اختیار کر گیا ہم سب کو اس کی بہادری اور جرأت پر ناز تھا اور ہم سب اپنے آپ کو نادر پرویز سے بڑھ کر ثابت کرنا چاہتے تھے صرف موقع چاہتے تھے۔

گرمیوں میں دونوں ملکوں کی سیاسی جنگ جاری رہی اور ستمبر میں حالات بہت خراب ہو گئے پتہ چلا کر یونٹیں محاذ جنگ پر اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال چکی تھیں۔ ہماری تربیت تقریباً ختم ہو رہی تھی اور اکتوبر میں پاسنگ آؤٹ تھی حالات دن بہ دن بہت کشیدہ ہو رہے تھے۔ تربیت کے آخری مراحل ہونے کی وجہ سے مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ ہم سب چاہتے تھے کہ جنگ ہو جس کی دو بڑی وجوہات تھیں اول یہ کہ اگر جنگ ہوئی تو ہم وقت سے پہلے پاس آؤٹ ہو جائیں گے اور یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا اور دوسرا یہ کہ ہمیں سروس کے شروع میں ہی جنگی تجربہ حاصل ہوگا۔ نادر پرویز کا کردار ہمارے سامنے تھا اور ہم اپنے آپ کو نادر پرویز ثابت کرنا چاہتے تھے۔

6 ستمبر کی صبح پریڈ کے وقت ہمیں پتہ چلا کہ ہندوستان نے لاہور کے محاذ پر حملہ کر دیا تھا۔ اکیڈمی کا ماحول یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ ہم سب اپنے آپ کو جنگ کا حصہ سمجھنے لگے تھے۔ جنگ کی تفصیلات جاننے کے لئے بیقرار تھے۔ تمام آفیسرز سے پوچھتے اور مختلف جوابات ملتے لیکن دل کا اطمینان نہ ہوتا۔ شام کو اکیڈمی میں خبر پھیل گئی کہ بہت سے آفیسرز نے اپنی اپنی یونٹوں کے ساتھ لڑنے کے لئے محاذ جنگ پر جانے کے لئے درخواستیں دے دی ہیں اور اکیڈمی میں رہنے کو کوئی بھی تیار نہیں۔ یہ سن کر ہمیں خوشی بھی تھی اور حسد بھی کاش ہماری بھی کوئی یونٹ ہوتی اور ہم بھی لڑ سکتے۔ بہر حال رات تک یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ ہم جلدی پاس آؤٹ ہوں گے۔

اکیڈمی کے ماحول میں ہم سب الرٹ تھے کہ کوئی رات کو روشنی نہیں کرے گا حتیٰ کہ سگریٹ بھی نہیں پیئے گا کیونکہ ملٹری اکیڈمی دشمن کے لئے ایک بہت اہم ٹارگٹ ہوتا ہے اس لئے ہم اپنے طور اردگرد ماحول پر جاسوسی نظر رکھ رہے تھے۔ اکیڈمی کے شمال اور جنوب میں دو گہرے نالے ہیں جن میں بڑی بڑی گھاس اور جھاڑیاں ہیں ہمیں یہ وہم ہو گیا کہ دشمن کے کمانڈوز ضرور اس نالے کے راستے اکیڈمی پر حملہ آور ہو سکتے ہیں اس لئے ہم سب کا فرض ہے کہ اردگرد گراؤنڈ پر گہری نظر رکھیں۔

8 ستمبر کو پتہ چلا کہ ہماری 11 ستمبر کو پاسنگ آؤٹ ہوگی اور اُس میں سینئر دو ٹرموں کے کیڈٹ پاس آؤٹ ہوں گے جس سے تمام اکیڈمی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جنگ کے متعلق مختلف خبریں آ رہی تھیں لیکن جو قابل ستائش چیز تھی وہ ہمارا جذبہ اور جوش تھا۔ ہم سب چاہتے تھے کہ اُڑ کر محاذ جنگ پر پہنچ جائیں۔ جن آفیسرز کی یونٹوں میں واپسی ہوئی وہ بہت خوش تھے اور ہم سب حسرت سے انہیں دیکھتے تھے۔ اس دوران سکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم اور اُس کے ساتھیوں کی بہادری کے کارنامے جب ہم تک پہنچے تو ہمارے دل و دماغ خوشی سے جھوم اُٹھے۔ ایمان تازہ ہو گیا اور محاذ جنگ پر جانے کی خواہش اور بھی شدید ہو گئی۔

8 ستمبر کی رات تقریباً 11 بجے اکیڈمی میں افواہ پھیل گئی کہ دشمن کے جاسوس علاقے میں آ گئے ہیں۔ ہوا یہ کہ رات کو ایک بنگالی ڈیوٹی کیڈٹ نے دیکھا کہ اکیڈمی کے جنوب میں ''نیلور سپر'' نامی پہاڑی پر لائٹ دو دفعہ جلی ہے اور بجھی ہے۔ اور پھر اُس کے مقابلے میں سامنے مانسہرہ روڈ کی پہاڑی پر اس روشنی کے جواب میں اُسی

طرح روشنی ہوئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ دشمن کے جاسوس آپس میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہے ہیں۔ اس کی اطلاع فوری طور پر ڈیوٹی آفیسر کو دی گئی۔ ہم نے اکیڈمی کے دونوں جانب نالوں پر پٹرولنگ بڑھا دی فوری طور پر جوانوں کا ایک دستہ ٹیلور سپر پر روانہ کیا گیا۔ کچھ جوان سامنے مانسہرہ روڈ پہاڑی کی طرف بھی گئے تفتیش پر پتہ چلا کہ ایک بیمار دیہاتی کے لئے اسکے گھر والوں نے تھوڑی دیر روشنی کی تھی جس کے لئے دیہاتیوں کو آئندہ ایسا نہ کرنے کی تنبیہ کی گئی۔

باقی چند دن افراتفری اور پاسنگ آؤٹ کی تیاری میں گزرے۔ جنگ کی خبریں مسلسل آتی رہیں کبھی خوش کن اور کبھی تکلیف دہ۔ 11 ستمبر کو پاسنگ آؤٹ ہوئی خطرے کے پیش نظر پاسنگ آؤٹ کے وقت ایئرفورس کی طرف سے کور مہیا کیا گیا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کی تاریخ میں ہماری پاسنگ آؤٹ واحد پاسنگ آؤٹ تھی جو ہوائی جہازوں کے سائے میں منعقد ہوئی جس کا ہمیں آج تک فخر ہے۔

پاسنگ آؤٹ کے بعد سب اپنی اپنی یونٹوں میں چلے گئے۔ کچھ نے ڈائریکٹ محاذ جنگ پر رپورٹ کی۔ میری پوسٹنگ ایبٹ آباد ہوگئی۔ جنگ تو ہفتے بعد بند ہوگئی لیکن میں اپنے دوستوں کی جنگی کارکردگی جاننے کے لئے بیقرار رہا۔ کچھ دوست شہید ہو گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون لیکن کچھ دوستوں نے بہت جرأت اور بہادری کی مثالیں قائم کیں اور انہیں فوجی اعزازات سے نوازا گیا۔ کچھ دلچسپ واقعات جو بعد میں مجھ تک پہنچے حسب ذیل ہیں:

1. سیکنڈ لیفٹیننٹ صابر حسین کی یونٹ لاہور سے آگے محاذِ جنگ پر تھی لہٰذا اس نے محاذِ جنگ پر ہی رپورٹ کی۔ چند دنوں بعد رات کو اسے دشمن کے علاقے میں جاسوسی کے لئے بھیجا گیا جسے فوجی زبان میں "ریکی" کہتے ہیں۔ رات کو چلتے چلتے دشمن کے علاقے میں ایک برانچ نہر پر پہنچا۔ اسے شک پڑا کہ نہر پر کچھ آدمی ہیں اس نے اپنے آدمیوں کو کنارے کے ساتھ چھپایا اور خود احتیاط سے آگے بڑھا لیکن جونہی کنارے پر پہنچا دشمن کے دو سپاہیوں نے پکڑ لیا لیکن صابر نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ جس طرف دشمن کے سپاہیوں کی پیٹھ تھی اُدھر منہ کر کے آواز دی گل خان فائر کرو۔ سپاہیوں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ صابر نے زور سے دونوں کو دھکا دیا۔ وہ اپنا وزن برقرار نہ رکھ سکے اور نہر میں جا گرے۔ ایک سپاہی سے رائفل کنارے پر گر گئی صابر نے رائفل اٹھائی ان دونوں پر تان لی سپاہیوں نے گھبرا کر ہاتھ اوپر کر دیئے۔ لہٰذا انہیں باہر نکالا اور آگے لگا کر اپنے چھپے ہوئے آدمیوں کے پاس لایا۔ وہاں ان کے ہاتھ باندھے اور مارچ کراتے ہوئے واپس یونٹ میں لے آئے اور ان سپاہیوں سے دشمن کی تمام پوزیشنوں کا پتہ چل گیا۔

2. دوسرا واقعہ لیفٹیننٹ نوید کے ساتھ پیش آیا۔ اس کی یونٹ آزاد کشمیر میں تھی اور وہیں اس نے محاذِ جنگ پر رپورٹ کی۔ اس کی یونٹ کے نزدیک ایک پہاڑی چوٹی دشمن کے قبضے میں تھی جو سارا دن وقفے وقفے سے فائر کر کے یونٹ کو بہت تنگ کرتے تھے۔ خیال تھا کہ اس چوٹی پر کم از کم دشمن کی ایک کمپنی ضرور ہوگی لہٰذا ایک رات لیفٹیننٹ نوید کو کچھ آدمی دیکر پٹرولنگ کے لئے دشمن کے علاقے میں بھیجا گیا۔ نوید جب گھوم پھر کر اُس چوٹی کے نزدیک پہنچا تو اُسے کسی قسم کی آواز یا حرکت سنائی نہ دی لہٰذا وہ دشمن والی طرف سے آہستہ آہستہ چوٹی پر چڑھے۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مورچے خالی ہیں لہٰذا وہ مورچوں میں بیٹھ گئے وہاں سے ایک سپاہی کو بھیجا کہ یونٹ کو جا کر اطلاع دے۔ اتنی دیر میں روشنی ہونے لگی اور سامنے سے دشمن کی پلاٹون پہاڑی پر چڑھتے ہوئے

دکھائی دی۔ اب یہ راز کھلا کہ دشمن رات کو چوٹی خالی کر دیتا تھا اور صبح سویرے آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ نوید نے کمال دلیری سے اپنے جوانوں کو مختلف جگہوں پر چھپایا اور جونہی دشمن بے دھیانی میں نزدیک پہنچا نوید کے اشارے سے اکٹھا فائر کھول دیا۔ دشمن کے سامنے والے جوان تو اِدھر ہی گر گئے اور باقی پتھروں کی اوٹ میں چھپ کر نیچے گئے۔ اتنی دیر میں اپنی یونٹ کے لوگ بھی پہنچ گئے اور یوں چوٹی پر ہمارا قبضہ ہو گیا۔ دشمن کی لاشیں کھینچ کر اوپر لائی گئیں۔ دشمن نے اس چوٹی پر قبضہ کرنے کے لئے متعدد حملے کئے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ بعد میں یہ بھی سننے میں آیا کہ دشمن کی اس بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر کا اس ناکامی کی وجہ سے کورٹ مارشل کیا گیا تھا۔ یہ چوٹی آج بھی پاکستان کے پاس ہے۔

3. تیسرا واقعہ سیکنڈ لیفٹیننٹ اصغر کے ساتھ پیش آیا۔ یہ چھمب میں تھے کہ انہیں رات کو ''ریکی'' کے لئے بھیجا گیا۔ ریکی کے دوران یہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں کسی قسم کی جھاڑیاں یا اوٹ نہیں تھی اچانک سامنے سے چند سکھ سپاہی جھومتے ہوئے اور گاتے ہوئے آ رہے تھے ہاتھ میں شراب کی بوتلیں تھیں چونکہ دشمن کا علاقہ تھا اور اِردگرد دشمن کی یونٹیں تھیں۔ اس لئے رات کو فائر کھولنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اصغر نے دیکھا کہ اور کوئی چارہ نہیں تو بجائے فائر کے رائفل کے بٹ مار کر دشمن کو قابو کرنے کا سوچا۔ جونہی سکھ سپاہی نزدیک پہنچے اصغر نے کمال دلیری سے ساتھیوں کو کہا ''پکڑ لو ان سکھڑوں کو یہ ہمارے علاقے میں کیسے آئے ہیں۔ شاباش جانے نہ دینا''۔ سکھ جو شراب کے نشے میں دُھت تھے حالات کو سمجھ نہ پائے۔ اُن کے کمانڈر نے کہا ''اوئے منگل سنگھا اساں غلطی نال پاکستانی علاقے اچ آ گئے آں۔ اوئے نس او ایتھوں'' اور پھر انہوں نے دوڑ لگا دی دوڑتے ہوئے ایک سپاہی کو پکڑ لیا گیا اور ساتھ لے آئے۔

اور بھی کئی واقعات ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ ہمیشہ جذبے سے جیتی جاتی ہے اور جذبے والے بے سروسامان 313 سپاہی بھی ہزار پر بھاری ہوتے ہیں۔ اس جنگ میں ہمارے سپاہیوں اور آفیسرز کا جذبہ فقید المثال تھا اور جن کا جذبہ بلند ہو انہیں دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ کوریا اور ویت نام میں جو امریکیوں کا حشر ہوا یا افغانستان میں جو روسیوں کا حشر ہوا وہ سب ہمارے سامنے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ جذبہ افواجِ پاکستان میں یونہی بلند اور ناقابلِ تسخیر رہے۔ آمین!

آج جب میں ان واقعات کے متعلق سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ عام طور پر اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہونے والے آفیسرز (سیکنڈ لیفٹیننٹ) کی عمر 19 سے 21 سال ہوتی ہے اور زندگی کا یہ دَور بے فکری، لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا دَور ہوتا ہے۔ اس عمر کے نوجوان عام طور پر گلیوں میں کرکٹ کھیلتے ہوئے یا مختلف قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکات کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ چہ جائیکہ دشمن کے علاقے میں جا کر اتنی دلیرانہ کارروائیاں کرنا نہ صرف جرأت و بہادری بلکہ احساسِ ذمہ داری، حب الوطنی اور جذبہ ایمانی کی بھی اعلیٰ مثالیں ہیں اور اس کے لئے میں اپنی ملٹری اکیڈمی کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں جس کی تربیت نے کھلنڈرے اور لاپرواہ لڑکوں کو اتنے ذمہ دار اور بہادر مجاہدوں میں تبدیل کر دیا۔ میرا ایمان آج پہلے سے بھی زیادہ پختہ ہے کہ جب تک ہماری تربیت گاہیں 1947 یا 1965 والے جذبے سے کام کرتی رہیں گی تو پاکستان کے بیٹے وطن کی حفاظت جانبازی اور بہادری کی اعلیٰ روایات قائم کرتے رہیں گے اور جب تک پاکستان کے بیٹوں میں سے ایک بھی زندہ ہے تو ان شاء اللہ پاکستان پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ پاکستان پائندہ باد!

◆❖◆

جرم وسزا

ترنگل اور شہ رگ

بھوسے والی کوٹھری میں لاش کے ساتھ خون آلود ترنگل پڑی تھی۔ فرش پر صاف ستھری دری، تکیہ اور کمبل بچھا ہوا تھا۔ دری پر ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور تکیے پر پڑے لمبے بال ایک خاص کہانی سنا رہے تھے

☆ آفتاب علی خان

میں اپنے شوق کی وجہ سے پولیس میں ڈائریکٹ اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی ہوا تھا۔ سروس پانچ سال پوری نہیں ہوئی تھی کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ہم زمیندار لوگ تھے۔ ہماری ساری دولت اراضی تھی۔ والد صاحب کا سایہ اٹھ گیا تو اس کے بعد جو فصل آئی اسی سے پتہ لگ گیا کہ مزارعین کے سر پر مالک کا موجود رہنا ضروری ہوتا ہے۔ والد صاحب کے بعد میں ہی تھا، میں نے پولیس کی سروس سے سبکدوشی کر لی اور گھر آ گیا۔

پانچ سال سروس کے دوران کے بعض واقعات سنانے کے قابل ہیں۔ ابھی قتل کی ایک واردات زیر دفعہ 302 اور اس کی تفتیش سناؤں گا۔ یہ تفتیش میری نہیں، یہ ایک سکھ سب انسپکٹر شمشیر سنگھ کی تفتیش تھی جو متعلقہ تھانے کا ایس ایچ او تھا اور میں اس کے ماتحت اے ایس آئی تھا۔ شمشیر سنگھ بڑا لائق اور بہت سخت طبیعت کا تھانیدار تھا۔ تفتیش اتنی سخت کرتا تھا کہ اس کو دنیا کا کوئی خیال نہیں رہتا تھا۔ یہ تھانہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں دیہات کے علاقے میں تھا۔

ایک روز صبح سویرے تھانے میں رپورٹ آئی کہ محمد رفیق نامی ایک آدمی اپنے مکان کی بھوسے والی کوٹھڑی میں مرا ہوا پڑا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ لاش کے قریب ایک ترنگل پڑی ہوئی ہے جس پر بہت سارا خون لگا ہوا ہے۔ مقتول بڑی ذات کا امیر زمیندار بتایا گیا۔ اس کی عمر جو لکھوائی گئی وہ تیس سال سے ذرا زیادہ تھی۔

میں ان کارروائیوں کے بارے میں نہیں لکھوں گا جو تھانے میں کاغذات پر کی جاتی ہیں۔ میں تفتیش کی سیدھی کہانی سناؤں گا۔ یہ کیس سب انسپکٹر شمشیر سنگھ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے رپورٹ کرنے والوں کے ساتھ جو سوال جواب کئے تھے ان سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس قتل کی تفتیش بہت مشکل ہو گی۔ مجھ کو ابھی مشکل تفتیش کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ دیہات کے علاقوں میں اکثر قتل کی وارداتیں پرانی دشمنی کی بناء پر ہوتی تھیں۔ ان کے ملزم جلدی پکڑ لئے جاتے تھے اور ان کو مار پٹائی کر کے اقبال کرا لیا جاتا تھا مگر کوئی کوئی واردات ایسی ہو جاتی تھی جس میں یہ بھی پتہ نہیں لگتا تھا کہ قتل کا باعث کیا ہے۔ مقتول کی کوئی دشمنی نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح کی وارداتوں کی تفتیش مجھ سے جیسے کم تجربے والے اے ایس آئی کے لئے بہت مشکل ہوتی تھی۔ یہ واردات جو میں بیان کر رہا ہوں ایسی ہی واردات تھی۔

سب انسپکٹر سردار شمشیر سنگھ بہت اچھا آدمی تھا۔ اس کی عادتیں تو دوآبے کے دیہاتی علاقے کے سکھوں جیسی تھیں لیکن وہ اچھے برے کو پہچانتا تھا اور اس میں نیک اور بد کی تمیز بھی تھی۔ مثال کے طور پر میرے بارے میں اس کو معلوم تھا کہ ناتجربہ کار آدمی ہوں اور شاید وہ مجھ کو نالائق بھی سمجھتا ہو گا لیکن اس نے کبھی بھی مجھ کو نالائق یا ناتجربہ کار نہیں کہا تھا۔ وہ میری ٹریننگ کرتا رہتا تھا۔ اس واردات کی تفتیش میں بھی اس نے مجھ کو اپنے ساتھ رکھا لیکن ساری تفتیش اس نے خود کی۔

واردات والا مکان پکی حویلی جیسا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں گھر والے خود رہتے تھے اور دوسرا حصہ مویشیوں وغیرہ کے لئے تھا۔ اس حصے میں بھی کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس کا الگ صحن تھا۔ مویشیوں کی کھرلیاں بھی تھیں اور صحن میں تین درخت بھی تھے۔ وہاں ایک کمرہ تھا جس کو دیہات میں کوٹھڑی کہتے ہیں۔ اس میں بھوسہ رکھا ہوا تھا۔ اندر جا کر دیکھا مقتول محمد رفیق کی لاش دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ایک ترنگل پڑی ہوئی پائی گئی۔ ترنگل کی تین نوکیں خون آلود تھیں اور خون ترنگل کے دستے پر بھی آیا ہوا تھا۔

اس کوٹھڑی میں بھوسے کا ڈھیر لگا ہوا تھا جو تین

دیواروں تک گیا ہوا تھا۔ دروازے کی طرف تقریباً آدھی کوٹھڑی خالی تھی۔ خالی جگہ پر بھوسہ بکھرا ہوا تھا۔ کوٹھڑی کے ایک کونے میں ایک دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک تکیہ بھی تھا اور ایک کمبل تھا۔ ان پارچات پر بھی خون تھا۔ ان کی حالت ایسی تھی جس سے پتہ لگتا تھا کہ مقتول ان پر لیٹا ہوا تھا یا ان پر گرا تھا یا مرنے کے پہلے ان پر تڑپا ہوگا۔ دری پر کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے پائے گئے۔ ان کا رنگ سبز تھا۔ شمشیر سنگھ نے دری اور تکیے کو اور زیادہ دھیان سے دیکھا تو دو لمبے بال ان کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔

آپ نے قتل کی وارداتوں کی کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس واردات میں کوئی عورت ہوتی ہے تو واردات کی جگہ سے چوڑیوں کے ٹکڑے اور ایک دو لمبے بال ضرور برآمد ہوتے ہیں۔ یہ اس وقت برآمد ہوتے ہیں جب عورت اس جگہ زیادہ دن رہی ہو اور چوڑیوں کے ٹکڑے اس واردات میں ملتے ہیں جس میں عورت کے ساتھ تشدد کیا گیا ہو۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت اپنی مرضی اور خوشی سے کسی آدمی کے ساتھ رہی ہو تو بھی پلنگ یا چارپائی پر ٹوٹی ہوئی چوڑی کے ایک دو ٹکڑے مل جاتے ہیں۔ چوڑیوں اور بالوں سے جائے واردات پر عورت کی موجودگی کی شہادت ملتی ہے۔

اس واردات میں بھی بالوں اور چوڑیوں کی شہادت پائی گئی۔ اس کوٹھڑی میں دری، تکیہ اور کمبل صاف بتاتے تھے کہ ان کو یہاں کس مقصد کے لئے بچھایا ہوا تھا۔ یہ معاملہ بالکل صاف تھا کہ قتل کا باعث عورت ہے۔ اس عورت کو سامنے لانا شمشیر سنگھ کا کام تھا۔

مقتول کے جسم پر جو ضربیں پائی گئیں وہ دو زخم تھے جو سوراخوں کی شکل کے تھے۔ یہ دونوں مقتول کی ٹھوڑی کے نیچے تھے۔ جسم پر کہیں اور کوئی زخم نہیں تھا اور کوئی چوٹ بھی نہیں تھی۔ اگر وہاں خون آلود ترنگل نہ ہوتی تو یہ سمجھنا بہت ہی مشکل ہوتا کہ اسے ... قتل کیا ہے۔ شمشیر سنگھ نے ترنگل اپنے ہاتھ میں پکڑی اور اس کی نوکیں مقتول کی ٹھوڑی کے نیچے دونوں زخموں پر رکھیں۔ دونوں نوکیں دونوں زخموں پر بالکل فٹ آ گئیں۔

"دیکھ اوئے کاکا!" شمشیر سنگھ نے مجھ کو کہا۔ "اس کو اس ترنگل سے ہلاک کیا گیا ہے یہ لیٹا ہوا ہوگا یا قاتل کے ساتھ لڑتے جھگڑتے پیٹھ کے بل گرا ہوگا۔ قاتل نے ترنگل اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اتنے غصے سے دبائی کہ ترنگل کی دو انگلیاں اس کی شہ رگ میں دور تک اتر گئیں ... یہ دیکھ۔ شہ رگ کٹ گئی ہے اور دوسری انگلی ایسی جگہ اندر چلی گئی ہے جہاں سے سانس والی نالی میں بھی سوراخ ہو گیا ہے۔ اگر اس شخص میں ہمت ہوتی تو زخموں کے ساتھ بھی باہر تک جا سکتا تھا لیکن ایسا لگتا ہے جیسے قاتل نے اس کے گلے سے ترنگل اس وقت ہٹائی ... یہ مر چکا تھا یا خون اس کے پھیپھڑوں میں چلا گیا ہوگا۔ یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں پتہ چلے گا۔"

شہری لوگوں نے ترنگل نہیں دیکھی ہوگی۔ دیہات میں لوگ اس کو کھلیانوں میں استعمال کرتے ہیں اور اس سے بھوسہ بھی اکٹھا کرتے ہیں۔ یہ ایک لمبا بانس ہوتا ہے جس کے آگے انسان کے ہاتھوں کی طرح تین یا چار انگلیاں بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہر انگلی کی لمبائی ایک بالشت کے برابر یا اس سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ ہر انگلی آگے سے نوکیلی ہوتی ہے۔ استعمال کرتے کرتے نوکیں اتنی باریک اور تیز ہو جاتی ہیں کہ ذرا سا دباؤ ڈالنے سے انسان کے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں۔

خون کے چھینٹے ایک دیوار اور کواڑ کے پچھلی طرف بھی پڑے ہوئے تھے۔ پتہ لگتا تھا کہ مقتول اتنا نہیں تڑپا۔ اگر تڑپتا تو کوٹھڑی میں بہت ساری جگہ پر تڑپنے کے نشان ہوتے اور خون ہر جگہ ہوتا۔ شمشیر سنگھ کا کہنا ٹھیک تھا کہ قاتل نے اس کو موت واقع ہو جانے تک دبا کر رکھا۔

ترنگل کو اپنے قبضے میں لے لیا اور لاش کو ...

کاغذی کارروائی برائے پوسٹ مارٹم بھیج دیا۔ باہر آ کر صحن میں دیکھا۔ فرش تو کچا تھا لیکن وہاں اتنے زیادہ لوگ آ چکے تھے کہ قاتل کے کھرے لاپتہ ہو گئے تھے۔ حویلی کے اس حصے اور رہائشی حصے کے درمیان جو دیوار تھی اس میں ایک دروازہ تھا۔ یہ اِدھر اُدھر آنے جانے کے کام آتا تھا۔

خوبصورت عورت کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا

اس حصے کی الگ ڈیوڑھی تھی جو صاف نہیں تھی۔ اس میں سے مویشی اندر باہر آتے جاتے تھے اور دیہات میں صفائی کا کون خیال رکھتا ہے۔ سب انسپکٹر شمشیر سنگھ نے اسی ڈیوڑھی میں تفتیش کے لئے بیٹھنے کا حکم جاری کر دیا۔ نمبردار کو اور مقتول کے باپ وغیرہ کو مصیبت پڑ گئی۔ ان سب نے بھاگ دوڑ کر ڈیوڑھی میں جھاڑو دلوایا، دو تین چارپائیاں رکھوا دیں اور ان پر بستر بچھا دیے اور دو دو تکیے رکھ دیے۔ دو کرسیاں اور چھوٹی سی ایک میز آ گئی اور اس طرح مویشیوں کی ڈیوڑھی تھانیداروں کا دفتر بن گئی۔

مقتول کے باپ کو بلا کر بٹھایا اور پوچھا کہ دشمنی کس کے ساتھ تھی۔ اس نے ایک خاندان کا نام لیا۔ اس کے ساتھ ان کی خاندانی دشمنی جس کو پرانی عداوت کہتے ہیں، چل رہی تھی۔ دو سال پہلے دونوں خاندانوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ اس میں دونوں طرف کے آدمی زخمی ہوئے تھے اور ایک مر گیا تھا۔ دونوں طرف کے آدمی گرفتار ہوئے تھے۔ مقتول اور اس کے ایک چچا یا شاید ماموں کے بیٹے پر قتل کی فرد جرم لگی تھی لیکن عدم ثبوت کی بناء پر دونوں بری ہو گئے تھے۔ لڑائی میں دونوں طرف زیادہ آدمی ہوں تو کسی ایک یا دو ملزموں کے خلاف قتل ثابت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

یہ ہمارے مشتبہ تھے۔ میں نے ان کو مشتبہ بنا لیا تھا لیکن شمشیر سنگھ نے مجھ کو کہا کہ ان کو شامل تفتیش تو کر لیں گے لیکن قاتل ان میں نہیں۔ اس نے یہ بات اس وجہ سے کہی تھی کہ واردات والی کوٹھڑی میں ایک عورت کی موجودگی کی شہادت ملی تھی۔

''یہ ہوسکتا ہے کہ مقتول کے دشمنوں نے اس کو قتل کرنے کے لئے اس عورت کو استعمال کیا ہو''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''اس عورت نے مقتول کو پھانس لیا ہو گا اور ملاقات اس کوٹھڑی میں طے ہوئی ہو گی۔ مقتول اس پھندے میں آ گیا اور دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا''۔

نمبردار کو کہا کہ اس خاندان کے سب آدمیوں کو ادھر اکٹھا کر کے لے آئے اور کوئی آدمی غیر حاضر نہ ہو۔

مقتول کے باپ نے بتایا کہ وہ مقتول کے گھر کے ساتھ والے مکان میں رہائشی ہے۔ اس سے پوچھا کہ مقتول کا اخلاق کیسا تھا؟ اس نے بتایا کہ سولہ آنے ٹھیک تھا۔

''پھر بھوسے والی کوٹھڑی میں عورت کو کون لایا تھا؟'' شمشیر سنگھ نے پوچھا۔ ''یہاں کوئی آدمی رات کو نہیں سوتا''۔

''مجھ کو معلوم نہیں''۔ باپ نے جواب دیا۔ ''رفیق کی بیوی کو معلوم ہو گا''۔

باپ کی حالت کو غم نے بہت خراب کیا ہوا تھا۔ وہ سوالوں کے جواب بہت مشکل سے دیتا تھا۔ اس سے اپنے رونے پر کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔ اس کو کہا کہ وہ مقتول کی بیوی جلو بھیج دے۔

بیوی آئی تو اس سے پوچھا کہ اس کو کس پر شک ہے۔

''میں کس کس پر شک کروں!'' اس نے کہا۔ ''پتہ نہیں وہ کس کس عورت کا خاوند بنا ہوا تھا''۔

اس عورت نے بتایا کہ مقتول کا اخلاق ٹھیک نہیں تھا۔

''تم ان عورتوں کو جانتی ہو گی''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔

اس نے ایک ہندو اور ایک سکھ عورت کا نام لیا اور اس نے کہا کہ یہ دونوں اس گاؤں کی بدمعاش عورتیں ہیں۔

''معلوم ہوتا ہے اپنے خاوند کے ساتھ تمہاری گزر بسر ٹھیک طرح نہیں ہو رہی تھی''۔ شمشیر سنگھ نے اس کو کہا۔ ''وہ تمہارے ساتھ شاید ہیرا پھیری کرتا تھا...... تمہارے ساتھ اس کا سلوک کیسا تھا؟...... اچھا نہیں ہوگا!''

اس کی آنکھیں پہلے ہی سوجی ہوئی تھیں اور بہت سرخ تھیں۔ یہ نشانی تھی کہ یہ عورت بہت روتی رہی ہے۔ اب شمشیر سنگھ نے اس کو کہا کہ اس کا خاوند اس کے ساتھ ہیرا پھیری کرتا تھا تو اس کا ضبط ٹوٹ گیا۔ پہلے اس کو ہچکی آئی پھر وہ زور زور سے رونے لگی۔ اس نے دوپٹہ اپنے منہ پر ڈال لیا۔ شمشیر سنگھ تو بڑا مضبوط آدمی تھا، اس کو کچھ بھی نہ ہوا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے منہ پھیر لیا۔

میں نے جب منہ ادھر کیا تو شمشیر سنگھ مجھ کو گھور رہا تھا، پھر اس نے مقتول کی بیوی کو حوصلہ دینا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ وہ صحیح حالت میں آ گئی۔

''میں جانتا ہوں تمہارے دل پر کیا گزر رہی ہے''۔ شمشیر سنگھ نے اس کو کہا۔ ''میں تمہیں پانچ چھ دن تنگ نہ کرتا کیونکہ تم غمی کی حالت میں ہو لیکن میں نے قاتل کو پکڑنا ہے۔ میرے لئے ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں''۔

''آپ نے کہا تھا کہ خاوند میرے ساتھ ہیرا پھیری کرتا ہوگا''۔ مقتول کی بیوی نے کہا۔ ''یہ تو آپ نے ٹھیک کہا ہے لیکن وہ بہت پیارا آدمی تھا۔ میرے ساتھ اس کی دلی محبت تھی۔ ہر طرح میرا خیال رکھتا تھا۔ اس میں خرابی یہ تھی کہ دوستیاں بہت پالتا تھا۔ جس کو دوست بناتا تھا، کہتا تھا کہ اس کو اپنی جان بھی دے دوں''۔

''زیادہ دوستیاں کس کے ساتھ لگاتا تھا؟'' شمشیر سنگھ نے پوچھا۔ ''آدمیوں کے ساتھ یا عورتوں کے ساتھ؟''

''دونوں کے ساتھ!'' عورت نے جواب دیا۔

''تم نے کبھی اس کو منع نہیں کیا تھا؟''

''منع تو میں کرتی تھی''۔ مقتول کی بیوی نے جواب دیا۔ ''میں اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتی تھی اور ناراض بھی ہوا کرتی تھی لیکن وہ میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرتا تھا کہ میں اس کی باتوں میں آ جاتی تھی اور اس کی عادتوں کو برداشت کر لیتی تھی''۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اس کے ساتھ خوش رہتی تھیں''۔

''میں تو سچے دل سے اس کے ساتھ خوش رہتی تھی''۔ مقتول کی بیوہ نے جواب دیا۔ ''اور وہ میرے ساتھ خوش رہتا تھا''۔

''ایک تو تم لوگوں کی خاندانی دشمنی تھی''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''میں نے تمہارے دشمن خاندان کو بلایا ہوا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ مقتول کی اپنی دشمنی کس کے ساتھ تھی؟''

''اس نے کبھی کوئی بات مجھ سے چھپائی نہیں تھی''۔ مقتول کی بیوہ نے جواب دیا۔ ''میں کسی کا نام نہیں لے سکتی جس کی دشمنی میرے خاوند کے ساتھ تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کا الگ تھلگ کوئی دشمن نہیں تھا...... لیکن میں یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتی۔ کسی دوست کے پیچھے اس نے کسی کے ساتھ دشمنی پیدا کر لی ہو تو وہ مجھ کو معلوم نہیں''۔

''ان عورتوں کی وجہ سے اس کی کوئی دشمنی ہوگی جن عورتوں کے ساتھ اس نے تعلق جوڑا ہوا تھا؟'' شمشیر سنگھ نے کہا۔

''میں نے آپ کو دو عورتوں کے نام بتانے ہیں''۔

مقتول کی بیوی نے کہا۔ ''ایک ہندو ہے اور ایک سکھ۔ ان دونوں کے آدمی میرے خاوند کے دشمن ہو سکتے ہیں۔ یہ آپ خود معلوم کرلیں۔ آپ تھانیدار ہیں۔ باہر کی باتیں آپ مجھ سے زیادہ اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں''۔

''ان دو عورتوں کے علاوہ کسی اور عورت کا نام لے سکتی ہو؟''

''نہیں!'' اس نے جواب دیا۔ ''میں اتنا ہی کہتی ہوں کہ خوبصورت اور جوان عورت کو دیکھ کر وہ خوش ہوتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ اس کے ساتھ گپ شپ لگائی جائے''۔

نوکر کی بیوہ بہن

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ عورت جو مقتول کی بیوی تھی خود بھی خوبصورت تھی اور اس کا رنگ روپ بھی بہت اچھا تھا اور وہ اپنی خوبصورتی سے دل پر اثر کرتی تھی۔ اس عورت کی موجودگی میں خاوند کو کسی دوسری خوبصورت عورت کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے تھی لیکن بعض لوگ عادت سے مجبور ہوتے ہیں، پھر یہ بات بھی تھی کہ مقتول روپے پیسے والا آدمی تھا۔ مسلمان کے ہاتھ میں زیادہ پیسہ آ جائے تو وہ سب سے پہلے ایک خوبصورت عورت کو خریدنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے دماغ میں صرف عیاشی رہ جاتی ہے۔

مقتول کی بیوی کے ساتھ بہت زیادہ سوال جواب ہوئے تھے۔ شمشیر سنگھ نے بعد میں مجھ کو بتایا تھا کہ اس کو یہ شک ہو گیا تھا کہ مقتول اپنی عیاشی کی عادتوں کی وجہ سے اپنی بیوی کے ساتھ خراب سلوک کرتا ہوگا۔ وہ کسی عورت کو بھوسے والی کوٹھڑی میں لایا ہوگا جس کا بیوی کو پتہ لگ گیا ہوگا اور بیوی نے خاوند کو اپنے بھائیوں وغیرہ سے قتل کرا دیا۔ اس طرح کے کیس تھانوں میں آتے رہتے تھے مگر سوچنے والی بات یہ تھی کہ قتل کرنے والوں نے عورت کو کیوں چھوڑ دیا۔

مقتول کی بیوی پر اتنے زیادہ سوال پھینکے گئے تھے کہ وہ تنگ آ گئی تھی۔ شمشیر سنگھ نے جرح بھی بہت کی تھی۔ اس کا یہ صاف نتیجہ نکلا کہ اس عورت کی زندگی اپنے خاوند کے ساتھ خوش باش گزر رہی تھی۔

''کیا تمہارا کوئی نوکر ادھر مویشیوں کی طرف رات کو نہیں سوتا تھا؟'' شمشیر سنگھ نے اس سے پوچھا۔

''روزانہ رات کو ایک نوکر اس ڈیوڑھی میں سوتا تھا''۔ اس نے جواب دیا۔

''یہ جو رات گزری ہے، کیا یہ نوکر یہاں سویا تھا؟''

''مجھ کو معلوم نہیں''۔ مقتول کی بیوی نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' شمشیر سنگھ نے پوچھا۔ ''تمہیں کیوں معلوم نہیں، تم گھر کا اتنا بھی خیال نہیں رکھتی تھیں؟''

''اس طرف کا سارا انتظام دو نوکروں کے ہاتھ میں ہے'' عورت نے جواب دیا۔ ''میرا خاوند کبھی کبھی ادھر دیکھ لیا کرتا تھا اور میں بھی کبھی کبھی ادھر کا چکر لگا لیتی تھی لیکن پانچ چھ دنوں سے میں نے شام کے بعد ادھر نہیں دیکھا تھا''۔

''رات کو تمہارا خاوند کس وقت گھر سے نکلا تھا؟'' شمشیر سنگھ نے پوچھا۔ ''یا وہ حویلی کے اس طرف کس وقت آیا تھا؟''

''میرا خیال ہے کہ آدھی رات کا وقت ہوگا''۔ مقتول کی بیوی نے جواب دیا۔ ''میرا خاوند گھر سویا ہوا تھا۔ وہ شام کے بعد باہر نکلا تھا اور جلدی واپس آ گیا تھا۔ آدھی رات سمجھ لیں یا جو بھی وقت سمجھ لیں۔ ہم برآمدے میں سوئے ہوئے تھے۔ میری آنکھ کھلی۔ میرا خاوند اٹھ کر اس طرف آ رہا تھا۔ اس نے درمیان والا دروازہ کھولا اور ادھر مویشیوں کی طرف آ گیا۔ مجھ کو یاد ہے کہ اس نے درمیان والا دروازہ ادھر سے پکا بند کر دیا تھا۔ اس طرف

دروازے کی زنجیر ہے۔ میں نے اس پر ایسا شک نہیں کیا کہ پتہ نہیں ادھر کیا کرنے گیا ہے۔ ہمارے ساتھ دشمن لگے ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی رات کو ادھر جا کر مویشیوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ بہت گہری نیند کا وقت تھا۔ میری پھر آنکھ لگ گئی اور آنکھ اس طرح کھلی کہ نوکر منہ اندھیرے بھینس اور گائے کو دوہنے سے پہلے چارہ ڈالنے گئے تو جھوٹے کی کوٹھڑی میں گئے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ کوئی دشمن میرے سہاگ کا خون کر گیا ہے۔ نوکر دوڑے ہوئے آئے اور مجھ کو جگایا''۔

اس کے بعد اس عورت نے یہ بتایا کہ اپنے خاوند کی لہولہان لاش دیکھ کر اس کا کیا حال ہوا۔ پھر کس طرح ساری برادری اکٹھی ہوگئی اور تھانے اطلاع دینے کے لئے آدمی چلے گئے۔

''کیا تم نے پتہ کیا تھا کہ نوکر رات کو یہاں سویا ہوا تھا یا نہیں؟'' شمشیر سنگھ نے اس سے پوچھا۔

''ہاں جی!'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ تو پوچھنا ہی تھا۔ میرے سسر نے بھی پوچھا تھا اور نمبردار نے بھی پوچھا تھا۔ ایک نوکر سامنے آیا اور اس نے بتایا کہ وہ یہاں ڈیوڑھی میں سویا کرتا تھا لیکن چار پانچ دن ہوئے میرے خاوند نے اس کو کہا تھا کہ وہ اپنے گھر جا کر سویا کرے''۔

''نوکروں کے ساتھ کوئی گڑبڑ تو نہیں تھی؟''

''نہیں جی!'' مقتول کی بیوی نے جواب دیا۔ ''نوکروں کے ساتھ کیا گڑبڑ ہونی تھی''۔

''نہیں میری بہن!'' شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''میرا مطلب سمجھو گڑبڑ سے میرا مطلب یہ ہے کہ تم خود کہتی ہو کہ تمہارا خاوند عورتوں کا شوقین تھا۔ شاید ایسی بات ہو کہ نوکروں یا مزارعوں سے کسی کی بیٹی، بیوی یا بہن کے ساتھ اس نے تعلق جوڑا ہوا ہو یا جوڑنے کی کوشش کی ہو تم کہو گی کہ ان کمین لوگوں میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی لیکن میں تم کو بتاتا ہوں کہ غیرت کے جوش میں آیا ہوا آدمی اپنی اور دوسرے کی حیثیت نہیں دیکھا کرتا''۔

''ایسا ہو سکتا ہے''۔ عورت نے کہا۔ ''مجھ کو بھی پتہ نہیں لگا۔ اگر پتہ لگ جاتا تو میں اس عورت کے پورے خاندان کو گاؤں سے نکلوا دیتی''۔

اس عورت سے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ کر لیا تھا۔ اس کو کہا کہ وہ چلی جائے۔ یہ پتہ لگ گیا تھا کہ مقتول رنگین مزاج کا تھا۔ اس کی بیوی کو اس کی ساری عیاشیوں اور باہر کی بدمعاشیوں کا پتہ نہیں لگ سکتا تھا۔ یہ سارا معاملہ معلوم کرنے کے لئے شمشیر سنگھ نے مجھ کو کہا کہ نمبردار کو اندر لے آؤ۔ میں اس کو لے آیا۔ شمشیر سنگھ نے اس کو کہا کہ وہ مقتول کے بارے میں بتائے۔

نمبردار نے تصدیق کر دی کہ مقتول عورتوں کا شوقین تھا۔

''اس کی بیوی اس کے ساتھ لڑتی جھگڑتی نہیں تھی؟'' شمشیر سنگھ نے پوچھا۔

''نہیں سردار جی!'' نمبردار نے جواب دیا۔ ''یہ میری گواہی لکھ لیں کہ میاں بیوی میں بہت محبت تھی اور ہنسی خوشی رہتے تھے۔ یہ تو آپ ساری برادری سے معلوم کر سکتے ہیں۔ رفیق بیوی کو ہمیشہ خوش رکھتا تھا اور گھر کا سارا اختیار اس نے بیوی کو دیا ہوا تھا۔ برادری میں بیاہ شادیوں پر، ماتموں اور ختنوں وغیرہ کے موقعوں پر لینا دینا بیوی کے ہاتھوں ہوتا تھا۔ یہ عورت تو سردار جی، گردن اکڑا اکڑا کر چلتی تھی اور اپنے خاوند کے سر پر فخر کرتی تھی۔ آپ یہ شک دل سے نکال دیں کہ رفیق کو بیوی نے اس کے کرتوتوں سے تنگ آ کر مروا دیا ہو گا''۔

''ایک بات بتاؤ''۔ شمشیر سنگھ نے نمبردار سے پوچھا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ مقتول کے تعلقات کسی نوکر یا مزارعے کے گھر کی عورت کے ساتھ تھے؟''

''ایک عورت کے ساتھ تھے''۔ نمبردار نے جواب دیا۔ ''یہ اس کے ایک نوکر کی بہن ہے جو ڈیڑھ سال ہو

بیوہ ہو کر گھر میں بیٹھی ہے"۔

''کیا تم اس آدمی کو جانتے ہو جو یہاں اس ڈیوڑھی میں سویا کرتا تھا؟

''جانتا ہوں"۔ نمبردار نے جواب دیا۔ ''وہ باہر موجود ہے۔ رفیق کا یارانہ اسی نوکر کی بہن کے ساتھ تھا"۔

''سنا ہے کہ پانچ چھ دنوں سے مقتول نے اس نوکر کو یہاں سونے سے منع کیا ہوا تھا"۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''اس بارے میں تم کچھ بتا سکتے ہو؟"

''سردار جی!" نمبردار نے جواب دیا۔ ''میری نظر گاؤں کے ہر آدمی پر رہتی ہے۔ مجھ کو معلوم ہے کہ یہ آدمی پہلے یہاں سوتا تھا اور اب اس نے یہاں سونا چھوڑ دیا ہے"۔

''یہ کیسا آدمی ہے؟"

''بڑا ہوشیار اور چالاک آدمی ہے"۔ نمبردار نے جواب دیا۔ ''یہ مالک کے منہ چڑھا ہوا تھا"۔

''کیا اس کو پتہ تھا کہ اس کی بہن کا مقتول کے ساتھ کوئی تعلق تھا؟"

''نہ سردار جی!" نمبردار نے جواب دیا۔ ''میں یہ نہیں جانتا"۔

شمشیر سنگھ کو یہ شک تھا کہ یہ آدمی ادھر ہی سوتا تھا۔ مقتول نے اس کو کسی خاص مطلب سے یہاں سونے سے منع کیا تھا اور واردات کی رات اس آدمی کو پتہ لگ گیا ہوگا کہ اس کی بہن گھر میں نہیں ہے اور مقتول کے پاس گئی ہوگی۔ اس کو معلوم ہوگا کہ مقتول بھوسے والی کوٹھڑی میں اپنی دوست عورتوں کو لاتا ہے۔ اس خیال سے وہ سیدھا ادھر آیا۔ اس کی بہن ادھر ہی ہوگی۔ بہن کو وہاں سے باہر بھیج کر اس نے مقتول کو قتل کر دیا۔ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ معلوم کرنا تھا کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا یا کسی طریقے سے اس شخص نے کھول لیا تھا، یا وہ دیوار کے اوپر سے اندر آیا تھا۔

نمبردار کو کہا کہ وہ اس آدمی کو اندر بھیج دے اور اس کی بہن کو بھی بلا لے۔

وہ کون تھی؟

مقتول کا یہ نوکر دیہات کے نوکروں کی طرح نہیں تھا۔ دیہاتی نوکر بہت سادے ہوتے ہیں اور بالکل ہی غریب لگتے ہیں۔ عام طور پر ان کا حال حلیہ اور لباس میلا اور پھٹا پرانا ہوتا ہے اور ان کی حرکتیں اور باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے یقین ہو جاتا ہے کہ ان کو دنیا میں کسی چیز کے ساتھ دلچسپی نہیں اور یہ صرف اس کام کے لئے دنیا میں آئے ہیں کہ اپنے مالکوں کی خدمت کریں اور مالک بچی کھچی روٹی دیں اور دونوں عیدوں پر ایک دو روپے دیں تو یہ سچے دل سے قبول کر لیں لیکن یہ شخص جو مقتول کا نوکر چلا گیا تھا، ایسا نوکر نہیں تھا۔ حقیقت میں وہ نوکر لگتا ہی نہیں تھا۔ اس کے کپڑے اچھے اور صاف ستھرے تھے۔ اس نے تلے والی جوتی پہنی ہوئی تھی اور سر پر ململ کی پگڑی تھی جس کی کلف لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا نام علی رضا بتایا۔ گاؤں میں اسے علیا کہتے تھے۔

''دیکھ اوئے علیے!" شمشیر سنگھ نے اس کو کہا۔ ''جھوٹ نہیں بولنا۔ جھوٹ بولو گے کیسے؟ مجھ کو ٹھیک باتیں بتانے والے بہت ہیں۔ کھال اتار لوں گا"۔

''جناب سردار صاحب!" اس نے کہا۔ ''آپ پوچھیں کیا پوچھتے ہیں۔ میرے جواب کو پرکھیں۔ جس سے مرضی ہے پوچھ لیں۔ جھوٹ نکلے تو ہتھکڑی آپ کے پاس ہے۔ باندھ لینا"۔

''رات کو تم کہاں سوئے تھے؟"

''اپنے گھر میں!" علیے نے جواب دیا۔

''تم گھر سے نکلے تھے"۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''تم یہاں آئے تھے"۔

''نہیں جناب سردار جی!'' اس نے کہا۔ ''آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔ اگر رات کو میں یہاں آتا تو چوہدری رفیق قتل نہ ہوتا۔ معلوم نہیں اس نے مجھ کو یہاں سونے سے کیوں منع کر دیا تھا''۔

''کیا چوہدری رفیق یہاں عورتوں کو لاتا تھا؟''

''جب میں یہاں سوتا تھا اس وقت تو وہ کبھی کسی عورت کو یہاں نہیں لایا تھا''۔ اس نے جواب دیا۔

''سردار صاحب! اس کو بھوسے والی کوٹھڑی میں کسی عورت کو لانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو بادشاہ آدمی تھا۔ اس کے پاس اور بھی جگہیں تھیں''۔

اس سے بھی پوچھا کہ مقتول کا تعلق کس کس کے ساتھ تھا۔ اس نے اسی ہندو عورت اور سکھ عورت کا نام لیا جو مقتول کی بیوی بتا چکی تھی۔

''ایک عورت اور بھی ہے علیے!'' شمشیر سنگھ نے کہا۔

''وہ مجھ کو معلوم نہیں''۔ علیے نے جواب دیا۔

''تم اس کو بھی جانتے ہو علیے!'' شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''ایک آدمی قتل ہو گیا ہے۔ مجھ کو کسی کی بھی عزت کی پروا نہیں۔ تم شرافت سے نہیں بولو گے تو میں دوسرے طریقے سے بلواؤں گا۔ خود ہی بتا دو تو اچھے رہو گے''۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''فوراً بول!'' شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''میں تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ تیرے جواب کے انتظار میں بیٹھا رہوں گا..... اٹھ اور دروازہ کھول کر باہر دیکھ۔ تیری بہن موجود ہے یا نہیں..... اٹھ اور دیکھ''۔

وہ اٹھ کر دروازے میں گیا۔ دروازے سے باہر دیکھا اور دروازہ بند کر کے واپس ہمارے پاس آ گیا۔

''مرنے والا تو مر گیا ہے خالصہ جی!'' اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''شاہ جی۔ میری عزت رکھیں۔ میری بہن کو نہ بلائیں''۔

''کیا تم جانتے تھے کہ چوہدری رفیق تمہاری عزت کے ساتھ کھیل رہا تھا؟''

''ہاں!'' اس نے جواب دیا۔ ''میں جانتا تھا''۔

''تم نے اپنی بہن کو کچھ نہیں کہا تھا؟''

''کہا تو تھا''۔ اس نے مایوسی کے لہجے میں جواب دیا۔

''چوہدری رفیق کو بھی کچھ کہا تھا؟''

''نہیں سردار جی!'' اس نے جواب دیا۔

''اس کو کیوں نہیں کچھ کہا تھا؟''

اس شخص کا سر نیچا ہو گیا۔ میں اس کی مجبوری کو جانتا تھا۔ یہ نوکر چاکر لوگ تھے۔ ان کے مالک ان کے لئے خدا کے بعد کا درجہ رکھتے تھے۔ سارے مالک ایسے نہیں تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو اپنے برابر کے لوگوں کے ساتھ کم لیتے تھے اور اپنے مزارعوں اور نوکروں چاکروں کی ہر ضرورت کا اور ان کی عزت کا پورا خیال رکھتے تھے۔ سیدھی بات اس طرح ہے کہ وہ اپنے نوکروں چاکروں کو بھی اپنے جیسا انسان سمجھتے تھے۔ ایسے لوگ اب بھی موجود ہیں اور ایسے لوگ اس زمانے میں بھی موجود تھے لیکن چوہدری رفیق مقتول جیسے زمیندار بھی تھے جو نوکروں وغیرہ کی عورتوں کو بھی اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔

علیا اور اس کے مقتول مالک کے درمیان بھی ایسا ہی معاملہ معلوم ہوتا تھا۔ سب انسپکٹر شمشیر سنگھ دل میں یہ شک رکھ کر اس سے یہ پوچھ گچھ کر رہا تھا کہ مقتول کا قاتل یہ ہو سکتا ہے لیکن سوال جواب کا سلسلہ اور آگے چلا تو معاملہ صاف ہو گیا۔ علیا نے صاف لفظوں میں اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔

میں سارے سوال اور علیا کے جواب نہیں لکھ رہا۔ یہ بڑی لمبی باتیں ہیں۔ میں یہ بیان کر رہا ہوں کہ ہم نے اتنی زیادہ مغز کھپائی سے کیا نتیجہ نکالا تھا۔ میں کم تھوڑے لفظوں میں یہ نتیجہ بیان کروں تو میں یہ کہوں گا کہ علیا نے

پنی بیوی کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہوئی تھیں اور مقتول کی طرف سے اس کو انعام ملتا رہتا تھا۔ ایک انعام یہ تھا کہ مقتول نے اس شخص کو سارے نوکروں اور مزارعوں پر انچارج لگایا ہوا تھا۔

''تم نے ہر ایک بات کھول کر بیان کر دی ہے''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دو کہ یہاں رات کو جو عورت موجود تھی وہ کون تھی؟...... تم چوہدری رفیق کے خاص آدمی تھے''۔

اس سوال پر علیا نے ایک درجن قسمیں کھائیں اور کہا کہ اس کو کچھ بھی پتہ نہیں کہ رات کو یہاں کون آئی تھی۔

''میں شک شبے کی بات کر سکتا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''چوہدری (مقتول) نے مجھے کہا تھا کہ اب رات کو ادھر نہیں سونا۔ پھر اس نے کہا تھا کہ دن کے وقت مویشیوں کو چارہ وغیرہ ڈالنے کے لئے دو آدمی آ جایا کریں...... جناب سرکار جی! مجھ کو شک یہ ہے کہ چوہدری نے مجھ کو یہاں سونے سے جو منع کیا تھا اس کی کوئی خاص وجہ تھی۔ یہاں ایک اور کوٹھڑی ہے۔ چوہدری نے بہت سارا بھوسہ اس میں رکھوا دیا تھا اور کہا تھا کہ بھوسہ اس کوٹھڑی میں سے لیا کریں۔ تین چار دنوں سے نوکر اس کوٹھڑی میں سے بھوسہ لے رہے تھے جس کوٹھڑی میں چوہدری کی لاش تھی یہ تین چار دنوں سے بند تھی۔ آج صبح اس کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پھر بھی کوئی نوکر اس کے اندر نہ جاتا لیکن کسی آدمی کے پاؤں دروازے میں سے نظر آ رہے تھے اس لئے نوکر اندر چلا گیا۔ اگر لاش کے پاؤں نظر نہ آتے اور دروازہ بند رہتا تو لاش اندر پڑی رہتی اور کسی کو پتہ نہ لگتا''۔

وہ مان گئی

اس شخص پر شمشیر سنگھ نے بہت زیادہ وقت لگایا۔ لیکن جو بات ہم معلوم کرنا چاہتے تھے وہ معلوم نہ ہوئی۔ شمشیر سنگھ تجربہ کار سب انسپکٹر تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ علیا کا بیان ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ علیا کو باہر بٹھا دیا۔ اس کو ہم جانے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ ابھی دوسرے نوکروں کو بھی بلانا تھا۔ ان سے پہلے شمشیر سنگھ نے علیا کی بہن کو بلایا۔

اس عورت کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور وہ بڑی اچھی شکل وصورت اور بڑے اچھے جسم والی عورت تھی۔ ڈیوڑھی میں آئی تو بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس کو ہم نے تسلی دلاسہ دے کر بٹھایا۔ شمشیر سنگھ نے مجھ کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ عورت آئے تو اس کی چوڑیاں دیکھنا۔ میں نے اس کی چوڑیاں دیکھیں اس کے صرف ایک بازو میں چوڑیاں تھیں اور وہ سب سرخ رنگ کی تھیں۔

اس عورت سے شمشیر سنگھ نے کچھ باتیں پوچھیں۔ وہ ہر بات کا جواب ڈر ڈر کر دیتی تھی۔ مقتول کے ساتھ اس کا جو تعلق تھا اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے جھوٹ بول دیا کہ مقتول کے ساتھ اس کا کوئی اور تعلق نہیں تھا۔ شمشیر سنگھ نے کچھ اور باتیں اور سوال کر کے اس سے منوا لیا کہ مقتول کے ساتھ اس کا تعلق تھا لیکن بہت ساری کوشش کے باوجود اس سے ہم یہ پتہ نہ لگا سکے کہ چوہدری کی دوستی کس کون سی عورت کے ساتھ تھی جو رات کو یہاں آئی تھی۔

اس نے یہ اقبال نہیں کیا کہ گزری رات وہ یہاں آئی تھی۔ مجھ کو یہ نظر آ رہا تھا کہ شمشیر سنگھ اس عورت کو بہت رگڑا دے گا لیکن اس نے آرام آرام سے اس کے ساتھ باتیں کیں اور جب عورت نے ایک بات مان لی تو وہ مزید باتیں بھی مان گئی۔ شمشیر سنگھ نے اس سے پوچھا کہ اس کا بھائی علیا منع کرتا ہوگا کہ چوہدری کے ساتھ تعلق توڑو۔

''سچ پوچھتے ہو تھانیدار جی؟'' اس نے جواب دیا۔ ☆

''کبھی کبھی میرا بھائی مجھ سے خود ہی پوچھتا تھا کہ تم چوہدری رفیق کے پاس نہیں گئیں؟ انہوں نے نہیں بلایا تو خود جا کر پوچھ لینا تھا کہ کوئی کام تو نہیں؟ انسان کو سو کام پڑ جاتے ہیں''۔

اس کو شمشیر سنگھ نے گھر بھیج دیا۔ علیے کو نہیں جانے دیا۔ اس کو باہر بٹھایا ہوا تھا۔ مجھ کو آج تک یاد ہے۔ رات ہوئی تھی۔ اس وقت تک شمشیر سنگھ نے لسی کے دو گلاس پیے تھے جو ایک سکھ کے گھر سے آئی تھی اور میں نے بھی لسی کے دو گلاس پیے تھے۔ یہ لسی نمبردار کے گھر سے آئی تھی۔ اس لسی کے سوا شمشیر سنگھ نے نہ خود کچھ کھایا پیا تھا نہ مجھ کو کچھ کھانے پینے دیا تھا۔ دن کو روٹی کے وقت نمبردار نے تین چار دفعہ اندر آ کر پوچھا کہ روٹی لے آؤں؟

''او ٹھہر اوئے!'' ایک دفعہ شمشیر سنگھ نے یہ کہہ کر اس کو بھگا دیا۔ دوسری دفعہ یہ کہا۔ ''اوئے جا ایتھوں''۔ اور اس کو باہر نکال دیا اور ایک دفعہ اس نے کچھ کہنے کی بجائے نمبردار کو غصے سے دیکھا اور نمبردار بھاگ گیا۔

جب علیے کی بہن کو باہر بھیج دیا تو شمشیر سنگھ نے مجھ سے پوچھا کہ اب تو بتا کس کو بلائیں۔

''نمبردار کو!'' میں نے کہا۔

''نمبردار کو کیا کرو گے؟'' شمشیر سنگھ نے پوچھا۔ ''کوئی نئی بات تمہارے دماغ میں آئی ہے؟''

''نہیں موتیاں والی سرکار!'' میں نے کہا۔ ''بات نئی نہیں بہت پرانی ہے۔ کل شام کی بات ہے کہ روٹی کھائی تھی اور آج کی شام گزر گئی ہے''۔

شمشیر سنگھ نے قہقہہ لگایا۔ یہ شخص اتنی زیادہ مغز کھپائی کر کے بھی ہنس رہا تھا۔ اس نے نمبردار کو بلا کر کھانا منگوایا۔ اس نے مجھ کو کہا کہ اب یہ نہ کہنا کہ نیند آئی ہے۔

کھانے کے بعد مقتول کے خاندان کے دشمن خاندان کے تینوں آدمیوں کو باری باری بلایا۔ ان سب نے کہا کہ ہم دشمن کو چوروں کی طرح مارنے والے آدمی نہیں۔ جب دل میں اپنا خون چکانے کا ارادہ آئے گا تو دشمنوں کو للکاریں گے اور میدان میں دنیا کے سامنے بدلہ لیں گے۔

ہم کو یہ امید تھی کہ ان سے پوچھیں گے کہ مقتول کیسا آدمی تھا تو یہ اس کے بارے میں کئی باتیں بتا کر بہت سارا جھوٹ بھی شامل کریں گے اور اس طرح اپنے دشمنوں کو بدنام کریں گے لیکن ان سے پوچھا تو ان تینوں نے ہماری طبیعت صاف کر دی۔

''وہ دنیا سے چلا گیا ہے''۔ ان میں سے سب سے پہلے آدمی نے کہا۔ ''دشمنی زندہ انسانوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اللہ اس کی گور ٹھنڈی کرے۔ اچھا آدمی تھا۔ اگر گناہگار تھا تو گناہ اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ اب اس کا اچھا برا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اس کے خلاف زبان پر ایک لفظ بھی نہیں لائیں گے''۔

شمشیر سنگھ نے اور میں نے بھی بہت زور لگایا کہ وہ مقتول کے خفیہ کردار کی کوئی بات کریں لیکن انہوں نے تو قسم کھالی تھی کہ نہیں کریں گے۔ سب نے اسی طرح کے جواب دیئے۔

ان کے بعد مقتول کے نوکروں اور مزارعوں کی باری آئی۔ سب نے مقتول کے بارے میں وہی باتیں بیان کیں جو میں سنا چکا ہوں۔

رات ان کے ساتھ گزر گئی مگر ہمارے ہاتھ کوئی کھوج نہ آیا۔ پوسٹ مارٹم کے لئے لاش چھ میل دور ایک چھوٹے شہر کے سرکاری ہسپتال میں گئی تھی۔ واپس آئی تو ہمیں رپورٹ معلوم ہوئی۔ مقتول کی موت نرنگل سے واقع ہوئی تھی۔ اس کی انگلیاں گردن کی ہڈی تک پہنچ گئی تھیں۔ شہ رگ میں اور ہوا کی نالی میں سوراخ ہو گیا تھا۔ خون باہر بھی نکلا تھا اور پھیپھڑوں کے اندر بھی چلا گیا تھا۔

کھوج یہ لگاتا تھا کہ بھوسے والی کوٹھڑی میں عورت

کون تھی۔ میں اور شمشیر سنگھ اکیلے بیٹھے اور غور کرنے لگے۔ سوال یہ سامنے آتا تھا کہ دری، تکیہ اور کمبل کیوں لایا گیا تھا۔ یہ پورا بستر تھا۔ کیا وہاں کوئی سویا ہوا تھا یا سویا کرتا تھا؟ یہ تینوں چیزیں کسی نوکر کی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ نوکر کی ہوتیں تو اتنی اچھی قسم کی نہ ہوتیں اور اتنی صاف نہ ہوتیں۔ ہم نے پہلے اس پر غور نہیں کیا تھا۔

شمشیر سنگھ نے مقتول کی بیوی کو بلایا۔ وہ روتی ہوئی آئی۔ اس کو حوصلہ دیا اور کہا کہ وہ اس بستر کو اچھی طرح دیکھے۔ اس نے تینوں چیزیں الگ الگ دیکھیں۔

''یہ بستر کہاں سے آیا ہے؟'' شمشیر سنگھ نے پوچھا۔ ''تمہارے گھر کا تو نہیں؟''

''کمبل اور تکیہ ہمارے گھر کے ہیں''۔ مقتول کی بیوی نے جواب دیا۔ ''دری بھی اپنی ہی لگتی ہے''۔

اس نے پہلے یہ بستر نہیں دیکھا تھا یا غور سے نہیں دیکھا تھا۔ خاوند کی لاش دیکھ کر اس کو کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ وہ حویلی کے رہائشی حصے میں چلی گئی پھر واپس آ کر اس نے بتایا کہ تینوں چیزیں اس کے اپنے گھر کی ہیں۔ شمشیر سنگھ نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کو پتہ ہی نہیں کہ یہ چیزیں بھوسے والی کوٹھڑی میں کب اور کس طرح آ گئی تھیں۔

شمشیر سنگھ کہنے لگا کہ باقی تفتیش تھانے میں کریں گے۔

بزدل دوست

ہم تھانے میں مع جملہ مشتبہان آ گئے۔

اب آپ اس طرف دھیان نہ دیں کہ ہم یہ تفتیش کس وقت کر رہے تھے۔ دن تھا یا رات تھی، ہم نے کھانا کھایا تھا یا نہیں کھایا تھا۔ آپ سیدھی کہانی سنیں۔ میں نے جو باتیں تحریر کر دی ہیں یہ بہت تھوڑی ہیں جس طرح کہانیاں لکھ کر آپ کو بھیجنے والے دوسرے سب انسپکٹر اور انسپکٹر صاحبان تحریر کیا کرتے ہیں کہ تفتیش اتنی لمبی ہوتی ہے کہ اگر اس کو پورے کا پورا قلمبند کیا جائے تو تین سو یا چار سو صفحوں کی کہانی بن جائے۔ بعض اوقات ایک ہی مشتبہ پر پوری رات نکل جاتی ہے۔ آپ خود سوچیں کہ اس کے ساتھ جو پوری باتیں ہوئی تھیں وہ ساری کی ساری تحریر میں لائی جائیں تو ایک موٹی کتاب بن جائے۔

مقتول کے گاؤں میں ہم نے صرف اتنی تفتیش نہیں کی تھی جو میں نے بیان کی ہے۔ شمشیر سنگھ نے مخبروں کے اور نمبردار کے علاوہ دو تین معزز آدمیوں سے بھی مقتول اور اس کے خاندان اور جملہ مشتبہان کے بارے میں معلومات لی تھیں۔ تھانے میں آ کر شمشیر سنگھ نے یہ سوچا کہ مقتول کی بیوی نے بتایا تھا کہ مقتول دوستیاں پالتا تھا اور جس کے ساتھ دوستی لگاتا تھا اس پر جان بھی قربان کر دینے کو تیار ہو جاتا تھا۔ شمشیر سنگھ نے کہا کہ مقتول کے جو گہرے دوست ہیں ان کو تھانے میں طلب کیا جائے۔ آسان بات تو یہ تھی کہ ان دوستوں کو گاؤں میں ہی اکٹھا کر لیا جاتا لیکن شمشیر سنگھ کہتا تھا کہ تھانے میں تفتیش آسان ہو گی اس کا مطلب یہ تھا کہ جس پر شک ہوگا کہ جھوٹ بول رہا ہے اور اصل بات چھپانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے ساتھ دوسرا طریقہ اختیار کریں گے۔ شمشیر سنگھ دوسرے طریقے کو اچھا نہیں سمجھتا تھا لیکن اس کو جب شک ہو جاتا تھا کہ یہ شخص چالاک بننے کی کوشش کر رہا ہے تو پھر شمشیر سنگھ بہت ہی ظالم آدمی بن جاتا تھا۔ اتنا تشدد کرتا تھا کہ مشتبہ یا ملزم کے زندہ رہنے کی امید بہت تھوڑی رہ جاتی تھی۔

تھانے میں ہمارے ساتھ مقتول کے قریبی رشتے دار بھی آئے تھے۔ ان سے اور گاؤں کے دیگر اشخاص سے معلوم کیا کہ مقتول کے گہرے دوست کون تھے۔ انہوں نے چار آدمی بتائے۔ شمشیر سنگھ نے ان آدمیوں کو

تھانے میں لانے کے لئے آدمی بھیج دیئے۔

جب ان کو بلانے والے آدمی چلے گئے تو مقتول کے ایک قریبی رشتے دار نے مجھ کو بتایا کہ مقتول کا ایک دوست اس گاؤں میں بھی ہے۔ اس گاؤں سے مطلب وہ گاؤں تھا جس میں تھانہ تھا۔ مقتول کا گاؤں تھانے سے والے گاؤں سے دو میل اور شاید دو فرلانگ دور تھا۔ میں نے یہ بات شمشیر سنگھ کو بتائی۔ شمشیر سنگھ نے یہ بات بتانے والے کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ وہ کس طرح کہتا ہے کہ اس شخص کی دوستی مقتول کے ساتھ گہری تھی۔

یہ بات بتانے والے شخص نے مقتول کے اس دوست کا نام کامل بتایا اور کہا ''دس پندرہ دنوں بعد کامل چوہدری رفیق کے گاؤں جاتا تھا اور ایک یا دو راتیں اس کے گھر رہتا تھا۔ چوہدری رفیق بھی کامل کے گھر آتا جاتا تھا اور کبھی کبھی اس کے گھر میں ایک دو راتیں گزارتا تھا۔ یہ بات تو چوہدری رفیق کی بیوی کو بھی معلوم ہوگی کہ ابھی پانچ چھ روز پہلے بھی کامل ہمارے گاؤں میں آیا ہوا تھا اور وہ چوہدری رفیق کے گھر ٹھہرا تھا۔ دو روز بعد وہ پھر آیا تھا لیکن رات کو نہیں ٹھہرا تھا۔ صبح آیا اور شام کو چلا گیا تھا''۔

اس آدمی کو باہر بٹھا کر شمشیر سنگھ نے مجھ کو کہا کہ جو دو آدمی مقتول کے گاؤں کو روانہ کئے گئے ہیں ان کو واپس بلا لو۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو سائیکل پر ان کے پیچھے دوڑا دیا۔ وہ ابھی دور نہیں گئے تھے۔ ان کو واپس بلا لیا۔ شمشیر سنگھ نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر وہ مقتول کے گاؤں جائے اور دو کام کرے۔ ایک تو مقتول کے دوستوں کو اکٹھا کرنا تھا اور دوسرا کام یہ تھا کہ مقتول کی بیوی سے مقتول کے اس دوست کے بارے میں جس کا نام کامل تھا، ضروری باتیں پوچھنی تھیں۔ جو باتیں پوچھنی تھیں وہ شمشیر سنگھ نے ہیڈ کانسٹیبل کو سمجھا دیں۔ میں آپ کو یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ ہیڈ کانسٹیبلوں کو آج کل بھی وہی اختیارات حاصل ہیں جو ہمارے زمانے میں تھے لیکن ہمارے زمانے کے ہیڈ کانسٹیبل اپنی ڈیوٹی کے پکے ہوتے تھے۔ وہ تھانیداروں کی جگہ تفتیش کرتے تھے۔

جس ہیڈ کانسٹیبل کو ہم نے مقتول کے گاؤں بھیجا تھا وہ تجربہ کار آدمی تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ مقتول کی بیوی سے کیا معلوم کرنا ہے۔ ادھر شمشیر سنگھ نے کامل کو تھانے طلب کر لیا۔ وہ آیا تو میں نے اس کو دیکھا۔ بہت اچھا جوان تھا۔ میں اس کو شمشیر سنگھ کے پاس لے گیا۔ شمشیر سنگھ نے مجھ کو بھی بٹھا لیا۔

''کامل بھائی!'' شمشیر سنگھ نے اس کو کہا۔ ''تم کیسے جگری یار ہو، تمہیں پتہ نہیں لگا کہ تمہارا اتنا گہرا دوست قتل ہو گیا ہے؟''

''مجھ کو پتہ لگ گیا تھا''۔ کامل نے جواب دیا۔

''پھر وہاں گئے کیوں نہیں؟''

''اس کے ساتھ کیا رشتہ داری تھی!'' کامل نے جواب دیا۔ ''اتنی گہری دوستی تو نہیں تھی''۔

''اچھا، اچھا!'' شمشیر سنگھ نے کہا اور اس نے مجھ کو کہا۔ ''آفتاب بھائی! اس بے چارے کو تم نے خواہ مخواہ بلا لیا ہے۔ تم کہتے تھے کہ ان کی بڑی پکی دوستی تھی''۔

''اگر یہ کہتا ہے کہ اس کی دوستی چوہدری رفیق کے ساتھ نہیں تھی تو نہیں ہو گی''۔ میں نے کہا۔ ''پھر اس کو جانے دیتے ہیں''۔

''ہاں جی!'' کامل خوش ہو کر بولا۔ ''مجھ کو جانے دیں۔ اس کے ساتھ میری دوستی اتنی پکی ہوتی تو میں کل ہی وہاں پہنچ جاتا اور اس وقت وہیں ہوتا''۔

شمشیر سنگھ اور میں اس طرح بات کرتے تھے جیسے نہ وہ سب انسپکٹر ہے نہ میں اسسٹنٹ سب انسپکٹر ہوں۔ کامل کو اس واردات میں ہم نے ضروری نہیں سمجھا تھا اور اس کو تفتیش میں شامل بھی نہیں کرنا تھا۔ بتایا گیا تھا کہ یہ

بھی مقتول کا دوست تھا اس لئے اس کو بلایا تھا کہ شاید اس سے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو ہمارا کام آسان کر دے لیکن اس شخص نے مقتول کی دوستی سے انکار کر کے اپنے خلاف شک پیدا کر دیا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ ڈر گیا ہو کہ یہ قتل کی واردات ہے اور اس کو تھانے میں بار بار بلایا جائے گا۔ کامل عام کسان خاندان کا جوان نہیں تھا۔ خوشحال زمیندار خاندان کا بیٹا تھا۔

''پھر سوچ لو بھائی!'' شمشیر سنگھ نے اس کو کہا۔ ''کیا وہ تمہارا دوست نہیں تھا؟''

''نہ جی!'' کامل نے جواب دیا۔ ''سلام دعا ضرور تھی''۔

''تم اس کے گھر نہیں گئے تھے؟''

''کبھی گیا ہوں گا!'' اس نے جواب دیا۔ ''ہاں ایک دو دفعہ گیا تھا''۔

''پھر یاد کرلو''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''شاید زیادہ دفعہ گئے ہو گے..... اور وہ کبھی تمہارے گھر آیا ہوگا''۔

''شاید کبھی آیا ہو''۔ اس نے کہا۔ ''آپ اس کے بارے میں کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں؟''

''تو میں اور کیا چاہتا ہوں''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''میں اس کے قاتل کی جگہ تمہیں تو پھانسی نہیں دلوانا چاہتا۔ تم دو روز پہلے بھی اس کے گھر گئے تھے۔ اس سے دو تین روز پہلے بھی گئے تھے۔ تم اس کے گھر ایک دو دن رہتے تھے۔ وہ تمہارے گھر ایک دو دن رہتا تھا..... تم مجھ کو اس سوال کا جواب دو کہ تم جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ جس گاؤں میں تم جاتے اور رہتے تھے اور جس گاؤں میں وہ آتا اور رہتا تھا وہاں کے اور یہاں کے لوگ اندھے تو نہیں اور ان سب کو معلوم ہے کہ کون کس کا دوست اور کون کس کا دشمن ہے..... ہاں، بولو۔ تم نے جھوٹ کیوں بولا ہے؟''

''قتل کا معاملہ ہے جی!'' اس نے کہا اور اس سے آگے اس نے سوچا لیکن صرف سر تھوڑا سا ہلا دیا۔

''وہ تمہارا دوست تھا یا نہیں؟'' شمشیر سنگھ نے پوچھا۔ ''ہاں یا نہیں؟ فوراً بولو۔ ہاں بولو یا نہ بولو''۔

اس نے پہلے شمشیر سنگھ کی طرف دیکھا پھر میری طرف سر موڑا۔

''فوراً بول!'' شمشیر سنگھ نے رعب سے کہا۔ ''ہاں یا نہیں۔ یہاں تیرے باپ کے مزارعے بیٹھے ہیں جو تیرے حکم کے انتظار میں بیٹھے ہی رہیں گے''۔

اس نے پہلے سر کو ادھر اُدھر ہلایا پھر بولا۔ ''نہیں!''

''اس کو باہر بٹھا دو''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔

میں اس کو باہر لے گیا اور کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا۔ میں شمشیر سنگھ کے پاس واپس گیا تو اس نے کہا کہ یہ شخص بہت ہی بزدل ہے۔ دوستی سے مکر گیا ہے اور یہ اس کے جنازے پر بھی نہیں پہنچا اور اب کہتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کی دوستی ہے ہی نہیں۔

سِکھا شاہی

مقتول کی بیوی سے پوچھ گچھ کر کے ہیڈ کانسٹیبل تین ساڑھے تین گھنٹوں بعد واپس آیا۔ اس کے ساتھ تین آدمی تھے۔ یہ مقتول کے دوست تھے۔ سب سے پہلے ہیڈ کانسٹیبل نے یہ رپورٹ دی کہ اس نے مقتول کی بیوی سے کیا معلوم کیا ہے۔ بیوی نے یہ کہا کہ کامل مقتول کا گہرا دوست تھا۔ کامل کئی بار اس کے گھر ایک یا دو راتیں ٹھہرا تھا۔

مقتول کی بیوی نے یہ بھی بتایا کہ دو تین دن پہلے کامل اس کے گھر آیا تھا اور اس سے دو تین دن پہلے بھی آیا تھا۔ ایک بار دو راتیں وہیں گزاری تھیں اور دوسری بار صبح گیا اور شام کو واپس آیا تھا۔

ہمارے ہیڈ کانسٹیبل نے مقتول کی بیوی سے ایک اور بات معلوم کر لی تھی۔ اس عورت نے اس کو بتایا تھا کہ

یہ جو دو دفعہ کامل آیا تو اس نے اور مقتول نے زیادہ وقت حویلی کے مویشیوں والے حصے میں گزارا تھا۔ کامل پہلے بھی آتا تھا لیکن مقتول اس کو مویشیوں والی طرف کبھی نہیں لے گیا تھا۔

شمشیر سنگھ نے مقتول کے دوستوں کو باری باری بلایا۔ سب نے مقتول کے اخلاق وغیرہ کے بارے میں وہی باتیں بتائیں جو ہم پہلے سن چکے تھے۔ انہوں نے مقتول کے تعلقات بھی سنائے جو اس نے مختلف عورتوں کے ساتھ جوڑے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان عورتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جس کے گھر کے آدمی اتنے مضبوط ہوتے کہ چوہدری رفیق جیسے آدمی کو قتل کر دیتے۔

کامل کو ایک بار پھر بلایا اور اس سے پوچھا کہ وہ مقتول کے مویشیوں والے مکان میں کیا لینے گیا تھا۔

''اس کی بھینس کو دیکھنے گیا تھا''۔ کامل نے جواب دیا۔ ''وہ کہتا تھا کہ یہ بھینس خرید لو...... میں نے بھینس دیکھی تو مجھ کو یہ اچھی نہ لگی''۔

وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ ملزم یا مشتبہ تو نہیں تھا کہ ہم اس کی مار پٹائی شروع کر دیتے۔ اس کو مقتول کا دوست بیان کیا گیا تھا اس لئے اس سے مقتول کے بارے میں کچھ معلوم کرنا تھا۔

''تم ہمارے پاس مہمان بن کر رہنا چاہتے ہو''۔ شمشیر سنگھ نے اس کو کہا۔ ''جاؤ باہر بیٹھو اور آرام کرو''۔

اسی میں رات ہو گئی۔ کامل کو تھانے سے باہر نہ جانے دیا گیا۔ شمشیر سنگھ اس کو سچ نہ بولنے کی سزا دینے پر اتر آیا تھا۔ میں نے کامل کو باہر جا کر کہا کہ وہ اپنی عزت کا خیال کرے ورنہ اس کو حوالات میں بند کر دیں گے۔

''خان صاحب!'' اس نے کہا۔ ''بات کوئی بھی نہیں۔ وہ میرا دوست تھا۔ عورتوں کے معاملے میں اس کی عادتیں ٹھیک نہیں تھیں۔ وہ ضرور کسی عورت کے پیچھے مارا گیا ہے۔ میں اس وجہ سے انجان بنا ہوا ہوں کہ اس کا دوست ہونے کی وجہ سے میں بھی پھنس جاؤں گا۔ ہم خان صاحب! میں نے یہ سوچا ہے کہ مجھ کو عدالت میں گواہی دینے کے لئے نہیں جانا چاہئے۔ میں قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھ کو ذرا سا بھی پتہ نہیں کہ وہ کس عورت کے ساتھ پکڑا گیا اور مارا گیا ہے۔ مجھ کو سکھوں پر شک ہے۔ ان کی ایک جوان اور شادی شدہ عورت کے ساتھ چوہدری رفیق نے دوستی لگائی ہوئی تھی۔ میں اس کو منع کرتا تھا لیکن وہ منع نہیں ہوتا تھا۔ مجھ کو پتہ لگ گیا تھا کہ رفیق قتل ہو گیا ہے۔ میں نے اس کی بیوی کے پاس جانا تھا لیکن پولیس کی سوچ کر میں نہیں گیا۔ سب نہیں گے کہ یہ شخص بھی رفیق کا دوست تھا، پھر مجھ کو یہ سوچ آئی کہ سکھوں کو پتہ لگ جائے گا کہ میں بھی رفیق کا دوست تھا تو وہ مجھ کو بھی قتل کر دیں گے''۔

میں آپ کو مختصر بات سناتا ہوں۔ کامل نے مجھ کو منوا لیا کہ وہ پولیس اور سکھوں کے ڈر سے نہیں مانتا تھا کہ مقتول اس کا دوست تھا۔ میں نے سب انسپکٹر شمشیر سنگھ کو یہ ساری بات سنا دی اور اس کو کہا کہ مجھ کو بھی سکھوں پر شک ہے۔ میں سکھوں کو جانتا تھا۔ سکھ بیوقوف ہو سکتا ہے، وہ جسمانی لحاظ سے کمزور ہو سکتا ہے اور اس میں بہت ساری کمزوریاں اور خرابیاں ہو سکتی ہیں لیکن سکھ بزدل نہیں ہو سکتا۔ میں جس علاقے کی واردات سنا رہا ہوں اس علاقے کے سکھ کسی کو قتل کر دینا معمولی بات سمجھتے تھے۔ ان کو جانگلی سکھ بھی کہا جاتا تھا۔ ان میں سے جو قصبوں اور شہروں میں کام کاج اور نوکری چاکری کرتے تھے وہ تعلیم یافتہ ہو کر بھی فطرت کے لحاظ سے جانگلی ہوتے تھے۔

''آپ میرے استاد ہیں''۔ میں نے شمشیر سنگھ کو کہا۔ ''لیکن میری بات پر ضرور غور کریں۔ قاتل سکھ ہیں''۔

''نہیں اوئے کاکا!'' شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''میں نے نوہ لگا لی تھی۔ جس باپ کی وہ بیٹی ہے جس کے ساتھ مقتول کا تعلق تھا وہ باپ اور اس کے دونوں بیٹے تھوڑے دل والے آدمی ہیں''۔

شمشیر سنگھ کے ساتھ میرے اس شک پر بحث ہوئی لیکن شمشیر سنگھ نہیں آ مانتا تھا۔ میں اصل بات سمجھ گیا۔ شمشیر سنگھ کٹر سکھ تھا اور اپنے آپ کو فخر سے واہگورو کا خالصہ کہا کرتا تھا۔ سکھوں میں یہ وصف تھا کہ ایک دوسرے کی بہت مدد امداد کیا کرتے تھے۔ شمشیر سنگھ کو میں نے پہلے بھی دو تین موقعوں پر دیکھا تھا۔ اس نے سکھوں کے خلاف مقدمے کمزور بنائے اور ان کو بری کروا دیا تھا۔ اب میں اس واردات میں بھی دیکھ رہا تھا کہ وجہ موجود ہونے کے باوجود کسی سکھ کو مشتبہ کی حیثیت سے بھی تھانے نہیں بلا رہا تھا۔

اس واردات میں ایک ہندو عورت کا نام بھی آتا تھا۔ شمشیر سنگھ نے اس کے گھر کے آدمیوں کو بھی پوچھ گچھ کے لئے نہیں بلایا تھا۔ میں نے مقتول کے گاؤں میں اس کو کہا تھا کہ اس ہندو عورت کو شامل تفتیش کر لیتے ہیں لیکن اس نے اس کا بھی یہی جواب دیا۔ ''نہیں اوئے کاکا! ہندوؤں کی اتنی پسلی نہیں ہوتیں ہندو تو ہوتے ہی بے غیرت ہیں''۔

میں نے اس کو استاد کا درجہ دیا ہوا تھا، اس لئے اس کو یہ نہ کہا کہ تم نے علیے کی بہن کو تو فوراً بلا لیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان تھی اور وہ مزارعوں کی بیٹی تھی۔ میں اس وقت تو نہیں بولا تھا لیکن اب میں نے دل میں یہ پکا ارادہ کر لیا کہ اس نے سکھوں کو بچانے کی نیت سے کسی مسلمان کو پھنسانے کی کوشش کی تو میں اس کا ہاتھ روک دوں گا اور پورا کیس مع تفتیش زبانی تحریری اور جو میری عقل نے سوچا اور جو میری آنکھوں نے دیکھا اور جو میرے کانوں نے سنا تھا، ڈی ایس پی کے سامنے رکھ دوں گا اور تفتیش سی آئی کے سپرد کرا دوں گا۔ مجھ کو نوکری کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ میں تو والد صاحب کی خواہش پر نوکری کر رہا تھا۔ اللہ کا فضل تھا، بہت اراضی تھی۔ والد صاحب کی وفات کے بعد میں نے نوکری چھوڑ بھی دی تھی۔ اس وقت لوگ کہتے تھے کہ فوج اور پولیس میں افسری عزت کا باعث ہوتی ہے۔ مجھ کو ایسی عزت کی ضرورت نہیں تھی کہ میرے سامنے مسلمانوں کو رگڑا لگتا رہتا اور میں اپنی افسری پر ہی خوش رہتا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ شمشیر سنگھ کی میرے دل میں بہت عزت تھی۔ میں اس کو اپنا استاد مانتا تھا۔ اس نے مجھ کو عملی طور پر بہت ٹریننگ دی تھی لیکن میں اس کے ہاتھوں مسلمانوں کو خراب ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دوسری شادی پھر طلاق

میں سنا رہا تھا کہ میں نے شمشیر سنگھ کو بتایا کہ کامل پولیس کے اور سکھوں کے ڈر سے تسلیم نہیں کرتا کہ مقتول اس کا جگری یار تھا۔ میں نے اس کو ساری بات سنائی تو اس نے کامل کو بلایا۔ اس نے کامل کو بہت گالی گلوچ کرنی تھی کہ اس نے ہمیں پریشان کیا ہے مگر شمشیر سنگھ نے بس ہنس کر کامل کے ساتھ باتیں کیں۔

''سردار جی!'' کامل نے کہا۔ ''مجھ کو سولہ آنے شک سنتو کے بھائیوں پر ہے''۔

سنتو اس سکھ عورت کا نام تھا جس کے ساتھ مقتول کی دوستی تھی۔ اس کا باپ بھی تھا اور دو بھائی بھی تھے۔

''سنتو بہت دلیر لڑکی ہے جی!'' کامل نے کہا۔ ''مجھ کو رفیق نے بتایا تھا کہ سنتو تین چار دفعہ اس کے پاس مویشیوں والی ڈیوڑھی میں آدھی رات کو آئی تھی''۔

''وہاں رفیق کا ایک نوکر سوتا تھا''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔

''وہ علیا ہے''۔ کامل نے کہا۔ ''اس سے پوچھیں وہ سب جانتا ہے''۔

میں یہ ڈرامہ دیکھ رہا تھا کہ کامل یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ قاتل سکھ ہیں اور قتل کا باعث سنتو ہے لیکن شمشیر سنگھ بڑے مزے مزے سے کہہ رہا تھا کہ یہ شک غلط ہے۔ آخر اس نے کامل کو چھٹی دے دی۔

''استاد جی!'' میں نے شمشیر سنگھ کو کہا۔ ''آپ مجھ کو اجازت دیں۔ میں مقتول کے گاؤں چلا جاتا ہوں۔ سنتو اور اس کے بھائیوں وغیرہ سے تفتیش کروں گا، صبح تک قاتل مجھ سے لے لیں''۔

''نہیں اوئے کاکا!'' شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''بیٹھ جا یہاں''۔

میں بیٹھ گیا اور اس ارادے کو اور زیادہ پکا کر لیا کہ شمشیر سنگھ کے ساتھ پوری ٹکر لوں گا۔

تفتیش چلتی رہی۔ دوسرے کام بھی کئے اور دو یا شاید تین دن اور گزر گئے۔ تھانے میں مخبر آتے رہتے تھے اور کوئی نہ کوئی خبر سنا جاتے تھے۔ پھر وہ اشخاص ہوتے تھے جو مخبر نہیں تھے۔ وہ معززین کہلاتے تھے۔ وہ تھانے میں اس طرح آتے تھے جس طرح لوگ مسجد، مندر اور گوردوارے میں جاتے ہیں۔ بڑے اور چھوٹے تھانیدار کو سلام کرنا پھر چاپلوسی کی باتیں کرنا عبادت سمجھتے تھے۔ آج کل بھی تھانوں میں، خاص طور پر قصبوں اور دیہات کے تھانوں میں، یہ سلسلہ چلتا ہے۔ یہ لوگ جو معزز یعنی عزت والے کہلاتے ہیں، تھانیداروں کے پاس جا کر دوسروں کی چغلیاں کرتے ہیں۔ اس سے تھانیداروں کو یہ فائدہ مل جاتا ہے کہ ان کو تفتیش میں سہولت ہو جاتی ہے اور تھانیدار ان عزت والے اشخاص کو مخبروں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ ہم ان سے بہت فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ یہ گاؤں جس میں تھانہ تھا، چھوٹا گاؤں نہیں تھا۔ یہ قصبے جتنا بڑا گاؤں تھا۔ چھوٹے گاؤں میں کسی کے گھر کی بات چھپ نہیں سکتی تھی، قصبے جتنے بڑے گاؤں میں گھر کی پردہ پوشی ہو جاتی تھی۔

اس طرح کے اشخاص سے ہمیں بھی فائدہ ملا۔ دو آدمیوں نے بتایا کہ گاؤں کے ایک گھر کی کنواری لڑکی لاپتہ ہو گئی تھی اور تین چار روز بعد خود آ گئی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ اس لڑکی کے باپ نے لڑکی کی ماں کے مرنے کے بعد ایک جوان بیوہ کے ساتھ شادی کر لی تھی اور اب اس کو طلاق دے دی ہے۔

یہ کوئی ایسی اطلاع نہیں تھی کہ تھانہ کارروائی شروع کر دیتا۔ دوسری شادی کر لینا پھر طلاق دے دینا کوئی جرم نہیں تھا۔ ایک لڑکی لاپتہ ہو کر اپنے آپ واپس آ گئی تھی تو ہم کیا کرتے! تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں آئی تھی۔ اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے تھے لیکن یہ واقعہ شمشیر سنگھ کو اس وجہ سے سنایا گیا تھا کہ لڑکی کا گھر سے لاپتہ ہونا کامل کے ساتھ بتایا گیا تھا پھر تین چار دنوں بعد لڑکی بھی آ گئی۔

یہ سن کر شمشیر سنگھ کی آنکھوں میں روشنی آ گئی۔

''کیا سمجھے آفتاب!'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''جانے دو موتیاں والے استاد!'' میں نے کہا۔ ''فضول چکر میں کیوں پڑتے ہو''۔

''نہیں اوئے کاکا!'' شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''کامل کو فوراً بلا یہاں''۔

کامل کو بلا لیا گیا۔ اب وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ شمشیر سنگھ نے اس سے پوچھا کہ نذیرو نام کی لڑکی کو وہ کہاں لے گیا تھا اور وہ اکیلی کیوں واپس آئی تھی؟

کامل کی جو حالت ہوئی وہ میں آپ کو کس طرح بتاؤں! ایک دم اس کا چہرہ لاش کے رنگ جیسا ہو گیا۔ یعنی خون غائب۔ اس کی آنکھیں بھی سفید ہو گئیں۔

''تم اس لڑکی کو کہاں لے گئے تھے؟'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

میں اس کے پاس کھڑا تھا اور وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ منہ اوپر کر کے مجھ کو دیکھا اور وہ بول نہیں

سکا۔

"میری بات سن کامل!" میں نے اس کو کہا۔ "کیا چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟ اگر کسی لڑکی کو تم ساتھ لے گئے تھے اور وہ گھر واپس آ گئی ہے اور اس کے کسی وارث نے تھانے میں کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی تو تم نے کوئی جرم نہیں کیا"۔

"اور میں تم کو یہ بھی بتا دیتا ہوں"۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ "اب تم کچھ بھی نہیں چھپا سکتے۔ تمہاری جو حالت ہو گئی ہے یہ بتاتی ہے کہ تمہارے اندر کوئی راز ہے۔ جس پر تم پردہ ڈال رہے ہو"۔

"کوئی راز نہیں"۔ اس نے ایسی آواز میں کہا جس میں جان نہیں تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "میں کسی لڑکی کو نہیں لے گیا تھا"۔

اس وقت شمشیر سنگھ نے اس پر زور نہ دیا۔ اس کے کہنے سے میں کامل کو باہر بٹھا کر اندر آیا تو شمشیر سنگھ نے کہا کہ اس کے خلاف شک یہ ہو رہا ہے کہ یہ مقتول کا گہرا دوست تھا۔ اس کے گھر جاتا رہتا تھا۔ ان پانچ دنوں میں یا تین چار دنوں میں نذیرو نام کی لڑکی گھر سے لاپتہ رہی اور مقتول کے گاؤں سے پتہ لگا تھا کہ ان چند ایک دنوں میں کامل تین دفعہ مقتول کے گاؤں میں گیا تھا۔ یہ شخص لڑکی کو مقتول کے پاس چھوڑ آیا۔ پھر اس لڑکی پر ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا اور مقتول اس کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اسی وجہ سے یہ نہیں مان رہا تھا کہ مقتول کے ساتھ اس کی گہری دوستی تھی۔

"دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے"۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ "لڑکی کے آدمی پہنچ گئے ہوں گے اور وہ مقتول کو مار کر لڑکی کو لے آئے"۔

نذیرو نے باپ کا ہاتھ روک دیا

لڑکی کے لاپتہ ہونے اور واپس آنے کی بات اس طرح باہر نکلی تھی کہ لڑکی کے واپس آتے ہی اس کے باپ نے اپنی دوسری بیوی یعنی لڑکی کی سوتیلی ماں کو طلاق دے دی۔ سوتیلی ماں نے یہ جوابی وار کیا کہ مشہور کر دیا کہ لڑکی کامل کے ساتھ نکل گئی تھی۔ اگر کامل اتنا زیادہ گھبرا نہ جاتا پھر ذرا دل مضبوط کر کے جھوٹ بول دیتا تو ہم اس پر شک نہ کرتے۔

شمشیر سنگھ نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر اس سوتیلی ماں کا اتا پتہ بتایا اور کہا کہ اس کو ساتھ لے آئے۔

وہ آ گئی۔ تیس سال کے لگ بھگ عمر کی خوبصورت عورت تھی۔ اس کا گھبرانا قدرتی امر تھا۔ پہلے تو اس کا حوصلہ مضبوط کیا اور اس کو بتایا کہ اس پر کوئی الزام نہیں۔ اس کا باپ اور ایک بھائی بھی ساتھ آئے تھے۔ ان کو بھی اندر بلا کر تسلی دی کہ اس کے بارے میں پریشانی نہ کریں۔

اس سے جب ہم نے نذیرو کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ دو سال پہلے نذیرو کی ماں مر گئی تھی۔ اس کے باپ نے ایک سال بعد اس عورت کے ساتھ شادی کر لی۔ یہ عورت نذیرو کی سوتیلی ماں بن گئی۔ اس عورت نے بات بہت ہلکی کر دی تھی۔ میں اس کو چھوٹا کر کے سناؤں گا۔ وہ کہتی تھی کہ نذیرو ماں کے مرنے کے بعد خراب ہو گئی تھی۔ سوتیلی ماں اس کو کہتی تھی کہ اپنے باپ کا نام نہ ڈبوئے اور غلط حرکتیں چھوڑ دے لیکن وہ باز نہیں آتی تھی۔

سوتیلی ماں نے دیکھا تھا کہ نذیرو کامل سے ملتی تھی۔ سوتیلی ماں نے نذیرو کے باپ کو بتایا کہ وہ نذیرو کو سمجھائے لیکن باپ نے الٹا اس عورت کو ڈانٹ دیا کہ وہ اس کی بیٹی کو بدنام کرتی ہے۔ ایک رات نذیرو گھر سے لاپتہ ہو گئی۔ سوتیلی ماں نے کامل کی ٹوہ لگائی وہ بھی گھر سے غائب تھا۔ وہ شام کو واپس آیا۔

پرسوں رات کے آخری پہر نذیرو واپس آ گئی۔

PAKSOCIETY1

PAKSOCIETY

اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو سوتیلی ماں کی بھی آنکھ کھل گئی۔ باپ نے دروازہ کھولا۔ اندر آ کر باپ نے لالٹین جلائی اور نذیرو کو مارنے لگا۔ نذیرو نے کہا کہ ٹھہر جاؤ پہلے میری بات سن لو۔ اس نے سوتیلی ماں پر الزام لگایا کہ یہ اس کو تنگ کرتی تھی اس لئے وہ کامل کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

میں آپ کو مکمل بات آگے چل کر سناؤں گا۔ ابھی سوتیلی ماں کا بیان سن لیں۔ اس نے بتایا کہ نذیرو کی حالت بہت بُری تھی۔ معلوم نہیں وہ کہاں سے آئی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی اور دوپٹے کا بھی یہی رنگ تھا۔ ان تینوں کپڑوں پر لال رنگ کے چھینٹے اور دھبے تھے اور اس کے ہاتھوں پر بھی رنگ تھا اور قمیص کی آستینوں پر یہ رنگ زیادہ تھا۔

یہ خون کا رنگ تھا لیکن سوتیلی ماں یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ یہ کسی کا خون ہے۔ نذیرو باپ کو کوٹھڑی میں لے گئی۔ سوتیلی ماں کو کوٹھڑی میں نہ جانے دیا گیا۔ صبح کی اذان کے بعد نذیرو کا باپ باہر نکلا اور نذیرو کی سوتیلی ماں کو کہا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے۔ سوتیلی ماں نے وجہ پوچھی تو باپ نے اس کو کہا کہ وہ اس کو تین بار طلاق دیتا ہے اور وہ فوراً اس کے گھر سے نکل جائے اور اگر ایک منٹ کی بھی اس نے دیر کی تو وہ اس کو تھپڑ اور مکے مارتا مارتا اس کے ماں باپ کے گھر چھوڑ آئے گا۔

سوتیلی ماں اپنے کپڑے، زیور وغیرہ لے کر اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ اس کو طلاق مل گئی تھی۔ اس نے نذیرو کے خلاف یہ بات اور اس کے چال چلن کی خرابی کی باتیں ہر جگہ مشہور کر دیں۔

شمشیر سنگھ نے نذیرو اور اس کے باپ کو طلب کر لیا اور نذیرو کی سوتیلی ماں کو تھانے میں بٹھا لیا۔

''اس لڑکی اور اس کے باپ کے آنے تک کامل کو یہاں لے آؤ''۔ شمشیر سنگھ نے مجھ کو کہا۔

میں کامل کو لے آیا۔

''دروازہ بند کر دے کاکا!'' شمشیر سنگھ نے مجھ کو کہا اور کامل کو کہا۔ ''اب بتا کاملے! سچ بولے گا یا دماغ سے ابھی جھوٹ کا کیڑا نہیں نکلے گا؟''

میں نے دفتر کا دروازہ بند کر دیا۔ کامل چپ چاپ کھڑا رہا۔ شمشیر سنگھ اٹھا اور اس کے پیچھے چلا گیا۔

''تو نذیرو کو کہاں لے گیا تھا؟'' شمشیر سنگھ نے اس سے پوچھا۔

کامل نے بولنے کی بجائے سر پیچھے کو گھمایا۔ شمشیر سنگھ نے اس کی گردن پر اتنی زور سے مکا مارا کہ وہ سامنے پڑی میز پر منہ کے بل جا پڑا۔ شمشیر سنگھ نے بڑی تیزی سے جھک کر کامل کے دونوں ٹخنوں سے ٹانگوں کو پکڑا اور زور سے پیچھے کو کھینچا۔ کامل کا سینہ میز پر تھا۔ وہ ابھی اٹھا نہیں تھا۔ شمشیر سنگھ نے ٹخنوں سے اس کو پیچھے کھینچا تو وہ اس طرح فرش پر گرا کہ اس کا منہ، سینہ اور پیٹ فرش پر لگے۔ شمشیر سنگھ نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر زور سے دبایا۔

''سچ بولے گا؟'' شمشیر سنگھ نے پوچھا۔

کامل پھر بھی نہ بولا۔ وہ پیٹ کے بل فرش پر پڑا رہا۔ اس کا ایک ہاتھ اس طرح فرش پر رکھا ہوا تھا کہ ہاتھ کی الٹی طرف اوپر کو تھی۔ شمشیر سنگھ نے کرسی گھسیٹ کر اس کا ایک پایہ کامل کے ہاتھ پر رکھ دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ کامل تڑپنے لگا۔ اس کا ہاتھ پکے فرش اور کرسی کے پائے کے درمیان آیا ہوا تھا اور کرسی پر شمشیر سنگھ کا بوجھ تھا۔

ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ کامل چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ وہ بولے گا۔ شمشیر سنگھ نے اٹھ کر کرسی ہٹا دی۔ کامل سیدھا ہو کر فرش پر بیٹھ گیا اور ہاتھ کو ملنے اور دبانے لگا۔

وہ ہمارے کمرے میں داخل ہوئی

''نذیرو میرے ساتھ گئی تھی''۔ کامل نے کہا۔ ''وہ

اپنی سوتیلی ماں سے اتنی تنگ آ گئی تھی کہ وہ میرے ساتھ گھر سے بھاگنے پر تیار ہوگئی تھی"۔

"تم کیا سوچ کر اس کو اپنے ساتھ لے گئے تھے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "اور کہاں لے گئے تھے؟"

"میں اس کو چوہدری رفیق کے پاس لے گیا تھا۔ کامل نے جواب دیا۔ "میں نے اس کے ساتھ پہلے بات کر لی تھی۔ اس نے مجھ کو کہا تھا کہ وہ میرا اور نذیرو کا نکاح پڑھوا دے گا۔ نکاح کے بعد میں نے نذیرو کو اپنے گاؤں لے آنا تھا۔ رفیق نے نذیرو کو مویشیوں والی طرف ایک کوٹھڑی میں رکھا تھا۔ میں دوسرے دن واپس آ گیا تھا۔ اس کے بعد دو دفعہ وہاں گیا۔ رفیق نے مجھ کو بتایا کہ اس نے نذیرو کو کوٹھڑی سے نکال کر بھوسے والی کوٹھڑی میں رکھا ہے۔ میں جب آخری دفعہ وہاں گیا تو نذیرو کو بھوسے والی کوٹھڑی میں دیکھا۔ وہ ہر طرح ٹھیک تھی۔ صرف یہ پریشانی اس کو لگی ہوئی تھی کہ نکاح جلدی ہو جائے۔ اس کے بعد میں نے یہ خبر سنی کہ رفیق قتل ہو گیا ہے......

"مجھ کو پکی امید تھی کہ نذیرو کا باپ اس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں دے گا لیکن اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ جب رفیق کے قتل کی اطلاع ملی تو اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی ملی کہ نذیرو رات کو واپس آ گئی ہے۔ گاؤں میں کئی لوگوں کو پتہ لگ گیا تھا کہ نذیرو گھر میں نہیں ہے۔ اب پتہ لگ گیا کہ وہ آ گئی ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ رفیق کے گاؤں جانا بیکار تھا۔ وہ تو مارا گیا تھا۔ نذیرو کے ساتھ ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ تو صاف بات ہے کہ باپ نے اس کو گھر میں قید کر لیا تھا۔ مجھ کو جب پتہ لگا کہ رفیق بھوسے والی کوٹھڑی میں مارا گیا ہے تو مجھ کو یہ خیال آیا کہ رفیق کا کوئی دوست آ گیا ہو گا۔ اس نے نذیرو کو پرائی لڑکی سمجھ کر اس پر دست درازی کی ہو گی اور رفیق نے اس کو روکا ہو گا اور اس جھگڑے میں رفیق مارا گیا"۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ نذیرو نے ہی رفیق کو قتل کر دیا ہو؟" شمشیر سنگھ نے پوچھا۔

"نذیرو مضبوط دل والی لڑکی ہے"۔ کامل نے جواب دیا۔ "لیکن اس نے رفیق کو کیوں قتل کرنا تھا۔ کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی"۔

کامل سے ہم نے مزید پوچھ گچھ کی اور اپنے شکوک رفع کئے پھر اس کو باہر بٹھا دیا۔ نذیرو اور اس کا باپ آئے ہوئے تھے۔ پہلے باپ کو اندر بلایا، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس کی حالت یہ تھی کہ ہم اگر اس کو کہتے کہ ہمارے قدموں میں سجدہ کرو تو وہ نہ صرف سجدہ کرتا بلکہ ہمارے جوتے بھی چاٹتا۔ اس کو ہم نے پیار محبت کی باتیں کر کے بٹھا لیا۔ وہ شریف آدمی لگتا تھا اور اچھی حیثیت والا زمیندار بھی تھا۔ اگر اولاد، خاص طور پر بیٹی کوئی خرابی پیدا کرے تو باپ اگر بادشاہ ہو تو بھی وہ کسی کے آگے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔

"اچھی طرح سن لو بھائی صاحب!" شمشیر سنگھ نے اس کو کہا۔ "ساری بات کھل گئی ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے تمہاری دوسری بیوی باہر بیٹھی ہوئی ہے اور تمہاری بیٹی جس کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی وہ ابھی تمہارے سامنے میرے دفتر سے نکلا ہے۔ پکی شہادت مل گئی ہے کہ تمہاری بیٹی چوہدری رفیق کے گھر میں رہی ہے اور چوہدری رفیق قتل ہو گیا ہے اور جس رات وہ قتل ہوا ہے اسی رات تمہاری بیٹی واپس آئی تھی"۔

"جناب عالی!" نذیرو کے باپ نے کہا۔ "میں سولہ آنے سچ بولوں گا لیکن ایک عرض کروں گا کہ مجھ کو سچ بولنے کا کچھ صلہ ملنا چاہئے"۔

"میں یہ الزام نہیں لگاتا کہ اس گاؤں کے چوہدری رفیق کو تمہاری بیٹی نے قتل کیا ہے"۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ "وہ صرف یہ بتا دے کہ وہاں کیا ہوا تھا اور رفیق کو کس نے قتل کیا ہے"۔

''نہ میں جھوٹ بولوں گا، نہ میری بیٹی جھوٹ بولے گی''۔ نذیرو کے باپ نے کہا۔ ''رفیق کو میری بیٹی نے قتل کیا ہے اور وہ پورا بیان دے گی''۔

میری اور شمشیر سنگھ کی یہ حالت ہوئی جیسے کمرے میں بہت زور کا دھماکہ ہوا ہو اور سب کچھ اڑ گیا ہو۔ شمشیر سنگھ نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس طرح محسوس ہوتا تھا کہ ہم دونوں آپس میں کوئی بات نہیں کر سکیں گے۔

''میں پولیس کو اور شہادت کے قانون کو اچھی طرح جانتا ہوں''۔ نذیرو کے باپ نے جرأت کے لہجے میں کہا۔ ''میری بیٹی بالکل صحیح اقبالی بیان دے گی لیکن اس پر قتل کا الزام ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ تھوڑی سی مدد کریں تو میری بیٹی آسانی سے بری ہو سکتی ہے۔ اگر آپ مدد نہیں کریں گے تو یہ آپ کی مرضی ہے۔ میں نے وکیل تو کرنا ہی ہے۔ آپ چاہیں تو صاف بات کریں اور مجھ سے پوری قیمت لیں''۔

یہی شخص جب ہمارے سامنے آیا تھا تو ڈرا ہوا تھا۔ اچانک یہی شخص اتنا جرأت والا ہو گیا کہ اس نے ہمیں حیران کر دیا لیکن حیرانی والی کوئی بات نہیں۔ جو آدمی سچ بولتا ہے اس میں جرأت اپنے آپ آ جاتی ہے۔ میں شمشیر سنگھ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، میں آپ کو اپنی بات بتاتا ہوں کہ میں اس شخص سے متاثر ہو گیا۔

''پہلے بیان ہو جائیں تو پھر بات کروں گا''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''پہلے تم بیان دو گے یا تمہاری بیٹی؟''

''یہ فیصلہ آپ کا ہو گا''۔ نذیرو کے باپ نے کہا۔

شمشیر سنگھ نے اس کو کہا۔ ''میں سچے دل سے وعدہ کرتا ہوں کہ مجھ کو کوئی اور بدمعاشی نظر نہ آئی تو میں تمہاری پوری مدد کروں گا اور ایک پیسہ نہیں لوں گا''۔

وہ چلا گیا اور اس کی بیٹی ہمارے کمرے میں داخل ہوئی۔

لڑکی مظلوم تھی

''یہاں بیٹھ جا کاکی!'' شمشیر سنگھ نے نذیرو کو کہا۔

نذیرو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شمشیر سنگھ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اسی میز کے ساتھ ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ نذیرو اچھی شکل وصورت والی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی اور پولیس کا خوف بھی تھا۔ ہم نے اپنی عادت کے مطابق نذیرو کا دل مضبوط کیا۔

''تمہارا ابا کہتا ہے کہ تم نے چوہدری رفیق کو قتل کیا ہے''۔ شمشیر سنگھ نے اس کو کہا۔ ''کیا وہ ٹھیک کہتا ہے؟''

''ٹھیک کہتا ہے''۔ نذیرو نے جواب دیا۔ ''وہ میری عزت لوٹنا چاہتا تھا''۔

''شاباش!'' شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''پورا بیان دو تم گھر سے کس طرح نکلیں اور کیوں نکلیں اور اس کے بعد کیا ہوا جو کچھ بھی تمہارے دل میں ہے وہ بیان کر دو''۔

''میں اس کا بیان لکھتا جاؤں''۔ میں نے شمشیر سنگھ سے پوچھا۔

''نہیں اوئے کاکا!'' شمشیر سنگھ نے مجھ کو ڈانٹ دیا۔

نذیرو نے جب اپنا بیان شروع کیا تو میں نے محسوس کر لیا کہ اس لڑکی کے سینے میں غبار بھرا ہوا ہے جس کو نکلنے کے لئے تین گھنٹے ضرور لگیں گے۔ وہ بیان دے رہی تھی۔ کبھی شمشیر سنگھ اس پر کوئی سوال کر دیتا تھا اور کبھی میں اس کی کسی بات کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے تھوڑی سی جرح کرتا تھا۔ لڑکی سچ بول رہی تھی اس لئے اس کی زبان اِدھر اُدھر نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح اس کا بیان جب ختم ہوا تو پانچ گھنٹے اور کچھ منٹ گزر چکے تھے۔ میں اتنا لمبا بیان پورے کا پورا نہیں سنا سکتا۔ اس کے ضروری حصے سناؤں گا۔

اس کی عمر اکیس بائیس سال ہو گئی تھی۔ دو سال

پہلے اس کی ماں فوت ہوگئی۔ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی تھے۔ ایک کی عمر دس سال اور دوسرے کی تیرہ چودہ سال تھی۔ ان کی جب ماں فوت ہوئی تو یہ دونوں بھائی اور زیادہ چھوٹے تھے۔ نذیرو کے باپ نے ان بچوں کے لئے دوسری شادی کرلی۔ یہ عورت ڈیڑھ دو سال پہلے بیوہ ہوگئی تھی۔

نذیرو کے باپ کی عمر پچپن سال ہوگئی تھی اور اس نے جس کے ساتھ شادی کی اس کی عمر ابھی تیس سال ہوئی تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھی۔ باپ پر اس کا یہ اثر ہوا کہ وہ اس کا غلام بن گیا۔ یہ تفصیل سنانے کی ضرورت نہیں کہ بوڑھے باپ کی جوان بیوی باپ کی پہلی اولاد کے ساتھ کیسا بُرا سلوک کرتی ہے۔ اس سوتیلی ماں نے بھی وہی سلوک شروع کر دیا۔ وہ سب سے زیادہ بُری حرکت یہ کرتی تھی کہ نذیرو کے باپ کے آگے نذیرو کی اور اس کے چھوٹے بھائیوں کی جھوٹی شکایتیں کرتی رہتی تھی اور باپ اپنی اولاد کو ڈانٹتا رہتا تھا۔

یہ عورت اتنی چالاک تھی کہ نذیرو کے باپ کی موجودگی میں نذیرو اور اس کے بھائیوں کے ساتھ اتنا اچھا برتاؤ رکھتی تھی جیسے یہی ان کی سگی ماں ہے۔ باپ کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ یہ عورت بہت اچھی ہے اور ساری خرابیاں اس کی اولاد میں ہیں۔

نذیرو پہلے تو برداشت کرتی رہی لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے چھوٹے بھائیوں کی پٹائی بلاوجہ ہو جاتی ہے تو اس نے سوتیلی ماں کے ساتھ لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا، پھر اس نے ایک روز اپنے باپ کو بتانے کی کوشش کی کہ سوتیلی ماں گھر میں کیا کر رہی ہے لیکن باپ نے سنے بغیر بیٹی کو ڈانٹ دیا۔

نذیرو نے اس طرح کے کچھ واقعات سنائے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ باتیں سن کر میرے دل میں اس لڑکی کی ہمدردی پیدا ہوگئی۔ میں شمشیر سنگھ کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے پتہ لگتا تھا کہ وہ بھی اس لڑکی کا ہمدرد بن گیا ہے۔ بیان دیتے دیتے لڑکی کے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ تھوڑی دیر تو وہ چپ ہی رہی اور وہ روتی رہی۔ پھر اس نے ایک اور واقعہ سنایا۔

اس کی سوتیلی ماں کا ایک بھائی جس کی عمر چھبیس ستائیس سال ہوگئی تھی، دماغی طور پر کچھ معذور تھا۔ اسی خرابی کی وجہ سے اس کو کوئی اپنی لڑکی کا رشتہ نہیں دیتا تھا۔ سوتیلی ماں نے نذیرو کو کہا کہ وہ اس کی شادی اپنے بھائی کے ساتھ کرائے گی، اور اس نے اس بات کا فیصلہ نذیرو کے باپ سے کرا لیا ہے۔ یہ تو گاؤں کے سارے لوگ جانتے تھے کہ سوتیلی ماں کا یہ بھائی شادی کے قابل نہیں۔ نذیرو کو جب سوتیلی ماں نے یہ فیصلہ سنایا تو اس کو چکر آنے لگے۔

نذیرو کا باپ اپنی بیوی کی چالاکیوں اور اس کی خوبصورتی کے جال میں اس بُری طرح آ چکا تھا کہ اپنی اولاد کی بات ہی نہیں سنتا تھا۔ نذیرو کو جرأت ہی نہ ہوئی کہ وہ اپنے باپ کو بتائی کہ سوتیلی ماں نے اس کو کیا فیصلہ سنایا ہے۔

نذیرو کو کامل اچھا لگتا تھا۔ اس کو وہ ملتی بھی تھی۔ اس نے قسمیں کھا کھا کہ ان کی محبت ناجائز تعلق والی نہیں تھی۔ نذیرو نے کامل کو بتایا کہ اس کی سوتیلی ماں نے اس کے باپ پر ایسا جادو چلایا ہوا ہے کہ وہ اس کی شادی اپنے پگلے بھائی کے ساتھ کر دے گی۔

کامل نے اس مسئلے کا سیدھا حل یہ نکالا کہ اپنی ماں کو راضی کرلیا اور اس کو نذیرو کا رشتہ مانگنے کے لئے بھیجا۔ نذیرو کی سوتیلی ماں نے صاف جواب دے دیا اور صرف جواب ہی نہیں دیا بلکہ کامل کی ماں کو بہت بُری باتیں کہہ دیں۔ ماں نے واپس آ کر کامل کو بتایا۔

کامل نے نذیرو کے ساتھ بات کی اور دونوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ گھر سے بھاگ چلتے ہیں اور باہر کہیں

شادی کر کے واپس آ جائیں گے۔ کامل اس معاملے میں بہت دلیر تھا۔ اس کے ساتھ اس کے اپنے تین بھائی اور تین چار چچازاد بھائی تھے۔ اس کے مقابلے میں نذیرو کا باپ تقریباً اکیلا تھا اور نذیرو کی سوتیلی ماں کے خاندان میں بھی آدمیوں کی کمی تھی۔

آخر ایک رات نذیرو کامل کے ساتھ گھر سے چلی گئی۔

ترنگل اور شہ رگ

کامل نے نذیرو کو بتایا تھا کہ وہ اس کو اپنے ایک دوست چوہدری رفیق کے گھر رکھے گا۔ رات کو ہی دونوں چوہدری رفیق مقتول کے گھر پہنچ گئے۔ رفیق نے نذیرو کو مویشیوں والی طرف ایک کوٹھڑی میں رکھا۔ کامل دوسرے دن واپس چلا گیا۔

رفیق دن میں دو تین دفعہ نذیرو کو دیکھنے کے لئے کوٹھڑی میں آتا تھا اور اس کو یہ تسلی دیتا تھا کہ ان کا نکاح جلدی کرا دے گا۔ نذیرو کو پوری تسلی تھی کہ سارا کام ٹھیک ہو جائے گا۔ تین دنوں بعد مقتول نے نذیرو کو اس کوٹھڑی سے نکالا اور بھوسے والی کوٹھڑی میں لے گیا اور وہاں اس کا بستر بچھا دیا۔ نذیرو کو یہ سمجھ نہیں آئی کہ مقتول اس کو بھوسے والی کوٹھڑی میں کیوں لے آیا تھا۔

میں آپ کو ایک خاص بات بتاتا ہوں۔ آپ نے یہ بات "حکایت" میں کسی کہانی میں پڑھی ہو گی۔ دیہات میں ایسا ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے کہ کامل کی طرح کوئی آدمی کسی عورت کو گھر سے بھگا کر لے جاتا ہے۔ اس کا ارادہ یہی ہوتا ہے جو کامل اور نذیرو کا تھا۔ وہ آدمی عورت کو اپنے کسی دوست کے گھر رکھتا ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جس دوست کے گھر عورت کو چھپایا جاتا ہے وہ اس عورت کی عزت کے ساتھ کھیلتا ہے۔ یہ ایک قسم کی اجرت ہوتی ہے جو عورت کو اپنے گھر چھپانے کی لی جاتی ہے۔

چوہدری رفیق نے پہلے تو نذیرو پر اپنا اعتماد جمایا پھر وہ غلط حرکت پر اتر آیا۔ قتل کی رات اس نے پہلی بار ایسی کوشش کی۔ نذیرو اخلاق کی بڑی پکی نکلی۔ اس نے مقتول کو منع کیا لیکن مقتول اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ اس نے زبردستی کرنا چاہی تو ان کے درمیان دھینگا مشتی ہوئی۔ باہر سے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ اس میں نذیرو کو ایک ترنگل پڑی ہوئی نظر آ گئی۔ اس نے ترنگل اٹھا لی۔

نذیرو نے اپنی اس وقت کی جو ذہنی حالت بتائی وہ ایسی تھی جیسے کوئی آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ آپ خود نذیرو کی پچھلی زندگی پر نظر دوڑائیں۔ وہ تو پہلے ہی پاگل ہو چکی تھی۔ سوتیلی ماں نے اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا تھا۔ اس نے وہاں سے رہائی کا یہ راستہ اختیار کیا تھا اور اس جگہ کو پناہ سمجھا تھا مگر یہاں بھی دھوکہ ہوا۔ اس کا دماغ اس کے قابو سے نکل گیا۔ جب اس نے ترنگل اٹھائی اس وقت مقتول کوٹھڑی کے کونے میں کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھنے لگا تو نذیرو نے ترنگل سیدھی آگے کی اور اس کی نوکدار لمبی انگلیاں مقتول کی گردن میں جا لگیں۔ وہ پیچھے ہٹا لیکن نذیرو پیچھے ہٹنے کی بجائے مقتول کی طرف آگے بڑھی۔ غصے نے اس کو پاگل کیا ہوا تھا۔ اس نے جسم کا پورا زور لگا کر ترنگل کو آگے دبایا۔ مقتول کوٹھڑی کے کونے میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ نذیرو ترنگل کو اور زیادہ دباتی رہی۔

مقتول نے ایک بار کچھ زور لگایا وہ زور سے تڑپا۔ اس کے بعد وہ گر پڑا۔ نذیرو نے پھر بھی ترنگل کو دبائے رکھا۔ آخر اس نے ترنگل نکالی اور وہاں سے نکل آئی۔ وہ گھبرا کر یا ڈر کر بھاگی نہیں بلکہ بڑے آرام آرام سے گاؤں سے نکلی۔ گاؤں سے دور آ کر اس پر خوف کا حملہ ہو گیا۔ کبھی وہ کسی درخت یا جھاڑی کے ساتھ لگ کر چھپ

جاتی اور کبھی وہ دوڑ پڑتی۔ اس کو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے پیچھے اس کو پکڑنے کے لئے کوئی آ رہا ہے۔

اس بُری حالت میں وہ اپنے گاؤں تک پہنچی اور اپنے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارے۔ باپ نے دروازہ کھولا اور اس کو اندر لے جا کر منہ پر بڑے زور سے تھپڑ مارا۔ نذیرو نے اس کو روک دیا اور کہا کہ پہلے وہ اس کی بات سن لے۔ اس نے اپنے باپ کو یہ بھی کہا کہ اس نے اس کی بات نہ سنی تو وہ سارے گاؤں کو سنائے گی پھر کچھ کھا کر مر جائے گی۔

باپ اس کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ نذیرو نے باپ کو اپنی سوتیلی ماں کی ہر ایک بات بتائی۔ اس نے ایک کام یہ بھی کیا کہ اپنے دونوں بھائیوں کو جگا لیا پھر اپنی سوتیلی ماں کو بھی وہاں بٹھا لیا۔ اس نے بھائیوں کو کہا کہ اپنے ابا کو ساری باتیں سنائیں۔ دونوں بھائیوں نے اپنی سوتیلی ماں کا برتاؤ اور دوسری باتیں سنانی شروع کر دیں۔

باپ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب نذیرو نے اس کو یہ بتایا کہ سوتیلی ماں نے اس کو حکم دیا تھا کہ اس کی شادی سوتیلی ماں کے پگلے بھائی کے ساتھ ہوگی تو نذیرو کا باپ غصے سے کانپنے لگا اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ اٹھا اور اس نے اپنے بچوں کی سوتیلی ماں کو تھپڑ اور مکے مارنے شروع کر دیئے۔ اس طرح اس کو گھر سے نکال دیا۔

نذیرو نے اپنے باپ کو کہا تھا کہ وہ گھر کے دوزخ سے بھاگ کر کہیں پناہ ڈھونڈنے گئی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا ارادہ یہ تھا کہ کامل کے ساتھ نکاح پڑھا کر واپس آ جائے گی اور اپنے دونوں بھائیوں کو ساتھ رکھے گی۔

سکھ انسپکٹر نے کمال دکھا دیا

یہ تو میں نے بات کو چھوٹا کر کے سنایا ہے۔ اگر میں آپ کو نذیرو کا ایک ایک لفظ سناتا تو آپ کے جذبات بھڑک جاتے۔ آپ کو غصہ بھی آتا اور آپ کے آنسو بھی

نکل آتے۔

نذیرو کے بعد ہم نے اس کے باپ کو اندر بلایا۔

''یہ سب تمہاری غلطی ہے میرے بھائی!'' شمشیر سنگھ نے نذیرو کے باپ کو کہا۔ ''دیکھو تمہاری غلطی نے تم کو کس گند میں پھینک دیا ہے''۔

''سب میری غلطی ہے''۔ نذیرو کے باپ نے کہا۔ ''میں مانتا ہوں سردار جی...... یہ بتائیں کہ میری بیٹی نے جھوٹ تو نہیں بولا؟...... یہ غلطی میری ہے یا کسی اور کی ہے، میں اس پر خوش ہوں کہ میری بیٹی نے اپنی عزت کی حفاظت میں ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ میں اپنی دوسری بیوی کو سچا سمجھتا تھا لیکن میرے بچوں نے جب اس کو درمیان میں بٹھا کر باتیں بتائیں تو میں نے اس کے ساتھ کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ ان کی سوتیلی ماں کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا''۔

''تمہاری بیٹی لاپتہ ہوگئی تھی''۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے تھانے میں رپورٹ کیوں درج نہیں کروائی؟''

''اس وقت میں اپنی بیٹی کو خراب اور اس کی سوتیلی ماں کو ٹھیک اور سچا سمجھتا تھا''۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں نے دل پر پتھر رکھ لیا تھا اور کہا تھا کہ میری بیٹی کو کوئی اٹھا کر نہیں لے گیا، وہ خود اپنی مرضی سے گئی ہوگی۔ گئی ہے تو چلی جائے لیکن اللہ کو کچھ اور منظور تھا...... میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں۔ قتل میری بیٹی نے کیا ہے۔ آپ اس کی بجائے مجھ کو گرفتار کرلیں اور جیسا اقبالی بیان آپ لینا چاہتے ہیں وہ میں مجسٹریٹ کے سامنے دے دوں گا۔ اگر آپ کچھ مدد کرسکتے ہیں تو میں اس کی قیمت دوں گا''۔

''نہیں!'' شمشیر سنگھ نے کہا۔ ''میں ایسا نہیں کرسکتا کہ اصل قاتل کی بجائے کسی اور کو پکڑ لوں''۔

''آپ کے لئے کوئی مشکل نہیں''۔ اس نے کہا۔ ''میں ایسا بیان دوں گا جس سے آپ کا مقدمہ کمزور نہیں ہوگا...... پھانسی چڑھنے سے پہلے میں اپنی اولاد کے غم سے آزاد ہو جاؤں گا۔ ساری زمین اولاد کے نام کر دوں گا اور بیٹی کی شادی کامل کے ساتھ کردوں گا''۔

''تم تو کہتے تھے کہ تم پولیس اور قانون کے طور طریقوں کو سمجھتے ہو الزام ثابت نہیں ہونے دو گے''۔ شمشیر سنگھ نے کہا۔

''مقدمہ تو میں اچھی طرح لڑوں گا''۔ اس نے کہا۔ ''میں یہ عرض کررہا ہوں کہ آپ کچھ کریں''۔

اس طرح کی باتیں اس کے ساتھ اور بھی بہت ہوئی تھیں۔ آخر میں اس نے یہ بات کہی کہ میں نے اپنے بچوں پر اور اپنی بیٹی پر جو ظلم کروایا ہے وہ ایسا جرم ہے جس کی مجھ کو سزا ملنی چاہئے۔

''دیکھ میرے بھائی!'' شمشیر سنگھ نے تھوڑی دیر سوچ کر اس کو کہا۔ ''میری بات غور سے سن لو۔ میں جو مدد کرسکتا ہوں وہ اس طرح کروں گا کہ تمہاری بیٹی کو قتل کے الزام میں گرفتار کروں گا۔ اس کا اقبال جرم مجسٹریٹ کے سامنے قلمبند کراؤں گا۔ وہ سیشن کورٹ میں اپنے بیان سے پھر جائے۔ تم اس بات کو غلط کہنا کہ تمہاری بیٹی گھر سے چلی گئی تھی۔ کامل بھی یہی بیان دے گا۔ باقی کام تمہارا وکیل کرے گا۔ تمہاری بیٹی کے لاپتہ ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ تھانے میں اس کی کوئی رپورٹ نہیں۔ میں ایسا گواہ جھوٹا یا سچا پیش نہیں کروں گا جو یہ کہے کہ تمہاری بیٹی کو مقتول کے گھر میں یا گاؤں میں کسی نے دیکھا تھا''۔

یہ مقدمے کی باتیں ہیں۔ یہ پوری کی پوری بیان کی جائیں تو ہی سمجھ میں آتی ہیں لیکن اتنی لمبی باتیں آپ سن کر کیا کریں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ نذیرو کے خلاف زیر دفعہ 302 مقدمہ عدالت میں گیا۔ سیشن جج کے لئے شک کا فائدہ دینے کی بہت گنجائش تھی۔ وہ اس نے دے دیا اور نذیرو بری ہوکر آگئی۔

✱○✱

آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل

میری تمام والدین سے گذارش ہے کہ وہ اپنی مصروف ترین زندگی میں سے کچھ وقت نکال کر اپنے بچوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔

☆ حمید اختر، قائم پور

رات کے آخری پہر سب انسپکٹر یاور حیات، ڈیوٹی ختم کر کے گھر پہنچا اور جاتے ہی لیٹ گیا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے نیند نے اسے اپنی آغوش میں لینے کے لیے دیر نہیں لگائی تھی۔ صبح موبائل فون کی گھنٹی نے اس کی نیند میں خلل ڈالا۔ سکرین پر انسپکٹر وجاہت کا نام دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا کہ اس وقت اس کی کال کسی نئی مصیبت کا پیش خیمہ ہی ہو سکتی تھی۔

''اسلام علیکم سر!''

''وعلیکم السلام، یاور!...... کیسے ہو؟...... نیند پوری ہوئی کہ نہیں؟''

''سر اللہ کا شکر ہے...... اور نیند کا کیا ہے پوری ہوتی ہی رہتی ہے۔'' یاور نے نیند سے بوجھل آواز میں جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''سر! اس وقت خیریت سے یاد کیا؟''

''خیریت اور پولیس کی نوکری میں؟''

''پھر بھی کیا ہوا سر؟''

انسپکٹر وجاہت نے تفصیل بتلاتے ہوئے کہا۔ ''گلشن کالونی کی گلی نمبر ۶ میں کوئی مہر حیات صاحب ہیں۔ ان کی بیٹی اور بیٹے کا قتل ہو گیا ہے۔ آپ فی الفور ادھر پہنچو۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل روانہ کر دیئے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے کچھ ضروری محکمانہ ہدایات دیتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔ اور سب

انسپکٹر یاور بغیر وقت ضائع کیے گلی نمبر ۶ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

کانسٹیبلوں نے دونوں کمروں کو لاک کر دیا تھا۔ یاور کے پہنچنے پر حاصل کردہ معلومات اس کے گوش گزار کر دیں۔

لڑکے کا نام عدنان اور لڑکی کا بانو تھا۔ دونوں بہن بھائی تھے۔

دونوں کی پھسڈی معلومات پر یاور کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ خاموش رہا۔ اس ناکافی معلومات کے سہارے تو تفتیش نہیں چل سکتی تھی۔

اس نے سب سے پہلے تو مہر حیات سے تعزیت کی اور پھر اس کے مرحوم بیٹے عدنان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

عدنان کی لاش بیڈ پر اس انداز سے پڑی تھی کہ سرسری نظر سے اس کے مرنے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ البتہ قریب جانے پر اس کی ناگفتہ بہ حالت واضح ہوتی تھی۔ اس کے سر کے اوپر والا آدھا حصہ لوتھڑوں کی شکل میں سرہانے اور بیڈ ریسٹ پر بکھرا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ۳۰ بور پسٹل پڑا تھا۔ شاید قاتل نے اس کے سر کو نشانہ بنا کر پسٹل وہیں پھینک دیا تھا۔

سب انسپکٹر یاور نے کمرے کا جائزہ لیا۔ بدنظمی کے کوئی اثرات نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر بھی یاور نے فنگر پرنٹ اور دیگر شواہد اکٹھے کرنے کا حکم دے کر بانو کے کمرے کا رخ کیا۔ بانو کی لاش بھی بیڈ پر پڑی تھی۔ بظاہر کوئی زخم وغیرہ کا نشان نہیں تھا البتہ چہرے کا رنگ نیلگوں مائل ہو رہا تھا۔ یاور کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ لڑکی کو زہر پلا دیا گیا تھا۔

مقتول بہن بھائی کو دیکھ کر یاور کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے خودکشی کہہ کر بھی جان نہیں چھڑائی جا سکتی تھی کہ آخر دونوں کو ایک وقت میں خودکشی کی کیا سوجھی۔ پھر اگر وہ اکٹھے خودکشی کر رہے تھے تو دونوں یا تو پسٹل سے خود کو ہلاک کرتے یا دونوں زہر پی لیتے ...... یہی بات قاتل کے متعلق بھی کہی جا سکتی تھی کہ اس نے دونوں کو ایک ہی طریقے سے کیوں قتل نہیں کیا؟ یہ اور اس جیسے کئی سوالات حل طلب تھے۔ یاور نے ضروری کارروائی کی اور وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق لڑکی کی موت رات ۱۱ سے ۱۲ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور موت کی وجہ گھریلو استعمال کا کیمیکل تھا۔ جبکہ لڑکے کی موت رات ۲ سے ۳ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور موت کی وجہ سر میں لگنے والی گولی تھی جو کہ بہت قریب سے چلائی گئی تھی۔ قاتل نے پسٹل اس کے سر پر رکھ کر گولی چلائی تھی۔ پولیس نے ضابطے کی کارروائی کر کے نعشیں ورثا کے حوالے کر دیں۔ دونوں کے والدین کے بیانات سے تفتیش کی گاڑی ایک انچ بھی آگے نہ سرک سکی البتہ جس زاویے سے سب انسپکٹر یاور آگے بڑھنا چاہ رہا تھا اس کے لیے دونوں کے دوستوں سے ملنا بہت ضروری تھا جو کہ کافی مشکل نظر آ رہا تھا۔

☆☆☆

ڈنر کے بعد اس نے اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا اور دوستوں سے چیٹ کرنے لگا۔ اس کے فرینڈز کی لسٹ کافی وسیع تھی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اسے نفیسہ کے نام سے فرینڈ ریکوئسٹ موصول ہوئی۔ اس نے ریکوئسٹ کنفرم کرنے سے پہلے نفیسہ کی پروفائل کھولی اور اس کا باریکی سے مطالعہ کیا۔ نفیسہ کی عمر ۲۰ سال تھی۔ BCS کے آخری سال میں تھی اور راولپنڈی کی رہائشی تھی۔ نفیسہ کی طرف سے اپ لوڈ کیے گئے فوٹوز اور اس کی پروفائل کا فوٹو یقیناً اسی کے تھے۔

اس نے تسلی کرنے کے بعد ریکوئسٹ کنفرم کر دی اور ساتھ ہی ویلکم کا میسج سینڈ کر دیا۔ فوراً ہی میسج آیا۔

''آپ کون؟''

''جی! میں اکمل ہوں اور باقی انفارمیشن میری پروفائل میں آپ نے پڑھ لی ہوں گی''۔

''وہ تو میں نے پڑھ لی ہے۔ آپ کیا کرتے ہو؟ اور کس شہر سے ہو؟''

''سی ایس ایس کے بعد انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ جوائن کیا ہے اور مری سے تعلق ہے''۔

''گڈ...... شادی شدہ ہو؟''

''کیا شادی شدہ رات کے اس پہر فیس بک پر چیٹ کرتے ہیں؟''

''اوکے...... کوئی گرل فرینڈ ہے؟''

''نہیں تو۔ آپ نے یہ کیوں پوچھا؟''

''بس ویسے ہی پوچھ رہی تھی''۔

''آپ کو علم ہے کہ سی ایس ایس کے لیے کتنی سٹڈی کرنی پڑتی ہے، اس طرح گرل فرینڈ کو ٹائم کہاں سے دے پاؤں گا''۔

''ہاں یہ تو ہے۔ اپنی اور یجنل فوٹو تو سینڈ کرو''۔

''میری پروفائل والی فوٹو اور یجنل ہی ہے اور آپ کی؟''

''میری بھی اور یجنل ہے''۔

''آپ کافی سمارٹ لگ رہی ہو''۔

''شکریہ، اور آپ بھی''۔

''کافی ٹائم ہو گیا ہے، باقی باتیں کل ہوں گی بائے بائے''۔

''بائے بائے''۔

اس نے لیپ ٹاپ آف کیا اور سو گیا۔

☆☆☆

انسپکٹر یاور اس کیس کو جتنا سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا، کیس اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا۔ دونوں کے دوست کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے والدین نے یاور کی اپنے بچوں تک رسائی مشکل بنا دی تھی۔ یاور ہار ماننے والا بندہ نہیں تھا۔ ہر کام کو چیلنج کے طور پر لیتا تھا۔ آٹھ سالہ پولیس سروس میں یاور نے جہاں اپنے انسٹرکٹرز اور سینئرز سے تفتیش کے رموز و اسرار سیکھے تھے، وہیں اس کے والدین کی شفقت، دعاؤں اور رہنمائی نے بھی انسپکٹر یاور کو کبھی ناکام نہیں ہونے دیا تھا۔

اگلے دن اس نے ایف آئی آر، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، مقتولین کے والدین کے بیانات اور دیگر شواہد کا ایک بار پھر باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ مگر تفتیش کی گاڑی جہاں پھنسی ہوئی تھی وہیں رہی۔ یاور ایک بار پھر مرحومین کے والدین کے پاس پہنچ گیا۔ ان کے گھر سے نکلنے، کھانے اور سونے کے اوقات، دوستوں کے ایڈریس سے لے کر ان کے مشاغل اور ان کے زیر استعمال موبائل سمز سے لے کر پرسنل ڈائری تک کے بارے میں دوبارہ سے معلومات حاصل کیں کیونکہ ایک اچھا تفتیشی آفیسر کبھی بھی ایک بار لیے گئے بیان پر مطمئن نہیں ہوتا۔ بظاہر یہ ملاقات بھی بے فائدہ ہی رہی تھی۔ مگر اس بار اسے کچھ ایسی اشیاء ضرور مل گئیں تھیں جن کی مدد سے [illegible] کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔

اس بار انسپکٹر یاور کو جو اشیاء ملی تھیں ان کی مدد سے اس نے تفتیش کا رخ دوسری طرف موڑا اور اس کام میں اسے ایک ٹیکنیکل اسسٹنٹ کی بھی ضرورت تھی جو اسے محکمے [illegible] سے ملنے کی قوی امید تھی۔

☆☆☆

اس نے حسبِ معمول رات کھانے کے بعد فیس بک پر لاگ آن کیا۔ دیگر نوٹیفکیشن کے علاوہ ان باکس میں نفیسہ کے چار میسجز بھی موجود تھے۔ وہ اس وقت بھی آن لائن ہی تھی۔ اکمل نے میسجز دیکھے۔

''ہائے...... اکمل ! آپ کہاں ہو؟...... ریپلائے پلیز...... میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں؟''

اس نے جواباً لکھا۔''ہائے نفیسہ!...... کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں اور آپ کہاں تھے؟ میں کتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں''۔

''ابھی سے انتظار شروع کر دیا''۔

''تو اور کیا، تم پہلے لڑکے ہو جس سے میں چیٹ کر رہی ہوں''۔نفیسہ آپ سے تم پر آگئی۔

''میں کیسے مان لوں؟''

''میری فرینڈز لسٹ دیکھ لو، یقین آجائے گا''۔

''وہ تو میں نے پہلے ہی دیکھ لی ہے''۔

''میں تو گھر میں سارا دن بور ہوتی رہتی ہوں، کیا ہم دن میں چیٹ نہیں کر سکتے؟''

''نو یار!...... میں تو آفس ٹائم میں مصروف ہوتا ہوں، رات ہی کو ٹائم ملتا ہے''

''تمہارے ڈیڈی کیا کرتے ہیں؟'' نفیسہ نے پوچھا۔

''ہمارا کافی زرعی رقبہ ہے، اسی میں مصروف رہتے ہیں...... اور تمہارے ڈیڈی کیا کرتے ہیں؟'' اس نے بھی جواباً پوچھا۔

''ان کا بزنس ہے اور ممی کو میری فکر نہیں ہے۔ بس یوں سمجھو گھر میں کسی کے پاس میرے لیے ٹائم نہیں ہے...... سارا دن گھر میں پڑی سڑتی رہتی ہوں، بس ایک دو سہیلیاں ہیں جو کبھی کبھار ملنے آجاتی ہیں...... سچ پوچھو تو مجھے ایک اچھے اور مخلص دوست کی تلاش تھی جو تمہاری صورت میں مل گیا ہے۔'' نفیسہ نے اپنا دکھڑا سنایا۔

''ہاں یار!...... میری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔''

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کی محبت میں اس قدر کھوئے کہ کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔اب تو اس نے جدید موبائل فون بھی لے لیا تھا۔جس کی مہربانی سے وہ سارا دن نفیسہ سے رابطے میں رہتا۔دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ مدِمقابل جنسِ مخالف ہی ہے۔اس کے بعد تو میسجز ہی ان کی زندگی تھے۔دونوں محبت کی پچ پر زندگی کی پہلی پہلی اننگز کھیل رہے تھے۔دونوں آفریدی کی طرح پہلی ہی اننگز میں سنچری سکور کرنا چاہتے تھے۔حیرت کی بات ہے کہ دونوں سیٹ بیٹسمینوں نے ابھی تک شیک ہینڈ نہیں کیا تھا اور نہ ہیلمٹ اتار کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

اب انسپکٹر یاور نے عدنان کے موبائل نمبر سے کی گئی کالز اور ایس ایم ایس کا ڈاٹا حاصل کیا جو تھوڑی تگ و دو کے بعد مل گیا۔گزشتہ ایک ماہ سے عدنان جس ایک نمبر پر روزانہ سینکڑوں کے حساب سے ایس ایم ایس کرتا رہا تھا۔وہ نمبر کسی ذیشان نام کے آدمی کا تھا۔اس نے وہ نمبر ٹرائی کیا مگر نمبر بند ملا۔مجبوراً اسے خود ذیشان کے گھر تک جانا پڑا۔اس کا تعلق شہر سے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں سے تھا۔ذیشان نے اس نمبر کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔جو اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔بالآخر انسپکٹر یاور نے اسی نمبر سے کی گئی کالز کا ڈیٹا حاصل کیا۔اب انسپکٹر یاور کو یقین ہو گیا کہ وہ اگلے دو دن میں اس کیس کو حل کر لے گا۔

☆☆☆

''ہیلو!...... تم کہاں ہو؟'' جیسے ہی اکمل نے فیس بک لاگ ان کیا تو نفیسہ کا میسج آگیا۔

''جی، میں ادھر ہی ہوں، سارا دن ٹائم ہی نہیں ملا جناب سے بات کرنے کا۔'' اکمل نے فوراً ریپلائے کیا۔

''میں تم سے ناراض ہوں۔''

''وہ کیوں؟'' اکمل نے جلدی سے پوچھا۔

''سارا دن میں بور ہوتی رہی ہوں اسی لیے۔''

نفیسہ نے ناراضی کی وجہ بتائی۔

''اوہ!......آئی ایم سوری میری جان، میں آپ کا موڈ ابھی ٹھیک کر دیتا ہوں۔'' اکمل نے معذرت خواہانہ انداز میں جواب دیا۔

''وہ کیسے؟'' نفیسہ نے پوچھا۔

''ایک اچھا سا رومینٹک گانا سناتا ہوں تمہیں!...... اور وہ بھی اپنی آواز میں۔'' اکمل نے پیش کش کی۔

''جی نہیں!...... میں اس طرح نہیں ماننے والی۔''

''تو بتاؤ میری جان کا موڈ کیسے ٹھیک ہوگا؟'' اکمل نے استفسار کیا۔

''جو میں کہوں گی وہ تم کرو گے ناں!...... اگر نہ کیا تو میں تمہیں Unfriend کر دوں گی۔'' نفیسہ نے دھمکی آمیز لہجے میں میسج کیا۔

''میری کیا مجال جو میں نہ کروں!...... حکم کرو غلام حاضر ہے۔'' اکمل نے مودبانہ انداز میں کہا۔

''مجھے اپنی نیوڈ تصویر سینڈ کرو۔'' بالآخر نفیسہ نے اپنی خواہش کا اظہار کر ہی دیا۔

اکمل نے ہچکچاتے ہوئے پردے کھینچے اور دروازے کو لاک کیا اور شرم ناک انداز میں وہ کر دیا جس کی خواہش نفیسہ نے کی تھی۔ اس کے بعد دونوں اطراف سے بیہودگی کا وہ مظاہرہ کیا گیا جو بیان نہیں کیا جاسکتا۔

☆☆☆

تیسرے دن سب انسپکٹر یاور ڈی ایس پی کو عدنان/ بانو قتل کیس پر بریفنگ دے رہا تھا۔

عدنان اور بانو فیس بک پر ایک دوسرے کے فرینڈ تھے جو فیس بک پر جعلی تصویروں اور ناموں اکمل اور نفیسہ کے نام سے ایک دوسرے سے چیٹ کرتے تھے۔ فیس بک یوزرز یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر کسی بھی نام سے اکاؤنٹ بنانا کتنا آسان ہے اور کوئی بھی تصویر لگائی جا سکتی ہے۔ اگر اس میں

والدین کی لاپرواہی اور عدم توجہی شامل ہو جائے تو اس جعلی اکاؤنٹ کو استعمال کرنا اور بھی سہل ہو جاتا ہے۔

وقوعہ والی رات دونوں میں ملاقات کا وقت طے ہوا۔ ملاقات کی جگہ راولپنڈی کا ایک مشہور ہوٹل مقرر کی گئی۔ پروگرام کے مطابق عدنان نے پہلے ہوٹل میں جا کر کمرہ بک کروایا اور ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بانو کو سینڈ کر دیا۔ ساتھ ہی ریسپشن پر بتا دیا کہ میری گیسٹ آئے گی اسے کمرے میں بھجوا دینا۔ عدنان کمرے میں جا کر انتظار کرنے لگا۔ اس کے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی کہ.....

کس طرح اپنے محبوب سے پہلی ملاقات ہوگی؟
اس کو پہچانوں گا کیسے؟
اس کو کیسے سرپرائز دوں گا؟

آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جب وہ دروازہ کھٹکھٹائے گی میں دروازے کے پیچھے چھپ جاؤں گا۔ جونہی وہ اندر داخل ہوگی اس کے پیچھے سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لوں گا اور پھر پیار بھری باتیں کریں گے۔ سسپنس کا ماحول بنانے کے بعد ہی ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ریسپشنسٹ نے انٹرکام پر ''مہمان'' کے آنے کی نوید دی۔ عدنان دروازے کی کنڈی کھول کر اس کے پیچھے چھپ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ ہلکی سی آہٹ سے کھلا اور ایک نقاب پوش لڑکی داخل ہوئی۔ عدنان نے نظر آئے بغیر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ نقاب پوش لڑکی نے بھی کوئی خاص مزاحمت نہیں کی۔ ہاتھوں کی بدتمیزیوں کی بناء پر نقاب سرک گیا تھا۔ اب عدنان کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہوئے اس کے جسم پر رینگنے لگا۔

''ابھی نہیں۔'' نقاب پوش کسمائی۔

عدنان نے بے صبری سے دونوں شانوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ عدنان مرد تھا اس کے حواس قدرے قابو میں رہے جبکہ بانو عدنان کو صرف ایک نظر ہی دیکھ پائی اور دھڑام سے گر گئی۔

عدنان کا ذہن ماؤف ہو گیا۔ گری ہوئی بانو کو چھوڑ کر تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ نارمل انداز میں کاؤنٹر کے سامنے سے گزرتے ہوئے باہر آ گیا اور نامعلوم منزل کی چل پڑا۔

رات کے وقت نہ جانے وہ کتنا چلتا رہا۔ ٹائم کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ آخر کار چلنے کے بعد ذہن کچھ سوچنے کا قابل ہوا تو اپنے کیے پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ اپنی بہن کا سامنا کیسے کرے گا۔ والدین کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ والدین کو پتہ نہیں تھا کہ کون سا طوفان آیا اور گزر گیا۔ ان کو تو اپنی پارٹیوں اور میٹنگوں سے فرصت نہیں ملتی وہ اولاد پر کیا توجہ دیتے۔ آخر کار اس نے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ چوکیدار کے بقول بانو گھر واپس آ چکی تھی۔ جو اس کے لیے تسلی کا باعث بنا۔ وہ بھی چپکے سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ صبح اپنی بہن کا کیسے سامنا کرے گا یہی سوچ کر وہ ہلکان ہو رہا تھا۔ اس نے الماری سے ماؤزر نکالا اور اپنے سر کے ساتھ لگا کر لبلبی دبا دی۔ اس کا آخری فیصلہ اس کی زندگی لے ڈوبا۔

ادھر بانو نے گھر پہنچتے ہی ٹوائلٹ میں استعمال ہونے والے کیمیکل کی بوتل پکڑی اور تقریباً آدھی خالی کر دی۔ اس سے آگے کے واقعات پہلے بیان کیے جا چکے ہیں۔

میری تمام والدین سے گذارش ہے کہ وہ اپنی مصروف ترین زندگی میں سے کچھ وقت نکال کر اپنے بچوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔

✻✻✻

سلسلہ وار آپ بیتی

آدی باسی بیل

''دیپا یہ تو ہمارا سارا پول ہی کھل گیا ہے۔ اب تو کلدیپ نے واپس جا کر اپنے پریوار اور پولیس میں ہمارے خلاف الزامات کی گرہ کھول دینی ہے اور پھر سمجھو کہ ہم سب پھانسی کی رسیوں میں جھولیں گے''۔

آخری قسط ☆ محمد رضوان قیوم

"اچھا یہی بات ہے تو آئیں مجھے بھی اپنی کچھ شکتی دکھلائیں"۔ (موہنتام دراصل سنتا سے ہلکا، دوسرے درجہ کا ہندوانہ انداز کا جادو ٹونہ ہوکرتا تھا)۔

نافہ بابا نے تھانیدار بھیم سنگھ کے سر کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر نرم نرم ہاتھوں سے اچھی طرح چمپی کی اور پھر اس کے سر کو اِدھر اُدھر ہلکے پھلکے انداز میں جنبش دیتے ہوئے کوئی نامانوس سے منتر پڑھنے شروع کیے۔

تھانیدار بھیم سنگھ کرسی پر خموشی سے اپنی آنکھیں بند کیے بڑے پُرسکون طور پر بیٹھا رہا۔

"واہ! دماغ کو ٹھنڈک اور شانتی مل گئی ہے"۔ اچانک بھیم سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔ "ارنافہ بابا! تُو تو واقعی اپنے دعویٰ کا نہ صرف کھرا ہے بلکہ تیرا ہاتھ تو بڑا ملائم کسی حسین کنواری کنیا کی مانند کول ہے۔ ارے ظالم اسے نہ روکنا، اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو میرے سر سے اس وقت تک نہ ہٹانا جب تک میں نہ کہوں"۔

"ارے سرکار! میں تب تک آپ کو سکون پہنچاتا رہوں گا جب تک میں تھک نہ جاؤں۔ آپ کی سیوا کرنا میرا فرض ہے"۔ بابا نافہ نے انکساری سے کہا۔

بھیم سنگھ کے ساتھ آئے سپاہی بڑے انہماک اور حیرت انگیز نگاہوں سے یہ مضحکہ خیز عمل دیکھ رہے تھے۔

"سر! بہت دیر ہوگئی ہے۔ اگلی انکوائری کے لئے بھی جانا ہے"۔ وہاں موجود ایک سپاہی نے ڈرتے ڈرتے انسپکٹر بھیم سنگھ کو باور کروایا۔

"یار مادھو تُو نے اچھا یاد دلایا میں نے تو واقعی ایک جگہ انکوائری کے لئے جانا ہے"۔ بھیم سنگھ نے مخمور لہجے میں کہا۔ "کیا کروں یار! یہ نافہ بابا کا ہاتھ اتنا ملائم اور موہنتام کا جاپ اتنا پُراثر ہے کہ بھگوان قسم مجھے اپنا فرض بھول کر نیند سی آ گئی تھی"۔ پھر بھیم سنگھ نے اپنی جیب سے 20 روپے نکالے اور نافہ بابا کے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے کہا۔

"بابا جی! یہ آپ کے رتبہ، علم کے شایانِ شان تو نہیں ہیں لیکن فی الحال یہ معمولی سا ہدیہ رکھ لیں"۔

بابا بیس روپے اکٹھے دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا۔

"سرکار! میں آپ سے نذرانہ لیتے ہوئے اچھا لگوں گا کیا وہ بھی اتنے روپے؟" بابا نے گھبرا کر کہا۔

"بابا مروت میں نہ پڑو اور اس وقت یہ نہ سوچو میں تھانیدار ہوں۔ بس یہ سمجھو کہ میری حیثیت آپ کے سامنے ایک مریض سی ہے"۔

"لیکن سرکار! میں اپنے اس عمل کے زیادہ سے زیادہ ایک یا دو روپے وہ بھی کوئی دے تو رکھ لیتا ہوں۔ آپ اس طرح کریں کہ بیس روپے رکھ لیں اور دو روپے میں آپ کی خوشی کے لئے رکھ لیتا ہوں"۔

"نہیں نہیں بابا جی! آپ الٹا مجھے شرمندہ کر رہے ہیں"۔ بھیم سنگھ نے کہا۔ "میں نے آپ کو پہلے ہی کہا ہے کہ بھگوان کی دیا سے میرے پاس بہت پیسہ ہے۔ میری نظر میں تو یہ بیس روپے بھی آپ کی خدمت کے لئے کم ہیں۔ ویسے اس جگہ سے ہٹ کر آپ مجھے اپنا کوئی ٹھکانا بتا سکتے ہیں جہاں آپ کے پاس آ کر روزانہ آپ سے دم کروالوں؟"

"ارے سرکار! آپ کو چِنتا کرنے کی کیا ضرورت ہے"۔ دھونڈو نے کہا۔ "ہم چند گیانی لوگوں نے مشترکہ طور پر حویلی کی دکانوں میں سے ایک دکان روحانی جادو ٹونہ توڑ، جنات وغیرہ کے معاملات کو دیکھنے کے لئے کرائے پر لی ہوئی ہے۔ آپ وہاں آ جایا کریں یا آپ کہیں گے تو ہم تھانے آجایا کریں گے"۔

"اچھا میں روزانہ اپنی ڈیوٹی دینے کے بعد وہاں آ جاؤں گا"۔ بھیم سنگھ نے کہا۔

نافہ بابا نے اپنی لنگی میں لٹکی چمڑے کی تھیلی میں سے ایک کالی سی گولی نکالی اور بھیم سنگھ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے کہا۔ "سرکار اسے رات کو سوتے وقت دودھ کے

ساتھ لے لینا۔ بھگوان نے چاہا تڑکے تک پُرسکون اور اچھے ماحول میں لمبی تان کے سوئیں گے''۔

''ارے یہ کیسی گولی ہے؟'' تھانیدار بھیم نے متجسس ہو کر پوچھا۔

''سرکار! یہ پوتر گنگا جل اور کئی قیمتی جڑی بوٹیوں کے ست سے بنائی گئی گولیاں ہیں''۔

''نہ بابا نہ، میں یہ ایسی ویسی گولیاں نہیں کھاؤں گا''۔ بھیم سنگھ نے شک بھرے انداز میں کہا۔

''ارے آپ ایک پولیس والے ہو کر ان گولیوں سے ایسے ڈر رہے ہیں جیسے کہ یہ کوئی جڑی بوٹیوں والی نہیں بلکہ کوئی جان لیوا زہر کی گولیاں ہوں''۔ بابا نافہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چلیں آپ کی مرضی، آپ بے شک اس گولی کو نہ لیں''۔

''مجھے رات کو نیند نہیں آتی، میں ساری رات کروٹیں لیتا رہتا ہوں۔ آپ ایسا کریں یہ گولیاں مجھے دے دیں۔ میں رات کو اسے دودھ کے ساتھ لے کر تجربہ کروں گا''۔ ایک سپاہی بولا۔

نافہ بابا نے ایک گولی اس سپاہی کو دی تو اس سپاہی نے کہا۔ ''بابا جی میرا ایک گولی سے کیا بنے گا، مجھے کم از کم دو چار گولیاں دیں''۔

اسی دوران دیپا اپنے باپ مکیش کے ساتھ وہاں آ گئی۔ دونوں پولیس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''کہاں سے آ رہی ہو بہو؟'' سنتو تائی نے پوچھا۔

''میں کلدیپ کے کپڑے، جوتے اور اس کی ضروریات کی تمام اشیاء مندر کی سیڑھیوں میں بیٹھے غرباء میں دان کرنے گئی تھی''۔ دیپا نے کہا۔

''بہو! یہ تم نے بڑے پُن کا کام کیا کہ سب چیزیں بانٹ دیں''۔ سنتو نے کہا۔

''ماتا جی! کپڑے لتے سب کچھ غرباء میں تقسیم کر دیا ہے''۔ دیپا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بس ایک کلدیپ کی تصویر روک لی ہے۔ (روتے ہوئے) اب اسی سے باتیں کرتی اور دیکھتی ہوں...... ماتا جی! یہ پولیس والے یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''اری بیٹی! یہی سوال میں ان سے پوچھ رہی ہوں کہ بالآخر پولیس والے ہم دکھیاروں کے زخموں پر بار بار نمک چھڑکنے کیوں آ جاتے ہیں؟'' سنتو تائی نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

''معاف کرنا، ہم پولیس والے بار بار یہاں کسی شوق سے آپ لوگوں کے زخموں کو ہرا کرنے نہیں آتے''۔ بھیم سنگھ نے کہا۔ ''ہم اس حویلی میں آتے ہیں تو کسی خاص مقصد کے لئے آتے ہیں''۔

''میں جانتی ہوں تم جیسے لوگوں کا ہم معصوم لوگوں کو ہراساں کرنے کا کیا مقصد ہوتا ہے؟'' دیپا نے کہا۔ ''ابھی میں تمہاری تلی گھوس کی گندگی سے بھر دوں تو تمہارا ہمیں بے جا تنگ کرنے کا مقصد ختم ہو جائے''۔

''یہ تمہاری ٹی آئی سی تھانے کی پولیس کے بارے میں غلط فہمی ہے''۔ بھیم سنگھ نے کہا۔ ''ہمیں اب سونے کے برابر سرکاری پگار ملتی ہے۔ ہمیں تم جیسے گندے ذہن کے حامل لوگوں کے ہاتھوں سے گند لینے کی ضرورت نہیں ہے''۔

دیپا جب تھانیدار سے زیادہ الجھنے لگی تو مکیش ہاتھ جوڑتے ہوئے تھانیدار بھیم سنگھ کے قریب آیا اور عاجزی سے بولا۔

''سرکار! میری ودوا پتری کا اس وقت دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے، یہ ابھی اپنے جوان شوہر کی اچانک موت کی وجہ سے صدمہ کی حالت میں ہے۔ لہٰذا میری آپ سے بنتی ہے کہ آپ اس کی درشت زبانی کا برا نہ مانیں''۔

''چلو میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد انہیں پولیس کی ذمہ داریوں اور اہمیت کے بارے میں بتا

دینا...... اور ہاں مجھے تم ایک بات یہ بتاؤ کہ تمہاری مقتول کلدیپ سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی یعنی تھنس گاؤں سے اس کی لاش ملنے سے کتنے دن پہلے؟"

"جی، مجھے تو اس سے ملے کافی عرصہ ہو گیا تھا"۔ مکیش نے جواب دیا۔

"اور بہو صاحبہ آپ سے کلدیپ آخری بار کب ملا تھا؟" اس نے دیپا سے پوچھا۔

"تھانیدار صاحب! آپ ہمیں کیوں تنگ کر رہے ہیں؟" دیپا نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "آپ سے پہلے تفتیشی تھانیدار پونم نے اس قسم کے سوالات کی ہم سے رٹ لگائی ہوئی تھی۔ میری زبان اسے یہ جواب دے دے کر سوکھ گئی ہے کہ اس سے میری آخری ملاقات اس دن ہوئی تھی جس دن میں حویلی والوں سے روٹھ کر حویلی سے اپنے گاؤں لا سا گئی تھی"۔

دھونند اور نافہ بابا ابھی تک کھڑے تھے۔

"میں مکیش جی اور ان کے پورے پریوار کو عرصہ دراز سے جانتا ہوں"۔ دھونند نے کہا۔ "یہ مالی طور پر کمزور ضرور ہیں لیکن ذہنی طور پر بڑے سلجھے، معصوم اور بے ضرر لوگ ہیں"۔

"دھونند جی! آپ جیسے مہان، نیک انسان نے جب یہ بات کہہ دی تو سمجھو آپ نے مکیش کے پریوار پر سندِ شرافت لگا دی ہے"۔ بھیم سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو سرکار آپ کب سے ہمارے اڈے پر موہنتام کے عمل کے لئے آئیں گے؟" نافہ بابا نے پوچھا۔

"ارے کل ہی شام کو آؤں گا"۔ تھانیدار بھیم سنگھ نے کہا اور جاتے جاتے سنتو تائی کو بڑی عجیب نگاہ سے دیکھا تھا۔

اگلے تین روز تک بھیم سنگھ نافہ بابا کے ٹھکانے پر جا کر موہنتام عمل کے لئے جاتا رہا۔ وہ نافہ بابا کو روزانہ اس کام کے لئے 20 روپے کا بھاری نذرانہ بھی دیتا رہا۔

❖❖❖

ایک روز صبح کے وقت سنتو تائی بازار سبزی لینے گئی لیکن خاصی دیر گزرنے کے بعد بھی وہ واپس حویلی نہ لوٹی۔ دیپا، ماتا اوس پڑوس کے گھروں، بازاروں میں انہیں ڈھونڈنے لگے۔ دوپہر تک جب ان کا کچھ پتا نہ چلا تو اردگرد کے مندروں، مسجدوں میں ان کی گمشدگی کے اعلانات کروائے گئے۔

حویلی میں ایک بار پھر اردگرد کے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ ماتا مکیش اور دیپا حویلی میں موجود لوگوں کو بتا رہے تھے کہ ماں جی حسب معمول صبح سبزی لینے گئی تھی لیکن تلاش بسیار کے باوجود وہ ابھی تک واپس نہیں آئی ہیں۔

بالآخر بڑے سوچ بچار باہمی مشورے کے بعد اہل محلہ نے یہ فیصلہ کیا کہ سنتو تائی کی گمشدگی کی رپورٹ قریبی تھانہ میں کروائی جائے۔ متعلقہ تھانہ میں ان کی یوں پُراسرار طریقہ سے گمشدگی کی رپورٹ درج کروا دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ اہل محلہ سنتو تائی کو ریلوے سٹیشن، پارکوں، ہسپتالوں اردگرد علاقے میں تلاش کرنے کے لئے سرگرداں ہو گئے۔

شام تک حویلی میں یوں ہی پریشانی کا ماحول طاری رہا۔

مغرب کے قریب علاقہ کے تھانہ ٹی آئی سی سے دو کانسٹیبل یہ خبر لے کر آئے کہ کول گاؤں کی ایک ندی سے سنتو کے چہرے مہرے اور شکل کے حلیہ کی ایک عورت کی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی لاش ملی ہے اور اس لاش کو تھانے والے مزید تفتیش کے لئے اپنے پاس لے آئے ہیں۔ یہ سن کر دیپا اور ماتا دھاڑیں مار مار کر رونے اور پیٹنے لگے۔

حویلی میں موجود لوگوں نے ان دونوں کو دلاسہ تسلی دیتے ہوئے کہا کہ پولیس کو ملنے والی عورت کی لاش کے بارے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعی سنتو کی ہے یا کسی اور کی ہے۔

اس دلخراش اطلاع کے آتے ساتھ ہی آناً فاناً حویلی سے وابستہ قریبی عزیز و اقارب اور اڑوس پڑوس کے لوگوں کا جم غفیر تھانہ پہنچ گیا۔

ٹی آئی سی تھانہ عام تھانہ تو تھا ہی نہیں وہ ایک حساس، خوف کی علامت والی جگہ تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے اچھے اچھے بدمعاش، صاحب حیثیت اثر و رسوخ کے حامل شخص کی سٹی گم ہو جاتی تھی۔

تھانہ کے مین گیٹ پر کھڑے بندوق بردار سنتریوں نے سنتو تائی کی لاش کی شناخت کے لئے جانے والے لوگوں کو گیٹ پر روک لیا۔

''مجھے میری ماں کی لاش دکھلا دو، مجھے چین نہیں آ رہا''۔ ماتا نے آہنی گیٹ پر اپنا سر دیوانہ وار مارتے ہوئے واویلا شروع کر دیا تھا۔

''ارے ہمیں تھانہ کے اندر جانے دو تاکہ ہم اپنی بہن سنتو جی کی لاش تو پہچان لیں''۔ ابا اور مکیش نے گیٹ پر کھڑے سنتریوں سے التجا کی تو سنتری نے واویلا کرتے ہوئے لوگوں کو کہا۔

''میں نے تھانے کے اندر آپ لوگوں کی آمد کی اطلاع کر دی ہے۔ اندر سے جیسے ہی آپ کے بلاوے کا حکم آئے گا میں آپ کو بھیج دوں گا''۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد تھانے کے اندر سے انسپکٹر پونم مع دو سپاہیوں کے مین گیٹ پر آیا۔ اسے دیکھ کر گیٹ پر موجود لوگوں نے واویلا اور احتجاج شروع کر دیا کہ انہیں جلد از جلد سنتو کی لاش کی شناخت کے لئے دیدار کرایا جائے۔ ماتا اتنے جنونی انداز میں رو رہا تھا کہ اس کا سنبھالنا دوبھر ہو رہا تھا۔

''تم سرکاری وردی والوں نے ہم لوگوں کو ذلیل کر کے رکھ دیا ہے''۔ ابا نے ناراضی میں سخت جملہ کہا۔

''شما کرنا بزرگو!'' انسپکٹر پونم نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''دراصل آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ یہ بڑی اہمیت کا حامل اور حساس تفتیشی ادارہ ہے۔ ہمارے لئے مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ سنتو کی لاش کی شناخت کے لئے آپ کا پورا محلہ یہاں آ گیا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں اس حساس جگہ پر ہم اتنے سارے لوگوں کو کیسے لے جا سکتے ہیں؟''

''تو آپ نے اس مسئلہ کا کیا حل سوچا؟'' ابا نے پوچھا۔

''اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ فی الحال تھانہ کے اندر سنتو کی لاش کی شناخت کے لئے صرف دس قریبی رشتہ داروں کی لسٹ مجھے دے دیں''۔ تھانیدار نے کہا۔ ''باقی لوگ بے شک مین گیٹ کی سامنے والی جگہ پر بیٹھ جائیں''۔

''میں جاؤں گا، سنتو میری بہن ہی نہیں بلکہ میری جگ بھی تھی''۔

''نہیں نہیں...... مجھے پہچانتی (مرنے والی) نے بچوں کی طرح پالا ہے، میرا نام ڈالو''۔

تھانے کے مین گیٹ پر جمع مجمعے سے ہر طرف سے یہ آوازیں آ رہی تھیں اور تھانہ کے اندر جانے کے خواہشمند افراد کی لسٹ ابا بنا رہے تھے۔ ہر کسی کی خواہش تھی کہ اس کا نام لکھا جائے۔ ابا کے لئے یہ مشکل ہو رہا تھا کہ کس کا نام ڈالیں کس کا چھوڑیں۔

''بھئی جلدی کرو''۔ انسپکٹر پونم نے ابا کے ہاتھوں سے لسٹ لے کر خود ہی اس میں لکھے ناموں سے سنتو تائی کے رشتہ ناطے کے بارے میں پوچھنے لگا۔

اس نے اس لسٹ میں ابا، مکیش، ماتا، دھومند، نکلتبال، جونم، شنکر دیال کے علاوہ محلہ کے تین بزرگوں

کے نام خود ہی لکھے اور ان لوگوں کو کہا کہ وہ تھانہ کے تفتیشی ہال میں آ جائیں۔ تمام لوگ تھانے کے بڑے تفتیشی ہال میں آ گئے۔ تفتیشی ہال کا منظر بڑا دل ہلانے والا اور سنانے والا تھا۔ دو بڑے میزوں کے ساتھ پولیس افسران کے بیٹھنے کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جبکہ چند پولیس کانسٹیبل خموشی سے بندوقیں تانے کھڑے ہوئے تھے۔

تمام افراد ہال کی دیوار سے اپنی کمریں لگائے تھانے کے ان متعلقہ ذمہ دار افسران کا انتظار کرنے لگے جنہوں نے ان کو سنتو تائی کی لاش کی شناخت کروانی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد تھانیدار پونم، تھانیدار بھیم سنگھ اور ایک اور تھانیدار کے ہمراہ پولیس کی بھاری نفری تفتیشی ہال میں پہنچے۔ تینوں تھانیدار اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔

''میری ماتا کہاں ہیں؟ بھگوان کے واسطے مجھے ان کا چہرہ دکھادو''۔ ماتا نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھ میں مزید انتظار کرنے کی تاب نہیں ہے۔''

ادھر مکیش نے اپنی قمیص کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''ہائے میری دیدی مجھے اپنا مرا ہوا چہرہ نہ دکھانا۔ میں سوگند کھاتا ہوں اگر ایسا ہوا تو میں اپنی آتما ہتھیا کرلوں گا''۔

''ارے بھئی ہمیں اس تھانہ میں خوار ہوتے ہوئے کئی گھنٹے ہوگئے ہیں''۔ ابا نے کہا۔

تیسرا تھانیدار جو شکل وصورت سے بھیم سنگھ سے کئی گنا بھیانک حبشیوں کی مانند رنگت کا سیاہی مائل، کیم شہیم بھینسے کی طرح تھا۔ اس نے ابا کو حکمیہ انداز میں کہا۔

''بابا جی! اپنی آواز کو ہلکا رکھو۔ یہ تیرا گھر نہیں ہے جہاں تُو یوں گلا پھاڑ کر چلا رہا ہے۔ تم سب لوگ خاموشی اور شانتی سے سینئر تفتیشی آفیسر کی باتیں سنو''۔

انسپکٹر پونم نے ابا اور محلہ کے چار بزرگوں کو اشارہ سے اپنے قریب بلایا اور پھر اس نے وہاں کھڑے سپاہیوں کو حکم دیا کہ چار کرسیاں لے آؤ۔ دو سپاہی گئے اور چار کرسیاں لے آئے۔ یہ چاروں بزرگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''میری ٹانگ میں زخم ہے سرکار!'' مکیش نے فریاد کرتے ہوئے کہا۔ ''میری ٹانگ میں شدید درد ہے، مہربانی کرکے میرے لئے بھی کرسی منگوالیں''۔

''اوہو، مکیش جی آپ کی کون سی ٹانگ میں چوٹ آئی ہوئی ہے؟'' ایک تھانیدار نے پوچھا۔

مکیش نے اپنے پاؤں سے ہندو کٹ پاجامے کا پائنچہ تھوڑا سا اچکایا تو وہاں واقعی ایک بڑی سی دوائی لگی پٹی بندھی ہوئی تھی جس میں سے واضح طور پر پیپ اور خون بہتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

''اوہو، میں ابھی آپ کے لئے کرسی منگواتا ہوں''۔ اس نے کہا۔

''مکیش جی! آپ اس کرسی میں بیٹھ جائیں''۔ ایک بزرگ نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے مکیش کو کہا۔

''جی نہیں بزرگو!'' آپ بیٹھے رہیں میں ابھی ان کے لئے بھی کرسی منگواتا ہوں''۔ اسی تھانیدار نے کہا۔

''حضور! ہمارے لئے کیا حکم ہے؟'' ابا نے تھانیدار کو اس بار بڑی آہستگی سے مخاطب ہوکر پوچھا۔ ''آپ کب تک بہن سنتو کی لاش ہمیں دکھائیں گے''۔

''بس دس منٹ اور انتظار کرلیں''۔ بھیم سنگھ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ ''مردہ خانہ سے ہمارے سپاہی ابھی ممکنہ مسماۃ سنتو بی بی کی لاش لاتے ہیں''۔

''دس منٹ اور...... '' دھونند نے تفکرانہ انداز میں اپنے منہ سے پھونک نکالتے ہوئے کہا۔

''چلو ابھی شناخت کے لئے میت آنے میں ہمارا پاس دس منٹ ہیں''۔ بھیم سنگھ نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ''اس دوران میں آپ اہل محلہ اور لالہ جی کے عزیز اقرباء کے سامنے اس بات کا انکشاف کر رہا ہوں کہ

پولیس اور ٹی آئی سی تھانہ کی مشترکہ تفتیشی ٹیموں نے بڑی تگ و دو کے بعد کلدیپ کے اصل قاتلوں کو تلاش کرلیا ہے"۔

"کون ہے میرے بھائی کا قاتل میں اس کا نرخرہ چبا جاؤں گا"۔ ماتا نے جذباتی ہو کر یہ بڑھک مارتے ہوئے کہا۔

"واقعی آپ نے کلدیپ کے پُراسرار قاتل کا سراغ حاصل کرلیا ہے؟" مکیش جھنگر دیال نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں"۔ انسپکٹر بھیم سنگھ نے دونوں کی جانب گھورتے ہوئے کہا۔ "ہاں ایک قاتل نہیں بلکہ قاتلوں کی پوری خونی زنجیر کو قابو کیا ہے"۔

"کہاں ہے وہ خونی زنجیر؟ ذرا کچھ ہمیں بھی دکھائیں، کچھ ہمیں بھی بتائیں"۔ چاند بابو بزرگ محلہ دار نے تھانیدار سے یہ سوال کیا تو اس نے پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"یوں سمجھو کہ لالہ جی کی حویلی کی خوشیوں کو، سکھوں کو اس گھر کے چراغوں سے آگ لگ گئی"۔

"کیا مطلب؟" ابا اور چاند بابو نے بیک وقت چونک کر اپنی کرسیوں سے اچکتے ہوئے یہ جملہ دہرایا۔

"ہاں بزرگو! بھیم سنگھ صحیح کہتا ہے"۔ انسپکٹر پونم نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سمجھے نہیں"۔ شنکر دیال نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

"ابھی سمجھاتے ہیں بزرگو!" انسپکٹر پونم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج تم لوگوں کو دو خوشیاں ملیں گی۔ ایک تو یہ کہ مسماۃ سنتو مری نہیں ہے بلکہ زندہ ہے اور دوسری ......"

"کیا مطلب، یہ آپ پولیس والے بالآخر ہم کو لمحہ بہ لمحہ اتنا چونکا کیوں رہے ہیں؟" کرسی پر بیٹھے ایک محلہ دار بزرگ نے تھانیدار سے سوال کیا۔

"بزرگو! ابھی تو آپ یہاں ہماری دو باتوں سے دو مرتبہ چونکے ہیں۔ ابھی آپ دیکھنا چند منٹوں بعد ہماری تفتیشی ٹیم آپ کے سامنے اتنے بھیانک انکشافات کرے گی کہ آپ کو اپنے پیروں تلے حیرت کے زلزلوں کے کئی جھٹکے محسوس ہوں گے......" بھیم سنگھ نے بلند آواز میں حکم دیا۔ "ماتا سمان مسماۃ سنتو کو یہاں لاؤ"۔

ذرا دیر بعد دو سپاہی سنتو کو لے کر آئے تو سب انہیں دیکھ کر ششدر رہ گئے اور حیرانگی سے دیکھنے لگے۔

"ماتا جی!" ماتا نے حیرت سے بھری آواز میں کہا اور ماں کی طرف لپکا۔

"رُک جاؤ لڑکے!" بھیم سنگھ نے ڈپٹ کر ماتا سے کہا۔ "اوئے جب تک ہم تم لوگوں کو اجازت نہیں دیں گے اس وقت تک کوئی بھی سنتو کے قریب نہیں جائے گا"۔

"تم لوگ ہمارے ساتھ یہ کیا ڈرامہ کھیل رہے ہو؟" چاند بابو نے برہمی سے پوچھا۔

"بابا جی! ہم تم بڈھوں کو کرسی دے کر عزت دے رہے ہیں حالانکہ ایسا ہمارے ٹی آئی سی تھانہ کا رواج نہیں ہے"۔ بھیانک شکل والے تھانیدار نے چاند بابو کو چپ کرواتے ہوئے کہا۔ "ہماری جانب سے پیش کیے جانے والے سچی کہانی پر مبنی قتل کے اس ڈرامے کے مزید کردار دیکھتے رہو۔ اب تم سب کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ بالآخر ہم نے اس بڑھیا کو اپنی تحویل میں کیوں چھپائے رکھا۔ اس کا جواب ابھی چند منٹ بعد دیتے ہیں۔ تھوڑا ذرا اور کشٹ سہہ لو"۔

دس منٹ بعد تھانہ کے مین گیٹ کے اندر پولیس کی جیپ نمودار ہوئی۔ اس جیپ میں سے پہلے دو لیڈی اور چار مرد پولیس مین اترے اور اس کے بعد وہیل چیئر پر لالہ جی اور پھر دیپا اور اس کا بھائی پونم اترے۔ دیپا اور پونم کو پولیس کے سپاہیوں نے مجرموں کی طرح حراست

میں لیا ہوا تھا۔

دیپا نے سنتو تائی کو زندہ دیکھا تو پہلے تو وہ بُری طرح چونکی اور پھر سنبھل کر چلائی۔ ''بھگوان کا شکر ہے کہ میری نگاہیں آپ کو صحیح سلامت دیکھ رہی ہیں لیکن پولیس والے ہمیں یوں گھسیٹ کر مجرموں کی طرح کیوں لائے ہیں، یہ انیائے ہے''۔

''آؤ بھورانی! ذرا ہمارے سامنے تو آؤ''۔ کالے کلوٹے بھوت جیسے تھانیدار نے بڑے مضحکہ خیز طنزیہ انداز سے یہ جملہ کہا۔

دیپا تھانہ میں کچھ زیادہ ہی واویلا کرنے لگی تو بھیم سنگھ نے اس کے پیچھے کھڑی خرانٹ لیڈی کانسٹیبل کو کچھ اشارہ کیا تو اس نے ایک جما کر مکہ گدی میں مارتے ہوئے کہا۔

''خموشی سے افسران کے سامنے کھڑے ہو کر ان کے سوالوں کا جواب دے ورنہ میں تیری گردن کا منکا توڑ دوں گی''۔

دیپا سہم کر تینوں تفتیشی تھانیداروں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ انسپکٹر بھیم سنگھ اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کو گھماتا ہوا اپنی کرسی سے اٹھا اور دیپا کے انتہائی قریب آ کر اس کی ٹھوڑی میں ڈنڈے کی نوک کو چبھوتے ہوئے بولا۔

''بھورانی! تم دل و دماغ سے تسلیم کر لو کہ اب تم سارے موقع پرست، نوسر بازوں، بے رحم قاتلوں کی بچھائی بساط الٹ چکی ہے۔ میرے خیال میں تجھ جیسی مکار کی صحت اتنی اچھی نہیں ہے کہ تُو تھانے کا خوفناک تشدد سہہ سکے۔ لہٰذا بھورانی تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تُو اپنے منہ سے خود ہی اُگل دے کہ تُو نے ہی کلدیپ کو نہ صرف قتل کروایا ہے بلکہ اپنی نند نوتن کو بھی چتا تک پہنچانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے''۔

''کیا کہا...... یہ ناگن نوتن کی زندگی کو بھی نگل گئی؟'' ابا نے اپنے سر پر حیرت سے ہاتھ رکھتے ہوئے تھانیدار سے استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، بزرگو! اس خبیث کے منہ سے فی الحال ان دو قتلوں کا اقرار سن لو''۔

دیپا کے چہرے کی سفیدی خوف، گھبراہٹ کے مارے پیلاہٹ میں تبدیل ہو رہی تھی اور زمین پر نظریں گاڑے ہوئے تھی اور دوسری طرف اس کی ٹانگوں میں بُری طرح لرزہ طاری ہو رہا تھا۔ اسی دوران لیڈی کانسٹیبل نے ایک زوردار ڈنڈا اس کے کندھے پر مارا اور چلاتے ہوئے کہا۔

''نی بولتی ہے یا کروں تیرے کومل چہرہ کو چھدار''۔

دیپا نے ڈنڈا کھاتے ہی ایک تکلیف بھری آہ نکالی اور یکدم غش کھا کر زمین پر گر کر بے ہوش سی ہوگئی۔ وہاں کھڑے تمام اہل محلّہ، دیگر بزرگ یہ منظر دیکھ کر دہل گئے۔

''ارے کیا ہوا کمبخت کو؟'' سنتو تائی نے پریشانی کے عالم میں روتے ہوئے انسپکٹر یونم سے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ارے چنتا نہ کرو ماسو جی! آپ کی بھورانی یہی کام کر رہی ہے۔ جو یہاں تھانہ میں آ کر پہلی بار چالاک مجرم کرتے ہیں۔ میں ابھی اسے ہوش میں لاتا ہوں''۔

پھر اس نے ایک لیڈی کانسٹیبل کو حکم دیا کہ اس کے جسم پر ''تتا'' چھینکو۔ (تتا تفتیشی پولیس ریمانڈ کے وقت مجرموں پر چھینکتی تھی۔ یہ ایسا پانی ہوتا تھا جس میں جسم کی کھال کو جلانے والے کیمیکل شامل ہوتے تھے۔ اس کی ایک بوند پڑ جانے سے ایسا لگتا تھا جیسے کہ کسی نے جسم پر آگ لگا دی ہو۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس سے انسان مرتا نہیں تھا لیکن اسے ناقابل برداشت حد تک تکلیف ہوتی تھی)۔ تتا لایا گیا، لیڈی کانسٹیبل نے دیپا کی کمر پر اس کی تھوڑی سی مقدار ڈالی۔ کچھ دیر تو وہ بے سدھ اس طرح پڑی رہی

جیسے کہ اس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ماحول میں مسلسل خوف میں لتھڑی ہوئی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہاں موجود تمام افراد اہل محلہ و دیگر خوف یہ منظر بڑے سہمے، پریشانی وانہماک سے دیکھ رہے تھے۔

''ارے یہ واقعی بے ہوش ہوگئی ہے''۔ دیوار سے لگا ایک محلہ دار بڈھا چیخا۔

''چپ کر بابا درمیان میں مت بول''۔ حبشی تھانیدار نے کڑک کر کہا۔ ''ابھی اٹھتی ہے یہ میسنی۔ اری چل ری اس ڈھیٹ کے سینے پر کھل کرتا کا چھڑکاؤ کر''۔ لیکن ساتھ ہی اس نے لیڈی کانسٹیبل کو آنکھ مار کر کچھ اشارہ بھی کیا۔ بہرحال اس لیڈی کانسٹیبل نے تھوڑی سی تاکی مقدار اور دیپا کے سینے پر انڈیلی تو وہ یکدم گھوڑے کی طرح اچھل کر اٹھی اور اپنی کمر، سینے کو ملتے ہوئے چلائی۔

''ہائے میں مری، میں جل گئی، میں مرجاؤں گی''۔

''دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ یہ ڈائن اپنے جرم کو چھپانے کی خاطر سارا ناٹک کر رہی ہے''۔

دونوں لیڈی کانسٹیبلوں نے بُری طرح ڈنڈوں، مکوں اور بالوں سے پکڑ کر اسے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔

''ارے میری بٹیا مرجائے گی''۔ مکیش روتے چلاتے ہوئے آگے بڑھا تو تیسرے تھانیدار نے لپک کر اسے جھٹکے سے اپنی جانب گھسیٹا اور اسے ایک اور جھٹکا دے کر زمین پر پٹختے ہوئے کہا۔

''نوسر باز! بے رحم قاتل ان سب لوگوں کے سامنے تو اور تیری پتری دیپا یہ اقرار کرے کہ انہوں نے کلدیپ اور نوتن کو قتل کیا ہے کہ نہیں..... بتا ورنہ تیرے دونوں کان پلاس سے کھنچوا کر علیحدہ کر دوں گا''۔

پھر مکیش کو تشدد کی چکی میں اس بُری طرح پیسا گیا کہ اس نے اقبالی بیان دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ کپڑے پھٹ گئے تھے۔ تشدد کے ماہرین نے اس کے جسم پر کوئی زخم لگائے بغیر اس کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

''چل سامنے آرام سے کھڑے ہو کر اپنے پاپوں کا کچا چٹھا بیان کر''۔ تھانیدار نے مکیش کو دو لمبے تڑنگے سپاہیوں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''جہاں یہ بیان دیتے ہوئے اٹکے اور جھوٹ کی ڈنڈی مارے تو اس کو دوبارہ خوراک دے دینا''۔

''چل بے اپنی زبان کا انجن سٹارٹ کر''۔ پیچھے کھڑے سپاہی نے اس کے کان پر ایک بے رحم مکا مارتے ہوئے کہا۔ مکیش نے دھونند اور پھر دیپا کی جانب بغور ایک لمحے کے لئے دیکھا تو انسپکٹر بھیم سنگھ نے شیر طرح دھاڑتے ہوئے کہا۔ ''جلدی بک جو بکنا ہے، ادھر اُدھر کیا دیکھتا ہے؟''

''ہاں، ہم لوگوں نے ایک لمبے منصوبے کے تحت خفیہ طریقے سے لالہ جی کی حویلی کو برباد کیا ہے۔ کلدیپ اور نوتن کو بھی ہم نے مروایا ہے''۔ مکیش نے کہا تو سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹ کر آگئیں۔

''اچھا یہ بتا کہ تیری ''ہم لوگوں'' سے کیا مراد ہے؟'' انسپکٹر پونم نے درمیان میں بڑے تحمل سے مکیش کو ٹوکتے ہوئے پوچھا۔ ''نام لے کر بتا کون کون تیرے ساتھ شامل تھا؟''

''دیپا، میرا بیٹا بونم، دھونند، نکتھال اور...'' کہتے کہتے مکیش رک گیا۔

''ہاں بول رک کیوں گیا؟'' پیچھے کھڑے کانسٹیبل نے اس کے کان کی لو کو ربڑ کی مانند نیچے کی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔ لو سے خون بہنا شروع ہو گیا۔

''جی..... وہ، اس خونی کھیل میں لالہ جی کا بیٹا ماتا بھی برابر کا شریک تھا''۔ مکیش نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

''بھگوان تیرا بیڑہ غرق کرے، تو نرک میں جلے''۔
سنتو تائی نے بین کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے مجھے ان کمینوں، حرام خوروں کی نسبت تیرے ہاتھوں حویلی کی تباہی پر دلی دکھ ہوا ہے''۔

سنتو اپنی چادر کا پلو اپنے چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جبکہ لالہ جی وہیل چیئر پر بیٹھا لقوہ زدہ منہ سے پورا زور لگا کر ہو ہو کر کے اپنے غصہ اور دکھ کا اظہار کر رہا تھا اور دوسری جانب وہاں بیٹھے تمام افراد فرط حیرت سے اس ناقابل یقین گھناؤنی واردات کے لرزہ خیز انکشافات سن رہے تھے۔ انسپکٹر پونم نے بڑے سخت لہجہ میں سب لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا۔

''شنکر دیال اور اس کے دونوں بیٹے آگے آ جائیں جبکہ باقی ماتا، دھونند، نکتھال، پونم بدستور دیوار سے لگے کھڑے رہیں''۔

شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کے لئے تھانیدار نے کرسیاں منگوا کر محلّہ کے چاروں بزرگوں کے ساتھ بٹھا دیا۔

''چلو فی الحال تم سارے دیوار سے لگے افراد مرغا بنو۔ اس نے سنتریوں سے کہا کہ مرغا بنے ملزموں کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کے کولہوں کا ڈنڈوں سے خوب سواگت کرو۔

''ہائے ماتا جی! مجھے پولیس سے کہہ کر بچالو''۔ ماتا نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں بے قصور ہوں''۔

''پولیس کے نرغے میں آیا تو تجھے ماتا یاد آئی''۔ سنتو نے قہر زدہ لہجے میں کہا۔ ''تھانیدار صاحب! اس ناخلف بھائی بہن کے قاتل کی ہڈیاں توڑ دو''۔ مرغا بنے دھونند، نکتھال کی پولیس کے سپاہیوں نے دل کھول کر ڈنڈوں، لاٹھیوں سے مرمت کی۔

ٹی آئی سی تھانہ میں اب مرغا بنے ملزمان کی ہائے ہائے مر گئے۔ اوئی اوئی کی آوازیں آ رہی تھیں تو دوسری جانب پولیس کے سپاہی اپنی مخصوص مضحکہ خیز جملوں سے انہیں اور اذیت دے رہے تھے۔

انسپکٹر پونم نے کرسی پر بیٹھے تمام افراد اور عملہ کے لئے گرم گرم چائے اور بسکٹ منگوا لئے۔

'اب آپ سب لوگ مجھ سے بلا تکلف کھلم کھلا باتیں کریں۔ یوں سمجھیں کہ آپ کے سامنے انسپکٹر پونم نہیں کوئی دوست بھائی بیٹھا ہے''۔

تیسرے کالے کلوٹے انسپکٹر نے کرسی پر بیٹھے تمام لوگوں سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں میز پر پڑے چائے کے کپ اٹھانے کا اشارہ کیا۔

''سرکار! یہ تو بتائیں کہ سنتو بہن کو آپ نے اپنی تحویل میں کیوں رکھا ہوا تھا یعنی اس کی کیا منطق تھی؟'' ابا نے سوال کیا۔

''آپ نے بہت اچھا با موقع سوال کیا''۔ انسپکٹر پونم نے اپنے ہونٹوں سے چائے کا کپ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کا جواب آپ کو انسپکٹر بھیم سنگھ دے گا''۔

انسپکٹر بھیم سنگھ نے اپنا گلا کھنکارا اور پھر چائے کے کپ سے ایک سپ لینے کے بعد اپنی بات یوں شروع کی۔

''ابتدائی رپورٹ کے مطابق بظاہر کلدیپ کا قتل تھنس گاؤں کے ڈاکوؤں کے ہاتھوں لگ رہا تھا۔ شواہد، واقعات بھی اسی امر کی قوی گواہی دے رہے تھے لیکن جب انسپکٹر پونم نے اس کیس کو مجھ ناچیز سے ڈسکس کیا تو میرے ذہن میں اس کیس کے بارے میں کچھ شہادتوں کے ملنے کی وجہ سے کچھ شکوک کا شائبہ محسوس ہوا۔ مثلاً انسپکٹر پونم نے مجھے بتایا کہ ٹی آئی سی کے ملازم دیسی کھوجی نے وقوعہ کی سیلابی جگہ پر بیل گاڑی کے پہیوں کے تازہ نشانات کا پتا دیا تھا۔ دوسرے مقتول کلدیپ کے بازوؤں کو ایک مخصوص خوبصورت ریشمی لال، نیلے رنگ کے ازار بند سے باندھا گیا تھا۔ وہ آزار بند میں نے

دیکھا اور تیسرے کلدیپ کی شیو بالکل ایک آدھ دن کی تازہ بنی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب مقتول کی لاش کا پوسٹمارٹم کیا گیا تو کیمیکل ایگزامنر نے یہ رپورٹ دی کہ مقتول کو قتل کرنے سے پہلے اسے دیسی شراب میں ایک خاص قسم کا زہر ملا کر پلایا گیا اور پھر اس کو شدید تشدد کے ذریعہ ہلاک کیا گیا تھا۔

ان شواہد، واقعات کو جمع کرنے کے بعد اس خیال کی نفی ہو جاتی تھی کہ کلدیپ کو تھنس گاؤں کے ڈاکوؤں یا لٹیروں نے مارا ہے۔ سچی بات ہے کہ کوئی ڈاکو یا لٹیرا کسی بھی نہتے معصوم لٹنے والے کو اتنی پلاننگ سے نہیں مارتا۔ یہ بات عیاں ہے کہ ڈاکو یا لٹیرا لٹنے والے کو عجلت میں صرف لوٹتا ہے یا اگر مجبوراً لٹنے والے کو اسے مارنا مقصود ہو تو وہ اسے اسی وقت چاقو یا بندوق سے قتل کر دیتا ہے مگر قتل کر کے اس کی لاش کو اتنی دور تک گاڑی میں لاد کر پھینکتا نہیں ہے۔

دوسرا سوال جو مجھے اکسا رہا تھا وہ یہ کہ مقتول کی لاش کے منہ سے مسلسل مختلف رنگ کا مواد جھاگ کی صورت میں رس رہا تھا۔ یہ اس امر کی چغلی کھا رہا تھا کہ کلدیپ کو باقاعدہ پہلے زہر دیا گیا ہے۔ ازاربند جو کلدیپ کی لاش کے بازوؤں اور پیروں میں باندھا گیا تھا۔ وہ ازاربند بھی کئی شکوک وشبہات کی بدبو پیدا کر رہا تھا۔ بہرحال میں نے ان اکٹھے کیے گئے شواہد وواقعات کی روشنی میں نئے سرے سے تحقیقات کا بیڑا اٹھایا۔

میں سب سے پہلے لاسا گاؤں گیا، وہاں میں نے خفیہ طور پر مکیش، دیپا، جونم اور بونم کے کریکٹر کے بارے میں تحقیق کی تو مجھے ان کے قریب کے کچھ دیہاتیوں نے بتایا کہ مکیش، اس کی بیوی، بیٹی دیپا دونوں بیٹے نسل در نسل لٹیرے، موقع پرست، بڑے فنکار اور نوسرباز ہیں اور یہ کسی بھی بڑی واردات کرنے سے بھی نہیں ٹلتے اور ان کے پاس آج کل نہ جانے کہاں سے کھلا روپیہ پیسہ آ رہا ہے۔ انہوں نے اس گاؤں میں تین ایکڑ زمین بھی خریدی ہے اور رہن سہن بھی شاہانہ ہو گیا ہے۔

دوسرے شاید ان ظالم قاتلوں کی قسمت بری تھی اور بھگوان نے اس اندھے بہیمانہ قتل کے انکشاف سے پردہ اٹھانا تھا۔ ہوا یوں کہ مجھے لاسا گاؤں کے ایک نائی نے یہ بتایا کہ اس نے ہی کلدیپ کی صبح کے وقت شیو کی تھی۔

اب یہاں آ کر میرا شک پکا ہو گیا کہ سو فیصد کلدیپ کے قتل میں اس کے سسرالیوں کا ہاتھ ہے لیکن ابھی تک میرا شک دیپا کی جانب نہیں گیا تھا۔

میں نے پھر دھونند کے بارے میں تفتیش کی اور اس کے گاؤں اور اس کے اس سکول بھی گیا جہاں یہ پڑھاتا تھا۔ وہاں کے سرکاری ریکارڈ سے پتا چلا کہ یہ وہاں سائنس لیبارٹری ٹیچر تھا اور سٹوڈنٹ کو مختلف کیمیکل کے تجربے وغیرہ کرواتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اپنی اس سکول کی نوکری کو چھوڑ کر بمبئی چلا آیا جہاں یہ فلموں میں استعمال ہونے والا ایک ایسا خاص آتشی کیمیکل سپلائی کرنے لگا جو کہ شوٹنگ کے دوران مصنوعی لیکن حقیقت میں اصل نظر آنے والی آگ پیدا کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ دیگر کیمیکلز کے بارے میں کافی علم ومعلومات رکھتا تھا۔ مثلاً پانی میں ایسی گولیاں ڈالی جاتی ہیں جو بلبلے اور دھواں پیدا کرتی ہیں۔

جو ازاربند کلدیپ کی لاش کے ہاتھوں اور پیروں میں کاٹ کر دو حصوں میں باندھا گیا تھا یہ ازاربند بہت خوبصورت ریشمی لال، نیلے رنگ کے دھاگوں سے بنا ہوا تھا اور یہ کانپور شہر کی ایک مشہور فیکٹری کا بنا ہوا تھا اور شہر کی چند مخصوص بڑی دکانوں سے ہی ملتا تھا۔ میں نے جب اس ازاربند کے بارے میں شہر کی مختلف دکانوں سے معلومات کی تو لالہ جی کی حویلی کے ایک قریبی بازار کے ایک دکاندار نے مذکورہ ازاربند کو دیکھ کر تصدیق کی کہ اس قسم کے ازاربند کچھ دنوں پہلے سنتو نے اس کی دکان

سے خریدے تھے۔ اس مقام پر آ کر کلدیپ کے قتل کا کیس خلاف توقع نیا رخ اختیار کر چکا تھا۔ اب اس میں کوئی شک وشبہات کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ کلدیپ کا پُر اسرار قتل سنتو یا دیپا میں سے کسی نے ایک نے کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے سامنے یہ اندیشہ منڈلا رہا تھا کہ آیا کہ اس قتل میں سنتو، دیپا دونوں کا مشترکہ ہاتھ ہے۔

اب آپ کو میری اس بات سے یہ جواب مل جائے گا کہ ہم نے سنتو کو اپنی تحویل میں کیوں رکھا۔ میں جب سنتو اور دیپا سے متعلقہ ازار بند کے بارے میں پوچھنے حویلی پہنچا تو اتفاق سے میرا سامنا سنتو سے ہوا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اس کی بہو دیپا محلے میں گئی ہوئی ہے اور میں نے جب سنتو کو ازار بند دکھایا تو وہ چونکی۔ اس نے مجھے علیحدہ کمرے میں بتایا تھا کہ یہ خوبصورت ریشمی ازار بند اس نے اور دیپا نے فلاں دُکان سے خریدے تھے۔ جن میں سے دو میں نے اور دو دیپا نے اپنے پاس رکھ لئے تھے۔ مجھے سنتو نے اپنے پاس رکھے دو ازار بند دکھائے تھے۔ سنتو نے مجھے بتایا تھا کہ اسے سوفیصد یقین ہو چلا ہے کہ اس کے بیٹے کلدیپ کے قتل مین ملوث اس کے گھر میں بسنے والی ناگن دیپا ہی ہے اور پھر میں نے سنتو کے ساتھ کلدیپ اور دیپا کے کمرے کی الماریاں وغیرہ چیک کیں تو دوران تلاشی مجھے دیپا کی چارپائی کے نیچے موجود ایک چھوٹے سے چوبی صندوق کے اندر سے ایک ایسی چھوٹی بوتل ملی تھی جس کا میں نے ڈھکن کھولا تو بوتل کے اندر سے پہلے دھواں نکلا اور پھر چند لمحے بعد اس کے اندر سے ایسا نیلا شعلہ ابھرا جو چند سیکنڈ بعد خود بخود بجھ گیا کہ یہ لازماً فلم انڈسٹری میں استعمال ہونے والا مصنوعی آگ پیدا کرنے والا محلول ہے۔ ادھر سنتو نے بھی اس شعلہ کو پہچانتے ہوئے مجھے بتایا کہ اسی قسم کی آگ رسوئی میں لگی تھی۔ ان متعدد ثبوتوں کے ملنے کے بعد میرا ذہن سنتو کی بجائے دیپا کی جانب گامزن ہوگیا۔

اس سے پہلے تھانہ میں اس موضوع پر بہت سوچ و بچار، پریشانی رہی کہ سنتو ماں ہونے کے ناطے اپنے بیٹے کا کسی بھی قیمت پر قتل نہیں کر سکتی۔ اسی لئے میرے سینئر تفتیشی آفیسر پریم نے ہی میری توجہ دیپا کی جانب مبذول کروائی تھی۔ میں نے ہی سنتو کو کہا تھا کہ وہ مزید چند روز تک اپنی زبان سی رکھے اور حویلی کے موجود باسیوں پر یہ تاثر دے کہ تفتیشی انسپکٹر بھیم سنگھ معمول کے مطابق تفتیش کے لئے آیا تھا۔

ادھر میں نے نافہ بابا کو جب پچاس روپے دیئے تو اس نے بھی اپنی یہ حقیقت میرے سامنے کھول دی کہ وہ ایک معمولی کام چلاؤ نام نہاد ”سنتا“ کا دم کرنے والا آدمی ہے اور وہ حقیقت میں اس بہروپ بدلنے سے پہلے گلیوں، کوچوں میں ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ مکیش اس کا پکا دوست تھا۔ اس نے اسے ورغلایا تھا کہ تو دو چار روپے روز کمانے کے بجائے میرے بنائے ہوئے حویلی کے (دکان) تھیے میں آ اور دھونند، مریدان اور دو چار جھاڑ پھونک جادوئی عمل کرنے والوں کی ٹیم کے ساتھ بیٹھ کر توہم پرست لوگوں کی جیبیں خالی کر۔ اس میں نافہ کا حصہ آدھا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ نافہ جب اس کے تھیے پر آیا تو اپنی سبزی کی ریڑھی کی آمدنی سے کئی گنا کمانے لگا تھا اور پھر مکیش سے حویلی میں لالہ جی کے اوپر جعلی سنتا کے دم، عمل کے لئے لے کر گیا تھا۔ وہاں یہ پہلے سے پریشان سنتو پر نفسیاتی دباؤ ڈال کر اس سے کافی روپے اینٹھ لیتا تھا۔

بھیم سنگھ نے بتایا کہ سنتو کو ہم نے اس لئے ڈرامائی طور پر اپنی کسٹڈی میں چھپا کر رکھا تھا کہ نافہ بابا نے ہمیں یہ راز انکشاف کیا تھا کہ اسے دھونند اور مکیش نے ایک سازش کے تحت قتل کرنے کا خفیہ پلان بنایا تھا۔ ان کا

پلان یہ تھا کہ وہ سنتو کو کمرے میں بند کر کے اسے باہر سے آگ لگا کر مار دیتے ہیں اور بظاہر یہ مشہور کر دیتے ہیں کہ اسے رسوئی میں موجود نادیدہ چڑیل اور جن کے بچے نے جلایا ہے اور دیپا نے پلان کے مطابق یہ کرنا تھا کہ اپنے پاؤں میں کیمیکل کی مدد سے مصنوعی جلنے کا زخم بنا لیتی۔ جیسا کہ بعض پیشہ ور فقیر اپنے بازوؤں، پیروں ہاتھوں میں ایسا جعلی زخم بنا لیتے ہیں جس کو دیکھ کر اصلی جلے یا پھوڑے کے زخم کا گمان ہوتا ہے۔ اسے عام فقیری زبان میں نتھا کہتے ہیں اور اسے دیکھ کر کراہت محسوس ہوتی ہے۔ اگر ہم تفتیشی تھانے والے سنتو کو اپنی تحویل میں نہ لیتے تو یہ پتھر دل قاتل اس بڑھیا کو بھی نگل جاتے''۔

انسپکٹر نے بیڑی کا طویل کش لینے کے بعد کہا۔

''ہمارے اس ایک کامیاب پلان کے پیچھے ہمارا یہ دوسرا پلان بھی کامیاب ہو گیا کہ اس بہانے اس واردات میں ملوث ہمارے مطلوب ملزمان خود ہی شکار ہونے کے لئے کے لئے تھانہ کے جال میں آ کر پھنس گئے۔ دیکھیے یہ پلان میرے ذہن میں دھوندند کے یار نافہ بابا نے ڈالا تھا''۔

''ماتا جی! میں آپ کے بیٹوں کی طرح ہوں''۔ پھر بھیم سنگھ سنتو سے مخاطب ہوا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں نے جو کچھ بھی آپ کے سامنے زم گرم زبانی گستاخی کی تھی اس کا سبب میری ڈیوٹی کی مجبوری تھی''۔

''ارے بیٹا! تم نے جو کچھ بھی کیا ہماری بھلائی کے لئے کیا''۔ سنتو تائی نے روتے ہوئے کہا۔ ''بھگوان تمہیں اس کا بدلہ دے''۔

تیسرے تھانیدار نے سرخ نگاہوں سے سوچوں کے سمندر میں ڈوبی دیپا اور مرغا بنے مکیش کو دیکھا اور انہیں غلیظ گالیوں سے نوازتے ہوئے حکم دیا کہ قریب آ جائیں۔ دیپا ابھی تک اپنی نگاہیں شرمندگی کی وجہ سے زمین پر گاڑے ہوئی تھی۔

''اپنے دیدے اوپر کر کے افسروں سے نگاہیں ملا کر ان کے سوالات کا درست جواب دے حرافہ!'' دیپا پر مامور ایک خرانٹ لیڈی حوالدار نے اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا جبکہ دوسری لیڈی پولیس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کو اس کے پیٹ میں گھسیڑنا شروع کر دیا۔ دیپا اذیت کے مارے جل بن مچھلی کی مانند تڑپنے لگی۔

''زبان تالو سے کیوں لگ گئی ہے کتیا!'' دوسری لیڈی کانسٹیبل نے غرا کر کہا۔ ''جلدی بک ورنہ میں یہ ڈنڈا پیٹ میں گھسا کر کمر سے نکال دوں گی''۔

انسپکٹر پونم جو بڑے تحمل سے ہونٹوں میں بیڑی لگائے اپنی کرسی پر بیٹھا یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا اس نے کافی دیر بعد اذیت اور کرب سے تڑپتی دیپا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بی بی! تمہارے سامنے پیش کیے گئے تمام ثبوت و واقعات اور سب سے بڑھ کر تمہارے یار مکیش کے بیان سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ تم اور تمہارا یار ان کلدیپ اور نوتن کے قتل میں ملوث ہیں۔ اب تم اگر اپنے منہ سے ہمارے سامنے اپنا اقبالی بیان دو گی تو یہ ہی تمہارے لئے بہتر ہوگا اور اگر تم نے اپنے جرائم کا یہاں اقرار نہ کیا تو تم کو یہ بخوبی اندازہ ہونا چاہئے کہ سی آئی ڈی تھانہ کے ریمانڈ روم میں سخت ڈھیٹ اور عادی مجرموں کو لوہے کی طرح پگھلایا جاتا ہے اور مکیش میں یہ بات نہ صرف تیری پتری کے لئے کہہ رہا ہوں بلکہ تیرے کانوں میں بھی بھاشن انڈیل رہا ہوں۔ اب تم باپ بیٹی کی مرضی ہے آرام سے بیان دو گے یا پھر ہم اگلوا لیں؟''

''مجھے پانی پلا دو''۔ دیپا نے لرزتے ہوئے لہجہ میں ہلکی سی زبان کھولی۔

''دیپا اور مکیش کو چھوڑ دو اور ان کے لئے دو کرسیاں لاؤ''۔ تھانیدار پونم نے تھانے کے خدمتگار کو کہا۔ ''اور دو

کپ کڑک سی چائے لاؤ''۔

انسپکٹر نے اپنے ہاتھوں سے میز پر پڑے علیحدہ علیحدہ دو گلاسوں میں پانی ڈالا اور دیپا اور مکیش کو دینے کے بعد بڑے تحمل سے ان کو یہ سمجھانے لگا کہ اب تم آرام سے چائے پیو اور سکون سے اس واردات کے بارے میں ہمیں بتاؤ۔ نیز پونم نے انہیں باور کرایا کہ اگر انہوں نے تفتیشی ٹیم کے ساتھ تعاون کیا تو وہ ان کے خلاف کٹنے والے پرچے میں نہ صرف نرمی برتے گا بلکہ تھانہ میں مزید تشدد نہیں کرے گا۔

''کون سے برانڈ کی بیڑی پیتے ہو مکیش جی؟'' تیسرے تھانیدار نے مصنوعی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی راونڈ برانڈ کی''۔ مکیش نے سہمے ہوئے لیکن طلب زدہ لہجہ میں کہا۔

تیسرے تھانیدار نے اپنی جیب سے خدمتگار کے ذریعہ اس کی پسندیدہ برانڈ کی بیڑی منگوا کر دی۔

انسپکٹر پونم نے دونوں باپ بیٹی کو بڑے اطمینان سے پندرہ منٹ تک چائے، بیت الخلاء جانے، پانی اور مکیش کو بیڑی پینے کا موقع فراہم کیا۔ اس دوران وہ دونوں سے اِدھر اُدھر کی، اُن کے گاؤں کی زندگی وغیرہ کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ تھانیدار پونم نے جب یہ محسوس کیا کہ دونوں کے اندر سے کسی حد تک خوف کم ہو کر ان کے اعصاب ہموار ہو گئے ہیں تو بڑے پریم سے چکارتے پہلے دیپا کو کہا کہ وہ اپنا بیان ریکارڈ کروائے۔

دیپا نے خاصی تفصیل سے بیان دیا۔ یہ بیان بڑے 13 صفحات پر مشتمل تھا جس کا لب لباب یہ تھا۔

''میرا پتا ہم لوگوں کو لے کر لاسا گاؤں میں چھ سال قبل ہی ''تونا'' گاؤں سے نقل مکانی کر کے آیا تھا۔ ہم لوگ نسل در نسل نوسر باز اور لٹیرے، وارد تیے ہیں۔ ہمارا فقیر حال پریوار بنیادی ضروریات سے محروم پسماندہ گاؤں لاسا میں ایک عجیب کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ میرے پتا ایک معمولی سی کریانہ کی دکان چلاتے تھے۔ دوسری جانب میرے دونوں بھائی جونم، پونم بھی ہڈ حرام اور کسی بھی کام کا کشٹ اٹھائے بغیر اپنی زندگی کو گزارنے کے عادی تھے۔ یہ دونوں شہر کے پوش علاقہ جات میں جا کر مالدار لوگوں سے نوسر بازی، جھوٹ فریب کے ذریعہ ان سے پیسے اینٹھتے اور یہ اس کام کو اکیلے نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے دھیرے دھیرے اپنا نوسر بازوں، لٹیروں کا گروہ بنایا ہوا تھا۔

میرے ماتا پتا کو ان کے کرتوتوں اور آمدنی کے ذرائع کا بخوبی علم تھا، وہ نہ صرف میرے ان دونوں بھائیوں کی کمائی کھاتے بلکہ ان کی اس ناجائز آمدنی والے کاموں کی حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے اور زندگی یونہی گزر رہی تھی۔

ایک دن میرے بے غیرت بھائی جونم نے پتا کو یہ بات کہی کہ پتا جی ایک طرف تو ہمارا، دھیان بالکل بھی نہیں گیا۔ پتا جی نے جونم سے پُرتجسس ہو کر پوچھا۔ کیسا دھیان؟ جونم نے جواباً کہا۔

''پتا جی ہماری بہن اتنی خوبصورت دلکش رنگت، نقش و نگار کی مالک ہے، ہم اس کی بدولت اپنی آمدنی کو کئی گنا اوپر کی جانب لے جاسکتے ہیں''۔

''چپ کر کنجر، یہ تو کنجروں والا کام ہے''۔ پتا نے اس پر برہمی کا اظہار کیا۔

''پتا جی! ہم نے کون سا بھگوان معاف کرے کنجروں والا پیشہ کروانا ہے''۔ جونم نے کہا۔ ''اس نے صرف اتنا کرنا ہے کہ شہر کے مالدار علاقوں میں بن سنور کر جانا ہے اور وہاں کے مالدار چھوکروں کو اپنی ادائیں دکھا کر لوٹنا ہے۔ ویسے بھی ہم نے اس کی سگائی کرنی ہے تو کیوں نہ یہ اپنے اور ہمارے مستقبل کے لئے شہر کے کسی دولتمند پریوار کے چھوکرے کو پھنسائے''۔

''ہاں، تُو کہتا تو ٹھیک ہے''۔ پتا جی کے دماغ میں میرے لالچی اور بے غیرت بھائی کی یہ کچھ سمائی۔

''ہاں میری پتری تو واقعی حُسن کی دیوی ہے''۔ پتا جی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس ہیرے کو اس گاؤں کے گوبر مانند فقیروں کے پریواروں میں کیوں پھینکوں۔ میں اس کے حُسن کو کیش کرواؤں گا اور پھر میں ہلکا پھلکا میک اپ کر کے شہر کے مالیدار علاقوں اور بڑی مارکیٹوں میں جا کر مالدار مردوں، لڑکوں کے آگے اپنے حُسن کا چارہ پھینک کر انہیں پہلے اپنی محبت کے جال میں پھنساتی اور پھر ان کی جیبیں خالی کروا دیتی تھی۔

میرے حُسن کا شکار زیادہ تر بوڑھے ہوا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے لٹنے کے بعد اپنی شرافت اور عزت کی خاطر صبر کر کے بیٹھ جاتے تھے۔

میری اس پاپ کی کمائی کو ہمارے پورے پریوار نے امرت سمجھ کر استعمال کرتے ہوئے مجھے اپنی آنکھ کا تارا بنایا ہوا تھا۔ میرے پتا، بھائیوں نے میرے ان کارناموں پر بہت حوصلہ شاباش کی تھپکیاں دیں۔

دیپا نے اپنے طویل بیان میں ایک جگہ بتایا تھا کہ ہمارا پریوار گاؤں میں بڑی احتیاط سے اس طرح رہ رہے تھے کہ اس پڑوس میں رہنے والوں کو رتی برابر بھی ہماری نوسربازی، غیر اخلاقی حرکات وسکنات کی خبر نہ تھی۔ پتا صرف دکھاوے کے لئے گاؤں میں کریانے کی دکان کرتے تھے۔

کلدیپ کی خراب اور میری شبھ گھڑی کا آغاز اس وقت ہوا جب ایک دن وہ اتفاق سے مجھے اپنے ایک دوست کے ہمراہ ملا۔ میں اس کے قریب سے دل لبھانے والی مسکراہٹ اچھالتے ہوئے گزری تھی۔ اس نے میری جانب سے پھینکی گئی مسکراہٹ کا چارہ نگل لیا تھا۔ میری اس پہلی کامیابی کے بعد مجھے دوسری کامیابی اس لمحے ملی جب کلدیپ نے میرا بازار میں پیچھا کرنا شروع کر دیا اور میں نے اسے ایسا کرنے دیا۔

وہ خلاف توقع میرے عشق کا زیادہ ہی جنونی نکلا۔ میرے دونوں بھائیوں نے جب کلدیپ کی تحقیق کی تو ہم چال بازوں کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ کلدیپ ایک کھاتے پیتے بڑی حویلی اور کئی دکانوں کے مالک سیٹھ لالہ جی کا بیٹا ہے۔ دوسری جانب میں نے اس کی شخصیت میں یہ خوبی دیکھی تھی کہ یہ سطحی سوچ وسمجھ کا حامل اور زن مرید اور لائی لگ تھا یعنی ہر بات پر بغیر سوچے سمجھے جلدی سے عمل کرنے والا۔ یہ ہم اٹھائی گیروں اور نوسربازوں کے لئے بہت آسان اور قیمتی شکار تھا۔ میں نے جب اپنے پریوار کو اس کے بارے میں بتایا تو میرے پتا اور بھائیوں نے سوگند کھائی کہ ہر قیمت پر میرے حُسن کی سیڑھی پر چڑھ کر اس حویلی کی بلندیوں کو چھوئیں گے۔ اس کام کو سرانجام دینے کی ساری پلاننگ کے پیچھے مرکزی ہاتھ اور سوچ دھونند کی تھی جو کہ میرے پتا کا مشیر خاص ہونے کے ساتھ گہرا دوست بھی تھا۔ اسی نے میرے بھائیوں اور پتا کو مشورہ دیا تھا کہ دیپا کو لالہ جی کی حویلی میں دیمک کی مانند گھسا کر دھیرے دھیرے اور خموشی سے پوری حویلی کی ملکیت کو حاصل کیا جائے اور اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کے لئے میرے تمام پریوار، دھونند، نکھپال نے طویل پلاننگ کی تھی۔ ہم لوگوں کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ لالہ جی کی قیمتی حویلی پر اس کے بھائی شنکر دیال اور ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے متعدد مقدمات لگے ہوئے ہیں اور یہ لوگ توہم پرست، جادوٹونہ عملیات اور پُراسرار مخلوق پر قوی یقین رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس ساری صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہم سب نوسربازوں نے ایک طویل منصوبہ تیار کر لیا۔

حویلی کی رسوئی میں بوڑھی چڑیل اور بچہ جن کی موجودگی کا احساس اور اس کی چوکھٹ پر لگنے والی پُراسرار آگ اور ناگوار بدبو یہ سب کچھ حویلی کے باسیوں کے

دلوں میں خوف، بددلی، بے چینی پیدا کرنے کے لئے کیا جاتا تھا۔ رسوئی کی چوکھٹ میں جو اچانک نیلے رنگ کا پُراسرار شعلہ ابھرتا تھا وہ واقعی فلموں میں استعمال ہونے والا مصنوعی آگ پیدا کرنے والا کیمیکل ہوتا تھا جسے میں یہ تماشا دکھانے سے پہلے رسوئی یا مطلوبہ جگہ پر چند منٹ پہلے چھڑک دیتی تھی۔ یہ محلول کی صورت میں ہوتا تھا اس کو جیسے جیسے ہوا لگتی اس میں آگ لگ جاتی اور چند لمحوں بعد بجھ جاتی اور اسی طرح حویلی کے کمروں کی الماریوں سے جو پیسے غائب ہو جاتے تھے۔ وہ میری ہی حرکت تھی۔

”پھر میں نے ایک وار اور کیا اور اپنے مقصد کی تکمیل کو آسان بنانے کے لئے نوجوان اور ناسمجھ مانا کو اپنے حُسن کے جلوے دکھا کر ورغلایا اور دیور بھابی جیسے مقدس رشتہ کو پامال کیا تھا۔ لوگوں کی نگاہ میں وہ میرے لئے چھوٹے بھائی کی طرح تھا لیکن اندرون خانہ ہم دونوں رشتوں کے تقدس کو روند کر پاپ کا کھیل کھیل رہے تھے۔ میں نے مانا کو کہہ رکھا تھا کہ تم نے اگر مجھ سے جسمانی راحت حاصل کرنی ہے تو جیسا میں کہوں تم کو ویسا ہی کرنا ہے۔

وہ کچے ذہن اور نوخیز جذباتی جوانی کا حامل لڑکا تھا۔ میں نے اسے اپنے مذموم مقاصد کے لئے آخری حد تک استعمال کیا۔ میں نے ہی اسے سمجھایا تھا کہ ہم دونوں نے اپنے اوپر جادوئی اثرات کے ہونے کا اور رسوئی میں کالی چڑیل اور جن کے بچے کے نظارے کا جھوٹا ڈرامہ کرنا ہے۔ دھونند نے جب ہم دونوں کے جسم سے پُراسرار مخلوق کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے مصنوعی جلتے پانی کی بالٹی میں کھڑا کیا تھا وہ ہم تینوں یعنی میرا، مانا اور دھونند کا رچایا ڈرامہ تھا۔

دیپا نے تفتیشی ٹیم کے سامنے کئی دل ہلا دینے والے بھیانک انکشافات کئے۔ اس نے بتایا کہ میں نے اپنے بھائی جونم اور پتا مکیش کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مانا کو چرس کی سگریٹ لگوائی تھی۔ میرا بھائی اس کے لئے چرس کا بندوبست کیا کرتا تھا۔ کلدیپ کو جان سے مارنے میں مانا کا برابر کا ہاتھ تھا۔ کلدیپ اور نوتن کو اپنی راہ سے ہٹانے کے بعد اب ہم نے جلد ہی اس آخری کانٹے مانا کو ہٹانا تھا اور اسے کیمیکل گیس کے ذریعہ مارنے کا ارادہ تھا۔ ہمارے جرائم سے پردہ نہ اٹھتا تو اگلے چند روز میں مانا کا کام تمام ہو جانا تھا۔

انسپکٹر بھیم سنگھ نے اس سے پوچھا کہ تم نے نوتن کو کیسے قتل کیا تو دیپا نے اپنے اقبالی بیان میں یہ انکشاف کیا کہ نوتن کو رات کو پینے والے دودھ کے گلاس میں تھوڑی سی مقدار ایک کیمیکل ملا دیا کرتی تھی تاکہ یہ کیمیکل اس کے پھیپھڑوں میں جم کر اس کو پھیپھڑوں کا مریض بنا دے اور میں اس کام میں کامیاب ہوئی۔ نیز میں اس کی دوائیوں میں ”گلشن“ ڈالا کرتی تھی۔ (ہلکے زہر کی جڑی بوٹی کا محلول جو کہ انسانی گوشت کو بڑے چپکے سے گلاتا تھا)۔

دیپا نے تفتیشی ٹیم کے سامنے یہ بھی اقرار کیا کہ اس نے ہی نوتن اور میرے (راوی ستار عباسی) کے درمیان عشق کی جھوٹی افواہیں اڑا کر لالہ اور عظیم کی فیملیوں کے درمیان بدگمانیوں کی دراڑیں پیدا کی تھیں۔

اپنے طویل بیان کے آخری حصے میں اس نے کلدیپ کو کیوں اور کیسے مارا کا انکشاف کیا۔ بقول اس کے۔

مجھے اوّل دن سے ہی کلدیپ بحیثیت پتی ذرا بھی نہ بھایا تھا۔ مجھے صرف اس کی دولت اور حویلی پر ہاتھ صاف کرنا تھا۔ میں نے اسے اپنی پُرفریب محبت کے جال میں اس طریقہ سے پھنسایا ہوا تھا کہ اسے نہ صرف میری محبت پر یقین کامل تھا بلکہ وہ میرا اتنا دم بھرتا جیسا میں کہتی وہ ہر قیمت پر ایسا ہی کرتا تھا۔ میں نے ہی اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی تھی کہ وہ لالہ جی کی تجوری سے

روپے اور زیور چرا کر میرے پاس آ جائے۔ کلدیپ واقعی لاسا گاؤں آیا تھا اور ہم نے اسے وہیں جان سے مار کر اس کی لاش تھنسی گاؤں کے شروعات کے دلدلی علاقہ میں ٹھکانے لگائی تھی۔

گاؤں میں ہم لوگوں کو یہ یقین نہ تھا کہ کلدیپ اپنے پتا کی تجوری میں سے ناوہ اور پیلا (روپے اور سونے) کو چوری کر کے یہاں چلا آئے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں شدید بارشوں کی وجہ سے ہمارے گاؤں سمیت کئی دیہاتوں میں تین سے چار فٹ تک باڑ آئی ہوئی تھی۔

لاسا گاؤں کے تمام باسی اپنے اپنے شکستہ، نیم شکستہ گھروں کی محفوظ جگہوں میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ ظاہر ہے ان میں ہمارا خاندان بھی اپنے شکستہ گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ امید یہ کی جا رہی تھی کہ ایک آدھ دن میں یہ سیلابی پانی اتر جائے گا اور گاؤں کی زندگی معمول پر آ جائے گی۔

ایک دن میں ماتا کے بستر میں اس کی جوانی کو [illegible] رہی تھی کہ جونم نے مجھے اطلاع دی کہ کلدیپ آ گیا ہے۔ اس کی خلاف توقع اچانک آمد ہمارے پریوار کے لئے ناقابل یقین تھی۔

میں نے فوراً ماتا کو کہا کہ تو بے سدھ گہری نیند کا ناٹک کر میں اسے سنبھالتی ہوں۔ کلدیپ کی حالت بڑی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ کیچڑ میں لتھڑے ہونے کی وجہ سے وہ بالکل بھوت کی مانند نظر آ رہا تھا۔ میں اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے اس سے لپٹ کر بولی۔

"جانی! تم اس شدید باڑ کو کیسے پار کر کے آ گئے؟ مجھے پکا وشواس تھا کہ ہمارا پیار امر اور کھرا ہے"۔

خلاف توقع اس نے پہلے ایک جھٹکے سے مجھے بری طرح اپنے وجود سے دور دھکیلا اور پھر اپنے نیفے سے ناوا، پیلے (روپے اور سونا) زیور کی پوٹلی نکال کر میری جانب پھینکتے ہوئے کہا۔

"لے ناگن اس خزانہ کو سنبھال"۔

میں ایک لمحے کو، ٹھٹکی اور اسی حالت میں اس سے پوچھا۔ "کلدیپ یہ تم کیسی بہکی بہکی گھٹیا سی باتیں کر رہے ہو"۔

"تو ایک خوبصورت ناگن ہے جو اپنے حسین جسم کے اندر پوشیدہ خطرناک زہر سے میرے پورے پریوار کی خوشیوں کو ڈس گئی ہے۔ مجھ عقل کے اندھے کو تمہارے گاؤں میں آ کر تمہاری شرافت کے پیچھے چھپے بدکردار چہرے نظر آ گئے ہیں۔

میرے دونوں بھائی اور پتا بھی وہاں ذرا [illegible] میں آ گئے۔ "کیا ہوا داماد جی! ارے تم یہاں کیسے پہنچے؟ یہاں تو دور دور تک گھٹنوں گھٹنوں دلدلی پانی کھڑا ہے"۔ میرے پتا نے اس سے بناوٹی تجسس سے پوچھا۔

"آج مجھے تم لوگوں کی اصلیت کا علم ہو گیا ہے"۔ کلدیپ نے غصے میں کھولتے ہوئے کہا۔ "تم سمیت تمہارا پورا پریوار فراڈیا اور نوسرباز ہے"۔

"ارے داماد جی! یہ کیا نشہ میں اول فول بک رہے ہو؟" پتا جی نے مکاری سے کام لیتے ہوئے بونم سے کہا۔ "چلو بھئی، کلدیپ بیٹے کا نشہ اتارنے کے لئے اسے اچار کھلاؤ تاکہ اس کا دماغ ٹھکانے آئے۔ لگتا ہے کمبخت گاؤں کے اوباشوں نے اسے بھنگ پلا دی ہے"۔

"میں نشہ میں نہیں ہوں"۔ کلدیپ نے کہا۔ "میں تو اب ہوش میں آیا ہوں۔ میں مانتا ہوں میں اس سے پہلے عقل کا اندھا تھا، تمہاری بیٹی نے میری عقل پر اپنے حسن کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ اب یہ پردہ ہٹ گیا ہے۔ آج ہی تو مجھے ہوش آیا ہے۔ [illegible] او بھگوان مجھے معاف کرنا یہ میں نے کتنا مہا پاپ کر دیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو دلدل میں پھنسا لیا ہے۔ میں نے تم جیسے بدقماشوں انتہائی گیروں سے ناطہ جوڑ لیا اور دوسرے اپنے پتا، ماتا کا دل دکھا کر ان کی گستاخی کا مرتکب ہوا ہوں۔ پیچھے میرے

ماتا پتا مجھے کوس رہے ہوں گے۔ میں تو ان کی ساری جمع پونجی بھی چرا لایا ہوں''۔ کلدیپ سینہ کوٹتے، روتے ہوئے واویلا کرنے لگا۔

''اچھا جیجا جی!'' جونم نے چکارتے ہوئے اسے کہا۔''جو کچھ بھی آپ نے ہمارے بارے میں کہیں سے جھوٹ سنا آپ ہمیں آرام سے بیٹھ کر بتلائیں۔ کچھ اپنی سنائیں اور کچھ ہماری سنیں''۔ بڑی مشکل سے بپھرے ہوئے کلدیپ کو بہلا پھسلا کر اندر کمرے میں لایا گیا۔ مانا جو بستر پر گہری نیند سونے کی ایکٹنگ کر رہا تھا وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور وہ بڑی ڈرامائی انداز میں اس سے لپٹ کر بولا۔

''بھائی! مجھے معاف کر دو میں خواہ مخواہ بھابی کی محبت میں ان کے ساتھ اپنے ماتا پتا کو چھوڑ کر گاؤں آ گیا تھا۔ بھائی! تم یہاں کیسے پہنچے؟''

کلدیپ نے سینے سے چمٹے مانا کو دھتکار کر پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

''کمینے حرام خور تُو بھی ان بدمعاشوں کے ٹولے کا حصہ بن گیا ہے۔ تھو تھو، چھی چھی لعنت ہے تجھ پر جو تُو اپنے ہی گھر کو اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کرنے والوں کے ساتھ مل گیا ہے''۔

''بھیا! لگتا ہے تم پر بھی حویلی کے اندر موجود بری چیزوں کا اثر ہو گیا ہے، اسی لئے تم یہ پاگلوں والی باتیں کر رہے ہو''۔ مانا نے روتے ہوئے کہا۔

کلدیپ نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گالوں پر مارتے ہوئے کہا۔''میرا دل کرتا ہے تیری شکل میں چھپے گھر میں موجود سنپولیے کو جان سے مار دوں لیکن نہیں میں پہلے ان بدمعاشوں کے ٹولے سے نمٹ لوں''۔

''اچھا، لو یہ لسی پیو اور شانتی سے بات کرو۔ چلو بے شک غصہ سے لیکن دھیرے دھیرے ہمیں وہ بات بتاؤ جو اچانک تمہارے دل میں ہمارے لئے بدگمانی کا باعث بن رہی ہے''۔ پتا جی نے اس کی چاپلوسی کرتے ہوئے کہا۔

مختصر یہ کہ کلدیپ پر پتا کی چکنی چپڑی باتوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ وہ کرسی پر بیٹھ کر شانت ہوا۔

''ہاں، بھئی داماد جی! اتنے تیخ پا ہو کر اپنی پتنی سمیت ہمارے پورے پریوار پر اتنے بڑے الزامات کیوں لگا رہے ہو؟'' پتا جی نے پوچھا۔

''میں الزام نہیں لگا رہا کمینو!'' کلدیپ نے بھڑک کر کہا۔''میں جن لوگوں سے تم سب کی حقیقت سن کر آ رہا ہوں انہوں نے تمہارے پریوار کے سارے کالے کرتوتوں کا بھید کھول دیا ہے''۔

''ابے کافی دیر سے میں تیری الٹی سیدھی بکواس سن رہا ہوں''۔ جونم نے تنگ آ کر کہا۔''ہم لوگ ایک تو تجھے سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں اور ایک تو ہے ہم پر آگ بن کر برسے جا رہا ہے۔ تُو نے ابھی تک ہمیں یہ نہیں بتایا کہ کس نے تجھے ہمارے خلاف تیری ناک کے نیچے دھواں دیا ہے؟''

کلدیپ نے آتش نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور مجھ سے طنزیہ انداز میں پوچھا کہ تم کسی راکھیندر نامی لڑکے کو جانتی ہو؟

''ہاں''۔ جونم کے منہ سے اچانک نکلا تو میں نے بجلی کی مانند اس کے جملے کی نفی کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، ہم کسی راکھیندر کو نہیں جانتے۔ یہ کون ہے؟'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔

''میں تم سے اس سوال کا جواب مانگ رہا ہوں''۔ کلدیپ نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور تم الٹا مجھ سے اس کے بارے میں استفسار کر رہی ہو''۔

کلدیپ کی اس بات سے میرے تو کیا میرے پورے پریوار کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

''بھائی ''ہاں'' کہتا ہے اور بہن ''ناں''۔ کلدیپ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دیکھا تم لوگوں کے دلوں میں چور اور بیانات میں تضاد ہے''۔

''اچھا اس بات کا فیصلہ بعد میں کرلیں گے کہ ہم کسی راکھیندر کو جانتے ہیں کہ نہیں''۔ پتا جی نے کہا۔ ''لیکن داماد جی! ہمیں یہ تو بتاؤ وہ تمہیں کہاں ملا اور اس نے ہمارے بارے میں آپ کے کان کیسے بھرے؟''

آخر کلدیپ نے کہنا شروع کیا۔

''میں جب حویلی سے سب روپے اور زیور چرا کر تیری جانب آرہا تھا تو مجھے بس اڈے پر ایک شخص نے بتایا کہ باڑ کی وجہ سے وہاں جانا ناممکن ہے لیکن تم تھنس گاؤں کی طرف سے لاسا جانے والی سڑک سے چلے جاؤ۔ اس شخص نے مجھے اس پکی سڑک کی نشاندہی بھی کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس واحد راستہ سے گوالے اپنا دودھ ریڑوں اور بیل گاڑیوں کے ذریعہ لے کر آتے ہیں۔

میں بڑی مشکلوں سے گزر کر تھنس گاؤں پہنچا تو وہاں حدِ نگاہ تک پورا علاقہ پانی کی لپیٹ میں تھا۔ میں تھنس گاؤں کے اس واحد سڑک کے کنارے پر بیٹھ گیا جو لاسا گاؤں کی جانب جاتی تھی۔ وہاں کافی دیر تک کسی سواری، بیل گاڑی یا چھکڑے کا بے صبری سے انتظار کرتا رہا۔ بالآخر دور سے ایک گوالا چھکڑے پر آتا نظر آیا۔ میں نے اسے ہاتھ دے کر روکا وہ رک گیا۔

''کہاں جانا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اسے کہا کہ بھائی مجھے لاسا گاؤں جانا ہے۔

''بھئی راستہ بڑا خراب ہے اور دوسرے تم دیکھ نہیں رہے کہ میرے پاس دودھ کا کتنا وزن ہے۔ میں تمہیں کیسے لے جاؤں گا؟''

''میرا وہاں جانا ضروری ہے بھائی!'' میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھ پر رحم کرو''۔

اس نے ایک لمحے کو میرے چہرے کی جانب بغور دیکھ کر مجھ سے پوچھا تو نے وہاں کس کے پاس جانا ہے۔ میں وہاں سب کو جانتا ہوں۔ میں نے ڈھیلا سا منہ بنا کر کہا کہ میں نے جونم، بونم کے گھر جانا ہے۔ میرے منہ سے یہ جملہ نکلا تو وہ فوراً چھکڑے سے نیچے اترا اور میرے قریب آ کر مجھ سے گلے ملتے ہوئے کہا۔ اوہو! تم کلدیش کے داماد جی ہو۔

''ہاں، ہاں آپ انہیں جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے جانتا ہوں، میں تو ان کے کھانے اور دکھانے کے دانتوں کو بھی جانتا ہوں''۔

''جی! میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا''۔

''تو مجھ سے فی الحال اس سوال کا جواب نہ پوچھ۔ بس چھکڑے پر بیٹھنے کی کر''۔ میں اچک کر چھکڑے پر بیٹھ گیا اور اس نے چھکڑا آگے بڑھا دیا۔

''کلدیپ تجھے میرے ساتھ راستہ میں کئی جگہ اترنا اور چھکڑے کو کھینچنا پڑے گا''۔

''تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ارے بیوقوف میں تجھے، اور تیرے پتا لالہ جی کو بھی جانتا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''میرا نام راکھیندر ہے اور میں لاسا کے ہر بڑے چھوٹے کو جانتا ہوں''۔ دلدلی راستہ میں کئی جگہ ہم نے مل کر پھنسے چھکڑے کو دھکیل کر کیچڑ سے نکالا۔ وہ مجھے لاسا گاؤں کی حدود کے ایک ڈیرے میں لے کر گیا جہاں بہت سے لفنگے قسم کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

''اے راکھیندر تو شدید باڑ سے کیسے گزر کر آیا ہے؟'' ایک آدمی نے اس سے پوچھا۔ ''اور یہ تیرے ساتھ کون ہے؟''

''ہاں، بے یہ کون ہے؟ ڈیرے میں بیٹھے ایک اور

غنضفر نے اس سے پوچھا۔

''ارے یہ ہمارے گاؤں کا داماد، دیپا بیگم کا پتی ہے''۔ اس نے بتایا۔

''اس کا کون سا نمبر ہے؟ اس کے تو کئی خصم ہیں''۔ وہاں بیٹھے ایک بھاری بھرکم بدمعاش نے منہ سے بیڑی کا گہرا دھواں نکالتے ہوئے بڑے طنزیہ طور پر کہا۔

اس کی اس بات سے اتنا طیش پا ہوا کہ میں نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اس بدمعاش نے مجھ سے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے وہاں موجود دیگر بدمعاشوں کو مخاطب ہو کر کہا۔

''اس کا طیش بتا رہا ہے کہ یہ واقعی غیرت مند اور شریف انسان ہے لیکن بیچارہ کنجروں، نوسر باز لٹیروں کے جال میں پھنس گیا ہے''۔

''راکھیندر! میں تو اپنی پتنی کے پاس جانا ہے''۔ میں نے راکھیندر سے کہا۔ ''یہ تم مجھے کس گھٹیا ماحول میں لے آئے ہو؟''

کلدیپ! ذرا ٹھنڈے دماغ سے ایک کونے میں آ کر اپنے فائدے کی بات سن''۔ راکھیندر نے مجھ سے کہا اور مجھے ایک کونے میں لے گیا۔

''تم نے ڈیرے کے اس آدمی کی جو کڑوی باتیں سنی ہیں وہ دراصل حقیقت پر مبنی ہیں''۔ راکھیندر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ارے بیوقوف تیری یہ سوچ کسی حد تک درست ہے کہ ہمارا یہ ڈیرا بھی بدمعاشوں، نوسر بازوں، لٹیروں کا مجموعہ ہے لیکن تُو اگر بظاہر پاوتر گنگا نہائے سسرال کے اصل روپ سنے اور دیکھے گا تو تیرے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ تجھے شاید میری باتوں کا یقین نہیں آئے گا اور تُو سمجھے گا کہ میں تجھے بھڑکا رہا ہوں۔ اس لئے میں تجھے تیرے سسرالیوں کے کالے کرتوتوں کے کچھ ثبوت دکھاتا ہوں''۔

یہ کہہ کر راکھیندر نے ڈیرے میں موجود ایک الماری سے کالے رنگ کی فائل نکال کر میرے ہاتھ میں تھمائی تو اس کے اندر سے تمہارے خاندان کی اصلیت کھل کر سامنے آ گئی۔ میری نگاہوں کے سامنے تیری چند غیر مردوں کے ساتھ قابل اعتراض تصویریں، تیری بداعمالیوں کے ثبوت کی صورت میں موجود تھیں۔

راکھیندر نے مجھے بتایا کہ بعض دفعہ تیری پتنی کے بے غیرت بھائی اور پتا دیپا کو میرے ساتھ شہر کے کھاتے پیتے علاقوں کے سادہ لوگوں کو لوٹنے، لبھانے کے لئے بھیج دیتے تھے۔ اس کے عوض مجھے دیپا نہ صرف لوٹ کے مال سے حصہ دیا کرتی بلکہ کبھی کبھار مجھے جسمانی راحت بھی پہنچایا کرتی تھی۔ پھر دیپا کا ہدف تجھ عقل سے پیدل بیوقوف مرغے کو پھنسانے کا تھا۔ تجھے اپنے چنگل میں پھنسانے میں دیپا کو زیادہ محنت نہ کرنی پڑی۔ دیپا نے کس طریقہ سے تمہارے پریوار کو بیوقوف بنایا دیپا اور تیرے بھائی ماتا کے درمیان جو گندا کھیل چل رہا تھا اس کا لمحہ لمحہ کا مجھے علم تھا۔

راکھیندر نے مجھے کہا کہ تُو میرے ساتھ میرے اس ڈیرے میں کم از کم دو روز رہ۔ میں تجھے اپنی بات کا یقین دلانے کے لئے چند اور خاص لوگوں سے ملواؤں گا۔

کلدیپ نے مجھے قہرناک نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''راکھیندر کے منہ سے تیرے بارے میں نت نئے انکشافات سن سن کر میرے پاؤں سے زمین کھسکتی محسوس ہو رہی تھی۔ بہر حال میں اس کے کہنے کے مطابق اپنے یقین کو پکا کر لینے کی خاطر اس کے ڈیرے میں دو تین روز رکا۔ اس نے میری دل و جان سے سیوا کی۔ ایک نائی کو بلوا کر اس نے وہاں میرے بال کٹوائے اور شیو بنوائی اور وہیں پر اس نے مجھے تین چار ایسے خاص بندوں سے ملوایا جو تیرے پتا اور بھائیوں کے کالے کرتوتوں کو کسی نہ کسی حوالوں سے جانتے تھے۔ انہوں نے بھی گیتا

ہاتھ رکھ کر سوگند کھا کر راکھیندر کی جانب سے کئے گئے تمام انکشافات کی تائید کی۔

بقول دیپا کے۔

کلدیپ جوں جوں ہمارے کالے کرتوتوں کی پرتیں کھولے جا رہا تھا توں توں میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی اور دل کی دھڑکنیں اچھلتی منہ کو آ رہی تھیں۔ اسی دوران میرے پتا نے آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے مصنوعی ہنسی کے ساتھ راکھیندر کی حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی۔

''ارے داماد جی! میرے ذہن میں راکھیندر نام کا ایسا آوارہ نشئی لڑکا آ رہا ہے جسے میں نے کبھی اپنی کریانے کی دکان پر ساٹھ روپے ماہوار پر نوکر رکھا تھا۔ میں نے تو اسے بڑا شریف انسان سمجھ کر اور ترس کھا کر اپنی دکان پر نوکر رکھا تھا لیکن کمبخت میری توقعات اور امیدوں پر پانی پھیر گیا۔ اس بے غیرت نے وہاں بھی ہیرا پھیری کرنی شروع کر دی۔ میں نے اس کے خلاف اسی علاقہ کی پولیس چوکی میں رپورٹ درج کروا کر اسے اور اس کے ٹولہ کے دیگر ساتھیوں کو پکڑوایا تھا۔ انہیں سزا تو نہ ملی لیکن اس کے دل میں میرے اور میرے پریوار کے بارے میں خلش کی آگ بھڑک گئی تھی۔ اب جبکہ وہ تمہیں گاؤں میں بااتفاق مل گیا اور اس نے تمہیں ہمارے بارے میں بھڑکایا ہے۔ وہ سراسر جھوٹ کا پلندہ ہے اور ہم شریف، سفید پوشوں پر بہتان ہے''۔

''جھوٹا وہ نہیں تم ہو''۔ کلدیپ نے گرج کر کہا۔

''مجھے راکھیندر نے دیپا کی جو شرمناک تصویریں دکھائی ہیں وہ جھوٹی ہیں اور وہ سارے لوگ بھی جھوٹے ہیں صرف تو سچا ہے''۔

کلدیپ نے بھڑک کر یہ بات کی۔ میرے پتا کے پاس اس کی صفائی کے لئے کوئی جواب نہ تھا۔ انہوں نے اوٹ پٹانگ باتوں سے رام کرنے کی کوشش کی لیکن لگتا تھا کہ اسے ہمارے بارے میں پکا یقین ہو چکا تھا۔

دوسری جانب کلدیپ نے ماتا کے کندھے پر پڑے میرے لمبے بالوں کی جانب سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہوس کی ماری ذلیل عورت! اپنی آنکھوں سے دیکھ تیری ہوس کی کچھ علامات میرے اس کمینے بھائی کے کندھوں پر پڑی تیری حقیقت بیان کر رہی ہیں''۔

اس نے ہم سب کو اس ثبوت کو دکھا کر لاجواب کر دیا۔ ہم سب وہاں کھڑے ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھنے لگے۔

اچانک ماتا نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا اور کلدیپ کو سنانے کے لئے کہا۔ دیپا بھابی ذرا میری بات سننا۔ میں ماتا کے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔

ماتا نے مجھے کہا۔ ''دیپا جان! اب ہمارے پاس بھائی کے سامنے اپنے کالے کرتوتوں، جرائم کی صفائی میں کچھ نہیں بچا اور نہ ہی اب ہماری جانب سے کیا جانے والا کوئی ڈرامہ اسے یہ یقین دلا سکتا ہے کہ اس نے راکھیندر کی زبانی جو سنا، یا دیکھا ہے وہ جھوٹ ہے۔ لہٰذا اب اسے کسی نہ کسی طریقے سے سنبھالنا پڑے گا''۔

اسی دوران جونم بھی وہاں آ گیا۔

''دیپا یہ تو ہمارا سارا پول ہی کھل گیا ہے۔ اب تو کلدیپ نے واپس جا کر اپنے پریوار اور پولیس میں ہمارے خلاف الزامات کی گرہ کھول دینی ہے اور پھر سمجھو کہ ہم سب پھانسی کی رسیوں میں جھول گئے''۔ جونم نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ''اس سے پہلے یہ غصہ سے بپھرا سانپ ہم سب لوگوں کو اپنے زہر سے ڈسے لہٰذا ہم سب کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کا سر ہمیں کچل کر فارغ کر دیا جائے''۔

''وہ کس طرح ہوگا؟'' ماتا نے اپنی کپکپاتی ٹانگوں سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"میرا تو خیال ہے ماتا اب تُو یہ بھول جا کہ یہ تیرا بھائی ہے"۔ میں نے کہا۔ "اور ویسے بھی آج کے بعد اس کے دل، ذہن سے تیری حیثیت بھائی والی نہیں بلکہ اس کی عزت کے ڈاکو جیسی ہے۔ تُو اگر اجازت دے تو میں اسے "مسا" شراب میں ملا کر پلاؤں"۔ (مسا دراصل ایک قسم کی ایسی زہریلی بوٹی کا زہر بنا ہوتا ہے جو کسی بھی انسان کو دو چار گھنٹوں میں مار دیتا تھا)۔

"نہیں نہیں، وہ میرا بھائی ہے"۔ ماتا نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ "جونم اس مسئلہ کا کوئی اور اوپائے کرو"۔

"اس سمسیا کا اوپائے صرف اور صرف اس کی موت ہے"۔ جونم نے سفاک لہجے میں کہا۔ "اس کی موت ہماری زندگی اور اس کی زندگی ہم سب کی پھانسی ہو گی"۔

ماتا کا ذہن ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ بالآخر اس نے بھی کلدیپ کو مسا کا زہر دینے پر رضامندی اختیار کر لی۔

دیپا نے اپنا بیان دیتے ہوئے کہا۔ ہم نے ماتا کو کہا کہ وہ کلدیپ کو شربت میں مسا پلانے کی کوشش کرے اور جب مسا پینے کے بعد وہ مر جائے گا تو ہم اسے نہاش چندر کی بیل گاڑی میں لاد کر تھنس گاؤں کے اس علاقے میں چھوڑ آئیں گے جو ڈاکوؤں، لٹیروں کی وجہ سے خاصا بدنام تھا۔ اس سے یہ ظاہر اور ثابت کرانا تھا کہ دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہو کہ کلدیپ لاسا گاؤں آنے سے پہلے ہی ڈاکوؤں، راہزنوں کے ہتھے چڑھ گیا۔

الغرض ماتا نے کلدیپ کو شربت میں مسا پلایا۔ کلدیپ نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ نہاش چندر کی بیل گاڑی میں لے جا کر تھنس کی دلدلی جگہ پہنچا کر اس کا سر بُری طرح کچل دیا گیا تاکہ وہاں کی زمین میں اس کا گرا ہوا خون نظر آئے تاکہ یہ ثابت ہو کہ اسے اسی جگہ ڈاکوؤں نے لوٹ کر مارا ہے۔

تفتیشی ٹیم کے سامنے دیپا نے بتایا کہ ہمارا یہ پروگرام تھا کہ کلدیپ کے بعد چند روز بعد کسی نہ کسی طریقہ سے ماتا کو بھی ٹھکانے لگانا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کبھی بھی ہمارے لئے خطرے کی گھنٹی بن سکتا تھا لیکن اس دوران اسے ہر لحاظ سے خوش رکھے ہوئے تھی۔ جونم نے اس کو دی جانے والی چرس کی ڈلی میں ہلکے زہر کی آمیزش شروع کر دی تھی۔

دیپا نے تفتیشی ٹیم کے سامنے تقریباً دو گھنٹے طویل اقبالی بیان قلمبند کروایا تھا۔ اس کے بعد مکیش، جونم، دھونند، نلکتھال وغیرہ نے پولیس کے بغیر تشدد کے اپنے اپنے اقبالی بیانات میں دیپا کے دل ہلانے والے انکشافات کی تائید کی۔

اس کہانی میں مکیش نے چند اہم یہ انکشافات کئے کہ بظاہر نلکتھال نے لالہ جی سے اس کی حویلی کی گیارہ دکانیں خریدیں اور اوپری حصے کی ڈیل کی تھی لیکن درحقیقت اندرون خانہ چار فرنٹ کی دکانیں مکیش کی ہی تھیں جو کہ نلکتھال نے اس کو لالہ کیدارناتھ کو بے وقوف بنانے اور قیمتی جائیداد کا کوڑیوں کے بھاؤ سودا کروانے کے صلے میں دی تھیں۔

دوسرا انکشاف مکیش نے یہ کیا تھا کہ اس نے ہی متعلقہ محکمے کے افسران کو بھاری رشوتیں دے کر لالہ جی کی حویلی کے سیدھے، سلجھے والے معاملات کو بگاڑا تھا۔ جس میں ایک آدھ وکیل وغیرہ کو بھی اس نے خریدا تھا۔

سنتو تائی نے خون کے آنسو روتے ہوئے دیپا اور اس کے تمام خاندان کو کوسنے، لعنت ملامت کرنے کے ساتھ دیپا کے منہ پر تھوکا۔ وہ بیچاری اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی۔

دوسرے روز دیپا، مکیش، جونم، دھونند، ماتا نلکتھال اور مرتیال وغیرہ کو ہتھکڑی ڈال کر لایا گیا۔ جونم کو بعد میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ان تمام ملزمان نے حویلی کے سامنے

کھڑے اہل محلہ اور دیگر لوگوں کے سامنے نہ صرف اپنے جرائم کا اظہار کیا بلکہ انسپکٹر پونم کی ہدایات کے مطابق دھوندو، دیپا، مکیش نے حویلی کی چوکھٹ میں اس کیمیکل والی مصنوعی آگ لگانے کا مظاہرہ بھی کیا جس کے بارے میں ان لوگوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ یہ حویلی میں موجود کسی پُراسرار مخلوق کا کیا دھرا ہے۔ حویلی کے باہر اہل محلہ نے تمام مجرمین پر نہ صرف لعن طعن کیا بلکہ اُن پر جوتیاں برسائیں۔

انسپکٹر پونم نے اس کیس کی بڑی دل جمعی، خلوص نیت کے ساتھ تفتیش کی۔ مزید کئی شواہد اکٹھے کئے۔ اس نے راکھیندر سے مکیش کے کنور سرباز تولہ کے بارے میں معلومات، دستاویزی ثبوت اکٹھے کئے۔ الغرض اس نے بڑا تگڑا چالان بنا کر دیپا، مکیش، جوگم پونم، دھوندو، ننکھپال اور کئی اور ملزمان کے خلاف متعلقہ عدالت میں پیش کیا۔

دوسری جانب ملزمان نے بھی لالہ جی کی لوٹی ہوئی دولت میں سے ہی اپنے دفاع میں شہر کے کئی نامور چوٹی کے وکیل کھڑے کئے۔ ان وکلاء نے ان کی ضمانتیں کروائیں۔ دیپا، مکیش، دھوندو روایتی طور پر عدالتوں میں اپنے اپنے بیانات سے مکر گئے۔ نیز انہوں نے رشوت خور عدالتی اہلکاروں، ججوں پر بے دریغ روپیہ پیسہ پھینکا اور کئی حربے آزمائے انہوں نے اس کیس کو نہ صرف غیر ضروری طوالت دلوائی بلکہ کئی اہم شواہد و دستاویزات کو غائب کروا دیا۔

کلدیپ کا چچا شنکر دیال اور اس کے دونوں بیٹے لالہ جی اور سنتو کو اپنے گھر لے گئے انہوں نے دل و جان سے دونوں کی بہت خدمت کی لیکن لالہ جی دماغی طور پر بالکل مفلوج ہو گیا تھا جبکہ سنتو چند ہفتوں بعد ہسپتال میں مر گئی۔ لالہ کیدار ناتھ نے طویل عمر پائی وہ 1968ء میں مرا تھا۔

شنکر دیال، ابا اور انسپکٹر پونم وغیرہ نے اس کیس کی دل و جان سے پیروی کی۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت نے دیپا کو عمر قید، ماتا کو سزائے موت، مکیش کو عمر قید، جوگم پونم کو دس دس سال قید کی سزائیں سنائیں۔ (دیگر کرداروں کو واجبی سزائیں ہوئیں) ننکھپال نے بعد میں یہ حویلی کسی دوسری پارٹی کو بھاری منافع کے ساتھ فروخت کر دی۔ دیپا کی موت سینٹرل سٹی جیل میں بڑے پُراسرار انداز میں ہوئی وہ ایک روز جیل کے بیت الخلاء میں مردہ پائی گئی۔ اس کے منہ سے اسی قسم کا زہریلا مواد نکل رہا تھا جو کہ کلدیپ کے منہ سے نکل رہا تھا۔ اس کے بارے میں پولیس اتھارٹی کو یہ نہ پتا چل سکا کہ آیا کہ اسے زہر دیا گیا تھا یا اس نے خودکشی کی تھی۔ ماتا کو بہرحال کچھ عرصہ بعد تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ وہ سزائے موت سے بچ سکتا تھا لیکن اس کے کیس کی کسی نے پیروی نہ کی تھی۔

انسپکٹر پونم نے مجھے محکمہ پولیس میں بطور کانسٹیبل نوکری دلوائی تھی۔ وہ دل کا ہمدرد اور اچھا انسان تھا۔

کلدیپ کی دیپا سے محبت، دیپا کی حویلی میں آمد لالہ کیدار ناتھ کی حویلی کے لئے ایک قسم کی "آ کاس بیل" کی مانند ثابت ہوئی جو اس ہنستی بستی حویلی کی خوشیوں کو چٹ کر گئی۔

ختم شد

تبصرہ نگار: عارف ثمود

یاداں تے تریخ

مصنف : افتخار وڑائچ کالروی

صفحات : 362

قیمت : -/300 روپے

ملنے کا پتہ: متر سانجھ پنجاب- کالرہ دیوان سنگھ، گجرات 0300-6275546

زیرنظر کتاب پنجابی زبان میں محترم افتخار وڑائچ کی پچھلی کتابوں کے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کا موضوع پنجاب کے مختلف قبرستانوں میں پائی جانے والی مشہور شخصیات کی قبروں کے کتبے ہیں۔

کتبہ نویسی ادب کی کوئی نئی اور غیر معروف صنف نہیں ہے۔ دنیا بھر میں ادیب اور قلمکار اپنے وطن میں پائی جانے والی نئی اور پرانی قبروں کے کتبے نقل کر کے اس کو ادب کا حصہ بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں بے شمار لوگوں نے کتبہ نگاری کے ادب میں اپنا حصہ ڈالا ہے مگر اس حوالے سے سرسید احمد خان اور پروفیسر محمد اسلم نے جو حصہ ڈالا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

قبروں پر کتبے نصب کرنے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس سلسلے میں برٹش میوزیم لندن میں ایک ایسا کتبہ محفوظ ہے جو 196 قبل مسیح کا ہے۔ اس کے علاوہ ایک قدیم ترین کتبہ ایتھوپیا کے ایک قدیم قبرستان سے ملا ہے جو ایک بچے کی قبر پر تھا۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہ 33 ملین سال قدیم ہے۔

قبرستانوں میں لگے کتبے ایک تو لواحقین کی محبت و عقیدت ظاہر کرنے اور عبرت کا سامان فراہم کرتے ہیں اور دوسرا یہ مرنے والے کی زندگی کے بارے میں معلومات بھی دیتے ہیں۔ بعض کتبوں سے مرنے والے کے عقائد اور سیاسی نظریات کا اظہار بھی ہوتا ہے اور بعض کتبوں کے پس منظر میں پوری ایک کہانی موجود ہوتی ہے۔

محترم افتخار وڑائچ نے بڑی عرق ریزی سے ان کتبات کی چھان بین کی ہے۔ اس کے لئے انہوں نے پنجاب کے ان گنت قبرستان کھنگال ڈالے۔ انہوں نے نامور شخصیات کے صرف کتبے ہی درج نہیں کئے بلکہ ان شخصیات کی مختصر زندگی کا جائزہ بھی بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ یقیناً یہ کتبہ نویسی میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔

✶+✶

کے ایچ مجاہد

اصلاحِ زبان و بیان

آیئے، درست اُردو بولیں اور لکھیں!

☆ کے ایچ مجاہد

تحریکِ نفاذِ اردو کی سرتوڑ کوششوں کے بعد عدالت نے حکومت کو حکم دیا ہے کہ جلد از جلد ملک میں اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت سے نافذ کیا جائے جس کے جواب میں حکومت نے مرحلہ وار نفاذِ اردو کا وعدہ کیا ہے جس کے تحت اوّلاً آئندہ گریڈ 1 سے 16 تک بھرتی کے لئے امتحانات اور آرڈرز اردو میں ہوں گے جبکہ گریڈ 17 اور اوپر کے لئے سارا نظام انگریزی میں ہی ہوگا۔ گویا فی الحال طبقاتی تفریق کو برقرار رکھا جائے گا۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ 68 سال بعد آغاز تو ہوا! بشرطیکہ یہ وعدہ بھی محض سیاسی ہی ثابت نہ ہوا تو دوسری طرف نرسری تا سوم کلاسز کا نصاب جو اس سال اردو میڈیم کیا گیا ہے اس پر ہماری تعلیمی ترقی کے لئے بھاری عطیات دینے والے غیر ممالک اور ان کی این جی اوز نے سخت برہمی کا اظہار کیا ہے جس سے خدشہ ہے کہ آئندہ سال سے یہ جماعتیں دوبارہ انگلش میڈیم نہ کر دی جائیں۔ بہرحال جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ سرِدست ہم اصلاحِ زبان کے لئے اپنی سی کوشش کر دیکھتے ہیں شاید مستقبل میں اس کا کچھ فائدہ ہو ہی جائے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آغاز میں کچھ اصطلاحات کی وضاحت کر دی جائے جو استعمال تو عموماً ہوتی رہتی ہیں مگر ان میں فرق اور اصل حیثیت سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔ ان میں سے پہلی اصطلاح ہے "غلط العام"۔ یہ ایسے الفاظ یا ان کی املاء اور روزمرہ یا محاورے ہوتے ہیں جو ہوتے تو غلط ہیں لیکن کثرتِ استعمال سے رائج ہو کر درست تسلیم کر لئے جاتے ہیں۔ خصوصاً زبان کی تبدیلی اور ارتقا میں غلط العام کا بڑا کردار ہے۔ مثلاً: تماشہ، تشتری، توتا وغیرہ۔ اب "ت" کی بجائے "ط" سے رائج ہو گئے ہیں اور درست تسلیم کئے جاتے ہیں یعنی طا،

طشتری، طوطا اور وطیرہ۔ اس کے باوجود کچھ ماہرین ان الفاظ کو اب بھی ''ت'' سے ہی لکھتے ہیں کچھ یہی صورت لفظ پانو کی ہے جو اب پاؤں لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح مہندی کا اصل املا مہندی تھا جو پانو کی طرح مشکل تلفظ کے باعث متروک ہوگیا۔ اسی طرح قلفی کا لفظ ہے جو اصل میں تو قفلی ہے مگر اب غلط العام ہو کر قلفی ہی رائج ہو گیا ہے۔ تمغا بھی غلط العام ہے، درست تھا تغما۔ چاروں شانے چت دراصل چاروں خانے چت ہے۔

دوسری اصطلاح ہے غلط العوام۔ یہ ایسے الفاظ یا ان کی املاء اور روزمرہ یا محاورہ ہوتے ہیں جو غلط رائج ہونے کے باوجود غلط ہی سمجھے جاتے ہیں ان کو درست تسلیم نہیں کیا جاتا۔ جیسے منع کا لفظ ہے جو عموماً غلط طور پر مع یا بمعہ لکھا جاتا ہے اسی طرح اہالیان کا لفظ ہے جو کہ اہل کی جمع اہالی کی جمع الجمع ہے اہالیان پاکستان کی بجائے اہل پاکستان درست ہوگا مزید قلفی غلط العام ہے جبکہ کلفی غلط العوام اسی طرح تمغا غلط العام ہے اور تمغہ غلط العوام۔

تیسری اہم اصطلاح ہے شتر گربہ جس کا لفظی مطلب تو ہے اونٹ بلی مگر اصطلاحاً یہ شاعری یا شعر کا ایک عیب ہے۔ مثلاً اگر کسی شعر کے ایک مصرعے میں مخاطب کو آپ اور دوسرے میں تم یعنی ایک میں ادب سے اور دوسرے میں بے تکلفی سے مخاطب کیا گیا ہو تو ایسا شعر شتر گربہ کے عیب سے پُر ہوگا مثلاً

چلیں میری فکر نہ کیجئے مگر اپنا فائدہ سوچیے
تمہیں جس کی چھاؤں عزیز ہے میں اسی درخت کا ہوں ثمر

پہلے مصرعے میں چلیں، کیجئے، سوچیے، احترام کے الفاظ ہیں اور دوسرے مصرعے میں تمہیں، بے تکلفی کے۔

اسی طرح نثر میں ایک ہی سلسلہ کلام میں ایک جملے میں اپنے لئے ہم اور آگے کسی جملے میں ''میں'' استعمال کیا جائے یا اوپر کی مثال کی طرح ایک جملے میں مخاطب کے لئے تم اور آگے کسی جملے میں آپ بولا جائے یا ایک ہی واقعے میں کہیں صیغہ غائب استعمال کیا جائے اور کہیں حاضر یہ سب شتر گربہ کہلائیں گے۔

روزمرہ اور محاورہ۔ اہل زبان کی بول چال جس کے خلاف بولنا درست نہ مانا جائے مثلاً آئے دن روزمرہ ہے اور ایسے الفاظ جو اصلی الفاظ کی جگہ کوئی اور معنی دیں محاورہ کہلاتے ہیں مثلاً تین پانچ کرنا۔ آئے روز بھی نہیں کہہ سکتے اور تین چار بھی غلط ہے کہ اہل زبان یوں نہیں بولتے۔

اب آتے ہیں غلطیوں کی طرف۔ رفع حاجت کے سلسلے میں الفاظ یا جملے عموماً غلط استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً جملہ ''رفع حاجت سے فارغ ہونا'' غلط ہے۔ درست ہوگا حاجت رفع کرنا یا حاجت سے فارغ ہونا یا حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرنا۔

مولانا کا مطلب ہے ہمارے سردار معنی کے لحاظ سے یہ لفظ کوئی دوسروں کے لئے تو استعمال کرسکتا ہے مگر اپنے لئے نہیں جیسے کہ بعض لاعلم ملاؤں نے اپنے لیٹر پیڈ تک میں یہ لفظ چھپوایا ہوتا ہے یعنی مولانا فلاں اور وہ خطوں میں بھی اپنے نام کے ساتھ مولانا لکھنا نہیں بھولتے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ کوئی شخص خود اپنا سردار کیسے ہوسکتا ہے یا شاید انہیں ڈر ہو کہ دوسرے ان کو مولانا تسلیم نہ کریں اس لئے خود یہ پیش بندی کردیتے ہوں۔ علما ہی ایسی غلطیاں کریں گے تو عوام کا کیا ہوگا۔ بعض لوگ کئی الفاظ کو غلط طور پر ملا کر لکھتے ہیں جیسے آجسُتجو ان الفاظ کو الگ الگ لکھنا درست ہے جیسے آج شب کو۔ پتہ ہر طرح سے غلط ہے شناخت کے لئے پتا لکھا جائے گا اور درخت پر جو لگتا ہے اسے شد کے ساتھ پتّا لکھیں گے۔

علیحدہ کی درست املا علاحدہ ہے کیونکہ یہ اصل میں علی حدہ ہے لیکن دراصل عربی کا لائن ہے۔ وضو بنانا غلط ہے وضو کرنا درست ہے۔ نون غنہ والے مرکبات میں عموماً نون غنہ کو نون بنا کر اور ملا کر لکھ دیا جاتا ہے جو کہ غلط

ہے جیسے چنانچہ، کیونکہ، حالانکہ، چونکہ وغیرہ ان کو الگ الگ لکھنا ہی درست ہے جیسے کیوں کہ، چوں کہ، چناں چہ، حالاں کہ وغیرہ۔ نماز پڑھنا کی بجائے نماز ادا یا قائم کرنا درست ہے۔ میاں کے لفظ کے کئی مطلب ہیں جیسے شوہر، آقا اور خواجہ سرا۔ یہ عزت اور حقارت دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ہندو طنزاً مسلمانوں کو بھائی میاں، میاں لوگ، میاں مودھو اور میاں مورکھ کہتے ہیں اس لئے اللہ کے ساتھ احتراماً میاں کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں۔ اللہ پاک یا اللہ تعالیٰ کہنا چاہئے۔ ہمشیرہ غلط العام ہے درست ہم شیرہ ہے جو دودھ شریک اور سگے بہن بھائی دونوں کے لئے استعمال ہوسکتا ہے ہمشیرہ صرف بہن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ سندر بن کا جنگل، شب برات کی رات، ماہ رمضان کا مہینہ، سنگ مرمر کا پتھر، آب زم زم کا پانی کو صرف سندر بن، شب برات، ماہ رمضان، سنگ مرمر اور آب زم زم لکھا جائے گا یا پھر زم زم کا پانی، مرمر کا پتھر، رمضان کا مہینہ، برات کی رات۔

نئی جدت غلط مرکب ہے صرف جدت کافی ہے کیونکہ جدت نئی ہی ہوتی ہے۔ جدت پسندی اپنانا میں بھی جدت اپنانا کافی ہے۔ نقات غلط ہے درست ہے نکات (ن زیر کے ساتھ) جس کا مطلب ہے اشارے درسی کتب میں بھی غلط طور پر نقات لکھا ہے۔ کردیں تھیں غلط ہے کردی تھیں درست ہوگا۔ اصول یہ ہے کہ آخر میں جمع ہو تو پہلے والی جمع واحد کردی جائے گی۔ اعلیٰ چیز کے لئے رکھنا کا لفظ استعمال ہوگا اور ادنیٰ کے لئے پڑے ہونا کا جیسے، ردی رکھی ہونا رومال جیب میں رکھا اور کوڑا پڑا ہونا وغیرہ لغت مذکر ہے لیکن عموماً مؤنث ہی استعمال ہوتا ہے اسی طرح عوام جمع مذکر ہے لیکن استعمال عموماً واحد مؤنث ہوتا ہے۔ کیے لیے دیے میں ہمزہ نہیں آتی اس لیے اسے کیئے لیئے دیئے لکھنا غلط ہے۔ بے عزتی خراب کرنا غلط ہے کسی کی عزت کرنا یا عزت خراب کرنا درست ہے۔ انشا

کا مطلب ہے عبارت لکھنا بات پیدا کرنا تحریر یا ایجاد کرنا اس لئے انشاء اللہ لکھنا غلط ہے اس کی درست صورت ہو گی ان شاء اللہ۔ البتہ انشا نام کے ایک شاعر اور ابن انشاء نام کے ایک مزاح نگار ہو گزرے ہیں ان کا نام اسی طرح لکھا جائے گا۔ مبادا فیل نہ ہو جاؤ غلط جملہ ہے درست ہو گا مبادا فیل ہو جاؤ کیونکہ مبادا کا مطلب ہے ایسا نہ ہو۔

اچھا خاصا جم غفیر غلط مرکب ہے۔ اچھا خاصا مجمع یا جم غفیر درست ہو گا۔ میں آپ کا مشکور ہوں گا غلط ہے درست ہو گا میں آپ کا ممنون/شکر گزار ہوں گا۔ سب سے بہترین غلط مرکب ہے سب سے اچھا یا صرف بہترین کہیں گے کیونکہ بہترین کا مطلب بھی سب سے اچھا ہے۔

غلام مذکر ہے، عورت کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا جیسا کہ بعض عورتوں کے نام ہوتے ہیں غلام بیوی، غلام فاطمہ وغیرہ۔ بیک مرر غلط ہے کیونکہ اس کا مطلب ہوا عقبی آئینہ جبکہ یہ سامنے ہوتا ہے۔ اصل میں یہ ریو مرر یعنی آئینہ عقب نما ہے۔ آنسوؤں سے رونا غلط ہے۔ آنسو بہانا یا صرف رونا درست ہے۔ دل نکل جانا غیر صحیح ہے۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا یا دل بیٹھ گیا کہیں گے۔ دوران کے بعد میں آتا ہے جو عموماً لوگ نہیں لکھتے۔ برا منانا غلط ہے درست روزمرہ ہے برا ماننا۔ آواز سے آواز ملانا صحیح نہیں۔ آواز میں آواز ملانا صحیح ہے۔ بے پروا اور لاپروا کے آخر میں عموماً "ہ" لکھ دی جاتی ہے جو کہ غلط ہے۔

السلام علیکم میں واؤ استعمال نہیں ہو گی بلکہ "م" پر پیش ہو گی اس میں علیکم جمع کا صیغہ ہے جو تین یا زائد کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن سامنے لوگ ایک ہوں یا زیادہ السلام علیکم یعنی جمع کا صیغہ ہی استعمال ہو گا کیونکہ ہر انسان کے ساتھ دو کراماً کاتبین (نیکیاں اور بدیاں لکھنے والے معزز فرشتے) بھی ہوتے ہیں۔ غیر مسلم کو البتہ السلام علیکم نہیں کہہ سکتے جب تک کہ وہ اسلام نہ لے آئے۔ غیر مسلموں کے نام خطوط میں نبی کریمؐ اس کی جگہ لکھواتے تھے "والسلام علیٰ مَنِ اتّبع الھُدیٰ (سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے) اس سلسلے میں ہمیں بھی ان کی سنت پر ہی عمل کرنا چاہئے البتہ ہم ان کی دنیاوی خوشیوں میں شریک ہو سکتے ہیں اور کر بھی سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں کی مذہبی تقاریب میں شامل ہونا سختی سے منع ہے تاکہ کم علمی کے باعث گمراہ نہ ہو جائیں۔

ڈارون کا نظریہ ہے کہ انسان بندر کی ارتقائی شکل ہے کئی کم علم رائٹر اپنی تحریر میں اس کی توثیق کر دیتے ہیں حالاں کہ یہ سراسر خلاف اسلام ہے۔ اولین انسان اللہ تعالیٰ نے مٹی سے بنایا اور پھر اس میں روح پھونکی اسی سے حوا کو پیدا کیا اور نسل چلائی۔ حادثات وغیرہ میں مرنے والوں کے لئے ہمارا میڈیا ہلاک کا لفظ استعمال کرتا ہے جو کہ قرآن میں گناہ گاروں اور کفار کی موت کے لئے آیا ہے یہ لوگ تو کسی طرح سے شہید ہوتے ہیں اس لئے جاں بحق کہنا چاہئے۔

ملحوظہ ہندو مذہب میں جانور کھانا حرام ہے کیوں کہ اس سے ان کو ایذا ہوتی ہے (البتہ مسلمانوں کو مارنا شاید حلال ہے کہ ان کو ایذا نہیں ہوتی) لیکن یہ فلسفہ غلط ہے کیونکہ جانور نہیں کھائیں گے تو پودے کھائیں گے اور وہ بھی جاں دار ہیں اور تکلیف محسوس کرتے ہیں اس لئے پودے اور جانور کھانا جائز ہیں کیونکہ وہ ہماری زندگی برقرار رکھنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ہندوؤں کی مذہبی کتب میں گوشت کھانے کا ثبوت ملتا ہے۔

(استفادہ: اردو زبان ہماری، اطہر ہاشمی۔ اردو املا، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ املاء کے مسائل، فائزہ خان۔ سوال و جواب، ڈاکٹر ذاکر نائیک)

***

آزاد نظم

خاموشی

☆ نسیم سکینہ صدف

اس سے پہلے کہ میں یہ نظم شروع کروں
میں آپ سے چاہوں گی کہ میرے ساتھ شامل ہوں۔
ایک لمحے کی خاموشی
ان کے احترام میں جو ورلڈ ٹریڈ سینٹر
اور پینٹاگون میں گیارہ ستمبر کو ہلاک ہوئے۔
میں آپ سے یہ درخواست بھی کرنا چاہوں گی
کہ ایک لمحہ خاموش رہیں۔
ان سب کے لئے بھی
جو ان حملوں کی جوابی کارروائیوں میں
ہراساں کئے گئے، قید کئے گئے
تشدد و زنا بالجبر کا نشانہ بنے اور مارے گئے
اور افغانستان و امریکہ دونوں کے مظلوموں کے لئے
اور اگر میں شامل کر سکوں
بس ایک اور معاملہ بھی
تو ایک پورے دن کی خاموشی

ان ہزاروں ہزار فلسطینیوں کے لئے جو مارے گئے،
جو امریکی پشت پناہی کی شہ پر
اسرائیلی فوج کے قبضے کی دہائیوں کے دوران
چھ ماہ کی خاموشی ان پندرہ لاکھ عراقیوں کے لئے
(جن میں زیادہ تر بچے تھے)
جو اس ملک کے خلاف
امریکہ کی عائد کردہ گیارہ سالہ پابندیوں کے باعث
فاقہ کشی کا شکار ہو کر مرے
اس سے پہلے کہ یہ نظم شروع کروں
دو ماہ کی خاموشی
ان سیہ فاموں کے نام جنہیں
جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کی تحفظ وطن پالیسی نے
خود اپنے وطن میں بے وطن بنا دیا
ہیروشیما اور ناگاساکی میں مارے جانے والوں کے لئے
جہاں موت کی بارش نے

کنکریٹ، لوہے اور کھالوں کی ہر تہہ کو
ادھیڑ ڈالا
اور جہاں
بچ جانے والے
اس گمان میں رہے کہ
جیسے وہ زندہ ہوں
سال بھر کی خاموشی
ویت نام کی جنگ کے نہیں بلکہ ان لاکھ ہا لوگوں کے نام
جنہیں جلتے تیل کی سڑانڈ
اس کی بھوبھل نے اپنے اعزاء کی مدفون جھلسی ہڈیوں
اور اسی میں نومولود بچوں کے بارے میں
کچھ نہ کچھ جاتا ہے۔ ایک سال کی خاموشی
کمبوڈیا اور لاؤس کے ان مردوں کے نام
جو شکار ہوئے
کچھ نہ بولو،
ہم نہیں چاہتے کہ انہیں پتہ چلے
کہ وہ مارے جا چکے ہیں
دو ماہ کی خاموشی کولمبیا میں کئی دہائیوں کے دوران
ان مارے جانے والوں کے لئے
جن کے لئے نام بھی
اُن کی مردہ لاشوں کے پشتوں کی طرح ہی
ڈھیر لگے اور پھر وہ ہماری زبانوں سے پھسل کر محو ہو گئے۔
اس سے پہلے کہ میں یہ نظم شروع کروں
ایک گھنٹے کی خاموشی السلواڈور
ایک سہ پہر کی خاموشی نکاراگوا،
دو دن کی خاموشی گوئٹے مالا والوں کے لئے
جن میں کسی ایک کو بھی پوری زندگی میں
امن چین کا ایک لمحہ نصیب نہ ہوا۔
67 سال کی خاموشی
پشاور پبلک سکول میں شہید کئے جانے والے 142
معصوم بچوں کے لئے،
پچھتر سال کی خاموشی
ان کروڑوں افریقیوں کے لئے جنہیں
زمین پر تعمیر شدہ آسمان کو چھوتی ہوئی
بلند ترین عمارت سے بھی زیادہ گہری
سمندر کی تہہ میں مدفن نصیب ہوا
اور جن کے مردہ تنوں کی شناخت کے لئے
نہ کوئی ڈی این اے ٹیسٹ ہوگا
اور نہ دانتوں کا ریکارڈ محفوظ ہوگا
اور ان کے لئے جو
جنوب شمال اور مشرق و مغرب میں
سائیکامور کے درختوں کی بلند شاخوں پر مصلوب ہوئے
اور سو سال کی خاموشی
ٹھیک اسی نصف کرے کے
ان کروڑوں مقامیوں کے لئے
جن کی زمینیں اور زندگیاں چرا لی گئیں
تصویری پوسٹ کارڈ کی طرح کی
ترشی ترشائی ترکیبوں سے
جیسے کے عنوان
اب ہمارے احساس کے سرد خانے پر
مقناطیس سے چپکی
بے ضرر شاعری میں تحلیل ہو گئے ہیں
تو تمہیں ایک لمحے کی خاموشی چاہیے،
ہم سب تو گنگ ہو گئے ہیں
ہماری زبانیں ہمارے ذہنوں سے نوچ لی گئی ہیں،
ہماری آنکھیں بھی سی دی گئی ہیں۔
تمام شعر زمین کی گود میں سلا دیئے گئے ہیں
تمام طبل خاک میں ریزہ ریزہ سما گئے ہیں
اس سے پہلے کہ میں یہ نظم شروع کروں
تمہیں ایک لمحے کی خاموشی چاہیے ہے؟

تم اس طرح ماتم کناں ہو جیسے
یہ دنیا جیسی تھی
اب اس طرح کی نہیں رہے گی
اور ہم سب کی بس یہ دلی دعا ہے کہ کاش! یہ ہی درست ٹھہرے
کہ اب یہ دنیا
ہمیشہ کی طرح کی دنیا نہ رہنے پائے
کیونکہ یہ گیارہ ستمبر کی نظم نہیں ہے
یہ دس ستمبر کی نظم ہے،
یہ نو ستمبر کی نظم ہے،
یہ آٹھ ستمبر کی نظم ہے،
یہ ایسی نظم ہے جو اسی طرح کی
مزید نظموں کے لکھے جانے کا سبب بنتی ہے
اور اگر یہ گیارہ ستمبر کی نظم ہے تو
یہ چلی کے لئے گیارہ ستمبر 1971ء کی نظم ہے
یہ بارہ ستمبر 1977ء کے
جنوبی افریقہ کے اسٹیون بیکو کے لئے نظم ہے
یہ چودہ ستمبر 1992ء کے صومالیہ کے لئے نظم ہے
یہ ہر اس یادگار تاریخ کے لئے نظم ہے
جو زمین پر راکھ ہو کر بکھر جاتی ہے
(ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی زمین بوس 110 منزلوں کی مانند)
یہ ان 110 کہانیوں کے لئے نظم ہے جو کبھی نہ سنائی گئیں
وہ 110 کہانیاں جنہیں تاریخ نویسوں نے
رقم نہ کرنے کا عہد کیا ہے۔ وہ 110 کہانیاں جنہیں سی
این این، بی بی سی نے
درخور اعتنا نہ جانا،
یہ نظم اسی پروگرام کو گڑبڑا دینے کے لئے ایک نظم ہے
اور اگر اب بھی تمہیں اپنے مُردوں کے لئے
ایک لمحے کی خاموشی چاہئے ہے
تو ہم تمہیں پیش کریں گے
ایک حیاتی کی بے نشاں خالی قبریں،
گمشدہ زبانیں،
جڑوں سے اکھڑے درخت اور تواریخ
بے نام بچوں کے چہروں پر مردہ نگاہیں
اس سے پہلے کہ میں یہ نظم شروع کروں
ہو سکتا ہے ہم ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں
مٹی میں دفن ہونے کی
ہماری آرزو پوری ہو جائے
اور اگر پھر بھی تم ہم سے
مزید خاموشی کے طلبگار ہو گے
اگر تمہیں ہماری ایک لمحے کی خاموشی کی خواہش ہے
تو پھر تیل نکالنے والے پمپ روک دو،
انجن اور ٹیلی وژن بند کر دو،
تفریحی جہاز ڈبو دو،
بازار ڈھا دو،
آرائشی روشنیاں گل کر دو،
ریل گاڑیوں کو ریلوں کی پٹری سے اتار دو
اگر تمہیں ایک لمحے کی خاموشی چاہئے ہے
تو شہر کے طعام خانوں کی
شیشے کی کھڑکیوں کو
سنگ باری سے توڑ ڈالو
اور ان کے کارکنوں کی غیر ادا شدہ اُجرتوں کو بحال کر دو
گرا دو سارے شراب خانے،
امیروں کے دولت کدے،
سارے پریذیڈنٹ ہاؤس اور جیل خانے،
عیاشی گھر اور پلے بوائز
اگر تمہیں ایک لمحے کی خاموشی چاہئے ہے
تو اب ہی لے لو
اس سے پیشتر کہ یہ نظم شروع ہو
یہاں میری آواز کی بازگشت
(اور گھڑی میں) سیکنڈ کی سوئی کے چلنے کی دھمک کے

درمیان وقفے میں
باہم متصل جسموں کے معدوم سے درمیانی فاصلے میں
یہ رہی تمہاری خاموشی،
اسے لے لو
اسے لے لو!
مگر بنی ہوئی قطار میں
دراندازی مت کرو
اپنی خاموشی کو جرم کی ابتدا سے شروع کرو
لیکن آج شب ہم تو
اپنے پیاروں کے لئے درود پاک پڑھتے رہیں گے.....
پڑھتے رہیں گے!

نظم کے حوالہ جات

(1) تحفظ وطن Homeland Security

جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کی بدنام پالیسی تھی جس کے تحت سیاہ فام باشندوں پر ہر طرح کا ظلم روا تھا۔ اسی نام سے امریکہ میں ایک قانون نافذ ہوا ہے۔ جس کی رُو سے ہندوستان سمیت کئی دوسرے ممالک کے تارکین وطن کی رجسٹریشن کی جا رہی ہے اور انسانی حقوق کی پامالی عام ہو رہی ہے۔

(2) غلام بنا کر امریکہ لے جائے گئے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو اگر راستے میں شدید بیمار ہو کر مر جاتے تو انہیں جہازوں سے سمندر میں پھینک دیا جاتا۔

(3) امریکہ میں آزادی کی خاطر فرار اختیار کرنے والے غلاموں کو پکڑ کر سائیکامور درختوں پر پھانسی دی جاتی یا انہیں زندہ جلا دیا جاتا۔

(4) مراد امریکی براعظم ہے۔

***

معاشرت اور قانون

ڈھائی پرسنٹ

لوگ شعیب کو گالیاں دیتے اور عورتیں جھولیاں پھیلا پھیلا کر اسے کوسنے اور بددعائیں دیتی تھیں لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا تھا کہ سُود لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ ہر کسی کو اپنے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کی ضرورت تھی۔

☆ صبا بتول رندھاوا

جب اشفاق احمد نے ایک کنال کی کوٹھی بنانا شروع کی تھی تمام محلے اور اردگرد کے لوگ آ کر پوچھتے تھے کہ کیا یہ کوئی فیکٹری بن رہی ہے؟ یا کوئی بڑے دفتر کی عمارت؟ وہ ایک عام سا محلہ تھا جہاں پانچ مرلہ اور تین مرلہ کے گھر تھے۔ اتنا بڑا گھر ہر نگاہ کا مرکز تھا۔ گول کمرے اور بالکنیوں سے بنی یہ عمارت ایک حسین شاہکار دکھائی دیتی تھی۔ اشفاق احمد کے پانچ بیٹے تھے ادریس، نعیم، کلیم، سلیم اور معین۔ اشفاق احمد نے پانچ پورشنز پر مبنی یہ خوبصورت کوٹھی تعمیر کروائی تھی تاکہ اس کے بیٹے بڑے ہوتے ہی شادی کے بعد ایک ساتھ اپنے اپنے پورشنز میں اکٹھے زندگی گزاریں۔ اشفاق احمد کا ٹرانسپورٹ کا بزنس تھا، تمام شہر میں 5 نمبر، 7 نمبر اور 8 نمبر کی پینتیس کے لگ بھگ ویگنیں اور کئی رکشے شہر میں چلتے تھے جن کے ڈرائیور شام ہوتے ہی گاڑیاں کوٹھی کے باہر کھڑی کر کے اپنی دیہاڑی رکھ کے چابیاں اور دن بھر کی کمائی حوالے کر کے جاتے اور صبح پھر لے جاتے۔

اشفاق کے بچے ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا لیکن اشفاق احمد نے دوسری شادی نہ کی اور ساری توجہ بچوں کی پرورش پر مرکوز کر دی۔ پانچ بیٹوں اور تین بیٹیوں رضوانہ، ندرت ور فزا کی شادیوں کے بعد اشفاق احمد نے اپنے تمام بچوں میں جائیداد تقسیم کر دی۔ سات سات ویگنوں اور آٹھ آٹھ رکشوں کے علاوہ خاندانی زمینوں کی تقسیم اور کوٹھی کے حصے پانچوں بیٹوں کے نام کر دیئے اور اس کے ایک سال بعد اشفاق دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پانچوں بھائیوں کے پاس اپنی اپنی لاکھوں کی جائیدادیں تھیں۔ جب لوگ ہزاروں میں ہی خود کو امیر ترین سمجھا کرتے تھے۔ پانچوں بھائی بہت سلوک اور محبت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ بہنیں بھی شادی کے بعد بھائیوں کے گھر آتی جاتی تھیں۔ بھائی ہر طرح سے ان کا خیال رکھتے تھے۔

ادریس نے بڑے ہونے کے ناتے تمام ذمہ داریاں اپنے ذمے لے لی تھیں اور ایک باپ کی طرح خاندان کے سربراہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ادریس کے دو بیٹے تھے سعدی اور ہادی۔ دونوں نے بڑے ہوتے ہی باپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اور کاروبار کو بڑھا کر جائیداد میں مزید اضافہ کیا۔ ادریس اور کلیم نے اپنا کاروبار اکٹھا کر لیا تھا۔ ادریس بڑا بھائی ہونے کے ناتے چھوٹے بھائیوں کی ہر مشکل میں ان کا ساتھ دیتا اور ہر طرح کی مالی مدد کرتا۔

ان بھائیوں پر مصیبت کا پہاڑ تب ٹوٹا جب تیسرے نمبر والے بھائی کلیم کے اچانک گردے خراب ہو گئے اور ڈاکٹروں نے نیا گردہ ڈلوانے کے لئے کہا۔ کلیم کی تین بڑی بیٹیاں تھیں اور بیٹا ابھی صرف چار سال کا تھا اس صورت میں بڑے بھائی ادریس نے بھائی کا بھرپور ساتھ دیا، وافر پیسہ ہونے کے باعث منہ مانگی قیمت پر گردہ خرید کر بھائی کا آپریشن کروایا لیکن کلیم کو نیا گردہ راس نہ آیا اور وہ وفات پا گیا۔ اس مشکل وقت میں ادریس نے اپنے بھائی کے یتیم بچوں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور کلیم کے بچوں کی ساری ذمہ داری خود اٹھالی۔ ادریس نے اپنے اور کلیم کے بچوں میں کبھی کوئی فرق نہیں کیا تھا۔

ادریس تمام بھائیوں کی اولادوں میں بڑے ابو کا درجہ اختیار کر گیا۔ سب اسے بڑے ابو کے نام سے بلانے لگے۔ سب سے چھوٹے بھائی معین کو ملک سے باہر جانے کا شوق ہوا تو اس نے اپنے حصے کی چند ویگنیں بیچ کر ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس تمام صورت حال میں اس کی بیوی اور بچوں کو بڑے ابو نے تنہا نہ رہنے دیا اور اپنے گھر لے آئے۔ ملک سے باہر جا کر معین کا کاروبار نہ چل سکا اور وہاں سے کچھ کما کر لانے کی بجائے معین دو سال بعد خالی ہاتھ وطن واپس لوٹ آیا۔ اس تمام مشکل وقت میں بڑے ابو نے دوبارہ معین کے کاروبار میں اس کی

مدد کی اور تب تک اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھا اور تمام خرچ بھی اٹھایا جب تک اس کے مالی حالات بہتر نہ ہو گئے۔

جیسے جیسے بچے بڑے ہوئے بڑے ابو نے کلیم کی دونوں بیٹیوں ارم اور کرن کی شادی اپنے دونوں بیٹوں ہادی اور سعدی سے کر دی سب خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے جبکہ ادریس سے چھوٹے نعیم کے حالات شروع سے ہی بہتر نہیں تھے اس کے ساتھ اسے کاروبار میں بہت بڑا فراڈ ہوا اور اس کا پارٹنر اس کے تمام پیسے لے کر بھاگ گیا۔ اس نے حالات بہتر کرنے کی غرض سے تمام زمینیں بھی بیچ ڈالی تھیں لیکن پھر بھی پریشان تھا۔ تمام بھائیوں کے بیٹے جوان ہو کر اپنے باپ کا کاروبار سنبھالنے لگے جبکہ نعیم کا بیٹا شعیب بچپن سے ہی پڑھائی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتا تھا۔ اسے چوری کی بھی عادت تھی۔ شعیب نے کئی بار گھر سے پیسے چرائے تھے وہ انتہائی لاپروا اور آوارہ لڑکا تھا۔ جبکہ نعیم کی دونوں بیٹیاں اور چھوٹا بیٹا تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

شعیب ہمیشہ پیسہ کمانے کے لئے شارٹ کٹ ڈھونڈتا رہتا تھا اور اس معاملے میں اس کا ذہن خوب چلتا تھا۔ یوں شعیب نے بچپن تو آوارہ گردی کرتے کرتے گزار دیا تھا لیکن جوان ہوتے ہی باپ کے ساتھ کاروبار میں دھیان دینے لگا۔ شروع شروع میں شعیب نے شہر میں ویگن چلانا شروع کی آہستہ آہستہ اس نے ڈرائیوری سے کما کر ویگن خرید لی اور دن رات محنت کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ شعیب کی محنت سے نعیم کے گھر کے حالات بہتر ہونے لگے۔ اپنے کاروبار کو مزید بڑھانے اور وسیع کرنے کے لئے شعیب نے لوگوں سے ڈھائی فیصد پرافٹ پر پیسے پکڑنے شروع کر دیئے اور ایک ویگن سے کئی ویگنیں خرید لیں اور ڈرائیور رکھ کر کاروبار چلانے لگا۔ اس طرح شہر میں بیس سے بائیس ویگنیں چلنے لگیں۔ ان سے جو کمائی ہوتی لوگوں کو ان کے حصے کا ڈھائی فیصد پرافٹ دینے کے بعد شعیب کے پاس بے شمار دولت اکٹھی ہونے لگی۔ شعیب نے اپنا پرانا گھر گرا کر ایک شاندار گھر تعمیر کیا۔ بہترین گاڑی رکھ کر انتہائی ٹھاٹ باٹھ سے زندگی گزارنے لگا۔ یوں نعیم کے گھر کے حالات تبدیل ہو گئے اور وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے بھی زیادہ شاندار زندگی گزارنے لگا۔

یہ ٹھاٹ باٹھ دیکھ کر دوسرے بھائیوں نے بھی شعیب کو ڈھائی فیصد پرافٹ پر پیسے دینا شروع کر دیئے اور بغیر کوئی کام کئے مہینے کے آخر میں اتنا پرافٹ ہر کسی کو اپنی طرف کھینچنے لگا اور دیکھا دیکھی خاندان کے تمام لوگوں نے شعیب کو پیسے دینا شروع کر دیئے اور شعیب کو ڈھائی فیصد پرافٹ پر لاکھوں روپے دے دیئے۔ شعیب کا کاروبار وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا وہ تمام لوگوں اور رشتہ داروں کو مہینے کی پہلی تاریخ پر پرافٹ ان کے ہاتھ میں پکڑا دیتا۔ جو کوئی بھی اپنی نوکری سے ریٹائر ہوتا اپنی پینشن کے پیسے لے کر شعیب کے پاس پہنچ جاتا۔ لاہور کی ایک کاروباری پارٹی نے کروڑوں کی انویسٹ منٹ شعیب کو کر رکھی تھی۔ اسی طرح پشاور سے ایک پٹھان لاکھوں روپے اکٹھے کر کے لاتا اور شعیب کو پرافٹ پر دے جاتا۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارہ نہ کی کہ یہ رقم سود ہے اور سب حرام کھا رہے ہیں۔

شعیب کی بڑی پھپھو رضوانہ کی بیٹی ندا خاندان کی واحد لڑکی تھی جس نے بی اے پاس کیا ہوا تھا وہ پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خوبصورت بھی تھی۔ شعیب بھی خوش شکل اور نوجوان تھا، پڑھا لکھا تو نہ تھا لیکن کروڑوں کا کاروبار کر رہا تھا بہترین گھر بنا کر شاندار گاڑی میں گھومتا تھا اس صورت میں جب نعیم نے اپنے بیٹے کے لئے اپنی بہن سے ندا کا رشتہ مانگا تو رضوانہ نے کوئی اعتراض نہ کیا اور یوں ندا اور شعیب کی شادی کر دی گئی۔

سب اس رشتے پر بہت خوش ہوئے اور پانچوں بھائی دھوم دھام سے شعیب کی بارات اپنی بہن رضوانہ کے گھر لے گئیں۔

اللہ نے شعیب کو ایک خوبصورت بیٹے سے نوازا، بیٹے کا نام احمد رکھا۔ احمد باقی بچوں کی طرح بہت ایکٹیو بچہ نہیں تھا بلکہ ابنارمل سا تھا۔ احمد کی پیدائش کے بعد شعیب نے گھر بہت دیر سے آنا شروع کر دیا۔ آدھی آدھی رات تک ندا شعیب کا انتظار کرتی رہتی۔

کچھ عرصہ تک تو شعیب باقاعدگی سے تمام لوگوں کو ہر ماہ کے ماہ ان کا پرافٹ دیتا رہا مگر پھر اس میں بے قاعدگی ہونے لگی اور وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ یہ دراصل سُود کی لعنت تھی جس نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا اور شعیب کا کاروبار تباہی کا شکار ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ ویگنیں کم ہونے لگیں۔ کسی ویگن کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو کسی کا انجن خراب ہو جاتا۔ جو رکشے اقساط پر دیئے تھے ان کی قسطیں دیئے بغیر لوگ لے کر بھاگ گئے اس صورت حال میں بجائے شعیب لوگوں کے پیسے واپس کرتا ان کی اصل رقم میں سے ہی ان کو ڈھائی فیصد پرافٹ دیتا رہا اور خود پُرسکون ہونے کے لئے نشہ آور ادویات کا استعمال کرنے لگا۔ تمام خاندان کے افراد اور لوگ اس سب معاملے سے بے خبر پرافٹ لیتے رہے اور اس طرح ان کی اصل رقم ختم ہوتی چلی گئی اور جب یہ بات سب پر کھلی تو تمام رقم ختم ہو چکی تھی چند گاڑیاں باقی بچی تھیں جو موقع ملتے پر لاہور والی پارٹی نے اپنے قبضے میں لے لیں، باقی لوگ شعیب کے گھر صورت حال جاننے کے لئے پہنچے تو وہاں تالے لگے تھے۔ شعیب کے باپ نعیم کو جب اس صورت حال کا پتہ چلا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اسے معلوم تھا کہ اب پیسے لینے والے دروازے پر آ جائیں گے تو ان کو کیا جواب دیں گے۔ شعیب کی گاڑی بھی لاہور والی پارٹی لے جا چکی تھی۔

گھر میں کوئی بھی پیسہ نہیں بچا تھا، سب نے راتوں رات گھر سے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ شعیب نے ندا کا زیور لیا اور ملتان کی طرف بھاگ گیا۔ نعیم بھی اپنی بیٹی، بیوی اور چھوٹے بیٹے کو لے کر کسی رشتہ دار کے گھر چھپ گیا۔ ندا اپنے بیٹے احمد کے ساتھ اپنے ماں باپ کے گھر واپس چلی گئی۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور ہنگامی صورت میں ہوا کہ کوئی بھی صورت حال کو نہ سمجھ سکا۔

آہستہ آہستہ سب کو معلوم ہو گیا کہ شعیب ان کو دھوکا دے کر کہیں بھاگ گیا ہے۔ اس کے گھر پر تالا دیکھ کر لوگ بڑے ابو اور ریس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ ادریس تو خود بہت سے پیسے شعیب کو بزنس کے لئے دے چکا تھا، وہ کیا کرتا؟ شعیب کی بہن تنزیلہ، کزن ثمائمہ اور پھپھو فزا بڑے ابو کے پاس آ کر رونے لگیں کہ اب کیا ہوگا ان کے سسرال کے بھی پیسے شعیب کے پاس تھے اگر وہ واپس نہ کیے تو وہ ان کا جینا حرام کر دیں گے۔ ان سب کی اتنی رقم تھی جو واپس کرنا ناممکن تھی۔ اب بڑے ابو کس کے پیسے لوٹانے کی کوشش بھی کرتے تو کس کس کو دیتے؟ کروڑوں کی رقم دینا بڑے ابو کے بس میں نہیں تھا جبکہ ان کا اپنا بھی لاکھوں کا نقصان ہوا تھا۔

ہر جگہ یہ بات پھیل گئی کہ شعیب لوگوں کے پیسے لے کر بھاگ گیا ہے کوئی یہ کہہ رہا تھا کہ نعیم نے بہنوں کے پیسے لوٹ کر کھا لئے۔ ابھی تو سب کو حوصلہ تھا کہ وہ شعیب کو ڈھونڈ کر کسی نہ کسی طرح اس سے اپنی رقم واپس لے لیں گے لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ شعیب کے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے اور وہ پرافٹ کی شکل میں ان کو اصل رقم ہی لوٹاتا رہا ہے اور گھر سے بھاگتے ہوئے بیوی کا زیور بھی لے کر گیا ہے۔ یہ سب معلوم ہونے کے بعد لوگ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ شعیب کی پھپھو ندرت کے شوہر کو صدمے سے ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ دوسری بہن فزا کے سسرال والوں نے اس کا جینا حرام کر دیا تھا۔ فزا کے جیٹھ نندوں سب نے شعیب کو پیسے دے رکھے تھے۔ انہوں نے طعنوں اور

دھمکیوں سے فزا کی زندگی کو عذاب بنا دیا تھا فزا شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ بن گئی اس کے شوہر کو روز اس کے بہن بھائی دھمکاتے کہ تم فزا کو بچوں سمیت گھر سے نکال دو۔ اسے اس کے بھائی کے پاس بھیجو ہمارے پیسے لے کر آئے۔

سسرال والوں کے بے تحاشا تنگ کرنے اور گھر سے نکال دینے کی دھمکیاں سن کر فزا نے اپنا اور اپنے بچوں کا سامان باندھ لیا۔ بڑے ابو انہیں لینے آ چکے تھے۔ جب فزا کے بچوں نے اپنا گھر چھوڑ کر جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم کسی صورت نہیں جائیں گے ان سب نے پیسے دیتے وقت تو ہم سے نہیں پوچھا تھا، تب پرافٹ کے لالچ میں ہم سے چھپ کر پیسے دیئے تھے، اب اگر نقصان ہوا ہے تو ہم ان کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ بالآخر فزا کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا اور اس نے سوچا جب اس کا شوہر اسے گھر سے نکلنے پر مجبور نہیں کر رہا تو وہ کیوں دوسروں کے کہنے پر اپنا گھر چھوڑ کر جائے لیکن فزا کے سسرال والے ہر انتہا پر جانے کے لئے تیار تھے۔ اس صورت حال میں صرف فزا کا گھر باقی بچا تھا جس کو بیچ کر قرض اتارا جا سکتا تھا لیکن کروڑوں کے قرض کو لاکھوں کے مکان سے اتارنا ممکن نہ تھا۔ فزا کے جیٹھ نے پندرہ بیس بندوں اور بندوقوں کے ساتھ نعیم کے گھر کے تالے توڑے اور گھر پر قبضہ کر لیا۔ بڑے ابو ساتھ والے گھر سے تمام صورت حال دیکھتے رہے لیکن وہ مجبور اور بے بس تھے۔ وہ ان کو نہیں روک سکتے تھے۔

پشاور سے پٹھان روز آ کر گھر کے باہر چکر لگاتے انہوں نے بھی گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ بھی بے چین ہو گئے اور کوئی قدم اٹھانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس تمام صورت حال میں ایک ایسی خبر آئی جس سے تمام لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب صبح 6 بجے سب کے گھروں میں فون گیا کہ نعیم فوت ہو گیا ہے،

ادریس کے گھر اس کی میت پڑی تھی، سب اپنی رقم لینے وہاں پہنچ چکے تھے، بڑے ابو جو لوگوں سے کہتے تھے کہ انہیں کچھ نہیں معلوم نعیم اور شعیب کہاں چھپے ہیں۔ آج نعیم کو ان کے گھر دیکھ کر سب ادریس کے سخت خلاف ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے یہ آواز اٹھائی کہ جب تک نعیم پر جو قرض کا بوجھ ہے وہ اتارا نہیں جاتا اسے دفنانے نہیں دینا۔ بالآخر بڑی منت سماجت کر کے نعیم کو دفنا دیا گیا، نعیم کی بہنوں نے اس روز ہی اپنے بھائی کو لاکھوں کی رقم معاف کر دی۔ جبکہ باقی لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اگلے جہان جا کر اپنی ایک ایک پائی وصول کریں گے۔ سب منتظر تھے کہ شعیب اپنے باپ کے جنازے پر ضرور آئے گا تو اسے گرفتار کروا کر اپنی رقم لیں گے لیکن شعیب اپنے باپ کے جنازے پر بھی نہ آیا۔

اس صورتِ حال میں سب متاثرین کو نعیم کا گروپ یتیم بھائی ادریس نظر آ رہا تھا کہ اسی سے پیسے نکلوائے جا سکتے ہیں۔ بھائی تو مر چکا تھا، اب ادریس کو نعیم کے بچوں کی فکر تھی۔ وہ ہر صورت ان کے گھر کو بچانا چاہتے تھے لیکن فزا کو سسرال والوں نے اتنا تنگ کیا اس کا جینا دشوار کر دیا کہ اپنے بھائی سے مکان کے کاغذات لا کر دو بالآخر فزا بڑے ابو کے پاس آ کر روئی کہ اس کی زندگی آسان کر دیں اور مکان ان کے حوالے کر دیں۔ ادریس کسی صورت ایسا نہیں چاہتے تھے لیکن بہن کو روتا دیکھ کر ان سے برداشت نہیں ہوا اور اس صورت میں گھر کے کاغذات دے کر بہن کا گھر تو بچا لیا لیکن بھائی کی آخری نشانی، اس کے بکھرے ہوئے بچوں کی آخری پناہ گاہ بھی بک گئی۔

جب پٹھانوں کو معلوم ہوا کہ ادریس نے گھر بیچ کر بہن کے سسرال کی رقم واپس کر دی ہے تو انہوں نے ادریس کے خلاف پرچہ درج کرا دیا اور اس سے پیسوں کی وصولی کا مطالبہ کرنے لگے اس مشکل وقت میں بڑے ابو ادریس کے لئے تمام راستے بند ہو رہے تھے۔ پشاور سے

پولیس انہیں گرفتار کرنے آ رہی تھی، مجبوراً ادریس کو بھی اپنا گھر چھوڑ کر کہیں چھپنا پڑا۔ وہ اپنے اور کلیم کے بچوں سمیت کسی پوش علاقے میں گھر لے کر وہاں رہنے لگے۔

پٹھانوں نے سکیم لڑائی کہ ادریس کے چھوٹے بیٹے ہادی کو اغوا کر کے پشاور لے جاتے ہیں اور تاوان کی صورت اس کے باپ ادریس سے منہ مانگی رقم وصول کریں گے۔ شعیب کی غلطیوں پر آج ادریس کی ساری فیملی بھی خطرے سے دوچار تھی۔ وہ سب اپنے کاروبار چھوڑ کر چھپے ہوئے تھے۔

پٹھان اتنے خطرناک تھے ان سے بچنا ناممکن تھا بالآخر ادریس کو ایک سکیم سوجھی ان سب سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہوں نے اپنے بیٹے ہادی کو خود ہی کہیں چھپا لیا اور پٹھانوں کے خلاف اغوا کا پرچہ درج کرا دیا۔ وہ جو آئے دن پشاور سے پولیس لے کر ان کو گرفتار کروانے آتے تھے۔ اب اس شہر کی پولیس کے ڈر سے بھاگنے لگے۔ انہیں لینے کے دینے پڑ گئے۔ جو کام کرنے کا وہ ابھی سوچ رہے تھے پہلے ہی اس میں پھنس گئے۔ اس صورت سے تنگ آ کر پٹھان جس نے خود لوگوں سے پیسے ادھار لے کر شعیب کو دیئے تھے اس نے خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی اور باقی افراد اغوا کا کیس ہونے کی صورت میں حواس باختہ ہو کر ادریس کے پاس آئے کہ وہ معافی مانگنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ادریس پر بلاوجہ کیس کر دیا تھا جبکہ ان کا ان پیسوں اور شعیب کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پٹھانوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور ادریس کے خلاف کیس واپس لے لیا۔ اس شرط پر کہ ادریس بھی اغوا کا کیس واپس لے لے۔ اس طرح یہ معاملہ ختم ہو گیا۔

لوگوں کو بھی اب یقین ہو گیا تھا کہ اپنی اپنی رقم پر اب صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے شعیب کو ڈھونڈنے کا بھی اب کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس کے پاس بھی کوئی رقم نہیں تھی۔ یہ سود کا کاروبار تھا جب فکس پرافٹ کی ڈیل کی جائے تو یہ رقم سود ہوتی ہے اور سود لینے اور دینے والے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ آخرکار ہاتھ کچھ نہیں آتا اور سب کچھ ڈوب جاتا ہے۔

لوگ شعیب کو گالیاں دیتے اور عورتیں جھولیاں پھیلا پھیلا کر اسے کوسنے اور بددعائیں دیتی تھیں لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا تھا کہ سود لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ ہر کسی کو اپنے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے کی ضرورت تھی۔ باقی سب تو جیسے تیسے صبر شکر کر کے دوبارہ اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے لیکن نعیم کے خاندان کی آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

لوگوں کی بددعائیں تھیں یا ندا کی بری قسمت کہ جیسے جیسے ان کا بیٹا احمد بڑا ہوا ان کو معلوم ہوا کہ یہ بچہ معذور ہے چلنا پھرنا تو دور کی بات وہ اپنے ہاتھ پاؤں گردن تک خود نہیں سنبھال سکتا۔ وہ خود تو بڑا ہوتا جا رہا تھا لیکن اس کے جسمانی اعضاء اتنے ہی کمزور تھے۔ وہ کچھ بھی نہیں کھا پاتا تھا یہاں تک کہ منہ بھی خود سے نہیں کھول سکتا تھا۔ ندا کے لئے وہ ایک ایسا امتحان تھا جو ایک پل بھی اسے سکون کا میسر نہیں آنے دیتا تھا۔ ندا اپنی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین خوبصورت اور پڑھی لکھی تھی لیکن اس کی قسمت سب سے زیادہ خراب تھی۔

بڑے ابو نے نبیلہ کا رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا تھا جب کسی کو معلوم ہوتا کہ اس کا بھائی کروڑوں روپے لے کر بھاگ گیا ہے اور ان کے گھر پر لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا یہ اپنے تایا کے گھر رہتے ہیں تو لوگ دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرتے۔

انہی دنوں شعیب کبھی اپنی بیوی ندا سے رابطہ کرتا تو کبھی بڑے ابو سے کہ میں واپس گھر آنا چاہتا ہوں لیکن کوئی بھی اسے واپس بلانے پر تیار نہیں تھا۔ پیسے مانگنے والے لوگ جو خاموش ہو گئے تھے وہ ایک بار دوبارہ کھڑے ہوتے۔ جو بھی شعیب سے رابطہ کرتا وہ بھی پھنس

جاتا۔ پولیس بھی شعیب کو ڈھونڈ رہی تھی۔ رضوانہ نے ندا کو سختی سے منع کر دیا کہ شعیب سے کوئی رابطہ نہ رکھے اگر وہ ایک بار یہاں آ گیا تو سب لوگ پولیس سمیت ہمارے گھر کا رخ کر لیں گے۔

شعیب نے گھر سے بھاگ کر بھی کوئی سیدھے کام نہیں کئے تھے، اس نے ملتان جا کر چوریاں اور ڈاکے شروع کر دیئے تھے۔ اب فوری پیسہ حاصل کرنے کا اسے یہی حل نظر آیا تھا پولیس تو پہلے ہی اس کی تلاش میں تھی۔ اب وہ شرافت کی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ موٹر سائیکلیں اور دیگر چوریاں کر کے وہ اپنا گزر بسر کر رہا تھا کہ ایک دن وہ رنگے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور ملتان جیل میں قید کر لیا گیا۔ دھوکے اور فریب سے پیسے لوٹنے کے کیس تو اس پر درج تھے ہی اب چوری اور ڈاکے کے کیس میں بھی اسے لمبی سزا ہو چکی تھی۔ کوئی بھی اس کے پیچھے آنے کو تیار نہ تھا۔

کسی طرح یہ بات بڑے ابو تک بھی پہنچ چکی تھی کہ شعیب ملتان جیل میں قید ہے۔ نعیم کی بیوی شوہر کے چلے جانے اور یوں اولاد اور گھر کے بکھرنے کے بعد شعیب کے غم میں گھلی جا رہی تھی، نہ وہ کسی سے کوئی گلہ شکوہ کر سکتی تھی اور نہ ہی بیٹے کے حوالے سے کوئی التجا کہ اس کے بیٹے کو جیل سے چھڑوا لائیں شعیب لوگوں کے لئے لاکھ برا سہی لیکن ماں کا تو وہ ویسا ہی بیٹا تھا۔ بیٹے کے غم میں گھل گھل کر ایک صبح وہ کسی سے کچھ کہے سنے بنا ہی تمام غموں کو دل میں سمو کر خاموشی سے اس دنیا سے چل بسی۔ شعیب کی بدنصیبی تھی کہ ماں باپ دونوں کا آخری بار چہرہ نہ دیکھ سکا۔ شعیب کو تو جیل کی کال کوٹھری میں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس سے ہمدردی رکھنے والی اس کی سلامتی کی دعائیں کرنے والی واحد ہستی اس کی ماں بھی اس دنیا سے چل بسی ہے۔

شعیب جیل میں بیمار رہنے لگا تھا۔ پہلے تو چھوٹا موٹا علاج ہوتا رہا مگر اسے افاقہ نہ ہوا۔ آخر ایک ڈاکٹر نے انکشاف کیا کہ اسے ہیپاٹائٹس ''سی'' کی بیماری لگ گئی ہے۔ جیل میں کوئی علاج نہ ہونے کے باعث بیماری اپنی آخری حد تک پہنچ گئی۔ جیل والے کہتے رہے کہ اپنے گھر والوں کو فون کر دو لیکن کوئی بھی تو نہ تھا جسے وہ فون کرتا۔ آخر کار بیماری اس انتہا تک پہنچ گئی کہ پولیس والوں کو خود ہی اسے ہسپتال داخل کروانا پڑا۔ شعیب کی حالت دن بہ دن خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹرز نے بھی کہہ دیا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ اس کا علاج ممکن نہیں ہے اس کے پاس بس گنتی کے دن ہیں۔ اسے اس کے گھر بھیج دیں۔ اسی دن ایک قیدی جیل سے رہا ہوا تھا اس نے شعیب کو کرایہ وغیرہ دے کر ٹرین پر بٹھا دیا اور اسے کہا تم گھر رابطہ نہیں کر سکتے تو لاؤ میں تمہارے گھر فون کرتا ہوں اس نے بڑے ابو کو فون کر کے تمام صورتحال بتائی۔ وہ سٹیشن سے اسے اس کی خالہ کے گھر لے گئے۔ شعیب کی حالت اتنی خراب تھی کہ کوئی بھی اسے پہچان نہیں رہا تھا۔ وہ شعیب جو گھر سے باہر دربدر پھرنے کے بعد جیل کی قید کاٹنے اور بیماری کی انتہا پر پہنچنے کے بعد اب شعیب بستر مرگ پر پڑا تھا۔ آخری وقت میں اس کی بہنیں بھی اسے دیکھ کر پہچان نہ پائیں۔ آخری لمحے وہ سب سے معافی مانگتا رہا اور بار بار اپنی ماں کو بلا رہا تھا۔ جب اسے بتایا کہ وہ اب دنیا میں نہیں ہیں تو چیخ چیخ کر رو دیا۔ صرف ایک دن زندہ رہ سکا اور ہزاروں لوگوں کی بددعائیں سمیٹ کر اس دنیا سے چلا گیا۔

شعیب کی غلطی اور بے وقوفی نے اس کے تمام خاندان کو تباہ کر دیا۔ اس کی لالچ اور حرص سے کتنے لوگوں کی زندگیاں تباہ ہو گئیں جو اپنی ساری ساری زندگی کی جمع پونجی شعیب کے ہاتھوں گنوا چکے تھے۔ زیادہ منافع کے لالچ میں اصل بھی گنوا بیٹھے تھے۔ سود کے ڈھائی پرسنٹ کے لالچ نے سب کو خالی ہاتھ کر دیا تھا۔

☆☆☆

میں بھول نہیں سکتا

گناہ اور گرفت

گناہ کا موقع نہ ملنا بھی نعمت ہے۔

☆ حبیب اشرف صبوحی راوی: ریحان صدیقی

اس کہانی کے راوی ریحان صدیقی صاحب ہیں جو میرے بہت قریبی اور بچپن کے دوست ہیں۔ ریحان صاحب طبعی طور پر انتہائی شریف النفس انسان ہیں۔ ہر شخص کے کام آتے ہیں اور ان کے ساتھ دامے، درمے، سخنے مدد کرتے ہیں۔ اس لئے دوستوں نے ان کا نام "خدائی خدمتگار" ڈال دیا ہے۔ اپنے آپ کو لوگوں کی مدد کرتے ہوئے کئی بار خطرے میں ڈالا ہے اور وہ معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ پانچ وقت کے نمازی ہیں اور ایک پیر صاحب کے عقیدت مند بھی ہیں اور ان سے بیعت بھی ہیں۔ یہ واقعہ ریحان صدیقی صاحب کی زبانی پیش ہے۔

میرے ایک دور کے رشتہ دار تھے جن کا نام زاہد تھا، ان سے میری بہت دوستی تھی۔ ان کو جب بھی کوئی کام یا مسئلہ پیش ہوتا وہ میری مدد مانگتے اور میرے مشورے پر عمل کرتے۔ اتفاق سے میرا مشورہ صحیح ہوتا اور ان کی پریشانی دور ہو جاتی۔ کوئی سامان خریدنا ہوتا یا بیچنا ہوتا یا بچیوں کی شادی کا جہیز خریدنا ہوتا وہ میری مرضی کے بغیر نہ ہوتا۔ زاہد صاحب کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی اور وہ وہاں چلے گئے۔ چودہ پندرہ سال وہاں رہے بیوی بچے ان کے یہیں رہے۔ میں وقتاً فوقتاً ان کے گھر جاتا، ان کی بیوی بچوں کی خبر گیری کرتا اور کوئی کام کاج ہوتا تو کر دیتا۔ ان کی بیوی بہت خوبصورت اور با اخلاق تھی۔ دل میں کبھی کوئی غلط خیال اس کے بارے میں نہیں آیا۔ وقت گزرتا گیا۔ زاہد صاحب اتنے سال گزارنے کے بعد واپس اپنے گھر آ گئے۔ ریٹائرمنٹ کے موقع پر ان کو کمپنی کی طرف سے کافی رقم ملی۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی اس رقم کو کسی کاروبار میں لگا دیں تاکہ ان کو ایک معقول رقم ملتی رہے اور گھر کا خرچہ چلتا رہے۔

میں سرکاری محکمے میں جس عہدے پر کام کر رہا تھا وہاں میرے ذمہ یہ کام تھا کہ مختلف ٹھیکیداروں سے ماہانہ بنیادوں پر ہیوی مشینری کرائے پر لینا جیسے ویلڈنگ پلانٹ، ہیوی ٹرک، جیپ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے زاہد صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ آپ جو رقم اپنے ساتھ لائے ہیں اس سے ہیوی مشینری خرید لیں اور ہمارے ادارے میں لگا دیں۔ لگوانے کی ذمہ داری میری ہے۔ اس مشینری کی دیکھ بھال اور دیگر ذمہ داریاں ادارے کے ذمہ ہوں گی اور آپ کو ہر ماہ معقول رقم ملتی رہے گی اور ہر دو سال بعد ریٹ میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ زاہد صاحب نے ہامی بھر لی اور کچھ مشینری خرید کر ہمارے ادارے میں لگوا دی

جہاں سے ان کو معقول آمدنی ہونے لگی۔ وہ میرے پہلے سے زیادہ احسان مند ہو گئے۔

زاہد صاحب کو کچھ عرصہ بعد دل کی تکلیف شروع ہو گئی، کافی علاج کرائے لیکن کوئی فرق نہیں پڑا اور اس بیماری میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد مشینری وغیرہ کا کنٹریکٹ ان کی بیگم کے نام منتقل ہو گیا اور ان کی بیگم کو ایک معقول رقم ہر ماہ ملتی رہتی۔ اسی سلسلے میں ان کی بیگم کا رابطہ مجھ سے رہتا وہ میری حد سے زیادہ شکر گزار تھیں اور کہتی کہ اگر آپ کا تعاون ہمارے ساتھ نہ ہوتا تو ہمارے گھر فاقے پڑنے لگ جاتے۔ میں ان سے کہتا کہ اللہ تعالیٰ سبب پیدا کر دیتا ہے اور یہ اسی کا احسان ہے ایک دن ان کی بیگم نے مجھ سے کہا کہ آپ گزشتہ پچیس تیس سالوں سے ہمارے ساتھ ایسی نیکیاں کر رہے ہیں کہ میرا سگا بھائی اور قریب سے قریبی عزیز بھی اتنی سر دردی نہیں لیتا جتنی آپ، اس کی کیا وجہ ہے؟

اس سوال پر میرے دل میں ایک دم شیطانیت آ گئی اور میں نے فوری طور اظہار محبت کر دیا اور کہا کہ میں آپ کو پہلے دن سے پسند کرتا ہوں لیکن آج آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ آپ ہمارے لئے اتنی سر دردی کیوں لیتے ہیں تو میں نے صحیح طور پر آپ کو وجہ بتا دی ہے چاہے آپ بُرا مانیں یا بھلا مانیں یا میری اس بات پر تعلقات ختم کر لیں۔

''آپ بھی بال بچے دار ہیں اور میں بھی بال بچے دار''۔ اس نے کہا۔''ہم کو زندگی میں محتاط ہو جانا چاہئے۔ میرے خاوند اتنے سال ملک سے باہر رہے، میں نے خراب ہونا ہوتا تو تب خراب ہو جاتی۔ آپ پانچ وقت کے نمازی ہیں اور آپ مجھے بہکانا چاہتے ہیں؟ میں بہکنے والی نہیں ہوں''۔

شیطان میرے اوپر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً اس کو ٹیلی فون کرتا رہا اور آخر کار اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اس کو زیر کر لیا۔ ہم اکثر ہوٹلوں میں ملتے۔ کھانا وغیرہ کھاتے، فلمیں دیکھتے۔ وہ میرے حصار میں پوری طرح آ چکی تھی۔ اتفاق سے میری بیوی کے ماموں ممانی کراچی سے آئے ہوئے تھے، ان کو ایک شادی میں دو دن کے لئے فیصل آباد جانا تھا۔ وہ میری بیوی کو بھی ساتھ لے گئے۔ گھر میں میں اور میرا بیٹا رہ گئے۔ بیٹا بھی صبح 9 بجے دفتر چلا جاتا تھا چونکہ میرے سر پر شیطانیت سوار تھی میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے ایک دن اسے بتایا کہ دو روز بعد میری بیوی فیصل آباد چلی جائے گی تم رات بارہ بجے میرے گھر آ جانا۔ وہ بالکل تیار ہو گئی۔

اب میں بے چینی سے اس دن کا انتظار کرنے لگا۔ میری بیگم اپنے ماموں ممانی کے ساتھ فیصل آباد چلی گئی۔ میں بہت خوش تھا۔ مقررہ دن سے ایک روز پہلے شام کو مغرب کے بعد میں گھر میں بیٹھا ہوا تھا میرے دو قریبی دوست مجھ سے ملنے کے لئے آ گئے۔ ان میں سے ایک دوست میرے محلے میں ہی رہتے تھے۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اتفاق سے ہمارے پڑوسی کو معلوم تھا کہ میری بیگم گھر پر نہیں ہیں۔ وہ کھانا لے کر میرے گھر آ گیا۔ کھانے میں کھڑی اور چاول، روٹی وغیرہ تھی اور کافی مقدار میں تھی۔

میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ یہ کھانا بہت زیادہ ہے تم بھی کھا لو۔ چنانچہ ان دونوں نے بھی خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور چلے گئے اور میں دوسرے روز کے حسین سپنے دیکھتے ہوئے سو گیا۔

رات ڈھائی بجے میری اچانک آنکھ کھل گئی۔ میرے سر میں شدید درد تھا اور لگتا تھا کہ میرے دل میں شدید تکلیف ہے اور بے چینی بہت زیادہ۔ میرا بیٹا اوپر دوسری منزل پر سویا ہوا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اس کو آواز دوں یا اس کو کسی طرح بلاؤں کہ مجھے ہسپتال لے چلے۔ تکلیف بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی

تھی۔ میں نے فوری طور پر اپنے دوست کو فون کیا جنہوں نے میرے ساتھ چند گھنٹے قبل کھانا کھایا تھا انہوں نے فون اٹھایا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔ گاڑی لے کر آئیں اور مجھے ہسپتال لے کر چلیں۔ وہ فوری طور پر آئے اور مجھے ہسپتال لے کر گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ میرا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو چکا ہے اور مجھے تو ہسپتال میں داخل کرنا پڑے گا۔

میں بڑا حیران تھا کہ مجھے آج تک ایسی کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی یہ بلڈ پریشر کہاں سے آ گیا؟ اگر کھانے میں کوئی خرابی ہوتی تو میرے دوسرے دوستوں کو بھی اس کا اثر ہوتا۔ معاملہ سمجھ سے باہر تھا۔ ہسپتال والوں نے ٹیکے لگائے اور ایک دو دوائیاں کھانے کو دیں جس سے مجھے نیند آ گئی۔

صبح دس بجے کے قریب میری آنکھ کھلی سر میں درد ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے میں نے بیٹے کو فون کیا اور اسے بتایا کہ میری رات کو طبیعت خراب ہو گئی تھی میں ہسپتال میں داخل ہوں، فوراً آؤ۔ وہ کچھ دیر بعد آیا۔ وہ بہت پریشان ہوا کہ ایک دم سے کیسے طبیعت خراب ہو گئی ہے؟ بہرحال وہ ناشتہ وغیرہ لے کر آیا۔ مجھے رات کی نسبت طبیعت کافی بہتر ہو گئی تھی۔ میں طبیعت خراب ہونے کی وجوہات پر غور کر رہا تھا کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ بیگم زاہد صاحبہ جن کے ساتھ میرا آج موج مستی کا پروگرام تھا، پریشانی کی حالت میں ہاتھ میں گلدستہ اٹھائے ہوئے داخل ہوئیں اور پوچھا کہ کیا حال ہے؟ یہاں کیسے پہنچے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے انہیں بتایا کہ رات اڑھائی بجے میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اس نے مجھے گلدستہ پیش کیا۔ میرا صدقہ اتارا اور کافی دیر دعائیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں ہسپتال میں داخل ہوں۔ اس نے بتایا کہ میں صبح سے تمہارے موبائل پر فون کر رہی ہوں لیکن تم کوئی جواب نہیں دے رہے۔ پھر گھر فون کیا تو تمہارے بیٹے نے تمہاری طبیعت کی خرابی کا اور ہسپتال کا پتہ بتایا۔

اس نے جو بات بتائی وہ ناقابل فہم اور پُراسرار بات تھی۔ اس نے بتایا کہ رات اڑھائی بجے میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے مرحوم خاوند سکوٹر پر میرے پاس آئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تمہیں میں لینے آیا ہوں، تم میرے ساتھ چلو۔ تم نے بھٹکنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا کہ تمہیں تو سکوٹر چلانا نہیں آتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے تمہاری وجہ سے چلانا سیکھ لیا، جلدی بیٹھو۔ میں نے کہا کہ میں تو تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اس پر انہوں نے کلائی سے میرا ہاتھ کس کر پکڑ لیا کہ میں تمہیں زبردستی لے کر جاؤں گا۔ تمہارے بعد میں تمہارے یار نعمان کو بھی دیکھ لوں گا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں مر گیا ہوں۔ میں تمہاری تمام حرکات سے واقف ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی کلائی چھڑائی۔

جب آنکھ کھلی تو میرے پورے بازو میں شدید تکلیف تھی اور پورا جسم خوف کی وجہ سے کپکپا رہا تھا اور سخت سردی لگ رہی تھی۔ میں نے کمبل نکال کر اوڑھا۔ جب میں کچھ نارمل ہوئی تو وضو کر کے تہجد کی نماز ادا کی۔ توبہ استغفار کی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ مجھے راہ راست پر رکھے اور تم سے بھی یہ درخواست ہے کہ توبہ استغفار کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک عظیم گناہ سے بچایا ہے۔ اگر ہم اس دلدل میں پھنس جاتے تو شاید کبھی بھی نہیں نکل سکتے تھے۔

یہ میری زندگی کا ایک ناقابل فراموش واقع ہے۔ یہ بزرگوں کی نظر کرم اور اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے کہ مجھے راہ ہدایت ملی۔

ایک منہ بولی بہن کا قصہ اسے اپنے بھائی کی غیرت مندی پر بڑا مان تھا مگر

☆ محمد سلیم اختر

تحصیل کے تھانے کا ایس ایچ او قتل ہو گیا تھا۔ قاتل فرار ہو گیا تھا۔ تحصیل ہی نہیں پورے ضلع کی پولیس حرکت میں آ گئی تھی۔ ناکہ بندی کی جا رہی تھی۔ قاتل ابھی تک ہاتھ نہ آیا تھا۔ تھانیدار کو قصبہ کے ایک بہت ہی جی دار جوان طوطی خان نے قتل کیا تھا۔ بارہ گھنٹے گزر گئے تھے، طوطی خان پولیس سے بچتا ہوا ملاکنڈ کے پہاڑی علاقے میں چھپتا ہوا علاقہ غیر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ علاقہ غیر میں داخل ہو کر ہی وہ پولیس اور قانون سے بچ سکتا تھا۔ جولائی کے دن تھے، سورج سوا نیزے پر آ گیا تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی، ہوا میں حبس بھی بڑھ رہا تھا۔ پیاس سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ کسی سایہ دار جگہ میں بیٹھ کر کچھ دیر ستانا چاہتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کا ذرا سی دیر کو ستانا بھی اس کے لئے موت کا پیغام بن سکتا تھا۔ پولیس کی بھاری نفری اس کی تلاش میں ہو گی۔ پہاڑی علاقے میں وہ مسلسل تین گھنٹوں سے چل رہا تھا۔ وہاں کہیں نشیب تھے اور کہیں فراز، اس کے پاؤں پتھروں سے ٹکرا کر دکھنے لگے تھے۔ کبھی کبھی اس کی سسکی نکل جاتی مگر اسے پھر بھی چلنا تھا۔ آگے بڑھنا تھا، رکنا گویا اس کے لئے موت کا پیغام تھا۔

اس کا تمام جسم پسینے سے شرابور تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ... نے اسے اتنا نڈھال کر دیا تھا کہ لگتا تھا ابھی اس کے سانس کی ڈور ٹوٹ جائے گی...... ایک نشیب میں اس کی سماعتوں سے پانی کے بہنے کی آواز ٹکرائی تو وہ رک گیا۔ اس کو ایک آس سی محسوس ہوئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو کچھ فاصلے پر اسے پانی کا چشمہ نظر آیا۔ وہ گرتا پڑتا وہاں پہنچا۔ اس نے چشمے کے ٹھنڈے پانی سے پیاس بجھائی۔ جی بھر کر سیراب ہوا اور پھر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا...... وہ دو دنوں سے مسلسل جاگ رہا تھا۔ اب اسے نیند آ رہی تھی مگر وہ پھر بھی سونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند کے باوجود شکرے کی طرح گردش کر رہی تھیں۔ اس نے کندھے سے کلاشنکوف اتاری اور اسے جھولی میں رکھ کر چند لمحوں کے لئے آنکھیں موند لیں۔

◆◆◆

تھانے کے ایس ایچ او خانزادہ کا باپ ریٹائرڈ ایس پی تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو بھی اپنے جیسا ہی بنانا چاہتا تھا مگر وہ صرف تھانیدار ہی بن سکا کیونکہ وہ اچھے کردار کا مالک نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر عیاشی کیا کرتا تھا مگر اب جب کہ وہ خود تھانیدار بن گیا تھا تو اس میں ایک خبیث اور شیطان روح سرایت کر گئی تھی۔ وہ عورتوں کا رسیا تھا۔ اپنی تھانیداری کا رعب ڈال کر عورت کو حاصل کرنا اس کے لئے نہایت ہی آسان تھا۔

اس کے اس کردار سے قصبہ والے نفرت کرتے تھے مگر کوئی اس سے ٹکر نہ لے سکتا تھا۔

طوطی خان اسی قصبہ کا رہنے والا تھا۔ وہ ایک غیرت مند اور جی دار انسان تھا۔ گاؤں کے کمزور اور نادار لوگوں کی خدمت کرنا اس کا شیوہ تھا۔ مردانہ حسن و جمال میں وہ اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ غیرت مند اتنا کہ قصبہ کی کسی بھی لڑکی کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ گاؤں والے اس کے اعلیٰ کردار اور بہادری کے معترف تھے۔ اس کی ایک ہی بہن تھی، گل بانو۔ وہ واقعی پھولوں کی شہزادی تھی۔ دونوں بہن بھائی میں بہت پیار تھا، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔

پری گل کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ گل بانو اور پری گل سہیلیاں تھیں۔ ایک دوسرے کے گھروں میں ان کا آنا جانا تھا۔ طوطی خان نے اس کے باوجود بھی پری گل کی شکل تک نہ دیکھی تھی اور نہ کبھی ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ پری گل بہت ہی حسین تھی۔ گل بانو سے بھی بڑھ کر۔ اس کا کھلتا ہوا قد بڑی بڑی حسین آنکھوں نے اسے بے حد حسین بنا دیا تھا۔ پری گل کو اپنی دوست گل بانو سے محبت تھی۔ اس کا باپ غریب تھا اور محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ اس کا سسرال وہاں سے بہت دور تھا۔ اس کی بیوی کا تعلق بھی غریب خاندان ہی سے تھا۔ پری گل کی نسبت انہوں نے بچپن میں ہی اس کے ایک ماموں زاد سے طے کر دی تھی۔

پری گل کے حسن کے چرچوں نے گاؤں میں اس کے کئی چاہنے والے پیدا کر دیئے تھے جو اس کے گھر کے اردگرد منڈلاتے تھے۔ جن میں شیرو اور کالو سرفہرست تھے۔ وہ دونوں پری گل کے باپ کی برادری کے تھے اور دونوں ہی پری گل سے شادی کرنے کے خواہشمند تھے۔ بس اسی بات پر ان میں دشمنی پیدا ہو گئی۔ بات زبان سے ہوتی ہوئی گالی گلوچ، لڑائی اور مار کٹائی تک ہی محدود نہ رہی بلکہ انہوں نے پستول نکال لئے اور وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے۔ گولیوں کا تبادلہ ہوا اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی گولیوں کا نشانہ بن کر زندگی گنوا بیٹھے۔ بات گاؤں سے تھانے اور عدالت تک جا پہنچی۔

تھانیدار خانزادہ نے پری گل اور اس کے باپ کو تھانے بلا لیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون سی لڑکی ہے جس کی خاطر دو گھبرو جوان زندگی گنوا بیٹھے ہیں۔ اس نے پری گل کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے اندر سویا عورتوں کا شکاری درندہ جاگ اٹھا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ پری گل کو اپنے بستر کی زینت بنا کر ہی دم لے گا۔ اس نے وقتی طور پر اسے جانے دیا۔ ایک دو ماہ گزر گئے لوگ شیرو اور کالو کی موت کو بھول گئے تو تھانیدار نے اپنے بندوں سے پری گل کو اغوا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر طوطی خان نے تھانیدار کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ وہ اتفاق سے ان غنڈوں کے راستے میں آ گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اغوا کی جانے والی لڑکی پری گل ہے۔ اس نے تو گاؤں کی عزت بچائی تھی اور وہ بھی اپنی جان پر کھیل کر۔ بس اس دن سے تھانیدار طوطی خان کا دشمن بن گیا اور وہ اس کو اپنی راہ کا کانٹا جاننے لگا۔ اس نے بھیڑیے کے جبڑوں سے اس کا شکار چھینا تھا۔ کیسے معاف کر دیتا۔

اس حادثہ کے بعد پری گل کے ماں باپ نے دیر نہ لگائی اور اس کی شادی کر دی اور وہ بیاہ کر بہت دور چلی گئی۔ اس کی سہیلی گل بانو اس روز بہت روئی تھی مگر پری گل کے ماں باپ نے سکھ کا سانس لیا کہ ان کی عزت محفوظ ہو گئی ہے۔ پری گل کی شادی انتہائی سادگی اور خاموشی سے ہوئی تھی۔ گاؤں کے لوگوں کو بھی اس کی خبر نہ ہوئی تھی۔ طوطی خان کو اس کی بہن گل بانو نے بتایا تھا کہ اس نے جس لڑکی کی عزت بچائی ہے وہ اس کی سہیلی پری گل ہے۔ جواب میں طوطی خان نے صرف اتنا ہی کہا

تھا۔ بہن کی سہیلی بھی میری بہن ہی ہے۔ یہ کوئی احسان نہیں ہے۔

گل بانو بھائی کی زبان سے ایسے الفاظ سن کر بہت خوش ہوئی تھی کہ اس کا بھائی کتنا غیرت والا ہے، ایسا بھائی اللہ ہر بہن کو دے۔

طوطی خان کاروبار کے سلسلہ میں پشاور تک جاتا رہتا تھا۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں وہ رات کو گھر لوٹ آتا تھا۔ اس روز پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے ایک رات کے لئے وہاں مجبوراً ٹھہرنا پڑا تھا۔ اس کی واپسی اگلی رات کو ہوئی تھی۔ مگر وہ رات اس کے لئے قیامت کی رات بن گئی تھی۔ تھانیدار کے بندے طوطی خان کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ تھانیدار کو معلوم ہوا کہ آج رات طوطی خان گاؤں سے باہر ہے تو اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے طوطی خان کی بہن گل بانو کو اغوا کرایا اور اسے بے آبرو کر ڈالا۔ گل بانو اپنی بے حرمتی اور رسوائی برداشت نہ کر سکی تو اس نے خودکشی کر لی۔ اگلے دن جب طوطی خان گاؤں پہنچا تو اس کی بہن کا جنازہ تیار تھا۔ ساری واردات سن کر وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ نکلا۔ اس نے گل بانو کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا اور پھر اس کی قبر کی مٹی کو مٹھی میں بھر کر قسم کھائی کہ وہ خانزادہ کو کتے کی موت مارے گا اور طوطی خان نے ایسا ہی کیا۔ اس نے خان زادہ کو اتنی بے دردی سے قتل کیا کہ اس کے جسم کے کئی ٹکڑے کر ڈالے۔ اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو وہ بھاگ نکلا۔

◆◆◆

طوطی خان کی آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔ وہ اٹھا اور آگے کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہاڑی سلسلہ اس کے مقدر کی طرح دشوار گزار تھا۔ مگر اس نے تو چلنا تھا یہاں تک کہ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اسے ایک آبادی نظر آئی جہاں چند ہی گھر بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک پہاڑی بستی تھی جس کے متعلق اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے اور اس کا نام کیا ہے۔ سارے گھر پتھروں کے بنے ہوئے تھے۔ اب تو اندھیرا بھی پھیلنے لگا تھا۔ بھوک اور تھکن سے اس کا برا حال تھا۔ اندھیرا کچھ گہرا ہوا تو وہ محتاط انداز میں چلنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ پتھروں سے بنے ہوئے ایک گھر کے سامنے آ کر رک گیا۔ دو کمروں کے گھر میں سے ایک کمرے کے روشن دان سے ہلکی سی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ وہ گھر بستی کے دوسرے گھروں سے ذرا ہٹ کر تھا۔

وہ دبے پاؤں چلتا ہوا ایک کمرے تک جا پہنچا۔ وہ چند لمحوں تک گھر کے مکینوں کی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا۔ کمرے کے دروازے کے پاس جا کر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا تو وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ وہ کمرہ خالی تھا مگر دیا جل رہا تھا۔ جس کی مدھم روشنی میں اسے دو چارپائیاں نظر آئیں۔ جن پر اجلی چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ وہ چند منٹ تک یونہی کھڑا رہا۔ پھر اچانک اس کی سماعت سے دو نسوانی آوازیں ٹکرائیں جو کمرے کے باہر سے آ رہی تھیں اور آہستہ آہستہ اس کمرے کے قریب آ رہی تھیں۔ وہ بجلی کی تیزی سے دروازے کے پیچھے ہو کر چھپ گیا۔ اس نے اپنا سر اور چہرہ چادر میں چھپا لیا کہ اب اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی ہیں۔ اب آوازیں بہت ہی قریب آ گئی تھیں۔

''اچھا میں چلتی ہوں، ڈرنا نہیں۔ زاراج خان آتا ہی ہوگا۔ پہلے تو اس نے کبھی اتنی دیر نہیں لگائی اس وقت آ جاتا ہے۔ اگر تم کہو تو اس کے آنے تک میں ٹھہر جاؤں''۔

''نہیں ترور (خالہ) میرے لئے یہ نئی بات نہیں ہے''۔ لڑکی نے کہا۔ ''ویسے تو وہ ہر کام میں بڑا جلد باز ہے لیکن ہفتہ میں ایک دن شہر جاتا اور دیر سے واپس آتا۔ اس کی عادت ہے۔ ہاں آج ذرا زیادہ دیر ہو گئی ہے۔

اندھیرا بھی بڑھ گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں وہ آتے ہی ہوں گے“۔

”بنی! میں تو کہتی ہوں کمرے کو تالا لگاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ تم نئی نویلی دلہن ہو تجھے میں نے اکیلا چھوڑا تو زاراج ناراض نہ ہو جائے“۔

”ارے ترور! (خالہ) وہ ناراض نہیں ہوں گے میں انہیں منالوں گی“۔ لڑکی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ پھر اس کی خالہ چلی گئی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور وہ لڑکی اندر داخل ہوئی لیکن پھر دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے نقاب پوش کو دیکھ کر وہ سہم گئی۔

”کون ہو وہ گھبراہٹ کے عالم میں بولی۔ دیئے کی کہ روشنی میں وہ اسے پوری طرح نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ اسے کوئی جواب نہ ملا تو وہ پھر بولی۔ ”تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر میرا شوہر آ گیا تو تمہارے کئی ٹکڑے کر دے گا۔ اگر تم غلط نیت سے اس گھر میں داخل ہوئے ہو تو تمہاری زندگی کی سب سے بڑی بھول ہو گی اور اگر چوری کی نیت سے آئے تو سن لو یہاں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے“۔

طوطی خان ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور کلاشنکوف کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا۔

”بڑی جی دار عورت ہو۔ بہرحال تم گھبراؤ مت، میں کمزوروں کو کچھ نہیں کہتا لیکن تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا“۔

”وہ کیا؟“

”تم میرے یہاں آنے کا کسی سے ذکر نہیں کرو گی صرف آج کی رات میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا“۔

”اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی“۔ وہ لاپروائی سے بولی۔ ”ابھی میرا خاوند آتا ہوگا۔ وہ تم جیسے دو تین سورماؤں کے لئے اکیلا ہی کافی ہے۔ تم نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر میں گھسنے کی جرأت کی ہے۔ دیکھ لینا وہ تمہارے اتنے ٹکڑے کرے گا کہ تمہاری ماں بھی تمہیں نہیں پہچان سکے گی“۔

”اے لڑکی! مجھے دھمکی مت دو، میرا نام بھی طوطی خان ہے۔ جس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا“۔

”کون طوطی خان؟“ لڑکی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”میں کوئی گرام کا رہنے والا ہوں“۔ طوطی بولا۔

”تم گل بانو کے بھائی ہو؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”ہاں، میں اسی بدنصیب کا بھائی ہوں“۔ وہ افسردگی سے بولا۔

”بھائی! میں پری گل ہوں گل بانو کی سہیلی“ وہ بے تابی سے بولی۔

”پری گل میری بہن نہیں“۔ یہ کہہ کر طوطی نے اپنے سر اور چہرے سے چادر سرکا دی اور کلاشنکوف ایک طرف رکھ دی۔

پری گل اس کے قدموں میں جھک گئی اور بولی۔ ”طوطی بھائی! مجھے معاف کر دو تم انسان نہیں فرشتے ہو۔ تم میری عزت کے محافظ ہوں۔ میں مرتے دم تک تمہارا احسان نہیں بھولوں گی“۔

طوطی خان نے پری گل کو اٹھایا اور اس کے سر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”آج سے تم ہی میرے لئے گل بانو ہو“۔

طوطی خان سسکنے لگا اور پھر رو رو کر اس نے پری گل کو گل بانو کے اغوا، آبرو کے لٹنے اور اس کی موت کی خبر سنائی تو پری گل بھی رونے لگی۔ وہ دونوں دیر تک گل بانو کو یاد کر کے اترے رہے۔

”تمہارا شوہر کہاں گیا ہے اور کب آئے گا؟“

”وہ شہر گیا ہے کسی کام سے، اسے آ جانا چاہئے

تھا"۔ پری گل بولی۔

"آج وہ نہیں آ سکے گا"۔ طوطی خان تشویشناک لہجے میں بولا۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"خان زادہ کا قتل کر کے میں چھپتا چھپاتا علاقہ غیر کی طرف جا رہا ہوں۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔ کہیں ناکہ لگ گیا تو اسے دیر ہو سکتی ہے۔ میں بھوک اور پیاس سے نڈھال ہو کر یہاں سے گزرتے ہوئے تمہارے گھر روشنی دیکھی تو چلا آیا ہوں۔ قدرت کو ہمارا ملن یوں ہی منظور تھا"۔

"میں آپ کے لئے کھانا لاتی ہوں"۔ یہ کہہ کر پری گل دوسرے کمرے میں گئی اور طوطی کے لئے کھانا لے آئی۔ طوطی نے چند ہی منٹوں میں کھانا ختم کر لیا۔

"پولیس اپنی تمام تر طاقت کے ساتھ میری تلاش میں ہے"۔ طوطی خان نے کھانے کے بعد کہا۔ "اس پہاڑ کے دوسری طرف میرے ننھیال رہتے ہیں جو علاقہ غیر بھی ہے۔ میں وہاں جا رہا تھا کہ راستے میں رات ہو گئی ہے۔ میرا سفر بہت طویل ہے۔ اس لئے میں تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں"۔

"تم ساتھ والے کمرے میں چلے جاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔ میں باہر سے تالا لگا دوں گی۔ یہ لو ماچس دروازے کے اوپر لالٹین رکھی ہے۔ ضرورت کے وقت تھوڑی دیر کے لئے جلا لینا۔ مگر زیادہ دیر کے لئے نہیں اور جب تک میں نہ کہوں باہر مت آنا"۔

طوطی خان کمرے کی طرف جانے کے لئے مڑا اور اکڑ کر بولا۔

"اگر تمہارا شوہر آ گیا تو؟"

"میں اس کو ساری بات بتا دوں گی...... وہ دل کا بہت اچھا ہے وہ تمہاری ضرور مدد کرے گا"۔

پری گل کی تسلی سے وہ مطمئن ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اندر سے کنڈی لگائی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

پری گل نے باہر سے تالا لگا دیا...... یوں ہی رات گزر گئی، زاراج خان نہیں لوٹا تھا۔

◆◆◆

صبح ہوئی تو پری گل پریشان ہو گئی کہ زاراج خان رات کو نہیں آیا، اللہ خیر کرے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج تو زاراج ضرور آ جائے گا۔ پری گل نے صبح کی نماز ادا کی اور زارج کی سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ پھر اس نے ناشتہ تیار کیا۔ اس نے دوسرے کمرے کا تالا کھولا۔ طوطی خان کو ناشتہ دیا اور پھر باہر نکل کر کمرے کو تالا لگا دیا۔ طوطی خان نے ناشتہ کر کے آگے کا سفر کرنا تھا...... مگر اس کی روانگی سے قبل ہی زاراج لوٹ آیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے پری گل کو سینے لگا لیا۔

"ساری رات کہاں تھے؟" پری گل شکایت بھری آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"ارے میں تو شام کو ہی پہنچ جاتا مگر سارے علاقے کو پولیس نے گھیر رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے بھی روک لیا۔ کہنے لگے کہ اس طرف ایک قاتل کو جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ لہٰذا شام کو تمہارا جانا مناسب نہیں۔ اب پولیس والوں کے ساتھ ہی آیا ہوں۔ پولیس والے گاؤں کو گھیرے میں لینے والے ہیں۔ ان کے ساتھ بڑے بڑے کتے ہیں جو قاتل کی بو پر یہاں پہنچے ہیں۔ ویسے اگر قاتل اس گاؤں میں ہوا تو بچ نہیں سکے گا، پکڑا جائے گا۔ تم نے اپنی سناؤ، رات کو ڈر تو نہیں لگا...... خالہ کو سلا لیا ہوتا"۔

پری گل گھبرا سی گئی۔ اس نے زاراج سے قاتل کے بارے میں کچھ نہ پوچھا کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ وہ طوطی خان ہی کی بات کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی فکر لاحق ہو

گئی کہ نہ جانے زاراج..... اس کے گھر میں طوطی خان کی موجودگی کو کیا رنگ دیتا ہے اور کیا وہ اسے برداشت کرے گا بھی یا نہیں۔ اسے اس کی جلد باز طبیعت اور بے پناہ غصے کا اندازہ تھا۔

''اچھا جلدی سے کھانا دو، بہت بھوک لگی ہے''۔

وہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔

پری گل..... زراج کے لئے کھانا بنانے کے لئے کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ اسے اچانک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... زاراج چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں تین سپاہی دو کتوں کے ہمراہ آتے دکھائی دیئے۔ کتے یوں اچھل رہے تھے جیسے وہ زنجیروں سے آزاد ہونا چاہتے ہوں۔ رفتہ رفتہ وہ قریب آ گئے اور وہ دونوں کتے زاراج کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔

''انہیں یہاں سے لے جاؤ''۔ زاراج غصے سے بولا۔

''ہم انہیں کیسے ہٹائیں، ہم ان کو خود تو نہیں لائے یہ تو قاتل کی بو پا کر آئے ہیں۔ قاتل اس گھر میں ہی داخل ہوا ہے جب ہی تو یہ سارا گاؤں چھوڑ کر یہاں آنا چاہتے ہیں''۔ ایک سپاہی پورا زور لگا کر کتے کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''تم کیا بکواس کر رہے ہو، اس قاتل کا یہاں کیا کام؟'' زاراج غصے سے بھرا ہوا بولا۔

اتنی دیر میں ایک کتا اندر داخل ہو چکا تھا اور وہ ساتھ والے کمرے کے دروازے کی طرف منہ کر کے زور زور سے بھونکنے لگا۔ دوسرا کتا بھی اس کی تقلید کرنے لگا۔

''قاتل اسی کمرے میں ہے''۔ ایک سپاہی وثوق سے بولا۔

زاراج نے پری گل کی طرف دیکھا اور اسے چابی لانے کو کہا۔ مگر پری گل پر تو سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

زاراج غصے سے دھاڑا۔ ''میں کہتا ہوں چابی دو تاکہ میں تالا کھول کر انہیں دکھا دوں''۔

پری گل التجا آمیز نظروں سے زاراج کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر نہ کہہ پا رہی تھی۔ پولیس کا ایک سپاہی آگے بڑھا۔ اس نے ایک شک بھری بھرپور نظر پری گل پر ڈالی اور پھر زاراج سے مخاطب ہوا۔

''مجھے سو فیصد یقین ہے کہ ہمارا مجرم اسی کمرے میں ہے۔ اگر چابی نہیں ملتی تو ہم دروازہ توڑ دیتے ہیں''۔

یہ کہہ کر سب پولیس والے مل کر دروازہ توڑنے لگے تو اچانک کھڑکی سے فائرنگ ہونے لگی۔ پولیس والوں نے بھی جوابی فائر کھول دیا۔ کچھ دیر بعد فائرنگ بند ہو گئی۔ طوطی خان کی کلاشنکوف کی گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ پھر دروازہ توڑا گیا۔ پولیس والے اندر داخل ہو گئے۔ جب وہ باہر نکلے تو طوطی خان زخمی حالت میں زاراج اور پری گل کے سامنے کھڑا تھا۔

پری گل زاراج کے قدموں میں گر گئی اور روتی ہوئی بولی۔ ''یہ میرا محسن بھائی ہے''۔

مگر زاراج نے اس کے الفاظ نہ سنے۔ اس نے پری گل کو ایک ٹھوکر مار کر دور لڑھکا دیا۔ اس نے جیب سے پستول نکالا اور زمین پر گری پری گل پر گولیاں چلا دیں..... پھر اس نے پستول کا رخ طوطی خان کی طرف موڑا اور باقی گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔ زاراج سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر خون میں لت پت پری گل اور طوطی خان کی لاشیں اوندھے منہ پڑی تھیں اور زاراج کو پولیس والوں نے قابو کر لیا تھا۔ ایک غیرت مند نے دوسرے غیرت مند کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

❋❋❋

ماہ ستمبر کے حوالے سے پاکستان کے سب سے بڑے جنگی وقائع نگار عنایت اللہ کی ناقابل فراموش تحریر

وہ کوئی اور تھا

ماں! میں شہید ہو جاؤں تو دودھ کی دھاریں بخش دینا...... تجھے اللہ پاک کی قسم ہے کہ رونا مت، نہیں تو میری نیکی برباد ہو جائے گی۔

☆ عنایت اللہ

قند مکرر

اگر میرے بریف کیس پر میرا نام نہ لکھا ہوتا تو ہم دونوں ریل کار کی ایک ہی سیٹ پر پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بیگانہ اور اجنبی رہتے۔ گندمی رنگ کا وہ جواں سال آدمی مسکرا رہا تھا جیسے اپنے آپ سے کوئی مذاق کر کے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ وہ لٹھے کی بش شرٹ اور خاکی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر سنجیدگی کا تاثر نمایاں تھا۔ ہم ریل کار کی آخری سیٹ پر بیٹھے تھے جہاں سے پچھلے شیشے سے ہمیں پیچھے کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ میں لاہور شہر کو تیزی سے پیچھے ہٹتا اور اونچی اونچی عمارتوں اور شاہی مسجد کے بلند میناروں کو چھوٹا ہوتا دیکھ رہا تھا۔ سورج ابھرتا چلا آ رہا تھا۔

''عنایت اللہ صاحب آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

میں نے چونک کر اپنے ہم سفر کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی تھی۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو میں نے کم ہی انسانوں میں کبھی دیکھی ہو گی۔ اس مسکراہٹ اور آنکھوں کی اس انوکھی سی چمک کے بغیر وہ بالکل عام سا انسان تھا۔ مہنگائی اور معاشرتی خلفشار کا مارا ہوا پاکستانی جو سینے میں سو دکھ چھپا کر تصوروں میں مسکرانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ میں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اس نے کہا۔ ''آپ کے بیگ پر آپ کا نام پڑھا ہے۔ ساتھ ''حکایت'' بھی لکھا ہوا ہے؟''

''میں راولپنڈی جا رہا ہوں''۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''اور آپ؟''

''گوجر خان''۔ اس نے کہا اور میں نے دیکھا کہ اس کی مسکراہٹ قدرے ماند پڑ گئی تھی۔ کہنے لگا۔ ''میں جنگ ستمبر کے متعلق آپ کے سارے ہی مضامین پڑھ چکا ہوں اور باقاعدگی سے پڑھتا ہوں''۔ اس نے ذرا توقف سے پوچھا۔ ''آپ جنگی کہانیاں کیوں لکھتے ہیں؟...... اس لئے کہ پرچہ زیادہ فروخت ہو یا آپ سچے دل سے پاک افواج کے کارناموں کو آنے والی نسلوں کے لئے لکھ رہے ہیں؟''

''آنے والی نسلوں کے لئے''۔ میں نے اسے کہا۔ ''اگر جنگی کہانیوں کی وجہ سے پرچے کی فروخت کم ہو گئی تو بھی میں یہ کہانیاں لکھتا رہوں گا''۔

''کیا آپ نے کبھی جائزہ لیا ہے کہ لوگ کب تک یہ کہانیاں سنتے رہیں گے اور کب اکتا جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔ ''کیا ایسا وقت بھی آئے گا جب قوم ان کہانیوں سے منہ موڑ لے گی؟''

''شاید نہیں''۔ میں نے کہا۔ ''پاکستانی ایک غیور قوم ہے۔ کوئی بھی پاکستانی ان زخموں کو نہیں بھول سکتا جو اس نے دشمن کے ہاتھوں کھائے ہیں۔ پاکستانی اپنی ان بہو بیٹیوں کو بھی نہیں بھول سکتے جو دشمن کی درندگی کا شکار ہو گئیں اور پاکستانی اپنے ان شہیدوں کو کیسے بھول سکیں گے جو ان ماؤں بہنوں کی آبرو پر قربان ہو گئے''۔

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح شہید ہوئے تھے؟'' اس نے معصوم سے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ نے ان کی لاشیں دیکھی ہوں گی، انہیں اس وقت نہیں دیکھا ہو گا جب ان کی آخری سانس کے ساتھ ان کے سینے سے آخری نعرہ تکبیر نکلا تھا اور اس نعرے کے ساتھ ہی ان کی روح نکل گئی تھی...... میں نے انہیں دیکھا تھا''۔ اس نے لمبی آہ بھری اور سوئے ہوئے سے لہجے میں بولا۔ ''میں نے ان کی لاشوں کو ان ہاتھوں سے اٹھایا تھا''۔

''آپ فوج میں ہیں؟''

''تھا''۔ اس نے کہا۔ ''سروس پوری ہو گئی ہے۔ خدا کا شکر ادا کیا کرتا ہوں کہ اس کی ذات نے ستمبر کی جنگ لڑنے کی سعادت عطا فرمائی تھی''۔

''آپ کون سے محاذ پر تھے؟''

''میں سارے ہی محاذوں پر تھا''۔ اس نے مسکرا کر

کہا۔ ”محاذ ایک ہی تھا، ایک ہی سرحد تھی۔ راجستھان کا صحرا بھی ہمارا، ٹیٹوال کی وادیاں بھی ہماری تھیں۔ ہم جہاں جہاں لڑ رہے تھے اس جگہ کا ایک ایک انچ ہمارے لئے پورے پاکستان جتنا قیمتی تھا۔ اس ایک انچ سے پیچھے ہٹنے کو ہمارے جوان پورے پاکستان سے پیچھے ہٹ جانے کے برابر سمجھتے تھے۔ ان کے قدم جہاں جم گئے، جم گئے۔ وہاں سے ان کی لاشیں اٹھائی گئی تھیں......“ وہ چپ ہو گیا اور کچھ سوچ کر بولا۔ ”آپ نے ایک جنگی واقعہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا ’وہ پیاسا شہید ہوا‘...... وہ واقعی سچا واقعہ تھا لیکن عنایت صاحب! پیاسا شہید ہونے والا وہی ایک نہیں تھا۔ سب پیاسے شہید ہوئے تھے۔ ان کی بوتلیں یا تو پانی سے بھری ہوئی تھیں اور انہیں پانی پینے کی مہلت نہیں ملی تھی یا ان کی بوتلیں بالکل خالی تھیں کیونکہ محاذ پر پہنچنے کی جلدی میں وہ اپنے ساتھ پانی لے جانا بھول گئے تھے۔ مورچوں میں پانی بھی پہنچتا رہا تھا اور کھانا بھی لیکن پانی کا گھونٹ یا روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے ضمیر پر کچھ ایسا بوجھ محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ہم فرض کی ادائیگی کے دوران عیاشی کر رہے ہوں۔ جنگ ختم ہوئے کئی برس گزر چلے ہیں لیکن میں اب بھی کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو......“ وہ چپ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں لال سرخ ہو گئی تھیں اور وہ ریل کار کے پچھلے شیشے سے باہر دیکھنے لگا تھا اور میں اس کی آنکھوں کے تاثر سے اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ محاذ پر جا پہنچا ہے۔

اس نے ایک جھٹکے سے گردن میری طرف گھمائی اور پُرجوش لہجے میں بولا۔ ”آپ کو ابھی بہت کچھ لکھنا ہے۔ اس وقت تک آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ جسموں کی کہانیاں ہیں۔ آپ نے ابھی ان روحوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا جنہوں نے ان جسموں کے اندر بیٹھ کر انسانوں کو اسی طرح لڑایا تھا جس طرح انسان ٹینک میں بیٹھ کر ٹینک کو لڑاتا ہے۔ یہ بات بالکل سچ ہے بھائی جی! کہ انسان ٹینک بن گئے تھے لیکن...... لیکن......“ وہ سوچ میں پڑ گیا اور ایسے انداز سے مسکرایا جیسے کسی سوال کا جواب نہ پا کر کھسیانا ہو گیا ہو۔ کہنے لگا۔ ”میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ شاید آپ بتا سکیں کہ ان میں اتنی ہمت اور اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی؟ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ان کی ماؤں کے دودھ میں کوئی اثر تھا......“ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ نے کسی شہید کی ماں کو بھی دیکھا ہے؟“

میں نے اسے بتایا کہ میں نے ایک شہید کی ماں کو اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنے بیٹے کے تابوت کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کا بیٹا راجستھان کے محاذ پر زخمی ہوا تھا۔ یہ سادھیوال کا آخری معرکہ تھا جو فائر بندی کے بعد لڑا گیا تھا۔ اس سیکٹر میں فائر بندی کے بعد معرکے لڑے گئے تھے کیونکہ پاکستان کی صحرائی فوج (ڈیزرٹ فورس) نے اس طرف سے دشمن کے سینکڑوں مربع میل پر قبضہ کر لیا تھا۔ دشمن نے اس علاقے کو چھڑانے کے لئے فائر بندی کے بعد بریگیڈوں کی نفری سے حملے شروع کر دیئے تھے۔ اس کے پاس تو توپخانہ بھی تھا اور فضائیہ بھی لیکن ادھر انڈس رینجرز کے چند سو رائفل بردار اور ان کے ساتھ سندھ کے حر تھے۔ نہ کوئی توپ نہ طیارہ۔ ڈیزرٹ فورس کے جوانوں نے ان تپتے ہوئے ظالم ریگزاروں میں نہ صرف دشمن کے بریگیڈوں کے حملے روکے بلکہ ان بریگیڈوں کو صحرا میں بکھیر کر جوابی حملے کئے اور دسمبر 1965ء تک دشمن کے دو ہزار مربع میل علاقے پر قابض ہو گئے۔

سادھیوال کا آخری معرکہ دشمن کی سرحد کے بیس میل اندر لڑا گیا تھا اور پاکستان کے صحرائی غازیوں نے دشمن کے سینے پر جا جھنڈا گاڑا تھا۔ یہ تو ایک معجزہ تھا جو ان غازیوں نے کر دکھایا۔ چھ سات سو رائفل برداروں نے پانچ ہزار کے بریگیڈ کا کم ہی کبھی مقابلہ کیا ہو گا۔

بھارت کے اس بریگیڈ میں سکھ لائٹ انفنٹری اور بہبے گرینیڈیرز جیسی چنی ہوئی۔ پلٹنیں بھی تھیں۔ بھارتی حکمرانوں نے ان چنی ہوئی اور جنگ کی تجربہ کار پلٹنوں کو اس لئے اس بریگیڈ میں شامل کیا تھا کہ سادھیوال سیکٹر میں انڈین آرمی کی پسپائی سے بھارتی عوام میں ان کی ساکھ ختم ہوگئی تھی۔ وہ ہر قیمت پر اس سیکٹر سے پاکستان کی صحرائی فوج کو پیچھے دھکیلنا چاہتے تھے۔ اس بریگیڈ کی انہوں نے اس حد تک خاطر مدارات کی تھی کہ جس صبح پاکستانیوں نے سادھیوال پر جوابی حملہ کیا اس صبح پورے بھارتی بریگیڈ کے لئے بہت بڑے "کڑاہ" میں حلوہ پک رہا تھا۔

پاک صحرائی دستوں کے پاس اس روز پہلی بار مارٹر گنیں آئی تھیں ورنہ وہ ان کے بغیر لڑتے رہے تھے۔ جب حملہ شروع کرنے سے پیشتر مارٹر گنیں فائر کی گئیں تو ایک گولہ "کڑاہ" میں جا گرا اور سارے بریگیڈ کا حلوہ ریت پر بکھر گیا۔ اس کے بعد سارے چار گھنٹے چند سو مجاہدوں نے رائفلوں سے توپوں، مارٹروں اور بھارتی بریگیڈ کی چار پلٹنوں (جن میں چنی ہوئی پلٹنیں بھی شامل تھیں) کو ریگزار اور صحرائی ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں بالکل اسی طرح بکھیر دیا جس طرح وہ ان کے حلوے کو بکھیر چکے تھے اور سادھیوال کی چوکی ان کے قبضے میں آ گئی۔

میں اس معرکے کے چند روز بعد اس محاذ پہ گیا تھا۔ دشمن کی سینکڑوں لاشوں کو پاکستانی مجاہد ایک ہی جگہ دبا چکے تھے اور صحرائی لومڑیاں لاشوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر لے جا رہی تھیں۔ دور دور تک ہندوؤں اور سکھوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں کئی لاشوں پر وردی بھی نہیں تھی۔ صرف بنیان اور انڈرویئر تھے کیونکہ یہ سورمے پاکستانی ڈیزرٹ فورس کے حملے کی شدت سے بوکھلا کر بھاگے تو صحرائی ٹیکریوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک گئے تھے۔ جانے کتنے دن یا کتنی دیر بھٹکتے رہے اور جسم سے وزن کم کرنے کے لئے انہوں نے رائفل، ایمونیشن، بوٹ اور وردی بھی کہیں پھینک دی تھی۔ ان لاشوں پر کوئی زخم نہیں تھا، کوئی چوٹ نہیں تھی۔ وہ ریگزار میں پیاسے مر گئے تھے۔ وہ بھٹک گئے تھے۔ یہی تھے بھارت کے وہ چنے ہوئے سورمے جو پاکستان کو فتح کرنے کے لئے حیدر آباد اور رحیم یار خان تک پہنچنے کے لئے آئے تھے۔

ہاں تو میں شہید کی ماں کی بات کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا اسی معرکے میں زخمی ہو کر ہسپتال آیا تھا۔ میں جس روز رحیم یار خان پہنچا اس روز قوم کا یہ بیٹا ہسپتال میں شہید ہو گیا تھا۔ اس کی میت تابوت میں رکھی تھی اور تابوت ہسپتال کے سامنے پڑا تھا۔ ہسپتال کی منڈیر پر پاکستان کا سبز جھنڈا بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔ شہید کی ماں تابوت کے پاس زمین پر بیٹھی تھی اور میں اس کے چہرے کو بڑے ہی غور سے دیکھ رہا تھا اور اس قابل صد احترام چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ماں کی آنکھیں خشک تھیں، ہونٹ نیم وا اور چہرے پر ایسا تاثر تھا جسے میں سنجیدگی بھی نہیں کہہ سکتا، متانت بھی نہیں، نہ میں اسے دکھ اور درد کہہ سکتا ہوں۔ میں اس تاثر کو بیان نہیں کر سکتا۔ ماں چپ چاپ تابوت کو دیکھ رہی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ آنکھیں بھی نہیں جھپک رہی۔ دو چار لمحوں بعد اس نے ہولے سے سر اٹھایا اور اوپر منڈیر پر جھومتے سبز جھنڈے کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر اس مقدس جھنڈے کو دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ نظریں نیچے کر کے اپنے بیٹے کے تابوت کو دیکھنے لگی۔

اب کے اس کے چہرے کا تاثر نمایاں اور قابل فہم تھا۔ وہ ایک ماں تھی جو اپنے جوان بیٹے کی لاش پر چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی لیکن اس کی ذات میں پاکستان کی جو عظیم ماں تھی وہ اسے رونے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے چہرے کا تاثر صاف بتا رہا تھا کہ یہ ماں اس سبز جھنڈے کو

دیکھ کر اندر ہی اندر فخر سے کہہ رہی ہے کہ اس پرچم کی ہریالی میں میرے جگر کا خون شامل ہے۔

''اور عنایت صاحب!'' میرے ہم سفر نے میری بات سن کر کہا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ ستمبر میں کتنے جگر کٹ گئے ہیں جن سے ابھی تک خون ٹپک ٹپک کر اس پرچم کی ہریالی میں شامل ہو رہا ہے؟...... کسی کو معلوم نہیں۔ کبھی معلوم نہ ہو سکے گا لیکن بھائی جی! ایک بات ضرور ہے کہ ایک شہید کی ماں کو دیکھو تو لگتا ہے جیسے ہر شہید کی ماں کو دیکھ لیا ہے''۔

وہ پھر چپ ہو گیا۔ ریل کار تر کی ''ڈومیلی'' کی پہاڑیوں سے گزر رہی تھی اور وہ پیچھے ہٹتی چٹانوں، ریل کی پٹڑی اور درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا شاید اس کے ذہن میں کوئی بات آ گئی تھی جسے وہ یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''بہت سی باتیں ہیں جو کہی بھی نہیں جا سکتیں''۔ اس نے کہا۔ ''آپ فوجیوں کے کچھ زیادہ ہی ہمدرد معلوم ہوتے ہیں ورنہ آپ جنگی کہانیاں نہ لکھتے مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ یہ کہانیاں حاصل کرنے کے لئے آپ کو کتنا خوار ہونا پڑتا ہوگا اور آپ کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہوں گے...... میں سینے میں ایک بھید لئے پھرتا ہوں۔ ابھی تک کسی کو نہیں بتایا۔ آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ گناہ تو نہیں؟ میں نے میدانِ جنگ میں جھوٹ بولا ہے اور ایک شہید کی ماں کو فریب دیا ہے...... ہو سکتا ہے کہ ایسے کئی اور واقعات ہوئے ہوں۔ بھائی جی! ستمبر کی جنگ عجیب وغریب طریقے سے لڑی گئی ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ ڈیڑھ ہزار میل لمبے محاذ پر کیا کچھ ہوتا رہا ہے۔ کہنے کو تو یہی کچھ ہے کہ ہم نے حملہ روک لیا تھا لیکن کس طرح روکا؟ اس جواب کے اندر اتنی ہی کہانیاں ہیں جتنی پاک فوج کی نفری تھی۔ ہم بے شک منہ زور ہو کر لڑے لیکن کمانڈروں کی سکیموں کو خراب نہیں ہونے دیا۔ ان کے حکم کی پوری پابندی کی۔ اس کے باوجود کئی موقعے ایسے بھی آئے جہاں ایک سپاہی کو اپنی ''موو'' کے متعلق خود فیصلہ کرنا پڑا۔ ہمارے ہر ایسے سپاہی نے وہی فیصلہ کیا جو ملک کی سلامتی کے لئے موزوں تھا۔ یہی فیصلے وہ کہانیاں ہیں جو میں چاہتا ہوں کہ تاریخ میں آ جائیں۔ بھائی جی! ضرورت یہ ہے کہ کسی شہید کی جگہ جو نیا جوان پاک فوج میں بھرتی ہو تو اسے معلوم ہو! چاہئے کہ جس کی رائفل مجھے دی گئی ہے وہ شہید ہوا تھا اور اس رائفل یا مشین گن سے اس نے وطن کی عزت بچائی تھی......

''بات یہ ہے عنایت صاحب! میں نے اپنے گاؤں کے ایک لڑکے کو فوج میں بھرتی کروایا تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور اس کے دو چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی زمین خاصی ہے جو اس وقت بھی انہوں نے بٹائی پر دے رکھی تھی اور اب بھی بٹائی پر دی ہوئی ہے۔ یہ لڑکا باپ کے مرنے کے بعد آوارہ سا ہو چلا تھا۔ شہر دور نہیں تھا۔ اسے دراصل شہر کی سیر اور سینما کی لت پڑ گئی تھی''۔

''کہاں کا رہنے والا تھا؟''

''یہ نہ پوچھیں''۔ اس نے کہا۔ ''میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا نہ اس کے گاؤں کا نام۔ اچھا ہوا کہ آپ نے میرا نام نہیں پوچھا۔ میں اپنا بھی نام نہیں بتاؤں گا۔ آپ میری بات سن لیں پھر آپ خود ہی محسوس کریں گے کہ مجھے واقعی نام نہیں بتانا چاہئے''۔

اس نے بات آگے چلاتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکے کو میں نے اپنے گروپ میں بھرتی کرایا تھا۔ ٹریننگ کے بعد وہ میری پلٹن میں آ گیا۔ فوجی ٹریننگ نے اسے خاصا سیدھا کر دیا تھا لیکن پلٹن میں آ کر وہ سینما کا شوقین ہو گیا۔ میں اسے اکثر نصیحتیں کرتا رہتا تھا۔ مجھے زیادہ تر یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اچھا سپاہی نہیں بن

سکے گا۔ بنیادی چیز ڈسپلن ہوتا ہے۔ اس میں ڈسپلن کی بھی کچھ کمی تھی......

''تین سال گزر گئے اور وہ دن آ گیا جس دن کے لئے سپاہی کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔ خبر ملی کہ دشمن نے اعوان شریف پر گولہ باری اور مشین گن فائرنگ کر کے ایک مسجد اور بہت سے لوگوں کو شہید کر دیا ہے۔ یہ لڑکا میرے پاس آیا۔ اسے جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تھی تو میرے پاس بھاگا آتا تھا۔ میں اس وقت حوالدار تھا۔ اس کی مشکلیں یہی ہوتی تھیں کہ آج سیکشن کمانڈر سے تو تو میں میں ہوگئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ کمپنی کمانڈر کے پیش کروں گا یا یہ کہ رات ملٹری پولیس نے بازار میں پکڑ لیا تھا ایسی ہی باتیں ہوتی تھیں۔ جو وہ مجھے آ بتاتا تھا تو میں اسے دو چار گالیاں دے کر اور [illegible] سے چھڑا لیا کرتا تھا۔''

''اس روز اعوان شریف پر بھارتی گولہ باری کی خبر سن کر بھی وہ میرے پاس آیا تھا۔ پریشان تھا۔ پوچھنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟ میں نے بغیر سوچے کہا کہ جو اللہ کو منظور ہوگا۔ اس نے اور زیادہ پریشان ہو کر پوچھا۔ ہم جوابی فائر نہیں کریں گے؟ میں نے کہا کہ حکم ملا تو ضرور کریں گے۔ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ استاد جی! ہم بے غیرت تو نہیں ہیں۔ دشمن گھر آ کر ہمارے بچوں کو مار جائے تو ہم پھر بھی حکم کا انتظار کرتے رہیں گے؟''

''وہ مجھے استاد جی کہا کرتا تھا۔ اعوان شریف پر دشمن کی گولہ باری سے اس کی جو حالت ہو رہی تھی اسے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے اپنے دشمن، اپنی سرحد اور اپنے فرض کو پہچان لیا تھا۔ سپاہی میں اس وصف کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اس جیسے گھامڑ اور لاپروا سپاہی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگے گی لیکن اس میں تو ایسی تبدیلی آئی کہ دو روز بعد اس کا سیکشن کمانڈر مجھے کہنے لگا۔ یار اپنے گرائیں کو تو نے کون سا تعویذ دیا ہے؟ بڑا ''چنگا'' ہو گیا ہے۔ اس روز کے بعد وہ شام کے وقت میرے پاس آ بیٹھتا اور جنگ کی ہی باتیں کہتا سنتا رہتا۔ ایک روز پوچھنے لگا کہ جنگ میں کوئی ہمیں فائر کرنے سے روکے گا تو نہیں؟

''اور چھمب جوڑیاں کی فتح کے بعد جنگ چھڑ گئی۔ ہماری پلٹن پہلے روز تو کھیم کرن سیکٹر میں تھی لیکن سیالکوٹ پر حملہ ہوا تو بہت سے ٹینکوں اور ہماری پلٹن کو سیالکوٹ بھیج دیا گیا...... باتیں تو بڑی لمبی ہیں صاحب! میں آپ کو صرف اس جوان کا واقعہ سناتا ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی پلٹن میں تھے، کمپنیاں مختلف تھیں۔ کھیم کرن پر جوابی حملے کے دوران میں نے ایک روز موقع نکال کر اس سپاہی کے پلاٹون کمانڈر سے پوچھا کہ وہ کس حال میں ہے اور کیسے چل رہا ہے۔ اس کے پلاٹون کمانڈر نے کہا کہ جوان کمال کر رہے ہیں۔ کوئی بھی ڈھیلا نہیں۔ مجھے تسلی ہو گئی......

''ہم دس تاریخ کی رات سیالکوٹ سیکٹر میں آ گئے۔ دشمن کا بہت زور تھا۔ کبھی تو ڈر لگتا تھا کہ سیالکوٹ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ کھیم کرن کا محاذ بھی کم ظالم نہیں تھا لیکن سیالکوٹ کی بات کچھ اور ہی تھی۔ جب میری پلٹن ایک ٹینک سکواڈرن کے ساتھ چھونرا کی طرف بڑھی تو ہم سمجھ گئے کہ دشمن پیچھے ہٹنے کے لئے نہیں آیا۔ اب ہم اسے بھگانا چاہتے تھے کہ پیچھے ہٹنے کے لئے ہم بھی نہیں آئے لیکن بھائی جی! وہ ٹینکوں کی جنگ تھی۔ انفنٹریاں یوں پس رہی تھیں جیسے لڑتے ہوئے بھینسوں یا سانڈوں کے درمیان دو کمسن بچے آ گئے ہوں۔ پہلی ہی ٹکر میں ہم نے دشمن کو چھونرا سے پیچھے تو ہٹا دیا لیکن بہت سی جانوں کی قربانی دے کر۔ پلٹن میں کئی جوان اور عہدیدار شہید ہو گئے جن کی جگہیں پُر کرنے کے لئے مجھے بھی پلاٹون دے دی گئی جس میں یہ سپاہی تھا جس کا میں واقعہ سنا رہا ہوں۔ اس کا پلاٹون کمانڈر شدید زخمی ہو گیا اور ہسپتال میں شہید ہو گیا تھا۔

''اسی رات مجھے حکم ملا کہ دس آدمیوں کی ایک ٹینک شکار پارٹی (Tank Hunting Party) بھیجنی ہے۔ مجھے اس پارٹی کے ساتھ جانا تھا۔ رات کے وقت ٹینک اندھے ہو جاتے ہیں۔ شام ہوتے ہی ٹینکوں کو دور پیچھے لے جاتے ہیں تاکہ ٹینک شکار پارٹیوں سے محفوظ رہیں۔ اگر انہیں آگے ہی رکھنا ہو تو انفنٹری ان کی حفاظت کرتی ہے چنانچہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے چند ایک آدمی ٹینک شکن ہتھیار مثلاً راکٹ لانچر لے کر دشمن کے مورچوں کے علاقے میں گھس جائیں اور ٹینکوں کو تباہ کر آئیں۔ اس مہم پہ جانے والے زندہ واپس آنے کے لئے نہیں جایا کرتے۔ ذرا تصور کیجئے۔ دشمن کے مورچوں کے علاقے میں چلے جانا، جہاں دشمن ذرا سی آہٹ پہ چوکنا ہو جاتا ہے روشنی راؤنڈ فائر کر کے علاقے میں روشنی کر لیتا ہے اور مشین گنوں کی بوچھاڑ میں فائر کرنے لگتا ہے، بارودی سرنگیں بھی بچھی ہوئی ہوتی ہیں اور ان میں آ جانے کا خطرہ ہر لمحہ رہتا ہے، یہ تو دل گردے کا کام ہے۔ اگر پاک فوج کے جوان اس کام سے گھبرا جاتے تو ملک کا اللہ ہی حافظ تھا......

''میں اس رات دس جوانوں کا انتخاب کرنے لگا تو دانستہ اس جوان کو چھوڑ دیا کیونکہ مجھے اس پر بھروسہ نہیں تھا لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ 'استاد جی! میں بھی جاؤں گا'۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ پرانے سپاہیوں کا کام ہے، رات کے وقت ٹھکانے پہ لانچر کا گولہ مارنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ تو جناب منت سماجت کرنے لگا اور میرے گھٹنوں کو چھو کر کہا۔ 'استاد جی! ساری عمر احسان مند رہوں گا۔ مجھے ساتھ لے چلو'...... ہم میں سے کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ اس کی ساری عمر بس یہی چند گھنٹے ہیں۔ میں نے اُسے ساتھ لے لیا۔ چلنے لگے تو بعض جوانوں نے جھک کر زمین کو چھوا اور انگلیاں چوم لیں۔ بعض نے کانوں پہ ہاتھ رکھے، خدا سے گناہوں کی معافی مانگی اور فتح کی دعا کی۔ کسی نے کہا۔ 'اللہ بیلی شیرو! چلو......''

''اور ہم چل پڑے۔ رات چاندنی تھی۔ جب دشمن کی پوزیشنوں کے قریب پہنچے تو میں نے اپنے جوانوں کو آخری بار ہدایات دیں اور کہا کہ بکھر جاؤ، آڑ کا خیال رکھو، فائر کے لئے اور پیچھے نکلنے کے لئے میرے حکم کا انتظار نہ کرنا۔ قید ہونے کا خطرہ ہو تو ہتھیار برباد کر دینا۔ قید ہو جاؤ تو دشمن کو نام اور نمبر کے سوا کچھ نہ بتانا......

''آگے کماد کے کھیت تھے۔ خالی کھیتوں کی اونچی نیچی مینڈھیں بھی تھیں۔ جوان ایک دوسرے کو سلام دعا اور خدا حافظ کہہ کر بکھر گئے اور چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مجھے خیال آیا کہ معلوم نہیں کہ ماؤں کے یہ سجیلے بیٹے میری نظروں سے تھوڑی دیر کے لئے اوجھل ہوئے ہیں یا ہمیشہ کے لئے، یہ خیال آیا اور ذہن سے نکل گیا بھائی جی! میدانِ جنگ میں ایسی باتیں سوچنے والے لڑ نہیں سکتے......

''دشمن کے ٹینکوں کو ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ دراصل دشمن نے خود ہی ہماری مدد کر دی تھی۔ اسے شاید کوئی شک ہوا تھا کہ اس نے یکے بعد دیگرے تین روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے۔ یہ دشمن کی نالائقی تھی۔ یہ پیراشوٹوں والے راؤنڈ تھے جو کچھ دیر فضا میں معلق رہتے ہیں۔ ان کی روشنی میں مجھے دشمن کی پوزیشنیں اور ان کے پیچھے درختوں کے نیچے تین ٹینک کھڑے نظر آ گئے۔ فوراً تین چار مشین گنیں فائر ہوئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''تیرا آسرا میرے مولا، اپنے نام کی لاج رکھنا'۔ مجھے اپنے جوانوں کا فکر ہوا مگر ہم اس قدر دور دور تھے کہ ایک دوسرے کی خبر گیری بھی نہیں کر سکتے تھے۔ دشمن کے فائر کئے ہوئے روشنی راؤنڈ نیچے آ گئے تھے۔ ان کی بجھتی روشنی اور پھیکی سی چاندنی میں مجھے کوئی ایک سو گز دور کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میں لیٹا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف رینگنے لگا۔ وہ یقیناً میرا ہی کوئی جوان تھا۔ میں تیزی

سے رینگتا ہوا اس تک پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنی فیلڈ پٹی کھول رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا کہ زخمی ہو گئے ہو؟ اس نے ہنس کر کہا۔ ہاں استاد جی! ذرا سا زخم ہو گیا ہے۔ وہ میرے گاؤں والا سپاہی تھا۔ اس کے لہجے سے مجھے شک ہوا کہ وہ تکلیف میں ہے اور زخم ذرا سا نہیں جیسا کہ اس نے کہا تھا۔ میں نے آگے ہو کر اس کی ٹانگ دیکھی تو اس کی پتلون کا رنگ گہرا لال ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا زخم کہاں ہے تو اس نے پہلے کی طرح ہنس کر کہا۔ 'یہاں ہے۔ کوئی پروا نہیں استاد جی! ذرا سا زخم ہے۔ میں آگے جاؤں گا.....'

''میں نے اس کی پنڈلی پہ ہاتھ رکھا تو میری انگلیاں گوشت میں دھنس گئیں۔ میں لرز اٹھا۔ قریب ہو کے دیکھا تو اس کی پنڈلی کے پچھے تار تار تھے۔ مشین گن کا پورا برسٹ (بوچھاڑ) اس کی دائیں پنڈلی سے گزر گیا تھا۔ ہڈی دیکھی، سلامت تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں نے اس کا زخم دیکھ لیا ہے تو اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور التجا کی کہ خدا کا واسطہ ہے تجھے استاد! مجھے پیچھے نہ بھیجنا۔ میں چل سکتا ہوں۔ میں نے اس کی پٹی اس کی پنڈلی پر کس دی۔ اوپر اپنی پٹی باندھ دی اور اسے کہا کہ وہ پیچھے چلا جائے لیکن وہ رو پڑا اور کہنے لگا کہ استاد جی! میری بے عزتی نہ کراؤ، مجھے آگے جانے دو۔ سب کہیں گے کہ بزدل گولی کھا کر واپس آ گیا ہے.....

''وہ اٹھا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔ آگے کماد کا کھیت تھا۔ ہم اس کی مینڈھ پہ چلتے کھلے علاقے میں گئے تو لیٹ گئے۔ وہ اچھا بھلا میرے ساتھ رہا۔ اس کے منہ سے میں نے 'سی' بھی نہ سنی۔ میں سرگوشیوں میں اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اتنے میں دور پرے دھما کہ ہوا اور دشمن کا ایک ٹینک جلنے لگا۔ میرے کسی جوان نے شکار مار لیا تھا۔ ان شعلوں نے ہمیں اور شکار دکھا دیا۔ مجھ سے ساٹھ سو گز دور دو ٹینک کھڑے تھے۔ میں نے لانچر سیدھا کیا۔ شست لی اور فائر کر دیا۔ ایک اور ٹینک جلنے لگا۔ اس کے شعلوں نے جو منظر دکھایا وہ میرے لئے ناقابل یقین تھا۔ ہم دشمن کی مشین گن پوسٹ سے بمشکل پچاس گز دور تھے۔ ہماری آڑ اچھی تھی۔ اس مشین گن کی بوچھاڑیں ہمارے اوپر سے چیختی ہوئی گزر رہی تھیں۔ گنرا اندھا دھند کماد کے کھیت میں فائرنگ کر رہے تھے.....

''میرے زخمی ساتھی نے گرینیڈ نکالا تو میں نے اسے روکا کیونکہ گرینیڈ پھینکنے کے لئے اسے کھڑے ہونا تھا اور کھڑے ہو کر وہ دشمن کو نظر آ سکتا تھا۔ ٹینکوں کے شعلوں نے دن کا منظر بنایا ہوا تھا لیکن اس نے میری نہ سنی اور کھڑے ہو کر گرینیڈ پھینکا اور اسی حرکت میں زمین پر پیٹ کے بل گرا۔ میری توقع کے خلاف گرینیڈ وہیں گرا جہاں اسے گرنا چاہئے تھا۔ دشمن کی مشین گن ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی لیکن وہاں تو پوری رجمنٹ تھی جس نے گولیوں کی بارش برسا دی۔ اسی قیامت میں دو اور دھماکے سنائی دیئے اور دو اور ٹینک جلنے لگے اور ان کی روشنی میں ہمیں نے دیکھا کہ تین چار ٹینک تیزی سے پیچھے جا رہے تھے۔ میں نے ایک اور راکٹ فائر کیا مگر خطا گیا۔

ہمارا مشن کامیاب تھا۔ اب واپسی کی مہم تھی۔ ہم رینگ کر نکلے۔ کماد کے کھیت کے اندر نہ گئے کیونکہ دشمن اس میں زیادہ فائرنگ کر رہا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد ہم رینگتے رکتے، رینگتے رکتے چھ سات سو گز پیچھے آ گئے۔ دشمن نے اچانک مارٹر فائر شروع کر دیا۔ کون سی جگہ تھی جہاں مارٹر کا گولہ نہیں گر رہا تھا۔ دشمن کے پاس ایمونیشن کے ڈھیر تھے جو وہ اندھا دھند پھونک رہا تھا۔ ہم اس آگ میں راستہ بناتے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ میرا ساتھی مجھ سے دس بارہ قدم دور ہو گیا تھا۔ ایک گولہ اس سے چھ سات گز پرے پھٹا اور میرا نوجوان غازی لڑکھڑایا اور گرا

پڑا۔ میں دوڑ کر پہنچا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اب وہ کبھی نہ اٹھنے کے لئے گرا تھا۔ مارٹر گولے کے ٹکڑے نے اس کا سینہ کھول دیا تھا۔ میں نے اس کا سر اپنے زانو پہ رکھا تو اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ استاد جی! میں مروں گا تو نہیں، میں نے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔ نہیں گرائیں! میں پوچھ رہا ہوں، میں شہید ہوں گا نا، مروں گا تو نہیں؟'

''بھائی جی! میں نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے۔ مجھے اس کی ماں کا خیال آ گیا۔ سوچا کہ اسے کیا جواب دوں گا۔ وہ کہے گی کہ تم اسے بھرتی کرانے لے گئے تھے، لاؤ میرا بیٹا واپس کرو۔ اتنی دیر میں اس نے پھر پوچھا۔ 'بولو نا استاد جی! میں شہید ہوں نا!' میں نے اسے کہہ ہی دیا۔ 'ہاں بچے! تم شہید ہو۔' اور میں اسے اٹھانے لگا تو اس نے کہا۔ 'نہ استاد جی! پیچھے نہ لے جاؤ، یہیں دفن کر دینا'۔ اس نے گرج کر نعرہ لگایا۔ 'اللہ اکبر' اور وہ شہید ہو گیا.....

''یہ نعرہ سن کر میرے دو جوان اس طرف آ گئے۔ گولے برس رہے تھے۔ انہوں نے شہید کو دیکھا تو کہنے لگا کہ پیچھے لے چلتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ نہیں، اس نے وصیت کی تھی کہ یہیں دفن کرنا۔ ایک جوان کے پاس رائفل تھی۔ اس نے سنگین سے قبر کھودنی شروع کر دی۔ میں نے شہید کی رائفل اٹھا لی اور سنگین سے زمین کا سینہ چیرنے لگا۔ ہم نے ڈیڑھ دو فٹ گڑھا کھود لیا۔ ہاتھوں سے مٹی ہٹاتے رہے اور شہید کو اس میں لٹا کر اوپر مٹی ڈال دی۔ مارٹر فائر رک گیا لیکن مشین گنیں چلتی رہیں اور گولیوں کے زناٹے ہمارے قریب سے گزرتے رہے۔ ہم نے پیٹ کے بل لیٹ کر شہید کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور رینگتے پیچھے آ گئے۔ اس شہید کا جنازہ نہ اٹھا، جنازہ پڑھا نہ گیا۔

''پھر صاحب! جنگ ختم ہو گئی اور پھر فوجیں

غازی یا شہید

بے شک اللہ نے خرید لئے ہیں مومنوں سے جانیں ان کی اور مال ان کے جنت کے بدلے۔ وہ لڑائی کرتے ہیں اللہ کی راہ میں۔ پس مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔ (التوبہ)

سرحدوں سے بارکوں میں آ گئیں۔ مجھے ایک ہی غم تھا کہ اس شہید کی ماں کو کیا جواب دوں گا، وہ تو اپنا بیٹا مجھ سے مانگے گی۔ میں نے اسے خط لکھ دیا تھا لیکن اس کا جواب نہیں آیا تھا جس سے میں اور زیادہ ڈر گیا کہ وہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ میں جلدی چھٹی نہ جا سکا کیونکہ ہسپتال میں تھا۔ وہاں زیادہ عرصہ رہنا پڑا''۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ زیادہ زخمی تھے؟''

''نہیں''۔ اس نے ٹالتے ہوئے کہا۔ ''زخم معمولی تھا۔ ڈاکٹر نہیں چھوڑ رہے تھے۔ خیر، مجھے اپنے زخموں کا تو کوئی غم نہ تھا۔ ہسپتال سے نکلتے ہی مجھے لمبی چھٹی مل گئی۔ میں ڈرتے ڈرتے گاؤں گیا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں شہید کی ماں کا سامنا کس طرح کروں گا۔ وہ مجھے دیکھ کر زمین و آسمان ایک کر دے گی لیکن بھائی جی! میں جب اس عظیم ماں کے سامنے جا کھڑا ہوا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ ماں ہے جس کا جوان بیٹا مر گیا ہے اور جس کی اس نے میت بھی نہیں دیکھی۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا اور میرے سر کو چومنے لگی۔ میری ہچکیاں نکل گئیں اور میں جی بھر کے رویا۔ بھائی صاحب! پاک فوج کا سپاہی رویا نہیں کرتا۔ وہ آنسو نہیں خون بہایا کرتا ہے۔ ہم نے جانے کتنے شہیدوں کو دفن کیا ہے لیکن آنکھ میں آنسو کبھی نہیں آیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کہہ رکھا تھا کہ مر جائیں تو چپ کر کے کہیں دفن کر دینا۔ منہ سے آہ نہ نکلے۔ مگر اس روز میں بچوں کی طرح رویا

''جب جی ذرا ہلکا ہوا تو میں نے شہید کی ماں کو دیکھا۔ مجھے بڑی شرم آئی۔ وہ عورت ذات اور ماں چپ چاپ تھی، نہ آنکھ میں آنسو نہ زبان پہ فریاد۔ وہ اندر گئی اور ایک کاغذ اٹھا لائی۔ میں نے پڑھا۔ یہ شہید کا خط تھا جو اُس نے ۴ ستمبر کو لکھا تھا کہ میں شہید ہو جاؤں تو دودھ کی دھاریں بخش دینا۔ تجھے اللہ پاک کی قسم ہے کہ رونا مت، نہیں تو میری نیکی برباد ہو جائے گی......

''خط پڑھ چکا تو ماں نے دکھیاری سی مسکراہٹ سے کہا کہ میں نہیں روؤں گی۔ سینہ جل رہا ہے لیکن آنکھ میں آنسو نہیں آنے دوں گی..... اُس نے اپنے بیٹے کے متعلق صرف اتنی سی بات پوچھی کہ وہ آگے شہید ہوا تھا یا کہیں پیچھے؟ میں نے اُسے بتایا کہ وہ اتنا آگے شہید ہوا تھا جہاں کوئی مرد کا بچہ ہی جا سکتا ہے۔ ماں کے سینے سے لمبی آہ نکلی اور اُس نے بڑے سکون سے کہا۔ 'اللہ تیرا شکر ہے۔' پھر میں نے اُسے سارا واقعہ سنایا تو وہ اللہ تیرا شکر، کا ہی ورد کرتی رہی۔ میں نے جب اُس کی قبر کا ذکر کیا تو اُس نے کہا مجھے اُس کی قبر پر لے چلو......

''اُس وقت مجھے خیال آیا کہ مجھے تو یاد ہی نہیں کہ میں نے اُسے کہاں دفن کیا تھا؟ علاقہ یاد تھا۔ میں نقشے پر دیکھ سکتا تھا لیکن قبر کہاں کھودی تھی؟ اُس پر ٹینک پھرتے رہے تھے۔ میں ماں کو یہ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کہ تیرے بیٹے کی قبر ہی نہیں ہے۔ میں نے دماغ پر زور دیا، ایک بات دماغ میں آ گئی اور میں نے اُسے قبر دکھانے کی ہامی بھر لی......

''دوسرے ہی دن اُسے ساتھ لئے سیالکوٹ پہنچا اور وہاں سے ایک گاؤں کا رخ کیا جس کا میں نام نہیں بتاؤں گا۔ میں ایک بار پھر اُس میدان کو دیکھ رہا تھا، جہاں ہم نے ملک کی خاطر زندگی اور موت کا معرکہ لڑا تھا۔ میرے سینے میں ایک بار پھر نعرے گونجنے لگے اور ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ میں لڑتے وقت نہیں ڈرا تھا لیکن خالی میدان کو دیکھ کر میرا جسم کانپنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میرے سامنے اب ایک بڑی ہی دشوار مہم تھی۔ یہ یقین تھا کہ قبر نہیں مل سکے گی۔ قبر تھی ہی کہاں؟

''دور آ گے ہم ایک گاؤں میں داخل ہوئے تو میں نے شہید کی ماں کو ایک جگہ بٹھا دیا اور خود اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں گاؤں کے بزرگ سے ملا اور اُسے بات کہہ سنائی۔ بزرگ کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے کہا وہ اس مسئلے کو سلجھا دے گا۔ وہ میرے ساتھ آیا اور ہم دونوں شہید کی ماں کو اس کے گھر لے گئے۔ روٹی کا وقت تھا۔ گھر والوں نے اُسے روٹی پہ بٹھا لیا اور مجھے بزرگ باہر لے گیا۔ پون گھنٹے بعد ہم واپس گھر میں آئے تو میں نے شہید کی ماں سے کہا آؤ قبر مل گئی ہے۔ وہ اٹھی اور گاؤں کے ساتھ ہی میں اُسے ایک خالی کھیت میں لے گیا۔ وہاں مٹی کی قبر بنی ہوئی تھی جس پر گاؤں کے دو آدمی پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے......

''میں نے ماں سے کہا کہ دیکھو گاؤں والے شہید کی قبروں کا کتنا احترام کرتے ہیں۔ ماں قبر کے پاس گئی۔ گیلی مٹی پر ہاتھ پھیرنے لگی اور قبر کے سرہانے بیٹھ کر بے تحاشہ رونے لگی۔ اتنا روئی کہ میں نے اُسے سہارا دے کر اٹھایا۔ گاؤں کی کئی عورتیں بھی آ گئیں، سب رو رہی تھیں۔ ماں نے اپنا دوپٹہ اتارا اور قبر پر بچھا دیا۔ گاؤں کی دو عورتیں آگے بڑھیں اور اپنے اپنے دوپٹے شہید کی ماں کے سر پر ڈال دیئے۔ وہ بزرگ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ خاطر مدارات کی اور ماں سے دونوں دوپٹے لے کر اُسے دو نئے دوپٹے، ایک قمیص کا اور ایک شلوار کا کپڑا پیش کیا۔ کپڑوں پر دس دس کے دو نوٹ رکھے تھے بزرگ نے کہا کہ یہ بیٹی کا حق ہے......

''جب ہم گاؤں سے نکل کر دور آ گئے تو ماں نے گھوم کر قبر کو دیکھا اور عجیب سے طریقے سے ہنس پڑی۔

مجھے کہنے لگی۔ اب نہیں روؤں گی..... اور بھائی صاحب! وہ بالکل نہیں روئی۔ کبھی کبھی آہ بھر کر کہتی ہے۔ اللہ تیرا شکر ہے، بیٹا شہید ہوا.....''

میرے ہمسفر نے کہانی سنا کر بے چینی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور التجا کے لہجے میں کہنے لگا۔ ''بھائی صاحب! سچ بتایئے آپ کا علم کیا کہتا ہے؟ میں نے اُس ماں کو جو قبر دکھائی تھی وہ قبر نہیں تھی۔ وہ تو میرے کہنے پر اس بزرگ نے ایک کھیت کے کنارے مٹی کی قبر نما ڈھیری بنا دی تھی اور اوپر پانی کا چھڑکاؤ کر دیا تھا تا کہ یہ شک نہ ہو کہ یہ ڈھیری ابھی بنائی گئی ہے۔ اس ڈھیری میں کوئی شہید دفن نہیں ہے۔ بزرگ نے مجھ کہا تھا کہ اس کھیت میں یہ ڈھیری ہمیشہ قائم رہے گی۔ بھائی جی! میں نے میدان جنگ میں کھڑے ہو کر جھوٹ بولا ہے، میں نے ایک شہید کی ماں کو دھوکہ دیا ہے۔ وہ میدان ہمارے لئے اب بھی پاک ہے۔ اس مٹی میں شہیدوں کا خون جذب ہو گیا ہے۔ میں نے اس پاک مٹی پر کھڑے ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ میں گناہگار ہوں بھائی جی؟.....''

''نہیں میرے عزیز! بالکل نہیں''۔ میں نے اُسے دلائل دے کر قائل کر لیا کہ کوئی گناہ نہیں ہے اور ایک شہید کی ماں کی تسکین کی خاطر اُس نے جو کچھ کیا ہے، وہ درست ہے۔ شہید کہاں دفن نہیں ہیں؟ جہاں کسی غازی کے خون کا ایک قطرہ گرا وہ ایک شہید کی قبر ہو گئی''۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے ہمسفر کی تسلی ہو گئی۔ کہنے لگا کہ آپ نے میرے ضمیر سے بوجھ اتار دیا ہے۔ اُس کے تو آنسو بہہ نکلے تھے لیکن پھر مسکرانے لگا۔ میں اُس سے جنگ کے اور واقعات سننے کا خواہش مند تھا۔ اُس نے کہا کہ جسے آپ کارنامے کہتے ہیں وہ ہمارے فرائض تھے۔ کون کون سا واقعہ سناؤں؟ اُس نے کہا۔ ''اب تو ہم آپ کا کارنامہ دیکھنا چاہتے ہیں''۔

''ہمارا کارنامہ؟''

''جی، آپ کا''۔ اُس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم کم علم اور کم عقل لوگ تھے، دیہات کے رہنے والے کسان اور چرواہے۔ ہم پہ بازی آئی تو ہم نے بازی جیت لی، جانیں بھی قربان کیں، آنکھیں بھی، ٹانگیں بھی اور بازو بھی۔ جو زندہ رہے وہ دکھ سے کہتے ہیں کہ ہم شہید نہ ہوئے۔ اب بازی آپ کے سر ہے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں، آپ نے سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں۔ آپ عالم فاضل ہیں، آپ پہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ پاک افواج نے جس ایثار سے اپنا فرض ادا کیا اسی ایثار سے آپ ان کہانیوں کو ڈھونڈ کر تاریخ میں ڈال دیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھے شاباش دیں۔ ہم نے جو کچھ کیا وہ ملک اور قوم کے نام پر کیا، اخباروں اور رسالوں کے لئے نہیں کیا۔ تمغوں اور انعاموں کے لئے نہیں کیا۔ ہمارے بعد آنے والوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم سے پہلے جو گزر گئے ہیں، وہ بہادر، غیرت مند اور جانباز تھے۔ پاک فوج کے نئے سپاہی کو معلوم ہو کہ اسے جو ہتھیار دیا گیا ہے وہ ایک شہید کا ہے اور یہ بھی کہ وہ کس طرح بہادری سے لڑتا شہید ہوا تھا۔ یہ کام آپ کا ہے۔ آنے والا وقت یہ دیکھے گا کہ اس ملک کے کم عقل اور ان پڑھ دیہاتی اچھے یا عالم فاضل تھے؟''

''جنگ میں سب سے زیادہ خطرناک ڈیوٹی او پی (O.P) کی ہوتی ہے''۔ اس نے ایک واقعہ سنایا۔ ''وہ دشمن کے منہ کے سامنے بیٹھ کر اپنے توپخانے اور مارٹروں سے دشمن کی دکھتی رگوں پر فائر کراتا ہے۔ دشمن سب سے پہلے او پی کو ڈھونڈتا ہے اور اسے تباہ کرتا ہے اگر گولے ٹارگیٹ پر نہیں گر رہے تو سمجھ لیجئے کہ او پی بزدل ہے، کہیں چھپ کے بیٹھا ہے اور اندھا دھند فائر کرا رہا ہے۔ ہمارا ایک حولدار ہے، جو اب گھر چلا گیا ہے، کیونکہ اُس کی بائیں ٹانگ شہید ہو گئی تھی۔ وہ ایک روز اپنی مارٹر پلاٹون کا او پی تھا۔ دشمن کا بہت زور تھا۔ حوالدار بہت آگے نکل

گیا اور جب اُس نے دشمن کی رگیں دیکھ کر فائرنگ کرائی تو دشمن کا زور رکنے لگا لیکن حملہ پسپا نہیں ہو رہا تھا، ہمارے حولدار نے ایسے ایسے گولے فائر کرائے کہ حملہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اتنے میں اس حوالدار کے قریب توپ یا مارٹر کا گولہ پھٹا جس سے اس کی بائیں ٹانگ کٹ گئی لیکن جسم سے الگ نہ ہوئی۔ اس حوالدار نے پروانہ کی اور اسی جگہ سے دشمن کو دیکھ دیکھ کر فائر کرواتا رہا۔ گولے ٹھکانے پہ جا رہے تھے۔ دشمن پیچھے ہٹنے لگا تو حوالدار کو اپنی پوزیشن بدلنی پڑی۔ وہ آگے رینگنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ کٹی ہوئی ٹانگ اُسے پریشان کر رہی تھی۔ اُس نے زخم کا معائنہ کیا۔ ہڈی بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ پٹھے کٹ گئے تھے اور ٹانگ ایک طرف سے صرف کھال کے سہارے جسم سے لگی ہوئی تھی۔ حوالدار نے چاقو نکالا اور ٹانگ کو جسم سے الگ کر دیا۔ پھر اپنی بش شرٹ (تاری) اور زخم پر رکھ کر اوپر پٹیاں کس دیں......

''تھوڑی دیر بعد دشمن پسپا ہو گیا لیکن 'او پی' نہ واپس آیا نہ اُس کے ساتھ وائرلیس کا ملاپ رہا۔ جا کے دیکھا تو وہ خون بہہ جانے سے بے ہوش پڑا تھا۔ اُسے اٹھا کر پیچھے لے آئے۔ اللہ کا کرم ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اگر آپ اُسے ملیں تو اُسے ہر وقت ہنستا مسکراتا دیکھیں گے''۔

''وہ کس پلٹن کا تھا؟'' میں نے پوچھا اور میں نے ہنس کر کہا۔'' وہ آپ ہی تو نہیں تھے؟''

''جی نہیں''۔ اُس نے بھی ہنس کر کہا۔ ''میری تو دونوں ٹانگیں سلامت ہیں۔ وہ کوئی اور تھا۔ آپ اُس کے نام نمبر اور پلٹن کو چھوڑیئے۔ میں نے یہ واقعہ اس لئے سنایا ہے کہ آپ لکھ لیں تاکہ فوجی پڑھیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ کامیاب 'او پی' دشمن کی کمر کس طرح توڑ سکتا ہے''۔

اتنے میں ریل کار کی رفتار کم ہونے لگی۔ گوجر خان کا ریلوے سٹیشن آ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ صبح کی ریل کار یہاں تو رُکتی ہی نہیں۔ یہ گوجر خان کیسے اترے گا؟ پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اُس نے لاہور ڈرائیور سے کہہ دیا تھا کہ اُسے گوجر خان اترنا ہے۔ کہنے لگا۔ ''آپ کو شاید معلوم ہو گا جنگ میں فوج اور ریلوے کی بڑی قریبی رشتہ داری ہوتی ہے۔ یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو ہم فوجی نہتے رہ جاتے ہیں۔ فوج اور ریلوے کو ایک دوسرے سے بہت پیار ہے۔ وہ مجھے گوجر خان اتار دے گا''۔

ریل کار رُک گئی۔ میرا ہمسفر اٹھا۔ میں بھی اس کے ساتھ اٹھا۔ وہ ریل کار سے اترنے لگا تو دیکھا ڈرائیور اپنی سیٹ پر سے اتر کر ریل کار کے دروازے میں کھڑا تھا۔ ڈرائیور نے ہاتھ بڑھایا اور میرے ہمسفر کا ہاتھ تھام لیا۔ جب وہ اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ کافی دقت محسوس کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے اسے سہارا دے کر اتارا۔ میں کود نیچے اترا اور اُس کی بائیں ٹانگ پہ ہاتھ رکھا۔ اُس کی بائیں ٹانگ مصنوعی تھی۔

ڈرائیور اس سے ہاتھ ملا کر اپنی سیٹ پر چلا گیا اور ریل کار چل پڑی۔ میں نے اپنے ہمسفر سے پوچھا۔'' وہ حولدار آپ ہی تھے نا؟''

''نہیں!'' اُس نے کہا۔ ''وہ کوئی اور تھا۔ آپ جائیے گاڑی چل پڑی ہے''۔

میں ریل کار کے پائیدان پر کھڑا ہو گیا اور وہ پلیٹ فارم پر کھڑا ہاتھ لہرانے لگا۔ ریل کار تیزی سے آگے نکل گئی اور میں اپنے جانباز ہمسفر کا ہلتا ہوا ہاتھ دیکھتا رہا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔ وہ میری پلکوں کے دھندلکے میں کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ جب خیال آتا ہے کہ مجھے اس کا نام پتہ معلوم نہیں تو میں جھنجھلا کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کرتا ہوں کہ وہ کوئی اور تھا۔

طب وصحت

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

دستِ شفاء

رحم میں رسولی کا ایک کیس

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ ایچ۔ ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرامیڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبہ طب ونفسیات

سب سے اول تو میں اس پاک ذات کا بے حد شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے مجھے ایک ایسا علم عطا فرمایا جس سے ہم ایسے امراض کا علاج کرتے ہیں جنہیں ایک زمانے میں میں خود لاعلاج سمجھتا تھا اور دیگر بڑی بڑی ڈگریوں (کلغیوں) والے ڈاکٹر صاحبان اب بھی لاعلاج ہی قرار دیتے ہیں اور صرف آپریشن ہی اس مسئلے کا حل سمجھتے ہیں۔ جبکہ اصل مسئلے کا حل وہ شاید جانتے نہیں یا کرنا نہیں چاہتے۔ کہتے ہیں کہ ایک حکیم صاحب ہوا کرتے تھے بہت سیانے اور سمجھدار، صبح سے شام تک لوگوں کی خدمت کرتے نہ تھکتے۔ ایک بار کہیں ان کو کسی ضروری کام سے دوسرے شہر جانا پڑ گیا اور مطب ان کے ایک شاگرد کو سنبھالنا پڑا۔ واپسی پر تفصیل شاگرد نے سنائی اور کہا کہ ''جی وہ فلاں قصائی کے پاؤں میں جو ہڈی کا ٹکڑا تھا وہ میں نے نکال کر پھینک دیا اور پٹی کر دی''۔ حکیم صاحب بے حد ناراض ہوئے اور کہا۔ ''بیوقوف وہ ہڈی کا ٹکڑا آدھ سیر گوشت روز کھلاتا تھا اب کیا ہوگا تو نے تو بیڑا ہی غرق کر دیا نالائق''۔

تو جناب عرض ہے کہ جہاں تو مرض بہت بڑھ گیا ہو اور آپریشن کے بغیر چارہ نہ ہو الگ بات ہے مگر جہاں اس کے بغیر کام چل سکتا ہو تو مریض کا جسم اور جیب کاٹنے کی کیا ضرورت ہے اور دوسری بات یہ کہ آپ نے Result of Bisease (رسولی) تو نکال دی مگر Cause of Disease یعنی رسولی بننے کی وجہ نہ دی۔ تو کیا یہ رسولیاں دوبارہ نہ ہوں گی۔ یقیناً ہوں گی تو

ایسے کام کا کیا فائدہ امید ہے کہ قارئین بات کو سمجھ گئے ہوں گے۔

اب ہم اس ماہ کے کیس کی طرف آتے ہیں تو اول بات یہ ہے کہ میرے پاس اکثریت ایسے ہی امراض کے مریضوں کی ہوتی ہے جو کہ لاعلاج کہے جاتے ہیں۔ اب جب بڑے بڑے ڈاکٹر مریض کو ''صرف آپریشن'' کا مشورہ دیں گے تو مریض کی تو جان پر بنے گی ہی۔

اب یہ چند دن قبل کی بات ہے کہ ایک مولوی صاحب نے فون پر رابطہ کیا۔ ٹائم لے کر زوجہ محترمہ کے ساتھ ہمارے کلینک آئے اور تفصیلات الٹرا ساؤنڈ رپورٹ کے مطابق دو عدد رسولیاں 4.2x3.2 سائز کی ہیں۔ بلڈ رپورٹ اور یورین رپورٹ میں بھی گڑبڑ پائی گئی۔ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹروں نے فوری آپریشن کا مشورہ دیا ہے مگر اتفاق کی بات کہ ان کے ایک جاننے والے نے بتایا کہ میری واقف کو بھی ایسا ہی مسئلہ درپیش تھا اور ہم نے ڈاکٹر رانا اقبال صاحب سے علاج کرایا اور وہ بفضلہ بہت جلد شفایاب ہوگئی حالانکہ اس کی رسولی کا سائز بھی کافی بڑا تھا۔ لہٰذا آپ بھی ادھر ہی رابطہ کریں میں نے نام پوچھا تو انہیں یاد نہیں تھا البتہ کیس کا نمبر (P-302) ریکارڈ نکالا تو وہ کیس مل گیا۔ آج آپ کی خدمت میں وہی کیس پیش کر رہا ہوں۔

یہ کیس 20-9-2013 کو ریکارڈ کیا گیا عورت کا نام بیگم ایس ایم تنویر تھا اور عمر 40 سال سے زیادہ ہے۔ رسولی کا سائز 8.3x2.5 دیگر علامات ٹانگوں میں درد، ماہواری کے مسائل، پیشاب میں کنٹرول نہیں، کردار بھی اکثر رہتا ہے۔ B.P. 150/180 تک رہتا ہے۔ ہر وقت تھکاوٹ، کھانے پینے کو دل نہیں کرتا۔ نیند بے حد کم، چہرے پر بھی داغ دھبے وغیرہ ہیں۔

ان کو ان کی جملہ علامات کے مطابق جو ادویات دی گئیں وہ یہ ہیں:

(1) Apis 6 صبح

(2) HK-2 صبح

(3) HK-3 دوپہر

(4) HK-4 رات

(5) C-7 صبح شام

(6) H/Sulfer 6 دوپہر

(7) M/Sol 30 رات

(8) Thuja 6 صبح شام

(9) BPR-30 صبح شام

ایک ماہ کی ادویات دی گئیں اور ساتھ ہی ہدایات کا پمفلٹ (پرچہ) دیا گیا، نمک، گوشت بالکل بند کر دیا گیا۔ 11/10 کو مریضہ آئی تو بہت بہتر تھی۔ ٹانگوں کا درد بالکل ختم ہوگیا تھا اور Periods بھی بالکل ٹھیک وقت پر آئے۔ بلڈ پریشر وغیرہ بھی کنٹرول میں تھا۔ پیشاب بھی درست ہو رہی تھی۔ البتہ لیٹنے رہنے کی خواہش بدستور قائم تھی۔ پھر مذکورہ ادویات دی گئیں کیونکہ وہ ٹھیک کام کر رہی تھیں۔ مورخہ 18/11 خاتون کو کسی کیڑے نے کاٹ لیا جس سے جسم پر سوجن، درد اور جلن ہوگئی۔ دیگر ادویات کو روک کر مندرجہ ذیل ادویات دی گئیں۔

(1) Apis 6 T3

(2) Ars. Alb 6 T3

(3) Laptandra 6 T3

آرام آنے کے بعد دوبارہ پہلی والی ادویات شروع کی گئیں پھر افاقہ شروع ہوگیا۔ جب مریضہ اگلی بار آئی تو بہت سی تکلیفات کا نام و نشان نہ تھا۔ اب 25/2 کو جو ادویات دی گئیں وہ اس طرح ہیں:

(1) Apis 6 صبح شام

(2) Sulfar 6 صبح شام

(3) Pyrogen 6 صبح شام

(4) Calc. Phos 6 صبح شام

دوپہر 30 Pulstilla (5)

صبح شام 6 Phos-Aid (6)

صبح شام 6 Calc. Flor (7)

اس کے بعد دو ماہ علاج مزید جاری رہا۔ اس کے بعد جو رزلٹ نکلا وہ مذکورہ بعد میں آنے والے مریض نے بتایا

ضروری گزارش

(1) ہم تو شروع سے ہی مریضوں سے ادویات و فیس میں بہت رعایت کرتے ہیں مگر مریض سودابازی سے باز نہیں آتے ان سے پرہیز کریں۔ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ آپریشن پر کتنے لاکھ کا خرچہ آتا ہے اور مشقت کتنی ہے؟

(2) کئی لوگ بار بار ایس ایم ایس کر کے ڈاکٹر صاحب کو تنگ کرتے ہیں کہ MSG کا جواب دیں۔ خدارا ان حرکتوں سے باز آ جائیں۔ میرا کوئی پیکیج نہیں اور نہ ہی میں اتنا فارغ ہوں۔ آگے آپ لوگوں کی مرضی میرا کام صرف علاج کرنا ہے مسیج کرنا نہیں جو بھی بات ہو فون کرلیا کریں۔

بعض مریضوں کا یہ مطالبہ ان کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے کہ انہیں چند دن میں تندرست وتوانا کردیا جائے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ انہوں نے یہ مرض کتنے سال صرف کر کے حاصل کیا ہے۔ اگر آپ جلدی صحت یاب ہونا چاہتے ہیں تو اپنے معالج کے ساتھ تعاون کریں۔ اس کی ہدایات اور صحت کے اصولوں پر عمل کریں۔ بعض مریض شکایت باقی رکھتے ہیں۔ اگر آپ کا بھی یہی رویہ ہے تو آپ اس پر قابو پائیں ورنہ کوئی دوائی آپ پر اثر نہیں کرے گی۔

★☾★

سفید پوش

''9 ستمبر کو میں نے راولپنڈی ریڈیو سٹیشن کی عمارت پر بم گرایا جو حیرت انگیز طور پر پھٹ نہ سکا۔

☆ محمد رضوان قیوم

ڈاکٹر پرتاب نرائن انڈیا کا دفاعی تجزیہ کار ہے۔ اس نے 1968ء میں جنگ ستمبر 1965ء کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا "War View 1965"۔ یہ کتاب انڈین نیشنل لائبریری دہلی میں موجود ہے۔ اس کے صفحہ نمبر 66 پر ڈاکٹر پرتاب نرائن نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے جو کچھ اس طرح ہے:

جی ایچ کیو دہلی میں 11 مئی 1966ء میں ملٹری کے اعلیٰ افسران کا ایک خفیہ اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت جنرل منہاداس نے کی۔ اس اجلاس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ ان عوامل اور اسباب پر غور کیا جائے جن کی وجہ سے انڈیا کو پاکستان پر ہر طرح کی برتری حاصل ہونے کے باوجود شرمناک شکست ہوئی۔ اس اجلاس کے دوران جنرل منہاداس نے چونڈہ کے محاذ پر شکست کھانے والے کرنل کمانڈنٹ پریم چوپڑا کی کارگزاری کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا۔

''آپ اس کی کوئی وجہ بیان کر سکتے ہیں کہ ہماری سینا کو پاکستان کی مٹھی بھر سینا سے کیوں مار پڑی؟'' اس نے پریم چوپڑا سے پوچھا۔

''یہ میری سمجھ سے باہر ہے سر!'' کرنل پریم چوپڑا نے ایک ٹھنڈی آہ لینے کے بعد کہا۔ ''ہماری نفری پاکستان سینا سے 11 گنا زیادہ تھی لیکن مجھے بظاہر اس کا کوئی سبب نظر نہیں آتا کہ ہم یہ جنگ کیسے ہار گئے''۔

''تم نے غور نہیں کیا ہوگا''۔ جنرل منہاداس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ پاکستانی فوجیوں کے کندھوں پر بیٹھے دونوں فرشتے بھی اتر کر ہمارے خلاف یدھ لڑ رہے ہوں؟''

اسی اجلاس میں موجود ایک بریگیڈیئر رینک کے آرمی آفیسر نے اس مذاق میں شامل ہوتے ہوئے جنرل منہاداس سے کہا۔ ''سر! ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ اس جنگ میں پاکستانی سینا کے ساتھ کچھ پُراسرار اور مافوق الفطرت مخلوق بھی ہمارے خلاف جنگ میں شریک تھی''۔

ایک اور جگہ مصنف ڈاکٹر پرتاب نرائن لکھتا ہے کہ میری ملاقات رائل انڈین ائرفورس کے ایک سکواڈرن لیڈر رزشال گپتا سے ہوئی۔ اس نے باتوں باتوں میں ایک عجیب انکشاف کیا۔

''میں کئی بار پاکستان پر حملے کے لئے گیا''۔ اس نے کہا۔ ''9 ستمبر کو میں نے راولپنڈی ریڈیو سٹیشن کی عمارت پر بم گرایا جو حیرت انگیز طور پر پھٹ نہ سکا۔ اگر یہ بم پھٹ جاتا تو بڑی بھیانک تباہی پھیلتی تھی۔ اسی طرح ایک بار جب میں نے روات کے قریب موجود ایک آرمی علاقے میں راکٹ اور بم گرائے تو مجھے یوں لگا کہ جیسے کوئی سفید لباس والا بابا ان راکٹوں اور بموں کو ہاتھوں سے دبوچ دبوچ کر واپس ہماری جانب اچھال رہا ہے''۔

بعد میں سکواڈرن لیڈر رزشال گپتا ذہنی ابتری کا شکار ہو گیا اور نیم پاگلوں جیسی باتیں اور حرکتیں کرنے لگا۔ اس پر اس کو میڈیکل ان فٹ قرار دے کر فضائیہ سے فارغ کر دیا گیا۔

چار دیواری کی دنیا

وہ سراپا فتنہ تھی

میں اسے دیکھتا رہا اور میں درندہ بن گیا۔ میں نے اس کے کھلے ہوئے منہ میں انگلیاں دے کر مختلف سمتوں کو اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ چڑیل کا منہ چر گیا۔

☆ ایم اے خان

میں اپنی دنیا میں واپس آ گیا ہوں۔ میں جہاں سے واپس آیا ہوں اسے آپ حقیقت نہیں سمجھیں گے۔ آج تو میں خود بھی اسے حقیقت نہیں سمجھتا لیکن میں اسے جھٹلا بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ مجھ پر بیتی ہے۔ جس عورت کو میں نے قتل کیا تھا اس کی قبر دیکھ آیا ہوں۔ عدالت نے جو فیصلہ سنایا تھا وہ بھی پڑھ چکا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے ہاتھ ایک عورت کے خون سے رنگے ہوئے ہیں مگر لوگ کہتے ہیں کہ میں باقی جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ سچ نہیں ہو سکتا۔

یہ واردات ہندوستان کی ہے۔ ابھی ملک تقسیم نہیں ہوا تھا۔ میں ایک روز اپنے قصبے کے قبرستان میں سے گزر رہا تھا۔ مجھ پر غم کا پہاڑ گرا ہوا تھا اور دل پر غم کے بوجھ کے ساتھ خوف بھی طاری تھا۔ میں دلیر آدمی نہیں ہوں نہ کبھی تھا۔ میری ازدواجی زندگی کے حالات نے ایسا پلٹا کھایا تھا جنہیں سنوارنا میرے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی بیوی سے اور اسے مجھ سے بہت ہی محبت تھی۔ ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے تھے مگر ہمیں جدا کر دیا گیا تھا۔

یہ میری ساس کی کرتوت تھی۔ وہ سراپا فتنہ تھی۔ اس کا خاوند سیدھا سادا سا انسان تھا۔ اس کی ایک بیٹی کی شادی میری شادی سے تین سال پہلے ہوئی تھی۔ اس داماد کو میری ساس نے بڑی استادی سے اس کے ماں باپ سے الگ کر کے اپنے گھر رکھ لیا تھا۔ مجھے بھی وہ اسی طرح گھر جوائی بنانا چاہتی تھی۔ میری شادی کو ابھی ایک ہی سال گزرا تھا۔ اس کی زبان میں ایسی چاشنی اور ایسا اثر تھا کہ میں کئی بار اپنے والدین کے خلاف بھڑک اٹھا لیکن میرے والد صاحب مرحوم دانشمند انسان تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ مجھ پر ساس کا جادو چل گیا ہے۔ انہوں نے نہایت پیار سے مجھے ٹھنڈا کر دیا اور بتایا کہ میری ساس کیا چاہتی ہے۔ وہ دراصل لالچی عورت تھی۔ دامادوں کو گھر رکھ کر ان کی آمدنی پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ ایک داماد کو اس نے اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ اب مجھے بھی پھانسنا چاہتی تھی۔

ایک روز میں اپنی بیوی کو میکے سے لینے گیا تو میری ساس نے مجھے دوسرے کمرے میں بٹھا کر صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو میرے ساتھ نہیں بھیجے گی۔ اس نے میری ماں پر شرمناک الزام عائد کئے۔ میرے والد صاحب کو بدکار تک کہہ ڈالا۔ غصے سے میں پاگل ہونے لگا مگر میں کوئی جوابی کارروائی نہ کر سکا۔ ساس نے مجھے اپنی بیٹی سے ملنے نہیں دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے مل جاتی تو میرے ساتھ آ جاتی۔ میرا سسر گھر نہیں تھا۔ میں واپس آ گیا۔ ایک دو روز بعد سسر سے ملاقات ہو گئی۔ اس سے بات کی تو اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ اپنی بیوی کے سامنے بے بس تھا۔ میرے ماں باپ نے سمجھوتے کی کوشش کی تو ساس نے انہیں غیروں کے سامنے بدنام اور رسوا کر دیا۔

ہمارے ہاں خرابی یہ ہے کہ لڑکیوں کو ہم نے مفلوج کر کے رکھا ہوا ہے۔ انہیں ہم بولنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر میری بیوی کو بولنے کی اجازت یا جرأت ہوتی تو وہ لوگوں کو بتاتی کہ اس کی ماں کے عائد کردہ الزام کہاں تک صحیح ہیں۔ وہ بے زبان جانوروں کی طرح ماں کی قید میں پڑی رہی اور ماں نے اس کی اور میری قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

میری ساس کے متعلق مشہور تھا کہ ٹونے، تعویذ اور جادو کرواتی ہے۔ میری ماں نے بھی مجھے بتایا تھا کہ کوئی پیر فقیر یا کوئی ہندو سادھو ہے جس کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ وہ لوگوں سے پیسے لے کر ان کے لئے جادو کرواتی ہے اور اس طرح کئی گھرانے اجاڑ چکی ہے۔ میں ان باتوں کو سچ مانا کرتا تھا۔ میں بچپن سے ہی بزدل تھا۔ ایسی مافوق الفطرت باتوں سے تو میں بہت ہی ڈرا کرتا تھا۔ لوگوں سے کالے جادو کے قصے سن سن کر میں

ڈرنے لگا تھا۔ اب ساس کے ساتھ دشمنی پیدا ہوگئی تو میں ڈرنے لگا کہ وہ مجھ پر جادو نہ کرا دے۔

میری ذہنی حالت پر غور کیجئے۔ ایک تو ایسی بیوی کی جدائی کا غم تھا جو مجھے چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ یہ غصہ کہ مجھ سے میری بیوی زبردستی چھین لی گئی ہے اور جب یہ خیال آتا تھا کہ ساس نے میرے ماں باپ پر شرمناک الزام عائد کئے ہیں تو میرا خون ابلنے لگتا تھا اور سینہ جل اٹھتا تھا مگر میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ بعض اوقات غصے سے سر چکرانے لگتا تھا۔ ہاتھ کانپنے لگتے تھے اور میں اکیلے بیٹھے دانت پیسنے لگتا تھا اور اس ابال کے ساتھ یہ خوف کہ ساس مجھ پر جادو کرا دے گی۔ ہر وقت مجھ پر غم، بے پناہ غصہ اور خوف طاری رہنے لگا۔

ایک روز میں اسی ذہنی حالت میں قبرستان میں سے گزر رہا تھا۔ قبرستان کے وسط میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جب میں جھنڈ میں داخل ہونے لگا تو میں نے دائیں طرف دیکھا مجھے اپنی ساس نظر آئی۔ وہ ایک بہت پرانی قبر پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے جھکے جھکے مجھے دیکھا۔ وہ مجھ سے تقریباً پچاس گز دور تھی۔ یہ شاید میرے دل کی کمزوری تھی کہ اس کی نظروں نے مجھے جیسے گرفتار کر لیا ہو۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ مجھے کچھ بھی سوچنے کا موقع نہ ملا۔ بس ایک خوف تھا جس نے میرے دل کو جکڑ لیا اور ذہن پر یہی ایک آسیب سوار ہو گیا کہ میری ساس مجھ پر جادو کر رہی ہے۔ میں نے یہ سن رکھا تھا کہ بعض اوقات کسی پر جادو کرنے والے قبرستان سے کسی پرانے مردے کی کوئی ہڈی استعمال کرتے ہیں۔

میرے قدم ڈگمگانے لگے اور میں نے بڑی مشکل سے نظریں ساس سے ہٹائیں۔ قبرستان سے نکل کر میں پگڈنڈی پر ہو لیا۔ ایک بار گھوم کر دیکھا۔ میری ساس دوسری طرف جارہی تھی۔ میرے دل پر خوف کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ اپنے آپ کو اس گرفت سے آزاد کرنے کی بہت کوشش کی لیکن میں اس وہم سے آزاد نہ ہوسکا کہ ساس مجھ پر جادو کر رہی ہے۔

اسی ذہنی کشمکش میں مجھے اپنے گرد ہلکی ہلکی گونج سنائی دی جو بلند ہوتی گئی پھر یہ گونج میرے اردگرد منڈلانے لگی۔ اچانک دائیں گال میں ایک سوئی اتر گئی۔ میں بچوں کی طرح بلبلا اٹھا۔ پھر ایک اور سوئی بائیں کان میں اتری۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ بھڑیں تھیں جو چھتے سے اڑ کر مجھ پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں بھڑیں میرے اردگرد اور میرے سر پر بھیانک بھنبھناہٹ سے اڑ رہی تھیں۔ میں نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور دوڑ پڑا۔ مجھے گردن، چہرے، کانوں اور ہاتھوں میں سوئیاں اترتی محسوس ہوتی رہیں اور ایسا شدید درد جو صرف محسوس ہوتا ہے لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتا۔

ڈرپوک انسان وہم کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ یہی حالت میری ہوئی۔ میری نگاہ میں یہ بھڑیں نہیں جن اور چڑیلیں تھیں جو ساس کے جادو کے زور سے بھڑوں کے روپ میں مجھ پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ میں دوڑتا رہا اور میری چیخیں نکلتی رہیں پھر میری آنکھوں کے سامنے دھند پھیلنے لگی۔ یہ دھند تیزی سے گہری ہونے لگی اور ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پھر کیا ہوا؟ مجھے بالکل علم نہیں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کتنا وقت یا کتنے دن گزر گئے تھے۔ اندھیرا دھند میں تبدیل ہوا پھر دھند بھی ختم ہوگئی۔ مجھے اپنے والد صاحب نظر آئے۔ ایک دو منٹ بعد میری ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ دونوں نے مجھ سے پوچھا کہ اب میں کیسا ہوں؟ درد ہے یا نہیں؟

میں نے ان سے بالکل نہیں پوچھا کہ مجھے گھر تک کون لایا تھا اور میں اگر بے ہوش رہا ہوں تو کتنا وقت بے ہوش رہا۔ انہوں نے بھی ایسی کوئی بات نہ کی۔ ماں نے میرے منہ پر ہاتھ پھیرا تو میں نے محسوس کیا کہ میرا منہ بہت بھاری ہے اور ماں کے ہاتھ کا لمس عجیب سا

ہے۔ میرا منہ یقیناً سوجا ہوا تھا لیکن میں کچھ اور ہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ یہ کہ یہ بھڑیں نہیں جن اور چڑیلیں تھیں۔ مجھے جسم پر کوئی درد نہیں تھا۔ دل پر خوف طاری تھا اور میرا جسم اندر سے کانپ رہا تھا۔ میں بالکل خاموش تھا۔ ایک بار اٹھنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ کمزوری زیادہ ہے۔

تین چار دنوں بعد میں کمرے سے نکلا۔ جسمانی لحاظ سے میں شاید ٹھیک ہو گیا تھا۔ ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے میں ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ دماغ اور دل پر وحشت طاری تھی جو اس یقین کا نتیجہ تھا کہ ساس [illegible] مجھ پر جادو چلا دیا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کو یہ [illegible] کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں بتاؤں تو جن اور چڑیلیں [illegible]۔

میں چپ چاپ گھر [illegible] میں ذرا چل پھر [illegible] دیکھنا چاہتا [illegible] قابل ہوں یا نہیں۔ قصبے میں دو مڈل سکول اور ایک ہائی سکول تھا۔ میں چونکہ تعلیم یافتہ تھا اس لئے میں نے درسی کتابوں اور سٹیشنری کی دکان کھول رکھی تھی جو ہم باپ بیٹا چلا رہے تھے۔

میں گلی میں سر جھکائے ہوئے چلا رہا تھا۔ میرے ذہن پر ساس کا خوف طاری تھا اور اس کے ساتھ ہی بیوی کی یاد بھی پریشان کر رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی بے بسی پر رونا بھی آ رہا تھا، غصہ بھی۔ ہر احساس انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل رہی [illegible] میرے پاؤں زمین سے اٹھ کر ہوا میں چلنے لگے۔ [illegible] تھا کہ میں ہوا میں چل رہا ہوں۔ میں [illegible] سے کہتا ہوں کہ میں ہوا میں چل رہا تھا۔ [illegible] رہے تھے اور ایسے نظر آ رہے تھے جیسے یہ دیواریں نہیں دیواروں کے عکس ہیں جو پانی میں جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔

اچانک بھڑوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر اور اوپر دیکھا۔ سینکڑوں بھڑیں میرے اردگرد اور سر پر اڑ رہی تھیں۔ ان کا رنگ زرد تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے گہرا بادامی ہوا اور فوراً ہی کالا ہو گیا۔ وہ اتنی تیزی سے میرے گرد اڑنے لگیں کہ میرے گرد سیاہ لکیروں کے سینکڑوں دائرے بن گئے اور میں ان میں قید ہو گیا۔ میں نے ایک آدھ منٹ کے لئے رک کر دیکھا پھر میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں بازو بلند کر کے ہوا میں مارتا دوڑ پڑا۔

معلوم نہیں کس کے بازو تھے اور کتنے بازو تھے جنہوں نے مجھے جکڑ لیا۔ میں ان بازوؤں سے آزاد ہونے کے لئے زور زور سے چیخنے بلکہ دھاڑنے لگا۔ مجھے یہ تو یقین تھا کہ مجھے بہت سے انسانی بازوؤں نے جکڑ رکھا ہے مگر مجھے کسی انسان کا چہرہ اور جسم نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے اردگرد شور بپا ہونے لگا اور بازو مجھے گھسیٹنے لگے۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی تھی۔

جب دھند ہٹ گئی تو میں گھر میں چارپائی پر پڑا تھا۔ کمرہ لوبان اور اگربتیوں کی خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ سب سے پہلے مجھے ایک سفید ریش بزرگ نظر آیا۔ وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میری نظریں اسی پر جم گئیں۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے میرے ماتھے اور سر پر ہاتھ پھیر کر مجھے تسلی دلاسہ دیا اور کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھ کر پانی کے گلاس میں ڈبو کر پانی مجھے پلا دیا۔ پھر ایک اور تعویذ لکھ کر کپڑے کے ٹکڑے میں لپیٹا اور دھاگے سے میری گردن [illegible] لٹکا دیا۔

وہ میرے والد صاحب کو ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔ میری ماں میرے پاس آ بیٹھی اور رو رو کر مجھ سے پوچھنے لگی کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ میں جب انہیں بتانے لگا تو مجھے پھر بھڑوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ [illegible] منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا اور میں اندر ہی اندر کانپنے

لگا۔ میں چپ ہوگیا۔

میں نے باہر جانا چھوڑ دیا۔ مجھے ہر روز ایک تعویذ گھول کر پلایا جاتا تھا۔ مجھ پر خوف اور خاموشی طاری رہتی تھی۔ میں گھر کے اندر ہی گھوم پھر لیتا تھا۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ اپنی بیوی اور اس کی محبت کسی لمحہ ذہن سے نہ اتری۔ ایک مہینے بعد میں ایک روز باہر نکل گیا اور ٹہلتے ٹہلتے قصبے سے نکل گیا۔ میرے ذہن میں ساس کا جادو، بھڑیں، اپنی بیوی، غم، غصہ اور خوف تھا۔ آبادی سے نکل کر میں کھلے علاقے میں گیا تو مجھے بھڑوں کی گونج سنائی دینے لگی۔ میں سہم کر رک گیا اور سوچنے لگا کہ بھاگ جاؤں یا رک جاؤں اور دیکھوں۔ میں نے رک کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن بھڑیں نظر نہ آئیں۔ ان کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر یہ گونج میرے اردگرد گھومنے لگی لیکن ایک بھی بھڑ نظر نہ آئی۔ اس سے میں اور زیادہ ڈرا۔ پھر یہ گونج دور ہٹنے لگی اور بالکل خاموش ہوگئی۔ میرا دل اس قدر زور سے دھڑک رہا تھا جیسے اچھل کر باہر آجائے گا۔

میں وہیں سے واپس گھر چلا گیا۔ میری ماں نے میرا چہرہ دیکھا تو وہ گھبرائی۔ اس نے بتایا کہ میرا رنگ زرد اور پسینہ چھوٹ رہا ہے میں اتنا ہی جانتا تھا کہ مجھ پر وحشت طاری ہے اور مجھے کوئی پناہ نہیں مل رہی۔ اس روز یہ خیال آیا کہ ساس کے ہاں جاؤں اور اس کے پاؤں چھو کر التجا کروں کہ مجھے اپنے جادو سے نجات دلا دے اور اس کے عوض وہ جو چاہے گی میں کروں گا۔ مگر اس خیال کے ساتھ ہی مجھے اپنی بیوی کا خیال آ گیا اور مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ اگر ساس یہ کہہ بیٹھی کہ میری بیٹی کو طلاق دے دو تو میں اس کی یہ شرط پوری نہیں کر سکوں گا۔ بیوی کی محبت خوف پر غالب آ گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری ساس مجھ سے دو میں سے ایک بات منوائے گی۔ اس کے گھر رہوں یا اس کی بیٹی کو طلاق دے دوں۔ میرے لئے کوئی ایک شرط بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔

آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ کسی نے میری آنکھ میں زرمی پنیر [illegible] نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ [illegible] میں اس طرح کی آواز سنائی دی جیسے [illegible] ہی کہیں بیٹھ گیا ہو۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میری آنکھ میں اسی پرندے کا پر لگا تھا۔ یہ چمگادڑ ہو سکتا تھا مگر میں اسے شرشرار سمجھنے لگا۔ بتی جلانے سے مجھے ڈر آتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں کہ کمرے میں مجھے بھڑوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ کوئی شک نہ رہا کہ کمرے میں سینکڑوں بھڑیں اُڑ رہی ہیں اور مجھے ڈسنے کے لئے میرے قریب آ رہی ہیں۔ میرا جسم خوف سے کانپنے لگا۔ بھڑوں کی گونج بہت زیادہ ہوگئی۔ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور میں چارپائی سے کود کر دروازے کی طرف بھاگا لیکن بند کواڑوں سے ٹکرا کر میں پیچھے کو گرا۔

دروازہ کھلا۔ والد صاحب، والدہ اور میری چھوٹی بہن گھبرائی کمرے میں داخل ہوئیں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کون مجھ سے ٹکرایا۔ کمرے کی بتی جلی۔ میں کمرے کے اندر گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ چھت کی طرف دیکھا۔ مجھے نہ چمگادڑ نظر آیا نہ کوئی بھڑ۔ والد صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ میں نے تھرتھر کانپتی آواز میں انہیں بتایا [illegible] گئی تھیں۔ آپ نے دروازہ [illegible]

والد صاحب اپنی چارپائی میرے [illegible]

آئے۔ ماں اور میری بہن رونے لگیں۔ والد صاحب نے انہیں تسلی دے کر باہر بھیج دیا اور مجھے لٹا کر خود بھی لیٹ گئے۔ میں باقی رات جاگتا رہا۔ صبح ہوئی تو والد صاحب مجھے تعویذ دینے والے صوفی صاحب کے ہاں لے گئے میں نے انہیں رات کی واردات سنائی تو انہوں نے میری گردن میں ایک اور تعویذ لٹکا دیا۔

اگر میں ایک ایک روز کی کہانی سنانے لگوں تو یہ سو

صفحوں کی کتاب بن جائے گی۔ مختصر یہ کہ بھڑوں کی بھنبھناہٹ روزمرہ کا معمول بن گئی اور رات کے وقت کتنی بار ایسا ہوتا کہ میں جاگ اٹھتا اور میری ایک آنکھ میں [illegible] کے پر کا کونہ لگتا یا جیسے کسی نے رومال کا کونہ آنکھ پر [illegible]۔ شروع شروع میں تو میں ڈر جاتا۔ جب پانچ چھ مہینے گزر گئے تو میں بھڑوں کی گونج اور رات کے وقت آنکھ پر یاد رومال [illegible] کا عادی ہو گیا مگر دل سے خوف کی گرفت کم نہ ہوئی اور اس کے ساتھ بیوی کا تصور ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہنے لگا۔

بیوی کی یاد اور اس کا تصور روز بروز نکھرنے لگا اور میں بیوی سے ملنے کے لئے بے تاب ہونے لگا لیکن وہ اپنی ماں کی قید میں تھی۔ جب مجھے اس کی ماں کا خیال آتا تو دل ڈوب جاتا۔ وہ میری نگاہ میں عورت نہیں چڑیل بن گئی تھی۔ مجھے اپنی بیوی پر رحم آتا اور اس کی ماں پر غصہ۔ رحم اور غصہ مل کر میرے اندر آگ لگا دیتے۔ میرا سر پھٹنے لگتا، دانت بجنے لگتے اور مٹھیاں اس طرح بند ہونے لگتیں جیسے کوئی بھی سامنے آیا تو میں گھونسا مار کر اس کے دانت توڑ دوں گا۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ میں چھت پر اکیلا سویا ہوا تھا۔ گھر کے باقی افراد نیچے صحن میں سو رہے تھے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اپنی پیشانی پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ سرہانے کی طرف کسی عورت کا سایہ کھڑا تھا۔ اندھیرے میں چہرہ نہیں پہچانا جا سکا۔ قد بت میری بیوی کی طرح تھا۔ میں ڈر کے مارے چیخنے ہی لگا تھا کہ سائے کی ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ یہ میری بیوی کی ہنسی تھی۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا:

''تم یہاں کیسے پہنچ گئی ہو؟''

''یہ بھی کوئی مشکل کام ہے؟'' اس نے جواب دیا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی اور وہ سرہانے پر بیٹھ گئی اور دوسرا ہاتھ میرے سر اور گالوں پر پھیرنے لگی۔ میں نے اس کے بازو کو کلائی سے کندھے تک دبا دبا کر یقین کیا کہ یہ خواب یا تصور نہیں۔ میری بیوی جیتی جاگتی اصل روپ میں ماں سے چوری چھپے میرے پاس آئی ہے۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا تو میں نے اس کے جسم اور اس کے بالوں کی وہی بو سونگھی جس سے مجھے دلی محبت تھی میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری ماں نے مجھ پر جادو کر دیا ہے اور میں کیسی اذیت میں مبتلا ہوں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میری ماں بہت بری ہے۔ وہ عورت نہیں چڑیل ہے۔ جس کے پیچھے پڑ جائے اس کا جینا حرام کر دیتی ہے''۔ اس نے آہ بھر کر کہا۔ ''میں تمہارے پاس آتی رہوں گی''۔

میں نے ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھایا تو مجھے اپنے قریب بھڑوں کی اڑان کی گونج سنائی دینے لگی میں نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا۔ اندھیرے میں مجھے زرد زرد روشنی کی لکیروں کا جال نظر آنے لگا۔ جیسے سینکڑوں جگنو میرے اردگرد اڑ رہے ہوں۔ میری نظریں ان لکیروں میں الجھ گئیں اور میں سوچنے لگا کہ یہ بھڑیں ہیں یا جگنو؟ لکیریں مدھم ہونے لگیں اور اندھیرے میں گم ہو گئیں۔ گونج بھی ختم ہو گئی اور جب میں نے سرہانے کی طرف دیکھا تو میری بیوی غائب تھی۔ میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ خواب تھا لیکن میرے ہاتھ میں اپنی بیوی کی کلائی کا لمس موجود تھا۔ میں اس کی بو باس بھی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اٹھ کر مکان کے پچھواڑے جھک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ صحن میں دیکھا گھر کے افراد گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ نیچے جا کر دروازہ دیکھا اندر سے زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ میں حیران تھا کہ میری

بیوی چھت پر کس راستے آئی تھی۔ وہ آئی ضرور تھی۔ یہ تصور، خواب یا خیال نہیں تھا۔ میں لیٹ گیا۔ بہت دیر بعد آنکھ لگی صبح طلوع ہوئی۔ میں نے اٹھ کر سرہانے کی طرف چھت پر دیکھا وہاں بیوی کے پاؤں کے کوئی نشان نہیں تھے۔ چھت کچی تھی۔ پاؤں کے نشان ہونے چاہئیں تھے مگر نہیں تھے۔ میں نے اپنے ماں باپ سے ذکر نہ کیا اور دل ہی دل میں حیران اور پریشان ہوتا رہا۔

کئی دن سکون سے گزر گئے۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ ایک اور رات آئی۔ میں چھت پر سویا ہوا تھا۔ آنکھ کھل گئی۔ میری آنکھ پر کوئی نرم سی چیز لگی۔ میں ابھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ میں نے آنکھ پر ہاتھ پھیرا۔ چند سیکنڈ بعد روئی یا پرندے کے پر کی طرح کی کوئی بڑی ہی نرم چیز میری دونوں آنکھوں پر پھر گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ ذرا ہی دیر بعد وہی چیز پھر پھر گئی۔ میں نے زور سے جھپٹا مارا اور میرے ساتھ میں جو کچھ آیا وہ کسی پرندے کے پر تھے۔ میں نے پر کو مٹھی میں دبا لیا۔ مجھے کسی پرندے کے پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دی مگر پرندہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کا پر میرے ہاتھ میں تھا۔

میں نے دوسرا ہاتھ آگے کر کے پر پر پھیرا تو یہ واقعی کوئی پرندہ تھا لیکن تھا بہت بڑا۔ روئی کی طرح نرم و گداز، عجیب بات یہ ہے کہ میں ذرا بالکل نہیں۔ پرندہ پھڑپھڑا رہا تھا اور میں اسے پوری طرح دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ تو روئی سے بھی زیادہ نرم تھا۔ میرے ہاتھوں سے تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح پھسلا جا رہا تھا۔ آخر وہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا اور میں نے اس کے اڑنے کی آواز سنی۔ یہ آواز ہلکی ہلکی ہنسی میں تبدیل ہوگئی اور میرے اردگرد گھومنے لگی۔ میری پھٹی پھٹی آنکھیں اس آواز کا تعاقب کر رہی تھیں۔

آخر یہ آواز پچھواڑے کی منڈیر پر ٹھہر گئی۔ میں نے نظریں جما کر دیکھا تو مجھے اپنی بیوی کے جسم جثے کا سایہ منڈیر پر کھڑا نظر آیا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ ”آگے آ جاؤ، گر پڑو گی“۔ وہ ذرا بلند آواز سے ہنسی اور پیچھے ہٹ گئی۔ میں اٹھ کر اس کی طرف دوڑا مگر وہ گر پڑی۔ مجھے اس کے گرنے کی آواز نہ سنائی دی۔ میں سیڑھیوں سے دوڑتا ہوا اترا۔ دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ پچھواڑے کی گلی میں جا کے دیکھا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ زخمی حالت میں اپنے گھر چلی گئی ہوگی اور ابھی کہیں راستے میں ہی ہوگی۔

میں اس کے گھر کی طرف دوڑنے لگا تو مجھے کسی نے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں نے دیکھے بغیر کہ وہ کون ہے، چلانا شروع کر دیا۔ ”وہ کوٹھے سے گر پڑی ہے۔ وہ راستے میں بے ہوش ہوگئی ہوگی“۔ میں بازوؤں سے آزاد ہونے کے لئے زور لگانے لگا اور مجھے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ”بیٹا! اندر آ جاؤ۔ خدا کے لئے بیٹا ہوش کرو“۔

یہ میرے والد صاحب کی آواز تھی۔ پھر مجھے اپنی ماں اور بہن کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ دونوں بھی رو رہی تھیں۔ میں اور زیادہ چلانے لگا۔ یہ لوگ مجھے حقیقی دکھائی دے رہے تھے۔ میرے لئے حقیقت صرف یہ تھی کہ میری بیوی مجھے ملنے آئی تھی اور وہ کوٹھے سے گر پڑی ہے۔

شاید آدھی رات گزر گئی تھی۔ میرے شور شرابے اور میرے ماں باپ اور بہن کی آوازوں سے محلے کے کئی آدمی باہر نکل آئے۔ گلی میں ہنگامہ بپا ہوگیا۔ میں ان سب کو دشمن سمجھ رہا تھا اور چلائے جا رہا تھا۔ ”وہ کوٹھے پر آئی تھی۔ وہ گر پڑی ہے۔ مجھے جانے دو۔ وہ راستے میں بے ہوش پڑی ہوگی“۔

اتنے سارے آدمیوں نے مجھے جکڑ لیا اور گھسیٹ کر اندر لے گئے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کون آئی تھی؟

میں نے کہہ دیا۔ ''میری بیوی آئی تھی۔ پہلے بھی آئی تھی۔ وہ پچھواڑے سے اترتے گر پڑی تھی''۔

دوسرے دن میری ساس ہمارے گھر آ گئی۔ وہ منہ پھٹ عورت تھی۔ اس نے میری ماں کی جی بھر کے بے عزتی کی اور جو منہ میں آیا بکا۔ محلے میں مشہور ہو گیا تھا کہ میری بیوی رات چوری چھپے مجھے چھت پر ملنے آتی ہے۔ لوگوں کو قصے کہانیاں سننے سنانے سے لذت آتی ہے۔ ساس نے واہی تباہی بکتے ہوئے بتایا کہ لوگوں نے میری بیوی کے متعلق بڑی ہی شرمناک کہانیاں گھڑ لی ہیں۔

میرے والد صاحب خوددار اور شریف انسان تھے۔ ماں البتہ ساس کی طرح کی عورتوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ اس نے میری ساس پر جوابی حملہ کیا۔ ساس نے للکار کر کہا کہ تم لوگوں نے میری شرم دحیا والی بچی کو بدنام کیا ہے۔ پہلے شاید میں اسے تمہارے ہاں بھیج دیتی۔ اب نہیں بھیجوں گی۔ تم طلاق دو نہ دو، ساری عمر گھر بٹھائے رکھوں گی۔ میری ماں نے کہا کہ پہلے تو شاید ہم طلاق دے دیتے، اب ساری عمر نہیں دیں گے۔ بٹھائے رکھو اسے گھر۔

والد صاحب نے بھی ماں کے فیصلے کی تائید کر دی اور ساس گالیاں بکتی چلی گئی۔ میں کمرے سے باہر نہ نکلا۔ ساس کی آواز ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے چڑیل چیخ رہی ہو۔ میں خوف سے جکڑا رہا تھا اور چارپائی سے ہل نہ سکا۔ جب میں نے یہ فیصلہ سنا کہ اب میری بیوی ساری عمر میرے گھر نہیں آئے گی تو خوفزدگی کے ساتھ غصہ اور غم بھی شامل ہو گیا جس سے میرا سر چکرانے لگا۔ اس کے ساتھ ساس کے جادو کا ڈر اور زیادہ شدید ہو گیا۔

میری بیوی میرے پاس ضرور آئی تھی۔ میں نے غلطی کی جو سب کو بتا دیا۔ اب یہ ڈر محسوس ہونے لگا کہ میری ساس اسے بالکل ہی قید کر لے گی اور اسے سزا بھی دے گی۔ ساس وحشی قسم کی عورت تھی۔ بیٹی کو اس نے ضرور مارا پیٹا ہوگا۔

اس رات بھی میں چھت پر سویا۔ معلوم نہیں رات کتنی گزر گئی ہوگی کہ میرے گال میں سوئی اتر گئی۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ میرے اردگرد سینکڑوں بھڑیں اڑ رہی تھیں۔ اندھیرا گہرا تھا پھر بھی مجھے بھڑیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ غضبناک طریقے سے میرے اردگرد اڑ رہی تھیں اور گھیرا تنگ کرتی جا رہی تھیں۔ مجھے ایک بھڑ ڈنک مار چکی تھی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں سیڑھیوں کی طرف دوڑ پڑا۔ والد صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور انہوں نے مجھے پکڑ لیا لیکن میں ان سے آزاد ہونے کو تڑپنے لگا۔ ماں اور بہن بھی آ گئیں۔ میں یہی ایک رٹ لگا رہا تھا۔ ''مجھے اندر بند کر دو۔ کاٹ کھائیں گی مجھے کہیں چھپا دو''۔ اور وہ مجھے کمرے میں لے گئے۔

دوسرے دن تعویذ دینے والے صوفی صاحب آ گئے۔ میں نے انہیں پہلی بار بتایا کہ ساس نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ صوفی صاحب نے میرا وہم دور کرنے کی بجائے تصدیق کر دی کہ میں واقعی کالے جادو کا شکار ہوں۔ وہ میرے والد صاحب کو اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ صوفی صاحب نے انہیں کیا علاج بتایا۔ میں نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا۔ رات ایک بھڑ نے ڈنک مارا تھا مگر سوجن محسوس نہ ہوئی۔

اس روز کے بعد دل میں یہی ایک ارادہ گھر کر گیا کہ اپنی بیوی کو دیکھوں گا۔ ساس نے اسے ضرور سزا دی ہوگی جبکہ وہ پہلے سے ہی میرے کوٹھے سے گر کر زخمی ہو گی۔ میں اٹھ کر باہر کو چل دیا۔ آج مجھے اس وقت کی کیفیت یاد آتی ہے تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میں آگ کا شعلہ تھا، گوشت پوست کا انسان نہیں رہا تھا۔ میں جب باہر نکلا تو مجھے محلے کا کوئی مکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبھی ایسے لگتا جیسے میرے اردگرد مٹی کے تودے

کھڑے ہیں اور کبھی دونوں طرف ریل گاڑیاں بھاگتی دکھائی دینے لگتیں۔ مجھے ذرہ بھر ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

میں چلتا گیا، چلتا گیا اور میری آنکھوں کے آگے دھند چھا گئی۔ ذرا دیر بعد دھند چھٹی تو میں نے اپنے آپ کو قبرستان میں گھومتا پھرتا پایا۔ میں نے کچھ بھی نہ سوچا کہ تودے اور ریل گاڑیاں کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ میں قبرستان سے نکل کر کھیتوں میں چلا گیا۔ مجھے اپنے پیچھے کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے رک کر دیکھ۔ میرے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میں پیچھے دیکھ رہا تھا کہ کوئی انسان دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزر گیا۔ میں نے ہر طرف دیکھا، مجھے کوئی انسان نظر نہ آیا۔

میں آگے کو چل پڑا۔ مجھے کسی عورت کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں رک گیا۔ ادھر ادھر دیکھا، کوئی عورت نظر نہ آئی۔ آگے پانچ چھ درخت اکٹھے ہی کھڑے تھے جب میں ان کے قریب پہنچا تو صاف نظر آیا کہ ایک جواں سال عورت ایک درخت کے تنے کی اوٹ میں چھپ گئی ہے۔ میں اب بزدل نہیں تھا۔ میں دوڑ کر پہنچا تو عورت اس درخت سے ہٹ کر دوسرے درخت کے تنے کے پیچھے ہو گئی۔ میں اس کا تعاقب کرنے لگا اور وہ بھاگ بھاگ کر چھپنے لگی۔ میں نے اسے پہچان لیا، وہ میری بیوی تھی۔

میں نے آخر اسے پکڑ لیا اور وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے وہ گھاس پر لوٹ پوٹ ہونے لگی اور میں بھی اس کے ساتھ ہی اسے بازوؤں میں دبوچ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میں نے اس سے بالکل نہیں پوچھا کہ تم میری چھت سے گر پڑی تھیں یا ماں نے تمہیں مارا تھا۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اس کے ساتھ پیار کی باتیں کرتا رہا اور وہ میرے ہاتھوں کی انگلیوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔

اچانک مجھے کندھوں پر چوٹ پڑی اور دنیا تاریک ہو گئی۔ اندھیرا جلد ہی ختم ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو بلندی پر پایا۔ نیچے مجھے بہت سے بچے نظر آ رہے تھے جو مجھ پر مٹی کے ڈھیلے پھینک رہے تھے۔ میں درخت کے ایک ٹہن پر بیٹھا تھا۔ اتنے میں کچھ آدمی آ گئے۔ انہوں نے بچوں کو گالیاں دیں اور میری آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی۔

دھند چھٹی تو مجھے مانوس سے چہرے نظر آئے جن میں ایک چہرہ والد صاحب سے ملتا جلتا تھا۔ دوسرا شاید ماں کا چہرہ تھا، تیسرا بہن کے مشابہ اور چوتھا تعویذوں والے صوفی صاحب کی طرح کا چہرہ مگر میں کسی کو بھی نہیں پہچانتا تھا۔ پھر یہ تمام چہرے ہوا میں تحلیل ہو گئے اور ہوا میں پانی کے عکس کی طرح جھلمل کرتا ایک انسانی پیکر نمودار ہوا۔ وہ میری طرف بڑھا اور میری بیوی بن گیا۔ میں نے لپک کر اسے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا اور چلانے لگا:

''اب تمہیں نہیں جانے دوں گا''۔

میں نے اپنی بیوی کو اپنے سینے میں قید کر لیا۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ کیسے ممکن تھا۔ ہوا یوں کہ میرا اور میری بیوی کا جسم ایک ہو گئے۔ پھر مجھے وقت اور زمانے کا کوئی احساس نہ رہا کہ سیکنڈ گزرے ہیں یا صدیاں۔ ہم دو جسم ہوا میں ایک ہو کر چلتے پھرتے رہے۔ بادلوں کے گالے سے تھے جن میں ہم رہتے تھے۔ مکانوں کی دیواریں اور چھتیں غائب ہو گئیں۔ گلیاں کہکشاں بن گئیں۔ باہر کی دنیا کی کوئی آواز کان میں نہیں پڑتی تھی۔

دل نہ توڑو

زندگی میں کبھی کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ وہ معاف تو کر دے گا لیکن کبھی بھولے گا نہیں۔

☆ ..... علیزا بتول۔ حیدر ا جکاں

کیا میں مر گیا تھا اور یہ اگلا جہان تھا؟ میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ اگر میں زندہ تھا تو یہ بادلوں کی دنیا تھی اور اگر میں مر گیا تھا تو بھی یہ بادلوں کی دنیا تھی اور میرا جسم میرا بھی تھا اور میری بیوی کا بھی۔ اس کے نقش و نگار تو وہی تھے لیکن بے حد حسین اور ایسے دلکش کہ مجھ پر خمار طاری رہتا تھا۔

ایک روز میں اپنی بیوی کے ساتھ اُڑ رہا تھا کہ میں زمین پر آ گیا۔ میرا جسم اکیلا رہ گیا۔ بیوی کا جسم مجھ سے جدا ہو چکا تھا اور میں اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں یہ ضرور محسوس کر رہا تھا کہ میرے آگے آگے کوئی بھاگ رہا ہے۔ وہ ایک سایہ سا تھا اور ہر سُو دھند سی تھی۔ میں اس سائے کا تعاقب کرنے لگا اور میں نے اسے پکڑ لیا۔ جب اس نے منہ میری طرف کیا تو وہ میری بیوی کا چہرہ تھا اور یہ چہرہ ایک چڑیل کا تھا۔ میں بہت ہی دلیر ہو گیا۔ میں نے اس کی گردن کو دبا لیا۔ میری انگلیاں لوہے کی سلاخیں بن گئیں۔ میں نے سلاخوں کا شکنجہ تنگ کر دیا۔ چڑیل کا منہ کھل گیا، زبان باہر نکل آئی اور آنکھوں کے ڈھیلے بھی باہر آ گئے۔ مجھ پر نشہ طاری ہوتا چلا گیا۔ چڑیل تڑپ تڑپ کر بے حس ہو گئی اور گر پڑی۔

میں اسے دیکھتا رہا اور میں درندہ بن گیا۔ میں نے اس کے کھلے ہوئے منہ میں انگلیاں دے کر مختلف سمتوں کو اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ چڑیل کا منہ چر گیا۔ قریب ہی ایک پتھر دیکھا خاصا وزنی تھا۔ میں نے اٹھا کر چڑیل کی پیشانی پر زور زور سے مارنا شروع کر دیا۔ خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر مجھ پر پڑنے لگے۔

اچانک کئی ایک ہاتھوں نے میرے ہاتھ پکڑ لئے اور میں دھند میں ان ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹنے لگا۔ میں نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا جو مجھے بہت اچھا لگا۔ میں اب اور خون پینے کو بیتاب ہونے لگا۔ معلوم نہیں وہ کس کا ہاتھ تھا جسے میں نے دانتوں میں دبا لیا اور خون چوسنے لگا۔ میرے سر میں کئی چوٹیں پڑیں پھر سفید سفید دھند سیاہ کالی ہو گئی۔

آج خواب کی طرح یاد ہے کہ عجیب عجیب سی شکلوں کے انسانوں کے ہجوم نے مجھے گھیر لیا تھا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ پھر دھند اور اندھیرا۔ پھر میں تنہا تھا۔ کچھ ایسے یاد آتا ہے کہ میں پنجرے میں بند تھا اور میرے گرد آوازیں ہی آوازیں تھیں جن میں سے کچھ تو شاید مجھ سے مخاطب تھیں اور کچھ میرے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں مگر میں ان سے بے نیاز تھا۔ کیونکہ میری بیوی کا جسم پھر میرے جسم میں تحلیل ہو گیا تھا۔

ایک روز میرے بازو میں ایک سوئی اتر گئی۔ میں تڑپ اٹھا۔ تین آدمیوں نے مجھے جکڑ لیا اور مجھے بھڑوں کی خوفناک بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ میرے اردگرد زرد پیلی لکیروں کا گول جال تن گیا لیکن فوراً ہی یہ جال غائب ہو گیا اور پھر مجھے کچھ بھی یاد نہیں کہ میں کہاں چلا گیا۔

اس روز کے بعد میں تاریکی میں زندہ رہا۔ بازو میں سوئی اتر جاتی تھی۔ میں تڑپتا تھا اور دو تین بازو مجھے جکڑ لیتے تھے۔ دن گزرے، مہینے یا سال گزرے، مجھے کوئی احساس نہ تھا۔ میرے لئے دن اور رات گہری دھند تھے اور اس دھند میں میں اپنی بیوی کو ڈھونڈتا رہتا تھا۔

ایک روز اچانک دھند چھٹ گئی۔ مجھے یہ دنیا نظر آنے لگی مگر میں جہاں بیٹھا تھا وہ میرا گھر نہیں تھا۔ ایک کمرہ تھا۔ دروازے میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ میں سٹول پر بیٹھا تھا۔ میرے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے جو امیر کبیر اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ ایک نے کہا:

”سنو دوست! ہم تمہارے گہرے دوست ہیں۔ تمہارے ذہن میں اس وقت کیا خیال ہے؟ کس کا خیال ہے، تم کیا محسوس کر رہے ہو؟“

"میری بیوی کہاں ہے؟" میں نے ڈرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "میری ساس کہاں ہے؟"

"تمہاری ساس مر چکی ہے"۔ اس نے جواب دیا۔ "اور تمہاری بیوی یہیں ہے۔ زندہ ہے۔ تمہیں مل جائے گی"۔

دوسرے نے کہا۔ "کیا تم اپنی ساری کہانی سنا سکتے ہو؟ تمہارے ماں باپ نے ہمیں بہت کچھ بتایا تھا۔ اب تم بتاؤ کہ تم کیا سوچتے رہے ہو۔ ہم تمہیں یہ بتا دیتے ہیں کہ تم اپنے ذہن کی دنیا میں چل گئے تھے۔ اس دنیا کی ساری کہانی سناؤ۔ ہم تمہیں تمہاری حقیقی دنیا میں واپس لے آئیں گے اور تمہاری بیوی بھی تمہیں مل جائے گی"۔

میرے آنسو نکل آئے۔ اب میں آگ کا شعلہ نہیں تھا اور میں درندہ بھی نہیں تھا۔ میں ایک بزدل بچہ تھا۔ میں نے روتے ہوئے پہلا جملہ یہ کہا۔ "میری ساس نے مجھ پر جادو کر دیئے ہیں۔ مجھے اس جادو سے بچاؤ۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے"۔ اور میں نے انہیں یہ ساری کہانی سنا دی جو آپ کو سنا چکا ہوں۔ جب میں سنا چکا تو ایسے لگا جیسے میرے اندر زہر بھرا ہوا تھا۔ وہ نکل گیا ہے۔ ان دو آدمیوں نے ایسی پیاری باتیں کیں کہ میں احساسات کی دنیا میں لوٹ آیا اور یہ دو آدمی مجھے فرشتوں کی طرح قابل احترام نظر آنے لگے۔

مجھے بھوک اور پیاس محسوس ہونے لگی۔ نیند اور بیداری بھی محسوس ہونے لگی اور صبح و شام کا احساس بھی بیدار ہو گیا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک آدمی دو تین گھنٹے روزانہ میرے پاس بیٹھتا اور مجھے بتاتا رہتا تھا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میں آگرہ کے پاگل خانے میں ہوں جہاں میں ایک سال سے زیر علاج ہوں۔ یہ دونوں آدمی ڈاکٹر تھے۔ ایک مسلمان تھا جو طب کا ڈاکٹر تھا اور دوسرا ہندو۔ وہ خاصا بوڑھا ہو چکا تھا اور وہ نفسیات کا ماہر تھا۔

ایک روز دونوں میرے کمرے میں آئے۔ ان کے پیچھے پاگل خانے کا ایک ملازم آیا۔ اس کے ہاتھ میں شیو اور حجامت کا سامان تھا۔ یہ سامان دیکھ کر میں نے اپنے منہ اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ میری داڑھی ایک بالشت سے زیادہ تھی اور سر کے بال عورتوں کی طرح لمبے۔ مسلمان ڈاکٹر نے کہا۔ "دوست! بال کٹوا لو۔ داڑھی رکھنا چاہو تو تمہاری مرضی۔ صاف کرانا چاہو تو یہ کر دے گا"۔

وہ میرے پاس بیٹھ گئے اور حجام میرے بال کاٹنے لگا۔ ہندو ڈاکٹر نے آہستہ سے حجام سے کہا۔ "استرا سنبھال کر رکھنا۔ کوئی پتہ نہیں"۔ اور وہ میرے ساتھ اس طرح باتیں کرنے لگے جیسے بچے کو بہلایا جاتا ہے۔

ہندو نے جادو اور کالے علم کے متعلق لیکچر شروع کر دیا اور مجھے سمجھایا کہ یہ سب محض میرا وہم تھا۔ حجام میرے بال کاٹتا رہا۔ پھر اس نے میری شیو شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ماہر نفسیات مجھے ذہن نشین کراتا رہا کہ میں ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ انہوں نے مجھے جوانی تک بچہ بنائے رکھا، نہ مجھے جوان ہونے دیا نہ مرد بننے دیا۔ اس سے میں بزدل ہو گیا۔ بزدل کا وہمی ہونا قدرتی امر ہوتا ہے۔ مجھے اپنی بیوی سے محبت تھی جو مجھ سے چھین لی گئی۔ ساس کے متعلق یہ افواہ کہ وہ جادو کرواتی ہے محض بے بنیاد تھی۔ مجھے پہلے روز واقعی بھڑوں نے گھیر لیا اور کاٹا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس سے پہلے میں نے ساس کو ایک قبر پر جھکے دیکھا تھا۔ ڈاکٹروں کی تفتیش کے مطابق وہ قبر اس کی ماں کی تھی۔ وہ ہر جمعرات کے روز اس قبر پر پھول رکھنے جایا کرتی تھی اور ہاتھوں سے قبر کی مٹی ہموار کیا کرتی تھی۔ میرے وہم کو تعویذوں والے صوفی صاحب نے اور زیادہ پختہ کر دیا کیونکہ اس شخص کی آمدنی کا ذریعہ یہی تعویذ تھے۔ ایسے پیر فقیر لوگوں کو وہم میں مبتلا کر کے ان سے پیسے بٹورتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی باتیں میرے ذہن میں اترتی چلی

گئیں اور میری شیو بھی ہوئی اور بال بھی کٹ گئے۔ پھر مجھے ایک وارڈر کی زیر نگرانی نہلایا گیا۔ جب میں غسل خانے سے نکلنے لگا تو میرے کپڑے غائب تھے۔ وارڈر نے مجھے ایک سفید چادر دی جو میں لپیٹ کر کمرے میں آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں پھر تصوروں کی دنیا میں پہنچ گیا کیونکہ کمرے میں میری بیوی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اس کے آنسو بہنے لگے۔ اس نے میرے دھلے دھلائے کپڑے اٹھا رکھے تھے۔ مجھ پر وہی کیفیت طاری ہونے لگی تھی لیکن وارڈر نے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں بھائی تمہاری اپنی بیوی ہے''۔

وارڈر کمرے سے نکل گیا اور دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں نے بیوی کے ہاتھوں سے کپڑے لے کر پہن لئے۔ بیوی میرے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں حقیقی دنیا میں لوٹ آیا۔ وہ شام تک میرے ساتھ رہی اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے گھر واپس آ گئی

ہے اور اس کی ماں مرگئی ہے مگر میں نے اعتبار نہ کیا۔ شام کے وقت میرے والد صاحب، ماں اور بہن آئیں۔ انہوں نے بھی بتایا کہ میری بیوی گھر آ گئی ہے۔

وہ سب شام کے وقت چلے گئے۔ میرا ذہن اب میرے قابو میں تھا مگر ساس کا تصور میرے پاؤں اکھاڑ دیتا تھا۔ دوسرے دن ڈاکٹر نے کہا۔ ''اب تم ٹھیک ہو۔ ہماری طرف سے تم فارغ ہو۔ گھر جا سکتے ہو''۔ میں نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ میری ساس زندہ ہے۔ میں اس کے ڈر سے وہاں نہیں جانا چاہتا۔

ڈاکٹر کمرے سے باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی فائل تھی۔ اس نے فائل مجھے دے کر کہا۔ ''تم انگریزی جانتے ہو، یہ پڑھو''۔

میں فائل پڑھنے بیٹھ گیا۔ پہلا صفحہ پڑھا تو میرا جسم لرز گیا۔ یہ میری ساس کے قتل کے کیس کی فائل تھی

اور میں ساس کا قاتل تھا۔ میں نے فائل پڑھنی شروع کر دی۔ استغاثہ کا الزام پڑھا پھر استغاثہ کے ہر ایک گواہ کی شہادت پڑھی۔ اس کے بعد صفائی کے گواہوں کے بیان پڑھے۔ مجھے حیرت اس پر ہوئی کہ میرے سسر نے اپنی بیوی کے خلاف اور میرے حق میں بیان دیئے تھے۔ آخر میں سیشن جج کے فیصلے کی نقل تھی جس کا لب لباب یہ تھا کہ میں (یعنی ملزم) اس حد تک پاگل ہوں کہ مجھے ذرہ بھر احساس نہیں کہ میں نے کیا کیا ہے اور میرے خلاف مقدمہ چل رہا ہے۔ میں اپنا بیان دینے کے قابل نہیں۔

سیشن جج نے میرے وکیل کی درخواست پر ماہرین نفسیات کے ایک سرکاری بورڈ سے میرا دماغی معائنہ کرایا تھا۔ معائنہ رپورٹ کے مطابق میں مکمل طور پر پاگل تھا اور میں اپنے قول و فعل کا ذمہ دار نہیں تھا۔ یہ رپورٹ نہایت صاف تھی۔ جج خود بھی دیکھ رہا تھا کہ میری ذہنی کیفیت کیا ہے۔ اس رپورٹ کی بنا پر جج نے مجھے بری کر کے سفارش کی تھی کہ مجھے پاگل خانے میں سرکاری انتظام کے تحت داخل کرا دیا جائے۔

کیس کی فائل کے مطابق میں نے ساس کو کھیتوں سے باہر درختوں کے جھنڈ کے نیچے اس وقت قتل کیا تھا جب وہ وہاں سے اتفاقیہ گزری تھی اور میں اپنے پاگل پن میں وہاں گھوم پھر رہا تھا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق میں نے ساس کا گلا گھونٹا تھا، پھر اس کا منہ چیر دیا تھا پھر پتھر سے اس کی کھوپڑی کچل ڈالی تھی۔ پولیس کے بیان کے مطابق مجھے تین چار کسانوں نے پکڑا تھا اور ان میں سے دو کو میں نے زخمی کر دیا تھا۔ ایک کا ہاتھ کاٹ کھایا تھا اور دوسرے کو پتھر سے لہولہان کر دیا تھا۔ مجھے گرفتار کیا گیا۔ چالان ہوا۔ مقدمہ چلا جو چھ مہینے جاری رہا مگر مجھے کوئی ہوش نہیں تھا۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ عدالت میں یا تو بالکل خاموش رہتا تھا یا میں ہنستا رہتا تھا یا چیخنے لگتا تھا۔

پتہ چلا کہ میں ایک سال پاگل رہا۔ ساس کو قتل کیا تو چھ ماہ بعد مجھے آگرہ کے پاگل خانے میں داخل کیا گیا جہاں میں ایک سال رہا۔

یہ کیس پڑھ لینے سے مجھ پر دو اثر ہوئے۔ ایک اس گناہ کا بوجھ کہ میں قاتل ہوں اور دوسری یہ خوشی کہ ساس اس دنیا سے اٹھ گئی ہے۔ بیوی اور اس کے باپ نے مل جل کر میرے ضمیر سے قتل کے گناہ کا بوجھ اتار دیا اور میں حقیقی دنیا میں واپس آ گیا۔ بیوی نے مجھے بتایا کہ ساس کی زندگی میں وہ کبھی بھی میرے پاس نہیں آئی تھی۔ میں اپنی بیوی سے تصوراتی دنیا میں ملتا رہا تھا۔ بیوی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس کی ماں نے کبھی کسی پر جادو نہیں کرایا تھا نہ اسے علم تھا کہ جادو سے کسی کو زیر یا پریشان کیا جا سکتا ہے۔ اس کی خصلت اتنی بری تھی کہ لوگوں نے اسے بدنام کر رکھا تھا۔ اس کے قتل کے بعد میرے سسر نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بیٹی کو میرے گھر بھیج دے گا۔ وہ شریف انسان تھا۔ میں پاگل خانے میں تھا۔ جس روز ڈاکٹروں نے میرے والدین سے کہا کہ اس کی بیوی کو لے آؤ تو میرے سسر نے فوراً میری بیوی کو بھیج دیا۔

فوراً بعد اس ملک کا عظیم واقعہ رونما ہوا۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ یہ ایسا انقلاب تھا کہ ضمیر سے تمام ناگوار بوجھ اتر گئے اور میں اپنے کنبے کے ساتھ مسلمانوں کی لاشوں میں سے گزرتا پاکستان میں داخل ہوا۔ آج میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ زندگی اچھی گزر رہی ہے مگر پاکستان میں چار دیواری کی دنیا میں بھی میں وہی قباحتیں دیکھ رہا ہوں جو مجھ جیسوں کو پاگل اور قاتل بنا رہی ہیں۔ جب کسی پاگل کو سڑکوں پر ہنستا یا چیختا دیکھتا ہوں تو دکھ ہوتا ہے کہ چار دیواری کی دنیا نے ایک اور انسان کو پاگل کر دیا ہے اور جو کسر رہ گئی تھی وہ تعویذ دینے والے صوفیوں، پیروں اور ملاؤں نے پوری کر دی ہوگی۔

❋❋❋

☆ خادم حسین مجاہد

صبح ہوتے ہی لاشعور نے میرے شعور کو تھپڑ مار کر جگایا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد یہی کام بیگم نے کر دینا ہے۔ میں نہار منہ بیگم سے مار کھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی اس قسم کے ''درشن'' کے بعد پورا دن برباد کرنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ لہٰذا بادل نخواستہ بستر کو داغِ مفارقت دے کر خمار آلود آنکھوں سے ڈول تلاش کرنے لگا تاکہ دودھ لا سکوں۔ ڈول پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے گردونواح میں نامانوس سی تبدیلی محسوس کی۔ گھر سے نکلتے ہی میری آنکھیں یوں کھل گئیں جیسے عوام کی الیکشن کے بعد کھل جاتی ہیں اور جو کچھ میں نے دیکھا اس کے بعد آنکھوں پر سے میرا ایمان سیاستدانوں کے بیانوں کی طرح اٹھ گیا کہ میرے سامنے ہڑپہ کی کھدائی کا منظر پیش کرنے والی سڑک کی بجائے کئی منزلہ سڑک پھیلی ہوئی تھی۔ ہر منزل شیشے کی طرح چمک رہی تھی پہلی منزل سے پیدل چلنے والے گزر رہے تھے، دوسری منزل سے صرف پانچ پہیوں

خاکہ

خادم حسین مجاہد طنز و مزاح کا جادوگر

ڈاکٹر احمد حسن رانجھا

آسمان کی طرف مجاہد صاحب کے قد کا سفر ساڑھے پانچ فٹ اور دائیں سے بائیں ڈیڑھ دو فٹ پر منتج ہوتا ہے۔ یوں اگر ان کے جسمانی اور ادبی حجم کا موازنہ کیا جائے تو فرق آسمان و زمین سے کچھ کم ہوگا۔ اگر آپ ان کی تحریریں پڑھیں اور پھر ان کے سراپا کا بغور جائزہ لیں تو یقیناً آپ سوچ میں گم ہو جائیں گے کہ اتنی بڑی بڑی باتیں اتنی مختصر جگہ قید تھیں۔ آج کے دور میں اچھا طنز و مزاح اچھے لوگوں کی طرح کمیاب ہوتا جارہا ہے لہٰذا طنز و مزاح کی اس قحط سالی میں ان کی تحریریں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہیں۔ طنز و مزاح لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ بے ہودگی سے دامن بچا کر قاری کو زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، ان کی تحریروں سے ان کی مزاح شناسی آشکار ہونے کے ساتھ ساتھ مزاح نگاری پر ان کی دسترس کا بھی پتا چلتا ہے۔ ان کی تحریر میں ہمیشہ آپ کو نئے خیالات، نئی سوچ اور نئی فکر ملے گی جسے ڈھونڈنے کے لئے آپ کو عمیق نظری کا سہارا نہیں لینا پڑے گا۔

خادم حسین مجاہد اپنے ہر کردار کو اس خوبصورتی سے نبھاتے ہیں اور اس قدر گہرائی میں جا کر اس کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کردار ان کی اپنی ذات کا ہی حصہ ہیں آپ ان کے کرداروں کو فراموش نہیں کر سکیں گے۔ زیرِ نظر تحریر میں خادم صاحب نے ہمیں مستقبل کی سیر کرائی ہے اور سو سال بعد کی دنیا کی حیرت انگیز منظر کشی کی ہے جب سائنسی ترقی انتہا کو پہنچ چکی ہوئی ہے۔ اس خالص سائنسی اور سنجیدہ موضوع کو جس طرح اپنے منفرد انداز میں انہوں نے مزاح کا لباس پہنایا ہے وہ بے مثال ہے۔

مجاہد صاحب احباب کے خاکے بھی اڑاتے ہیں لیکن اس طرح کہ نشانہ بننے والے سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ خوش ہوں یا ناراض، کیونکہ یہ انداز ہی اتنا شگفتہ رکھتے ہیں۔ خادم صاحب کی تحریریں طلسم ہوشربا ہیں اور خود یہ کسی جادوگر سے کم نہیں۔ ان کی تحریروں میں آپ کو گلی محلے سے لے کر اپنے وطن، براعظم حتیٰ کہ پوری دنیا کے مسائل سے آنکھیں چار کرنا پڑیں گی۔ ان کی تحریریں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ طنز و مزاح نگاروں کی دنیا ابھی ویران نہیں ہوئی بلکہ ان کی فہرست میں ایک اور اچھے مزاح نگار کا اضافہ ہو گیا ہے جو دوسروں پر ہی تنقید نہیں کرتے بلکہ خود پر تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ''خود تنقیدی'' بھی کر جاتے ہیں۔ اللہ انہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے!

والی سائیکلیں اور تیسری و چوتھی منزل سے بالترتیب دو پہیوں والی کاریں اور جیٹ جہاز نما کاریں گزر رہی تھیں۔ مزید اوپر پہنچنے میں میری نظر کسی غریب کی فائل کی طرح ناکام ہوگئی تو میں نے اردگرد نظر دوڑائی جیسے سائل پر کلرک دوڑاتے ہیں۔ پیدل چلنے والی منزل کے ایک طرف کچھ فاصلے پر ایک عجیب و غریب کیبن نظر آرہا تھا۔ میں متجسس قدموں سے کیبن کی طرف بڑھا لوگ مجھے اس تندہی سے گھور رہے تھے جیسے خدانخواستہ میں لڑکی تھا لیکن جلدی میں اس کی وجہ سمجھ گیا۔

میرا حلیہ اور لباس ان سب سے مختلف تھا اور وہ

سب ایک قسم کے ڈیزائن کے لباس میں تھے جس کا رنگ چمکدار سفید تھا اور ہر آدمی کے سینے پر سبز، سرخ اور نیلے رنگ کے بٹن موجود تھے۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ ان بٹنوں کو دبا کر دیکھوں تو کیا ہوتا ہے مگر پھر میں اس ارادے سے باز رہا کہ وہ سب پہلے ہی مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے پھر نہ جانے میرا کیا حشر کرتے۔ میں نے ابھی تک کسی کو مخاطب کیا تھا اور نہ ہی ان میں سے کسی نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی پھر ایک خیال کے تحت میں نے دودھ کا ڈول سڑک پر گرا دیا اور خود دور ہٹ گیا۔ فوراً سب اس کی طرف دوڑے اور اپنی جیبوں سے عجیب و غریب آلات نکال کر اسے چیک کرنے لگے، یقیناً وہ مجھے دہشت گرد قسم کی چیز سمجھ رہے تھے۔ اچانک ان میں سے تین آدمی میری طرف بڑھے میرے لئے کوئی راہِ فرار نہیں تھی لہٰذا میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ لوگ مجھے لے کر ایک عجیب و غریب کیبن کے پاس پہنچے کیبن کا کوئی دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیرونی دیواروں پر نیلی شعاعیں دوڑ رہی تھیں، ان لوگوں نے دیوار میں موجود چینل بٹن دبایا تو ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں کے آگے دھند چھا گئی پھر جب یہ دھند چھٹی تو ہم کسی اور جگہ موجود تھے۔ شاید یہ کیبن کا اندرونی حصہ تھا۔ چاروں طرف عجیب و غریب مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ اس حصے کے درمیان میں ایک بہت بڑی سکرین روشن تھی جس پر کئی منزلہ سڑک کی ہر منزل سے گزرنے والی ٹریفک واضح نظر آ رہی تھی۔ مجھے لانے والے آدمیوں میں سے ایک نے اشفاق احمد کے ڈراموں کی طرح سمجھ نہ آنے والی کسی زبان میں نیلے انسان سے کچھ کہا تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک کرسی نما چیز پر بٹھایا اور میرے سر پر ہیلمٹ نما چیز رکھ دی جس میں سے بہت سی تاریں نکل کر دیواروں کے ساتھ موجود مشینوں تک جا رہی تھیں۔ اب ان میں سے ایک مشین پر ایک چھوٹی سی سکرین روشن ہو چکی تھی سب کی نظریں اس سکرین پر لگی ہوئی تھیں۔ سکرین پر بہت سی اشکال بن اور بگڑ رہی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف ہندسے بھی جل بجھ رہے تھے۔ دس منٹ تک یہ کھیل ہوتا رہا پھر نیلے انسان نے میرے سر سے ہیلمٹ نما چیز ہٹائی اور میرے ساتھ آنے والے آدمیوں کو کوئی اشارہ کیا۔ انہوں نے دیوار کے پاس جا کر ایک بٹن دبایا تو دیوار کا وہ حصہ لٹو کی طرح گھوم گیا۔ دیوار پھر برابر ہوئی تو وہ لوگ موجود نہیں تھے۔ اچانک نیلے انسان کے منہ سے مشینی انداز میں یہ جملے برآمد ہوئے۔

''تمہارا دماغی تجزیہ کر کے ہم تمہارے بارے میں سب کچھ جان گئے ہیں تم 2000ء میں اپنی بیگم کے خوف سے سہم کر گھر سے باہر نکلے تھے اور Electromagnetic Rays کے ریلے کی زد میں آ کر 2100ء میں نازل ہو گئے۔ بیگم کی نافرمانی کرنے والوں کا برا انجام ہوتا ہے اور اب بتاؤ تمہارا کیا کیا جائے؟ کیا تمہیں تمہارے زمانے میں واپس چھوڑ دیں؟''

''خدا کے لئے یہ ظلم مت کرنا''۔ میری آنکھوں میں بیگم کی صورت گھوم گئی اور میں کانپ کر رہ گیا۔

''واپس تو تم کو ہر حال میں جانا پڑے گا، ہاں کوئی خواہش ہو تو بتاؤ''۔ اس نے ایک بار پھر مشینی انداز میں اردو بولی۔

''اگر ہو سکے تو مجھے اپنے زمانے کی سیر کرا دو تا کہ میں جا کر سائنسدانوں کی آنکھیں کھول سکوں''۔ میں نے اس خواہش کا اظہار کر دیا جو کیبن میں داخل ہوتے ہی میرے ذہن میں پیدا ہو گئی تھی۔

''ہاں یہ ممکن ہے، میں ابھی اس کا انتظام کرتا ہوں''۔ اس نے کہا اور پینل پر موجود کچھ بٹن دبائے تو بڑی سکرین پر نظر آنے والی عظیم الشان سڑک کی دھوئیں

منزل پر چلنے والی دو سیٹوں کی کاروں میں سے ایک رک گئی اور اس میں سے ایک ڈرائیور اتر کر سائیڈ میں موجود لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے بس سٹاپ اور دوسرے پبلک مقامات پر استعمال ہونے والے جملے کا سہارا لیا کیونکہ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا تھا لیکن میں اس کے بارے میں اتنا ہی جانتا تھا جتنا بند کمروں میں بیٹھنے والے زمین پر کھلے آسمان کے نیچے سونے والوں کے بارے میں جانتے ہیں۔

''کیوں نہیں میرا نام اللہ دتہ ہے اور میں روبوٹ ہوں''۔

''اللہ دتہ، روبوٹ......'' میں نے حیرت سے اٹکتے ہوئے کہا۔

''میری معلومات کے مطابق تمہارے زمانے کے لوگ اسی قسم کے نام رکھتے تھے لیکن اب ان کا رواج انسانوں میں ختم ہو گیا ہے تو سائنسدانوں نے ماضی کی یادگار کے طور پر روبوٹوں کے اس طرح کے نام رکھنا شروع کر دیئے ہیں۔ اسی طرح ہر زمانے کی تمام زبانیں ہمارے اندر فیڈ کر دی گئی ہیں''۔

''تمہاری ڈیوٹی کیا ہے؟''

''میں ٹریفک منیجر ہوں۔ اس بڑی سکرین پر ٹریفک جو تم دیکھ رہے ہو اس کو اس کیبن میں موجود خودکار کمپیوٹر کنٹرول کرتا ہے، میرا کام اس کام کی نگرانی کرنا ہے اور اس میں پیدا ہو جانے والی کسی بھی خرابی کو دور کرنا ہے''۔ ایسے کیبن ہر ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر سڑک کے ساتھ موجود ہیں، اس کیبن سے اگلے کیبن میں میرا دوست اللہ دسایا ڈیوٹی دیتا ہے''۔

اس سے قبل کہ میں اس سے کچھ اور پوچھتا اللہ دتہ کے سامنے پینل پر موجود ایک بلب جل اٹھا۔ اللہ دتہ نے پینل پر موجود ایک بٹن دبایا تو ایک چھوٹی سی سکرین روشن ہو گئی اس میں وہی ڈرائیور نظر آ رہا تھا جو دسویں منزل پر گاڑی روک کر لفٹ میں بیٹھا تھا۔

''باہر ڈرائیور کرم دین آیا ہے، یہ تمہیں سیر کرائے گا لہٰذا تم کرسی چھوڑ کر دیوار کے پاس پہنچو تاکہ میں تمہیں باہر بھجوا سکوں''۔ اللہ دتہ نے کہا۔

''ہمارے زمانے میں بھی کسی کو کرسی پر سکون سے بیٹھنے نہیں دیا جاتا تھا، لگتا ہے اب بھی یہی صورتِ حال ہے''۔ میں زیر لب بڑبڑاتا ہوا دیوار کے پاس پہنچا تو اللہ دتہ نے کوئی بٹن دبایا اگلے ہی لمحے میں اس کیبن کے باہر تھا۔ وہاں اللہ دتہ کی شکل کا ہی روبوٹ موجود تھا، صرف اس کا رنگ سرخ تھا۔ وہ مجھے لفٹ کے ذریعے سڑک کی دسویں منزل پر لے گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے اسے لائبریری میں جانے کے لئے کہا۔ کرم دین گاڑی جس رفتار سے چلا رہا تھا وہ اپنے زمانے کے رکشہ سے بیس گنا زیادہ ہو گی لیکن جھٹکے یا شور کا ملک میں انصاف کی طرح نام ونشان نہ تھا۔ اردگرد کی ٹریفک ہم سے بھی زیادہ تیزی سے رواں دواں تھی۔ سڑک کے کنارے حد رفتار ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی تختی پڑھ کر رفتار کی الجھن دور ہوئی تو میں نے پشت گاہ سے سر لگایا، اچانک سامنے سے آنے والی گاڑی نے ہماری گاڑی کو ٹکر مار دی۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے وہ سارے گناہ قرض خواہوں کی طرح یاد آ گئے جن کی پاداش میں اس پرائی صدی میں ایسی ہولناک موت راہ تک رہی تھی۔ چند لمحوں تک آنکھیں بند کئے میں نے اپنے جسم کے عاشق کے دل سے زیادہ ٹکڑے ہونے کا انتظار کیا۔ جب کچھ نہ ہوا تو میں نے سوچا کہ شاید ابھی میں گر رہا ہوں، ٹکڑے زمین پر پہنچنے کے بعد ہوں گے لیکن ایک منٹ گزر گیا اور میرے جسم میں کسی قسم کی تقسیم عمل میں نہ آئی تو میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو بے یقینی سے انہیں ملنے لگا کیونکہ ہم تینوں (کرم دین، کار اور میں) بخیریت تھے اور

سفر میں تھے۔ یہ صورتِ حال میرے بھیجے میں فٹ نہیں ہو رہی تھی اور میں ملکی سیاست کی طرح الجھ گیا تھا۔ کرم دین نے میری کیفیت نوٹ کرلی۔

''آپ حیران نہ ہوں سب گاڑیاں ایسے میٹریل سے تیار کی گئی ہیں جو شدید سے شدید ٹکر کے جھٹکے کو جذب کرلیتا ہے اور اس طرح حادثہ نقصان دہ نہیں ہوتا''۔ کرم دین نے وضاحت کی۔ سڑک کے ایک طرف پھیلے ہوئے عمارتوں کے عظیم الشان سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کرم دین نے بتایا۔

''وہ لائبریری ہے، اس میں دنیا کے تمام علوم اور پوری دنیا کے ادب کی ہر کتاب کمپیوٹر کی Chip کی شکل میں موجود ہے۔ آپ کے اپنی مطلوبہ چیزوں کی فہرست کمپیوٹر کے خانے میں ڈالنے سے Chip Disk برآمد ہوگی، اسے لائبریری میں موجود CPU میں رکھیں، وہ آپ کو مطلوبہ میٹر پڑھ کرسنائے گا اور لکھ کر بھی دکھائے گا اور اگر آپ کو ضرورت ہو تو آپ کے مطلوبہ میٹر کی کاپی بھی بنادے گا''۔

''کیا پورے ملک میں صرف ایک ہی لائبیریری ہے؟''

''ہر شہر میں ہو بہو اسی قسم کی لائبیری موجود ہے۔ دراصل دس سال قبل پوری دنیا کے علم و ادب کو Chip Disk پر منتقل کرنے کے بعد ان کی لاکھوں کاپیاں بنائی گئیں اور ہر شہر میں ایک لائبریری بنا کر ایک ایک کاپی وہاں رکھ دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا میں موجود لاکھوں لائبریریز میں میٹر کے لحاظ سے قطعی کوئی فرق نہیں'' (یہ خیال انٹرنیٹ کی صورت میں حقیقت کا روپ دھار چکا ہے)۔ باتیں کرتے کرتے ہم لائبریری پہنچ گئے۔ کرم دین نے روبوٹ لائبریرین کو کارڈ چیک کرایا اور ہم لائبریری میں داخل ہوئے۔ علم و ادب کے سمندر میں کافی دیر غوطے کھانے کے بعد میں نے کرم دین کو شعبہ اخبارات کی طرف چلنے کو کہا۔ اخبارات انتہائی باریک پلاسٹک پر رنگین چھپے ہوئے تھے۔ میں چونکہ اس زبان سے اتنی ہی واقفیت رکھتا تھا جتنی منتخب نمائندے عوام کے مسائل سے رکھتے ہیں۔ لہٰذا کرم دین نے چیدہ چیدہ اخباروں کی سرخیاں اردو میں سنائیں۔

''مشتری نے زحل کو خبردار کیا ہے کہ وہ اس کی حدود سے کیوی جیسے حسین پرندے کی چوری سے باز آجائے ورنہ سزا کے طور پر اس کی حدود میں کوے چھوڑ دیئے جائیں گے''۔

''زحل نے نیپچون سے خلائی جنگی قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کردیا''۔

''مریخ نے پلوٹو کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں سے باز آجائے ورنہ اس کو نظام شمسی سے کاٹ کر لاوارث چھوڑ دیا جائے گا''۔

''زہرہ پر فلم Digital Love کے یونٹ کو خوفناک حادثہ پیش آیا۔ وہ مائیکرو جنگل میں شوٹنگ کر رہے تھے کہ آگ بھڑک اٹھی جس سے بیشتر ارکان زخمی ہوگئے۔ عطارد سے تعلق رکھنے والے دو اداکاروں کی حالت تشویشناک ہے جبکہ زمین اور مریخ کے اداکاروں کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ فلم کی ہیروئنیں جو زہرہ سے تعلق رکھتی تھیں ان کو معمولی مرہم پٹی کے بعد فارغ کر دیا گیا ہے''۔

''یونیورسل پولیس نے پلوٹو پر ایک مجرم کو گرفتار کیا ہے جو پچھلے چھ ماہ سے زمین، مشتری اور زحل پر دہشت گردی کی وارداتوں کا ذمہ دار ہے''۔

''یونیورسل پیس (Universal Peace) تنظیم نے تمام سیاروں کے سربراہوں سے تخفیف اسلحہ کی درخواست کی ہے''۔

''کہکشاں نمبر دس سے بارہ کی طرف محو پرواز سپیس کیپسول (Space Capsule) کو پلوٹو کے

دہشت گردوں نے اغوا کرلیا۔ سپیس کمانڈوز ان پر قابو پانے کی کوشش کررہے ہیں''۔

مجھے حیرت سے سکتہ ہو چکا تھا کرم دین میری کیفیت سے بے نیاز آنکھ مارتے ہوئے بولا۔

''اور اب ضرورت رشتہ کے اشتہار سنو''۔

''ایک ٹیسٹ ٹیوب کنواری دوشیزہ عمر صرف پندرہ سال، زہرہ پر وسیع رقبے کی مالک اس کے علاوہ چاند پر ذاتی بیوٹی پارلر بھی چلاتی ہے، مریخ پر ذاتی بنگلہ اور سپیس کار بھی رکھتی ہے۔ صرف بیس سال کی عمر تک کے لڑکے رجوع کریں، گھر داماد رہنا ہوگا''۔

قبل اس کے کہ کرم دین کوئی اور رشتہ بتاتا میں ہوش وخرد سے بے گانہ ہوگیا، کرم دین نے پتا نہیں کیا پلایا کہ اگلے ہی لمحے میں چاق و چوبند ہوگیا، کرم دین کہہ رہا تھا۔

''یہ ساری خبریں پوری کائنات میں سرگرم عمل روبوٹ نامہ نگاروں کی ارسال کردہ ہیں چونکہ وہ انسانوں کی طرح جھوٹ نہیں بولتے لہٰذا ان کی بھیجی ہوئی خبریں سو فیصد سچ ہوتی ہیں۔ تمہارے لئے ان پر یقین کرنا مشکل ہوگا۔ دراصل ہم نے تمہارے زمانے کے دریافت کردہ نظام شمسی کے سیاروں کو تسخیر کرنے کے علاوہ کئی مزید سیارے بھی دریافت کر کے تسخیر کر لئے ہیں۔ ہمارے قدم کہکشاؤں تک بھی پہنچ چکے ہیں لیکن پھر بھی کائنات کے اسرار باقی ہیں جن سے پردہ اٹھانے کی ہم کوشش کررہے ہیں۔ سیاروں کی تسخیر کے بعد ہم نے انہیں زمین کی کالونیاں بنا دیا ہے۔ بیس سال قبل آبادی زمین کی گنجائش سے بڑھ گئی تھی تو اربوں انسانوں کو ان کالونیوں میں بسا دیا گیا۔ ان سیاروں پر شرح پیدائش زمین سے زیادہ ہے اور اب ایک سیارے سے دوسرے سیارے کی طرف سفر کرنا معمول کی بات ہے۔ اکثر لوگ اپنے فرائض کی وجہ سے دن بھر نظام شمسی میں دوڑتے رہتے ہیں۔ وہ سوتے زمین پر ہیں، شیو مریخ پر کرتے ہیں، ناشتہ عطارد پر کرتے ہیں، کام زہرہ پر کرتے ہیں، کھیلتے یورینس کے گراؤنڈ پر ہیں، لنچ پلوٹو پر کرتے ہیں، خریداری مشتری کی آٹومیٹک الیکٹرانک مارکیٹ سے کرتے ہیں جبکہ ان کے بچے زحل کے سکول میں پڑھتے ہیں''۔

''سیاروں کے درمیان سفر اتنے کم وقت میں کیسے ممکن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمام سیاروں کے درمیان جدید ترین سائنسی نظام لگایا گیا ہے جس کے تحت ایک سیارے پر موجود ایک خاص لیزر مشین کے ذریعے انسان کو الیکٹرونک ریز (Electronic Rays) میں بدل کر مطلوبہ سیارے کی طرف روانہ کردیا جاتا ہے جہاں موجود ایسی ہی مشین ان ریز کو وصول کر کے دوبارہ انسانی شکل میں لے آتی ہے چونکہ ریز کی رفتار روشنی کی رفتار کے برابر ہے لہٰذا کوئی بھی انسان سیکنڈوں میں ایک سے دوسرے سیارے تک پہنچ سکتا ہے''۔

''لیکن کرمو بھائی! اگر راستے میں انسان کا کوئی الیکٹران ادھر ادھر ہو جائے تو کیا پھر بھی مشین اسے مکمل صورت میں لے آئے گی یا شکل میں کوئی تبدیلی وغیرہ پیدا ہو جائے گی''۔

''آغاز میں یہ تجربات جانوروں پر کیے گئے۔ شروع شروع میں یہ ہوتا تھا کہ زمین سے ایک جانور بھیجا جاتا تو دوسرے سیارے پر کسی اور صورت میں ظاہر ہوتا یا اس کا کوئی عضو غائب ہوتا۔ سینکڑوں جانوروں کی قربانی کے بعد سائنس دان اس خامی پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔ اب یہ طریقہ بالکل محفوظ ہے اگر چاہو تو لگے ہاتھوں مشتری وغیرہ کی بھی سیر کرلو''۔ کرم دین نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''نا بابا نا''۔ میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ''میں

ایسے رسک کا متحمل نہیں ہو سکتا"۔

"اب کہاں چلیں؟" کرم دین نے پوچھا۔

"عجائب گھر"۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک وسیع وعریض، اکیس منزلہ عمارت میں موجود تھے۔ فلور پر قبل مسیح کی ایجادات اور آلات پڑے تھے، ان کو دیکھ کر جب ہم پہلی منزل پر پہنچے تو وہاں پہلی صدی عیسوی کی اشیاء رکھی ہوئی تھیں اسی طرح دوسری تیسری، چوتھی اور پانچویں منزل پر بالترتیب دوسری تیسری چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کی اشیاء رکھی گئی تھیں۔ اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے جب ہم بیسویں منزل پر پہنچے وہاں بیسویں صدی کی اشیاء پڑی تھیں۔ ان میں الیف سولہ، اواکس، ایٹم بم خلائی راکٹ اور ہماری صدی کی دوسری اشیاء شامل تھیں۔ کرم دین نے بتایا کہ اب یہ متروک ہو چکی ہیں۔ اس کے بعد وہ مجھے اکیسویں اور آخری منزل پر لے گیا جہاں اکیسویں صدی کی ایجادات وغیرہ دیکھتے ہوئے مجھے مسلسل حیرت کے جھٹکے لگتے رہے۔

جب ہم عجائب گھر سے نکلے تو مجھے بھوک محسوس ہوئی میں نے کرم دین سے اس کا ذکر کیا۔

"کیا کھاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا تو اس وقت بکری کا گوشت کھانے کو دل چاہ رہا ہے، ساتھ میں روسٹ مرغ ہو تو کیا بات ہے"۔

تھوڑا سا پیدل چلنے کے بعد کرم دین مجھے لے کر آسمان سے راز و نیاز کرتی ہوئی ایک شاندار عمارت میں داخل ہوا۔ ریسپشن سے گزرنے کے بعد ہم ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے۔ کرم دین نے دیوار میں موجود کوئی بٹن دبایا تو پلیٹ فارم آگے کو حرکت کرنے لگا اور ایک فرلانگ طے کرنے کے بعد پلیٹ فارم ایک بہت بڑے ہال کے باہر رکا اور ہم اس سے اتر کر ہال میں داخل ہوئے۔

سبز شیشے کے فرش سے گزر کر جونہی ہم سنہری شیشے کی میز پر بیٹھے ایک روبوٹ ویٹرس آ موجود ہوئی۔ کرم دین نے اسے مطلوبہ آرڈر بتایا اس دوران وہ قاتلانہ مسکراہٹیں پھینکتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد ویٹرس دو بوتلیں میز پر رکھ گئی، جاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھ کر اپنی بلب نما آنکھ بھی ماری۔ ایک بوتل میں سرخ سیال تھا جبکہ دوسری میں زرد۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے کرم دین کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے پینے کا اشارہ کیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر زرد بوتل پینا شروع کی تو یوں محسوس ہوا جیسے میں بکری کا گوشت کھا پی رہا ہوں۔ دوسری بوتل چکھی تو ذائقہ ہو بہو مرغ روسٹ جیسا تھا۔ میری حیرت بھانپ کر کرم دین بولا۔

''اب ہوٹلوں میں ہر قسم کی خوراک کے اجزا کو مائع گیس یا ٹھوس کی شکل میں سٹور کیا جاتا ہے جو طلب کرنے پر Serve کردی جاتی ہے۔''

کھانے پینے کے بعد میں نے پچاس ہرٹز کی ڈکار ماری جس سے دیوار میں موجود دو لائٹیں فیوز ہوگئیں۔

''یار کرم دین! اب تو کسی باغ کی سیر کراؤ''۔ ہوٹل سے نکل کر میں نے کرم دین سے کہا۔

باغ میں پہنچ کر میری حیرت آبادی کی طرح انتہائی درجے تک پہنچ گئی کیونکہ ہر طرف ایک پودے پر ہی ہر قسم کے پھول کھلے ہوئے تھے اور ایک ہی درخت پر ہر قسم کے پھل لگے ہوئے تھے۔ کرم دین نے بتایا کہ وہ جدید زرعی سائنس کی مدد سے ایک ہی کاشت سے ہر موسم اور ہر قسم کی فصل زیادہ مقدار میں حاصل کر لیتے ہیں جو ایک بڑی آبادی کے لئے کافی ہوتی ہے۔

کچھ وقت باغ میں گزار کر جب ہم دوبارہ سڑک پر آئے تو ایک انتہائی عجیب وغریب عمارت نظر آئی جس کی چھت پر عجیب وغریب آلات لگے ہوئے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے ایک آلے سے سرمئی رنگ کی گیس نکلی اور آسمان پر بادل کی شکل اختیار کر کے برسنے لگی۔ میں نے کرم دین سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا۔

''یہ عمارت محکمہ موسمیات کی ہے، یہاں انسان نے اللہ کی دی ہوئی عقل اور علم سے کام لے کر موسم کو قید کرلیا ہے۔ اس میں ایسے انتظامات ہیں کہ ہر موسم کو گیس کی شکل میں ذخیرہ کرلیا جاتا ہے مثلاً گرمیوں میں گرمی سردیوں میں سردی اور برسات میں بارش کو پھر زیادہ گرمی میں سردی کو چھوڑ کر موسم معتدل کرلیا جاتا ہے جبکہ فصلوں کے سیزن میں بارش نہ ہو رہی ہو تو سٹور کی ہوئی بارش کام میں لائی جاتی ہے۔ آج کل فصلوں کا سیزن ہے اس لئے مصنوعی بارش برسائی جارہی ہے''۔

بارش رکنے کے بعد قبل اس کے کہ میں کرم دین سے کہیں اور جانے کی فرمائش کرتا کرم دین نے مجھے ایک باریک سی پتری دی جس پر سنہری لکیریں لگی ہوئی تھیں۔

''یہ پتری کنپٹی پہ چپکا لو اس کے بعد تمہیں اپنی خواہش مجھ سے بیان نہیں کرنا پڑے گی بلکہ میں خود بخود سمجھ جاؤں گا''۔ کرم دین نے کہا۔

میں نے پتری کنپٹی سے لگائی وہ چپک گئی اسی وقت میرے دل میں بحری سیر کی خواہش پیدا ہوئی کرم دن فوراً بولا۔

''ٹھیک ہے، اب ہم ساحل سمندر کی طرف چل رہے ہیں''۔

ساحل سمندر پر کرم دین نے ایک سکوٹر نما چیز کرائے پر حاصل کی اس کی باڈی میں جابجا سوراخ تھے۔ اس نے بحری سکوٹر کو سٹارٹ کیا، مجھے پیچھے بٹھایا اور ساحل پر چلاتے ہوئے سمندر میں داخل ہوگیا۔ میں نے خوف سے کانپتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور کرم دین کو مضبوطی سے پکڑلیا۔ کافی دیر گزر گئی، مجھے نہ تو کوئی غوطہ آیا اور نہ میرا دم گھٹا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو سمندر میں

سڑک بنی ہوئی تھی جس پر ہمارے سکوٹر کے ساتھ اور بھی بحری ٹریفک چل رہی تھی۔ پانی سکوٹر کے سوراخوں میں سے گزر رہا تھا جس کی وجہ سے ہمیں حرکت کرنے میں دقت نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں بحری سڑک کے کنارے عجیب ہیئت کی مشینیں نصب تھیں جن کے بارے میں کرم دین نے بتایا کہ وہ آکسیجن پیدا کرتی ہیں اسی لئے ہمیں سانس لینے میں قطعاً کوئی دقت نہ ہو رہی تھی۔ وہاں سمندری مخلوق کے ساتھ ساتھ انسانی ہاتھوں سے تعمیر کردہ دنیا بھی قابلِ دید تھی۔ کئی قسم کی عظیم الشان فیکٹریاں اور لیبارٹریاں سمندری خزانوں سے انسان کو مالا مال کر رہی تھیں۔

ایک بحری ہوٹل سے مختلف اقسام کی مچھلیوں اور جھینگوں کو پیٹ داصل کرنے کے بعد ہم واپس روانہ ہوئے تو راستے میں اس سے اکیسویں صدی کے نظام تعلیم کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا۔

''اب تعلیم کی روایتی مشکلات ختم ہو گئی ہیں، پیدا ہوتے ہی بچے کو ایک ایجوکیشنل مشین میں ڈال دیا جاتا جس میں ساری دنیا کے علوم فیڈ (Feed) کئے گئے ہیں، وہ علوم آہستہ آہستہ بچے کے دماغ میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ پانچ سال بعد بچہ تمام علوم پر عبور حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں خوراک اسے مشین میں موجود ایک سسٹم کے ذریعے دی جاتی ہے۔ چھٹے سال میں بچے کو مشین سے نکالا جاتا ہے اور اسے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کی اجازت مل جاتی ہے''۔

میڈیکل سائنس کے متعلق میرے سوال کے جواب میں کرم دین نے بتایا۔

''ہمارے سائنس دانوں نے برسوں کی محنت کے بعد تمہاری صدی کی خطرناک بیماریوں ایڈز اور کینسر وغیرہ پر قابو پالیا ہے۔ دوسری تمام بیماریوں کا پہلے ہی خاتمہ کر دیا گیا تھا لیکن آج کل ایک نئی بیماری پیدا ہوگئی ہے جس کا علاج تا حال سائنسدان دریافت نہیں کر سکے۔ لوگ کثر غذا میں بے احتیاطی کرتے ہیں اور کام خود کرنے کی بجائے روبوٹ سے لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے پیٹ پہلے ڈھول کی شکل اختیار کرتے ہیں پھر پھٹ جاتے ہیں...... میڈیکل سائنس کا ایک بہت بڑا کمال یہ ہے کہ اب جنس بدلنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، صرف ایک گولی کھانا پڑتی ہے۔ کئی لوگ ضرورت کے مطابق صبح میں مرد ہوتے ہیں اور شام ہوتے ہی عورت بن جاتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں بھی ابھی لڑکی بنا دوں''۔

''کیوں نہیں، تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے!'' میں اشتیاق بھرے لہجے میں بولا۔

کرم دین نے ایک نیلے رنگ کی گولی مجھے دی جسے کھاتے ہی مجھے اپنے وجود میں نامانوس سی تبدیلی کا احساس ہوا، پانچ منٹ تک میرے جسم میں ہلکے ہلکے دھماکے ہوتے رہے، چھٹے منٹ میں جب میں نے اپنے جسم پر نظر ڈالی تو شرم سے دوہرا ہو گیا بلکہ دوہری ہو گئی کیونکہ میں لڑکی بن چکا تھا۔

''ہائے اللہ، آپ تو ایٹمی عناصر سے زیادہ خطرناک حسن کی مالک ہیں''۔ پہلا آوازہ کرم دین ہی نے کسا۔

شاید میں کوئی جواب دیتی لیکن اپنے گرد ہجوم دیکھ کر چپ رہی۔ ہجوم میں موجود ہر شخص نظروں نظروں میں میرا ایکسرے کرنے میں مصروف تھا۔ سرخ رنگ کے بھڑکیلے چست لباس میں ایک وسیع و عریض پیشانی کا مالک شخص تو کچھ زیادہ ہی بے چین نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا تو اس کے چہرے پر عجیب و غریب تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ منہ کھل گیا اور آنکھوں میں امید کا دریا بہنے لگا۔ پھر وہ تھوڑا سا آگے آ کر میرے سامنے دوزانو بیٹھ گیا اور جیب سے ایک عجیب سی کتاب نکال کر اپنی زبان میں کچھ عرض کرنے لگا۔ میں نے

الجھن آمیز نگاہوں سے کرم دین کی طرف دیکھا۔

''یہ حضرت شاعر ہیں اور آپ پر تہہ دل سے عاشق ہونے کے بعد اپنی کمپیوٹر ڈائری سے آپ کے اجنبی حسن کی شان میں قصیدے پڑھ رہے ہیں''۔ کرم دین نے بتایا۔

''ہمارے سائنسدان اور پلان میکر ہزاروں سال پرانی اس نسل کو باوجود کوشش کے ختم نہیں کر سکے۔ اکثر شاعروں کو ٹارچر سیلوں میں ملازمت دے دی گئی ہے مگر پھر بھی یہ اتنے زیادہ ہیں کہ بہت سے بے کار پھرتے ہیں اور پیشہ عشق کو بدنام کرتے ہیں''۔ ہماری گفتگو کے دوران گئی اور من چلے بھی پیش قدمی کر کے شاعر کے کندھے سے کندھا جوڑ کر میرے آگے دوزانو بیٹھ چکے تھے۔ قبل اس کے کہ کوئی خطرناک صورت حال پیدا ہوتی میں نے امداد طلب نظروں سے کرم دین کی طرف دیکھا تو وہ پٹری والے سسٹم کی وجہ سے سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے زرد رنگ کی ایک گولی میری طرف بڑھائی، گولی کھانے کے دو تین منٹ بعد میرے عاشقوں میں ہلچل مچ گئی کیونکہ مجھ میں اب نسوانیت کا شائبہ تک نہیں رہا تھا۔ شاعر صاحب اٹھ کر کرم دین کو پھاڑ کھانے دوڑے جس نے ان کو اجنبی حسن کے دیدار سے محروم کر دیا تھا۔ کرم دین نے غصے سے شاعر کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکلے اور شاعر صاحب کے سر کے رہے سہے بال بھی جل گئے۔ پھر مجمع چھٹتے دیر نہ لگی۔

''وقت کیا ہوا ہے؟'' میں نے کرم دین سے پوچھا کیونکہ اس وقت میری گھڑی بند تھی۔

''اس وقت رات کے دس بجے ہیں''۔

''لیکن......''

''حیران ہونے کی ضرورت نہیں یہی تو سائنس کا کمال ہے، اب رات اور دن کی تمیز ختم ہو چکی ہے۔ چوبیس گھنٹے کام ہوتا ہے، ہر آدمی چھ چھ گھنٹے بعد چار گھنٹے آرام کرتا ہے لیکن کاروبار زندگی مسلسل جاری رہتا ہے''۔

''تمہارے زمانے میں مجھے کہیں کوئی ٹرین نظر نہیں آئی؟''

''ٹرینیں متروک ہو چکی ہیں، تمہارے زمانے میں صرف طیارے ہی تیز ترین سفر کا ذریعہ تھے مگر اب ائرپورٹوں سے اندرون سیارہ نہ صرف طیارے بلکہ ہوائی کاریں اور موٹر سائیکلیں وغیرہ بھی پرواز کرتی ہیں''۔

''اچھا!'' میں نے اشتیاق سے کہا۔ ''کیا تم مجھے ہوائی کار میں فضائی سیر کرا سکتے ہو''۔

''بشرطیکہ کوئی پرواز جا رہی ہو کیونکہ پچھلے چند دن سے فضائی آلودگی کے خلاف ایک تنظیم کے ارکان ہوائی موٹر سائیکلوں پر فضا میں جلسے جلوس کر کے مزید آلودگی پھیلا رہے ہیں جس کی وجہ سے کئی پروازیں معطل ہو کر رہ گئی ہیں''۔

ائرپورٹ کی عمارت اتنی شاندار تھی کہ اسے لفظوں میں بیان کرنا اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ کرم دین نے پتہ کر کے بتایا کہ پرواز جا رہی ہے۔ ٹکٹ لینے کے بعد ہم چیکنگ روم میں پہنچے۔ پہلے کرم دین کو ایک دیوہیکل مشین پر کھڑا کر کے اس کے جسم سے عجیب و غریب سی سرخ رنگ کی شعاعیں گزاری گئیں، اس کے بعد میری باری آئی۔ جونہی آپریٹر نے مجھے مشین پر کھڑا کر کے شعاعوں والا بٹن دبایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا جسم سینکڑوں ذرات میں تبدیل ہو گیا ہو۔ جب ان ذرات نے دوبارہ اکٹھے ہو کر میرے جسم کی شکل اختیار کی تو میں نے دیکھا کہ نہ کرم دین ہے، نہ ائرپورٹ اور نہ وہ خوفناک مشین بلکہ میں دودھ کی بالٹی اٹھائے پاگلوں کی طرح سڑک پر کھڑا ہوں، میرے قدم خود بخود دودھ کی دکان کی طرف اٹھنے لگے۔ (1992ء)

***

امریکہ کی ایک عیسائی مبلغہ کا قبول اسلام اور داستانِ عزیمت

اندھیرے سے روشنی تک

سسٹر آمینہ

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

محترمہ امینہ جنان کا تعلق امریکہ سے ہے، انہوں نے 1977ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ اس سے قبل وہ امریکہ کے سنڈے سکولوں میں عیسائیت کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ قبولِ اسلام کے بعد انہیں غیر معمولی قسم کی قربانیاں دینی پڑیں مگر انہوں نے کسی موقع پر حوصلہ مندی اور استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اپنے بے پناہ حلم، شفقت، خوش طبعی، حسن اخلاق اور انسانی احترام کی وجہ سے وہ اپنے حلقۂ تعارف اور خواتین میں Smiling Lady یعنی متبسم خاتون کے لقب سے یاد کی جاتی ہیں۔

اسی خوش خلقی اور کریم النفسی کی وجہ سے لوگ انہیں عقیدت سے سسٹر امینہ بھی کہتے ہیں اور حالانکہ گزشتہ برس سے ان کی ریڑھ کی ہڈی میں درد ہے اور وہ بیساکھیوں کا سہارا لینے پر مجبور ہیں مگر نہ تو نماز پنج وقتہ کو قضا ہونے دیتی ہیں اور نہ دینِ حق کی تبلیغ میں کوتاہی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس معذوری کے باوجود ہزاروں میل کا سفر طے کر کے فروری 1990ء میں پاکستان آئیں اور اسلام پر اپنے کامل یقین سے بے شمار خواتین اور مردوں کو متاثر کر گئیں۔ وہ ایک باعمل خاتون ہیں اور قرآن و سنت کے ایک ایک حکم کو بجا لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ سفر پاکستان میں ان کے ساتھ ان کا دس سالہ بیٹا "محمد" بھی تھا جو بڑا ذہین اور حساس بچہ ہے اور سسٹر امینہ اس کی اسلامی اصولوں کے مطابق تربیت کر رہی ہیں۔

محترمہ موصوفہ نے مختلف مواقع پر اپنے قبولِ اسلام کی وجوہ بیان کی ہیں۔ میں نے اس نوعیت کے تین مختلف مضامین سے استفادہ کر کے ذیل کی خودنوشت مرتب کی ہے۔ ان میں سے مفصل مضمون مس منور صادق کا ہے، جو مجھے میرے بزرگ اور مہربان دوست کنور سعید اللہ خاں (سرگودھا) نے فراہم کیا۔ میں ان کے لئے کنور صاحب اور مس منور صادق کا ممنون ہوں۔

+++

میں جنوری 1945ء میں امریکہ کی ریاست لاس اینجلس کے علاقہ ویسٹ میں پیدا ہوئی۔ میرے والدین پروٹسٹنٹ عیسائی تھے اور ننھیال و ددھیال دونوں طرف مذہب کا بڑا چرچا تھا۔ میں سکول کے آٹھویں گریڈ میں تھی کہ میرے والدین کو فلوریڈا منتقل ہونا پڑا اور باقی تعلیم وہیں مکمل ہوئی۔ میری تعلیمی حالت بہت اچھی تھی۔ خصوصاً بائبل سے مجھے خاص دلچسپی تھی اور اس کے بہت سے حصے مجھے زبانی یاد تھے۔ اس سلسلے میں میں نے متعدد انعامات بھی حاصل کئے۔ میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی اور وومن لبریشن موومنٹ (تحریک آزادیٔ نسواں) کی پرجوش کارکن تھی۔

ہائی سکول کی تعلیم ختم ہوئی تو میری شادی ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی میں ماڈلنگ کے پیشے سے منسلک ہو گئی۔ خدا نے مجھے اچھی شخصیت عطا کی تھی اور میں خوب محنت کرتی تھی۔ اس لئے میرا کاروبار خوب چمکا۔ پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔ شوفر، بہترین گاڑیاں غرض آسائش کا ہر سامان میسر تھا۔ حالت یہ تھی کہ بعض اوقات ایک جوتا خریدنے کے لئے میں ہوائی سفر کر کے دوسرے شہر جاتی تھی۔ اس دوران میں میں ایک بیٹے اور بیٹی کی ماں بھی بن گئی۔ مگر سچی بات ہے کہ ہر طرح کے آرام و راحت کے باوجود دل مطمئن نہ تھا۔ بے سکونی اور اداسی جان کا گویا مستقل آزار بن گئی تھی اور زندگی میں کوئی زبردست خلا محسوس ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ میں نے ماڈلنگ کا پیشہ ترک کر دیا۔ دوبارہ مذہبی زندگی اختیار کر لی اور مختلف تعلیمی اداروں میں مذہبی تبلیغ کی رضاکارانہ خدمات انجام دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے مزید تعلیم کے لئے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ خیال تھا کہ اس بہانے شاید روح کو کچھ سکون ملے گا۔ اس وقت میری عمر تیس سال تھی۔

اسے خوش قسمتی ہی کہئے کہ مجھے ایک ایسی کلاس میں داخلہ مل گیا جس میں سیاہ فام اور ایشیائی طالب علموں کی خاصی بڑی تعداد تھی۔ بڑی پریشان ہوئی مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ مزید گھٹن یہ دیکھ کر محسوس ہوئی کہ ان میں خاصے لوگ مسلمان تھے اور مجھے مسلمانوں سے سخت نفرت تھی۔ میرے نزدیک، عام یورپین لوگوں کی طرح، اسلام وحشت و جہالت کا مذہب تھا اور مسلمان غیر مہذب، عیاش، عورتوں پر ظلم کرنے والے اور اپنے مخالفوں کو زندہ جلا دینے والے لوگ تھے۔ امریکہ اور یورپ کے عام مصنفین اور مؤرخ یہی کچھ لکھتے آ رہے ہیں۔ بہرحال شدید ذہنی کوفت کے ساتھ تعلیم شروع کی۔ پھر اپنے آپ کو سمجھایا کہ میں ایک مشنری ہوں، کیا عجب کہ خدا نے مجھے ان کافروں کی اصلاح کے لئے یہاں بھیجا ہو، اس لئے مجھے پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ میں نے صورتِ حال کا جائزہ لینا شروع کیا تو حیرت میں مبتلا ہو گئی کہ مسلمان طالب علموں کا رویہ دیگر سیاہ فام نوجوانوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ شائستہ، مہذب اور باوقار تھے۔ وہ عام امریکی نوجوانوں کے برعکس نہ لڑکیوں سے بے تکلف ہونا پسند کرتے نہ آوارگی اور عیش پسندی کے رسیا تھے۔ میں تبلیغی جذبے کے تحت ان سے بات کرتی، ان کے سامنے عیسائیت کی خوبیاں بیان کرتی تو وہ بڑے وقار اور احترام سے ملتے اور بحث میں الجھنے کی بجائے مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔

میں نے اپنی کوششوں کو یوں بیکار جاتے دیکھا تو سوچا کہ اسلام کا مطالعہ کرنا چاہئے تاکہ اس کے نقائص اور تضادات سے آگاہ ہو کر مسلمان طالب علموں کو زچ کر سکوں۔ مگر دل کے گوشے میں یہ احساس تھا کہ عیسائی پادری، مضمون نگار اور مؤرخ تو مسلمانوں کو وحشی، گنوار، جاہل اور نہ جانے کن کن برائیوں کا مرقع بتاتے ہیں لیکن امریکی معاشرت میں پلنے بڑھنے والے ان سیاہ فام

مسلمان نوجوانوں میں تو ایسی کوئی برائی نظر نہیں آتی بلکہ یہ باقی سب طلبہ سے مختلف و منفرد و پاکیزہ رویے کے حامل ہیں۔ پھر کیوں نہ میں خود اسلام کا مطالعہ کروں اور حقیقت حال سے آگاہی حاصل کروں۔ چنانچہ اس مقصد کی خاطر میں نے سب سے پہلے قرآن کا انگریزی ترجمہ پڑھنا شروع کیا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ یہ کتاب دل کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی اپیل کرتی ہے۔ عیسائیت پر غور وفکر کے دوران اور بائبل کے مطالعے کے نتیجے میں۔ ذہن میں کتنے ہی سوال پیدا ہوتے تھے مگر کسی پادری یا دانشور کے پاس ان کا کوئی جواب نہ تھا اور یہی تشنگی روح کے لئے مستقل روگ بن گئی تھی۔ مگر قرآن پڑھا تو ان سارے سوالوں کے ایسے جواب مل گئے جو عقل اور شعور کے عین مطابق تھے۔ مزید اطمینان کے لئے اپنے کلاس فیلو مسلمان نوجوانوں سے کئی بار گفتگو کی، تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ میں اب تک اندھیروں میں بھٹک رہی تھی۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں میرا نقطۂ نظر صریحاً بے انصافی اور جہالت پر مبنی تھا۔

مزید اطمینان کی خاطر میں نے پیغمبر اسلامؐ اور ان کی تعلیمات کا مطالعہ کیا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ امریکی مصنفین کے پروپیگنڈے کے بالکل برعکس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنی نوع انسان کے عظیم محسن اور سچے خیر خواہ ہیں۔ خصوصاً انہوں نے عورت کو جو مقام و مرتبہ عطا فرمایا اس کی پہلے یا بعد میں کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ ماحول کی مجبوریوں کی بات دوسری ہے، ورنہ میں طبعاً بہت شرمیلی ہوں اور خاوند کے سوا کسی مرد سے بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔ چنانچہ جب میں نے پڑھا کہ پیغمبر اسلامؐ خود بھی بے حد حیادار تھے اور خصوصاً عورتوں کے لئے عفت و پاکیزگی اور حیا کی تاکید کرتے ہیں تو میں بہت متاثر ہوئی اور اسے عورت کی ضرورت اور نفسیات کے عین مطابق پایا۔ پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عورت کا درجہ جس درجہ بلند فرمایا اس کا اندازہ اس قول سے ہوا کہ ''جنت ماں کے قدموں میں ہے''۔ اور آپؐ کے اس فرمان پر تو میں جھوم اٹھی کہ عورت نازک آبگینوں کی طرح ہے اور تم میں سے سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنی بیوی اور گھر والوں سے اچھا سلوک کرے۔

قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات سے میں مطمئن ہوگئی اور تاریخ اسلام کے مطالعے اور اپنے مسلمان کلاس فیلو نوجوانوں کے کردار نے مسلمانوں کے بارے میں ساری غلط فہمیوں کو دور کر دیا اور میرے ضمیر کو میرے سارے سوالوں کے جواب مل گئے تو میں نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا ذکر میں نے متذکرہ طالب علموں سے کیا، تو وہ 21 مئی 1977ء کو میرے پاس چار ذمہ دار مسلمانوں کو لے آئے۔ ان میں سے ایک ڈینور (Denver) کی مسجد کے امام تھے۔ چنانچہ میں نے ان سے چند مزید سوالات کئے اور کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی۔

میرے قبول اسلام پر پورے خاندان پر گویا بجلی گر پڑی۔ ہمارے میاں بیوی کے تعلقات واقعی مثالی تھے اور میرا شوہر مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا، مگر میرے قبول اسلام کا اسے غیر معمولی صدمہ ہوا۔ میں اسے پہلے بھی قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی اور اب پھر اسے سمجھانے کی بہت سعی کی، مگر اس کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا نہ ہوا اور اس نے مجھ سے علیحدگی اختیار کرلی اور میرے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ عارضی طور پر دونوں بچوں کی پرورش میری ذمہ داری قرار پائی۔

میرے والد بھی مجھ سے گہری قلبی وابستگی رکھتے تھے مگر اس خبر سے وہ بھی بے حد برافروختہ ہوئے اور غصے میں ڈبل بیرل شاٹ گن لے کر میرے گھر آ گئے تا کہ مجھے قتل کر ڈالیں...... مگر خدا کا شکر ہے کہ میں بچ گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر کے چلے گئے۔ میری بڑی بہن

ماہر نفسیات تھی، اس نے اعلان کر دیا کہ یہ کسی دماغی عارضے میں مبتلا ہوگئی ہے اور اس نے سنجیدگی سے مجھے نفسیاتی انسٹیٹیوٹ میں داخل کرانے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ میری تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ میں نے معاشی ضرورتوں کے پیشِ نظر ایک دفتر میں ملازمت حاصل کی لیکن ایک روز میری گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا اور تھوڑی سی تاخیر ہوگئی تو مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ فرم والوں کے نزدیک میرا اصل جرم یہی تھا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی حالت یہ تھی کہ میرا ایک بچہ پیدائشی طور پر معذور تھا۔ وہ دماغی طور پر بھی نارمل نہ تھا اور اس کی عام صحت بھی ٹھیک نہ تھی جبکہ بچوں کی تحویل اور طلاق کے مقدمے کے باعث امریکی قانون کے تحت مقدمے کے فیصلے تک میری ساری جمع پونجی منجمد کر دی گئی تھی۔ ملازمت بھی ختم ہوئی، تو میں بہت گھبرائی اور بے اختیار رب جلیل کے حضور سربسجود ہوگئی اور گڑگڑا کر خوب دعائیں کیں۔ اللہ کریم نے میری دعائیں قبول فرمالیں اور دوسرے ہی روز میری ایک جاننے والی خاتون کی کوشش سے مجھے ایسٹرسیل پروگرام میں ملازمت مل گئی اور میرے معذور بیٹے کا علاج بھی بلامعاوضہ ہونے لگا۔ ڈاکٹروں نے دماغ کے آپریشن کا فیصلہ کیا اور اللہ کے خاص فضل سے یہ آپریشن کامیاب رہا۔ بچہ تندرست ہو گیا اور میری جان میں جان آئی..... لیکن آہ! ابھی آزمائشوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا۔ عدالت میں بچوں کی تحویل کا مقدمہ دو سال سے چل رہا تھا۔ آخرکار دنیا کے اس سب سے بڑے ''جمہوری ملک'' کی ''آزاد'' عدالت نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر بچوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو تو اسلام سے دستبردار ہونا پڑے گا کہ اس قدامت پرست مذہب کی وجہ سے بچوں کا اخلاق خراب ہوگا اور تہذیبی اعتبار سے انہیں نقصان پہنچے گا۔

عدالت کا یہ فیصلہ میرے دل و دماغ پر بجلی بن کر گرا۔ ایک مرتبہ تو میں چکرا کر رہ گئی۔ زمین آسمان گھومتے ہوئے نظر آئے مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس کی رحمت نے مجھے تھام لیا اور میں نے دوٹوک انداز میں عدالت کو کہہ دیا کہ میں اپنے بچوں سے جدائی گوارا کر لوں گی مگر اسلام اور ایمان کی دولت سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ بچی اور بچہ دونوں باپ کی تحویل میں دے دیئے گئے۔

اس کے بعد ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ میں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے اپنا تعلق گہرا کر لیا اور تبلیغ دین میں منہمک ہوگئی۔ نتیجہ یہ کہ ساری محرومیوں کے باوجود ایک خاص قسم کے سکون و اطمینان سے سرشار رہی..... مگر میرے خیرخواہوں نے اصرار کے ساتھ مشورہ دیا کہ مجھے کسی باعمل مسلمان سے عقد ثانی کر لینا چاہئے کہ عورت کے لئے تنہا زندگی گزارنا مناسب و مستحسن نہیں ہے۔ چنانچہ ایک پاکستانی مسلمان کی طرف سے نکاح کی پیشکش ہوئی تو میں نے قبول کر لی۔ یہ صاحب ایک مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ قرآن خوب خوش الحانی سے پڑھتے اور سننے والوں کو مسحور کر دیتے۔ میں دین سے ان کے گہرے تعلق سے بڑی متاثر ہوئی اور ان سے نکاح کر لیا۔ عدالت نے میری رقوم واگزار کر دی تھیں۔ چنانچہ میں نے اپنے خاوند کو اچھی خاصی رقم دی کہ وہ اس سے کوئی کاروبار کریں، مگر وائے ناکامی کہ شادی کو صرف تین ماہ گزرے تھے کہ میرے خاوند نے مجھے طلاق دے دی۔ اس نے کہا: مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں، میں تمہارے لئے سراپا احترام ہوں، مگر اکتا گیا ہوں اس لئے معذرت کے ساتھ طلاق دے رہا ہوں۔ میں نے اسے جو بھاری رقم دی تھی چونکہ اس کی کوئی تحریر موجود نہ تھی، اس لئے وہ بھی اس نے ہضم کر لی اور اس کی مدد سے جلد ہی دوسری شادی رچالی۔

طلاق کے چند ماہ بعد اللہ نے مجھے بیٹا عطا فرمایا۔ اس کا نام میں نے محمد رکھا۔ اب یہ بیٹا ماشاء اللہ دس برس کا ہے۔ وجیہہ و شکیل اور بڑا ذہین ہے۔ اسے ہی میں دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ اب میں نے اپنے آپ کو اللہ کے فضل سے دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وقف کر دیا ہے اور جی چاہتا ہے کہ بقیہ زندگی اسی مبارک فریضے کی نذر ہو جائے۔ یہ بھی اللہ ہی کا فضل ہے کہ میں نے قرآن کو خوب پڑھا ہے۔ امریکہ میں اس وقت قرآن کے ستائیس ترجمے دستیاب ہیں، میں نے ان میں سے دس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ عربی زبان بھی سیکھ لی ہے اور جہاں ترجمے کی کوئی بات کھٹکی، فون پر عربی کے کسی سکالر سے معلوم کر لیتی ہوں۔ الحمدللہ میں مختلف کتب حدیث یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد اور مشکوٰۃ کا کئی کئی بار مطالعہ کر چکی ہوں اور اسلام کو جدید ترین اسلوب میں سمجھنے کے لئے مختلف مسلمان علماء کی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتی رہتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ جب تک ایک مبلغ قرآن، حدیث اور اسلام کے بارے میں بھرپور معلومات نہ رکھتا ہو، وہ تبلیغ کے تقاضوں سے کماحقہ عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

ایک زمانہ تھا کہ میں اتوار کا دن آرام کرنے کی بجائے کسی سنڈے سکول میں بچوں کو عیسائیت کے اسباق پڑھاتی تھی، آج اللہ کے کرم سے میں اتوار کا دن اسلامک سینٹروں میں گزارتی ہوں اور وہاں مسلمان بچوں کو دینی تعلیم دینے کے علاوہ دیگر مضامین پڑھاتی ہوں۔ لاس اینجلس میں مختلف مقامات پر مختلف نوعیت کی نمائشوں، کانفرنسوں اور مجالس مذاکرات کا اہتمام کر کے غیر مسلموں تک دین اسلام کا پیغام پہنچانے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ میں نے آپ لوگوں کو تبدیلی مذہب کے لئے نہیں بلایا بلکہ اس لئے زحمت دی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں

اور میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں اسلام سے کیوں وابستہ ہوں، زندگی کی کیا حقیقت ہے اور انسان اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہے؟ میں بحمد اللہ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بھی اسلامی تعلیمات پیش کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔

یہ بھی اللہ ہی کی توفیق سے ہے کہ میں نے مختلف مقامات پر مسلم وومن سنڈی سرکل قائم کیے ہیں جن میں غیر مسلم خواتین بھی آتی ہیں۔ میں انہیں بتاتی ہوں کہ اسی امریکہ میں آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے عورتوں کی باقاعدہ خرید فروخت ہوتی تھی اور ایک عورت کو گھوڑے سے بھی کم قیمت پر یعنی ڈیڑھ سو روپے میں خریدا جا سکتا تھا۔ بعد کے ادوار میں بھی عورت کو باپ یا شوہر کی جائیداد میں سے کوئی حصہ نہ ملتا تھا حتیٰ کہ اگر وہ شادی کے موقع پر ایک لاکھ ڈالر شوہر کے گھر میں لے کر جاتی اور چند ہی ماہ بعد اسے طلاق حاصل کرنا پڑتی تو وہ ساری رقم شوہر کی ملکیت قرار پاتی تھی۔ تعلیم کے مواقع بھی اسے مناسب صورت میں حاصل نہ تھے اور اس ایٹمی و سائنسی دور میں بھی صورتِ حال یہ ہے کہ امریکہ اور یورپ میں عملاً عورت دوسرے درجے کی شہری ہے۔ وہ مردوں کے برابر کام کرتی ہے مگر معاوضہ ان سے کم پاتی ہے۔ وہ ہمیشہ عدم تحفظ کا شکار رہتی ہے۔ پندرہ برس کی عمر کے بعد والدین بھی اس کی کفالت کا ذمہ نہیں لیتے اور اسے خود ملازمت کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ شادی کے بعد طلاق کا خوف اسے ہمہ وقت گھیرے رکھتا ہے اور طلاق کے بعد جو یورپین زندگی کا لازمہ بن گئی ہے، نہ والدین نہ بھائی اس کا غم بانٹتے ہیں۔ بچوں کی ذمہ داری بھی اسی کے سر پڑتی ہے اور سابق شوہر بچوں کا بمشکل تیس فیصد خرچ برداشت کرتے ہیں یعنی پچاس ڈالر ماہوار کے حساب سے ادا کرتے ہیں جس سے ایک بچے کا جوتا خریدنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

میں خواتین کو بتاتی ہوں کہ اس کے برعکس اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے خواتین کو جو حقوق عطا کیے تھے، اس کی انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ بحیثیت بیٹی، بہن، بیوی اور ماں اسے خاص احترام اور حقوق حاصل ہیں۔ باپ، خاوند، بھائیوں اور بیٹوں کی جائیداد سے اسے حصہ ملتا ہے اور طلاق کی صورت میں اولاد کی کفالت کا ذمہ دار شوہر ہوتا ہے۔ طلاق کو یوں بھی اسلام میں سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور شادی کے موقع پر خاوند کی حیثیت کے مطابق اسے معقول رقم (یعنی مہر) کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ خاوند کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنی شریک حیات کے ساتھ بہترین سلوک روا رکھے اور اس کی غلطیوں کو معاف کرے اور اس باپ کے لئے جنت میں اعلیٰ ترین انعامات کی خوشخبری دی گئی ہے جو اپنی بچیوں کی محبت اور شفقت سے پرورش کرتا اور ان کی دینی تربیت کر کے انہیں احترام سے رخصت کرتا ہے اور اس اعزاز کی تو کہیں اونیٰ سی بھی مثال نہیں ملتی کہ ماں کے قدموں میں جنت قرار دی گئی ہے اور باپ کے مقابلے میں اسے تین گنا واجب الاحترام قرار دیا گیا ہے۔

میں جب یہ تقابلی موازنہ کرتی ہوں تو امریکی عورتوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ جاتے ہیں..... وہ تحقیق کرتی ہیں، مطالعہ کرتی ہیں اور جب انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ میں صحیح باتیں کرتی ہوں اور واقعتاً اسلام نے عورت کو غیر معمولی حقوق و احترام عطا کیا ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتی ہیں۔ چنانچہ اللہ کا شکر ہے کہ اب تک تقریباً چھ سو امریکی خواتین دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکی ہیں۔

خواتین میں تبلیغ کے ساتھ ساتھ میرا ہدف شعبۂ تعلیم ہے جس کے نصابات میں اسلام کے بارے میں طرح طرح کے اعتراضات و الزامات ہیں۔ ٹی وی پروگراموں میں بھی جا بے جا، اسلام کے خلاف زہر افشانی کی جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے عزم کر لیا ہے کہ اس

تکلیف دہ صورتِ حال کی اصلاح کرنی چاہئے۔ اس کے لئے میں اکیڈمی آف آرٹ ریلیجس سائنس کے کارپردازوں سے ملی۔ یہی لوگ نصابات اور ٹی وی پروگراموں میں اسلام کی غلط تصویر کشی کے ذمہ دار ہیں...... میں نے اصرار کے ساتھ ان سے بحث مباحثہ کیا اور انہیں قائل کر لیا کہ اگر نشاندہی کر دی جائے تو وہ متعلقہ حصوں کی اصلاح کر دیں گے۔ چنانچہ میں نے مسلمان والدین کو توجہ دلائی، امریکہ میں مختلف مسلم انجمنوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں آمادہ کیا کہ وہ بچوں کی نصابی کتابوں میں سے غلط اور قابل اعتراض باتوں کی نشاندہی کریں۔ ان کوششوں کے نتیجے میں اسلامک فاؤنڈیشن فار کری کلم اِن رچمنٹ اینڈ ڈیولپمنٹ (IFOD) کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت نصابی کتابوں میں اسلام کے خلاف منفی اور قابل اعتراض مواد کی نشاندہی کی جاتی ہے...... اسی طرح امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کا مضمون یہودی، عیسائی اور ہندو پڑھاتے ہیں۔ ہم نے IFOD کی وساطت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اسلامیات کی تدریس پر صرف مسلمان اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ ہم یہ مطالبہ منظور کرا لیں گے۔

آخر میں یہ خوش کن خبر بھی سناتی جاؤں کہ میرا وہ خاندان جس نے میرا مکمل سوشل بائیکاٹ کر دیا تھا، اللہ کے فضل سے اس کے بیشتر افراد اسلام قبول کر چکے ہیں۔ میرے والد جو مجھے قتل کرنے کے درپے تھے، وہ مسلمان ہو چکے ہیں اور والدہ، سوتیلے والد، دادی، دادا اور خاندان کے کئی دیگر افراد بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ میرا وہ بیٹا جو اپنے عیسائی باپ کے ساتھ رہتا ہے اور جس کی مذہبی تربیت عیسائیت کے عین مطابق بڑے اہتمام سے ہو رہی تھی، ایک روز میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ''ممی! اگر میں اپنا نام تبدیل کر کے فاروق رکھ لوں تو آپ کے نزدیک کیسا رہے گا؟'' میں پہلے حیرت اور پھر مسرت کے بے پناہ احساس سے نہال ہو گئی۔ میں نے اسے سینے سے چمٹا لیا، پیار کیا اور اسلام کی دعوت پیش کی تو اس نے فوراً ہی کلمہ پڑھ لیا۔ فاروق اب بھی اپنے باپ کی تحویل میں ہے مگر راسخ العقیدہ مسلمان ہے۔ میری وہ بہن جو مجھے پاگل سمجھتی تھی، ایک تقریب میں اس نے میری تقریر سنی تو بے اختیار تعریف کرنے لگی۔ امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ بھی ایک روز دائرۂ اسلام میں آ جائے گی۔

یہ بھی اللہ کی عنایت ہے کہ امریکہ میں رہتے ہوئے باپردہ زندگی گزار رہی ہوں۔ اس ملک میں چہرے پر نقاب ڈال کر اِدھر اُدھر جانا تو ممکن ہی نہیں کہ اس سے بے شمار مشکلات آڑے آتی ہیں، تاہم چہرے اور ہاتھوں کے سوا میں سارے جسم کو ڈھیلے لباس میں مستور رکھتی ہوں اور اس میں بھی قدم قدم پر تعصب اور تنگ نظری کا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ ایک مرتبہ میں اسی لباس میں ایک بینک گئی تو جب تک وہاں موجود رہی، بینک کا گن مین میرے سر پر رائفل تان کر کھڑا رہا۔ ایک پی ایچ ڈی خاتون متعلقہ ملازمت کے لئے منتخب ہو گئی، مگر اسے پہلے ہی روز اس لئے فارغ کر دیا گیا کہ وہ باحجاب لباس میں تھی اور اس نوعیت کی مثالیں بے شمار ہیں

ایک بار میں نے ریڈیو پر بچوں کا پروگرام کیا، اسے ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا مگر تقریب سے ایک روز قبل جب کمیٹی کے ارکان سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے مجھے اسلامی لباس میں دیکھا تو کمال ڈھٹائی سے انہوں نے ایوارڈ منسوخ کر دیا۔

بہرحال یہ ہے امریکہ کا ماحول اور یہ ہیں وہ رکاوٹیں جن میں رہ کر مجھے تبلیغ دین کا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے استقامت عطا کرے اور میں آخیر وقت تک نہ صرف خود ایمان و یقین سے سرشار رہوں

بلکہ یہ روشنی دوسروں تک بھی پہنچاتی رہوں۔

+++

فروری 1990ء میں محترمہ امینہ انٹرنیشنل یونین آف مسلم ودمن کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لائیں اور یہاں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات، لاہور کالج برائے خواتین، کنیئرڈ کالج، کالج فار ہوم اینڈ سوشل سائنسز اور اسلام آباد کے مختلف تعلیمی اداروں میں خطاب فرمایا۔ انہوں نے خواتین کو تکرار کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی کہ حجاب میں عورت کی عزت واحترام ہے اور عورت کی سب سے بڑی ذمہ داری اپنے بچوں کی پرورش ہے۔ انہوں نے بڑے دکھ سے کہا: ''میں سمجھتی تھی کہ پاکستان کا معاشرہ اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہو گا مگر افسوس کہ یہاں ائرپورٹ پر اترتے ہی مجھے مردوں کے عجیب وغریب رویے سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ عورتوں کو جس انداز میں بے باکی کے ساتھ گھورتے ہیں، اس طرح امریکہ کے لادین معاشرے میں بھی نہیں ہوتا۔ پھر یہاں کی خواتین یورپین عورتوں کی نقالی میں ماڈرنزم اختیار کرنے کی بڑی شوقین ہیں۔

میں انہیں انتباہ کرتی ہوں کہ یورپ کے معاشرے کی تقلید نہ کریں۔ وہاں کی خواتین آزادی اور برابری کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکیں، انہوں نے ہر شعبۂ زندگی میں مردوں سے مسابقت کا انداز اختیار کیا اور نسوانیت کو ترک کر کے مردوں کی روش اپنالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج یورپ میں عورت سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں۔ وہ فحاشی اور عدم تحفظ کے گہرے گڑھے میں گر گئی ہے اور جو کچھ اس کے پاس تھا، وہ بھی کھو دیا ہے۔ آج عالم یہ ہے کہ گھر کو قید خانہ سمجھ کر دفتروں کی زندگی اپنانے کے نتیجے میں اسے صبح ہی صبح تیزی کے ساتھ گاڑیوں کا تعاقب کرنا پڑتا ہے اور ٹریفک کے بے پناہ رش میں دو دو گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد اپنے دفتر پہنچتی ہے۔ وہاں دن بھر نوکرانی کی طرح کام بھی کرتی ہے اور اپنے باس (Boss) کے اشارۂ ابرو پر ہر طرح کا ناگوار مطالبہ بھی پورا کرتی ہے۔ شام کو دوبارہ ٹریفک کے سیلاب کا مقابلہ کر کے گھر آتی ہے تو تھکاوٹ سے اس قدر نڈھال اور زندگی سے اتنی بیزار ہوتی ہے کہ اپنے ننھے پیارے بچے کی بات کا جواب تک نہیں دے سکتی۔

امریکی خواتین کے بچے ڈے کیئر سینٹروں میں پلتے ہیں۔ جہاں وہ عدم توجہ کا شکار رہتے ہیں اور نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔ وہاں انہیں ساحرانہ ازم اور جادوگری کا زہر پلایا جاتا ہے، ان پر مجرمانہ حملے ہوتے ہیں اور والدین کی شفقت اور خاندانی زندگی سے محروم ہو کر وہ بچپن ہی سے منشیات کے عادی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بے شمار بچے نو دس سال کی عمر میں خودکشی تک کر لیتے ہیں اور پبلک سکولوں میں فیل ہونے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایڈز اور ہم جنسی عام ہے اور امریکہ کی بعض ریاستوں میں تو ہم جنسی کو قانونی تحفظ حاصل ہو چکا ہے۔ بڑھاپے میں والدین شدید کسمپرسی کی زندگی گزارتے ہیں اور جونہی ایک خاتون کی عمر پینتیس سال سے تجاوز کرتی ہے اسے اس طرح نظر انداز کیا جاتا ہے کہ وہ زندہ درگور ہو کر نفسیاتی مریض بن جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ میں ذہنی امراض کے ہسپتال مریضوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ غرض وہاں نہ عورتوں کو سکون حاصل ہے، نہ بچوں کو نہ بوڑھوں کو۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پاکستانی خواتین اور مرد حضرات اس معاشرے کو آئیڈیل کیوں سمجھتے ہیں اور وہی اطوار کیوں اختیار کر رہے ہیں جنہوں نے امریکی اور یورپی سماج کو تباہ وبرباد کر دیا ہے؟''

جنگ اور جذبہ

وطن سے محبت قربانی بھی مانگتی ہے۔ جو قوم قربانی دینا جانتی ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

☆ محمد نذیر ملک

ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پاکستانی قوم حب الوطنی کے جس لازوال جذبہ سے سرشار تھی اس نے ملکی دفاع کو فی الواقع ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔ راقم اس وقت سکندر آباد (داؤد خیل) میں نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازمت کرتا تھا۔

6 ستمبر کی صبح ملک کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی ولولہ انگیز تقریر ریڈیو پاکستان سے نشر کی گئی۔ ٹی وی نشریات کا تب باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا۔

ہم بینک کے سٹاف نے ان کی تقریر ایک چھوٹے ریڈیو کے گرد بیٹھ کر نہایت انہماک توجہ اور قومی جذبہ سے سنی۔ جس میں انہوں نے کہا۔ ''بزدل دشمن نے رات کے اندھیرے میں بغیر اعلان جنگ کئے ہمارے وطن کی بین الاقوامی سرحد عبور کر کے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ میرے عزیز ہم وطنو! اٹھو اور لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرتے ہوئے دشمن کو بتا دو کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے''۔

دشمن نے اپنی جارحیت کا آغاز وزیر آباد کے قریب ایک سٹیشن پر کھڑی پسنجر ٹرین پر ہوائی جہازوں سے گولہ باری سے کیا جس سے پاکستان کی ایک بیٹی شہید ہو گئی۔ یہ اس جنگ کی پہلی شہید تھی۔

جنگ کے دوران عوام میں خوف و ہراس پیدا کرنے اور قومی جذبہ کو سرد کرنے کے لئے دشمن نے زیادہ تر سویلین آبادی کو ٹارگٹ بنانے کا اوچھا ہتھکنڈا اختیار کیا لیکن حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار پاکستانی قوم بیدار تھی۔ یہ دشمن کے ناپاک عزائم کے سامنے سیسہ پلائی

دیوار بن گئی۔

پاکستانی قوم کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ جب دفاعی فنڈ کے بینک اکاؤنٹ میں چندہ جمع کرانے کی اپیل کی گئی تو ہمارے بینک کی کھڑکی کے آگے چندہ دینے والوں کی لمبی قطاریں لگ گئیں۔ جن میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے بھی شامل تھے۔

ہم نے ایسی خواتین کو بھی دیکھا جنھوں نے چوڑیاں اور پہنا ہوا دیگر زیور اتار کر اپنے ہاتھوں میں لیا ہوا تھا اور باری آنے پر وہ نقد رقم کی جگہ زیور کھڑکی کے اندر آگے بڑھا دیتی تھیں اور میں وہ منظر اب تک نہیں بھول سکا جب ایک ضعیف العمر شخص ایک بہت ہی خوبصورت دنبہ پکڑے ہوئے آیا اور لائن میں لگ گیا۔ جب وہ دنبہ سمیت کھڑکی تک پہنچا تو دنبے کے گلے کی رسی بینک کے عملہ کے حوالے کرنی چاہی کہنے لگا۔ میری کل کائنات یہ دنبہ ہے، میں نے نہایت چاہت اور لاڈ پیار سے پالا ہے۔ میرے گھر میں اور کچھ نہیں۔ میں یہ دنبہ اپنے پیارے وطن کے نام پر نچھاور کرتا ہوں، آپ اسے دفاعی فنڈ میں قبول کرلیں۔ اس ضعیف العمر شخص کے جذبے کو دیکھ کر ہماری آنکھیں بھر آئیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!

کے مصداق جب ہمارے پیارے وطن پر آنچ آئیف تو سب ایک ہوگئے۔ جذبے جاگ اٹھے۔ کہتے ہیں کسی بھی ملک کی فوج وہاں کے عوام کے جذبوں پر لڑا کرتی ہے۔ فوج تو جنگی محاذوں پر دشمن سے برسرپیکار ہوتی ہے لیکن اسے جب یہ پتہ چلے اور یقین ہو کہ اس کے ساتھ پوری قوم کے جذبے اور دعائیں شامل ہیں تو اس کے ساتھ اللہ کی نصرت ہوتی ہے۔ ایسے میں وہ دشمن سے ہار نہیں سکتی۔ پھر چونڈہ کے محاذ پر لڑی جانے والی 600 ٹینکوں کی سب سے بڑی جنگ ہے۔ یا محیر العقول فضائی معرکے ہوں، یا پھر پاک بحریہ کی جانب سے دشمن پہ ایسی دھاک بٹھانا ہو کہ اس کے جہازوں کو ڈاک یارڈ سے باہر نکل کر کھلے پانیوں میں آنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ ایسے میں ہر محاذ پر قومی جذبہ کام آیا اور افواج پاکستان کا ہر محاذ پر مورال بلند رہا۔

سکندر آباد (داؤد خیل) میں WPIDC کی چار برتن فیکٹریاں تھیں (یہ فیکٹریاں اب بھی ہیں) پاک امریکن فرٹیلائزر، میپل لیف سیمنٹ فیکٹری، پنسلین فیکٹری اور پاک ڈائیز (فیکٹری)۔ ان چاروں فیکٹریوں کے جنرل منیجر اور سکندر آباد کالونی کے چیئرمین بریگیڈیئر ریٹائرڈ غلام محمد ملک تھے۔ بریگیڈیئر صاحب بڑے بااصول، وضعدار، دیانت دار اور محب وطن شخص تھے۔

یہ وہ وقت تھا جب مغربی پاکستان کے گورنر نواب آف کالا باغ ملک امیر محمد خان کا طوطی بولتا تھا۔ کالا باغ داؤد خیل کے قریب ہی واقع ہے۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں گورنر عبدالمنعم خان کا راج تھا۔

تب حاجی جنرل افتخار احمد WIPDC کے چیئرمین تھے۔ جو خود نہایت ایماندار اور اچھی شہرت کے مالک تھے۔

چاروں فیکٹریاں نہایت زور شور سے چل رہی تھیں اور خوب اچھی پیداوار دے رہی تھیں۔

سکندر آباد میں مقیم بریگیڈیئر (ر) غلام محمد ملک جو کہ چاروں فیکٹریوں کے جنرل منیجر تھے، فوجی قوائد و ضوابط سے اچھی طرح باخبر تھے۔ انہیں اس علاقہ کی جنگی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔

لہٰذا انہوں نے کہا کہ جنگ میں دشمن کی نظر مدمقابل ملک کے چالو کارخانوں پر ہوتی ہے ان کارخانوں کو اپنے حملوں کا نشانہ بناتا ہے۔ کسی بھی ملک کی صنعت اس ملک کی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی سی اہمیت رکھتی ہے۔ دشمن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے ملک کی فوج کے علاقے اور اس کا اقتصادی

ڈھانچہ بھی تباہ کردے۔ لہٰذا جنگی نقطۂ نگاہ سے یہ کافی اہم علاقہ ہے اور ہمیں بچاؤ کے لئے شہری دفاع کا انتظام کرنے کے لئے کارخانوں اور گھروں میں زمین کھود کر مورچے بنانے چاہئیں۔ پس اس تجویز کو بروئے کار لاتے ہوئے مورچہ بندی کا انتظام کیا گیا۔ بالآخر ہمارا یہ خیال غلط نکلا کہ اس دور دراز علاقہ پر دشمن کی نظر نہ ہوگی اور اس کے جہاز یہاں نہیں آئیں گے۔ مگر یہ علاقہ فی الواقع دشمن کی نظر میں تھا۔

جنگ شروع ہونے کے تیسرے روز رات کے وقت حملہ کے سائرن بج اٹھے۔ ہم نے گھروں وغیرہ کی تمام بتیاں بجھا دیں اور مکمل بلیک آؤٹ کرلیا۔ کچھ دیر میں بمبار جہازوں کی زبردست گڑگڑاہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی پے در پے دھماکے سنائی دیئے۔ جن سے زمین لرز اٹھی۔ ہم تو پہلے ہی گھر میں کھدے مورچے میں داخل ہو چکے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ بالکل ہمارے پہلو میں بم پھٹ رہے ہوں۔ ہمارے اندازہ کے مطابق ہمیں لگا کہ دشمن نے ہمارے ملک کے کارخانوں کو کافی نقصان پہنچایا ہوگا لیکن صبح ہونے پر معلوم ہوا کہ تمام بم ان سے ہٹ کر قرب و جوار کے علاقوں میں گرے اور ایک بھی بم کسی کارخانے پر نہیں گرا۔ اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم کیا۔ ویسے بھی ان جہازوں کے عملے کو واپسی کی جلدی تھی۔ انہوں نے تو بم گرا کر جہاز کا بوجھ خالی کرنے کی بات کر کے واپس بھاگنا تھا۔ ان کی بلا سے کہ بم کہاں گرے اور کہاں نہیں۔ ان کے لئے تو اتنا ہی کافی تھا کہ پاکستانی جہازوں سے بچ کر وہ نکل آتے تھے اور ممکن ہے راڈار کی زد میں بھی نہیں آئے ہوں گے۔ پاکستانی جہاز فوجی جنگی محاذوں پر مصروف عمل ہونے کی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔ نہ ہی ان کارخانوں کی حفاظت کے لئے ان پر اتنی اینٹی کرافٹ توپیں نصب کی جا سکیں بلکہ چاہئے تو یہ تھا کہ قریب کی پہاڑیوں پر ایسی توپیں نصب ہوتیں کیونکہ اس وقت جہازوں کے عملے کو جتنا ان توپوں سے خطرہ اور خوف تھا اتنا کسی دوسری چیز سے نہیں ہوتا تھا۔ یا پھر جہازوں کی دوبدو لڑائی میں جہاز کے ہٹ ہو جانے کا خطرہ ہوتا۔ میزائل وغیرہ سے تو دونوں ملکوں کے جہاز بعد میں لیس ہوگئے۔ دوبدو معرکے میں پاکستانی جہازوں کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہا۔ جس کی وجہ عملہ کی اعلیٰ تربیت قوت ایمانی اور اپنے ملک کے لئے مر مٹنے کا جذبہ تھا۔

پاک ایئرفورس میں اس وقت سیبر جہاز کا بڑا چرچا تھا۔ تب F-12، F-14 اور F-16 نہیں آئے تھے۔

اس سیبر کے بل بوتے سکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم نے ایک ہی معرکہ میں بیک وقت دشمن کے 6 جہاز گرا کر ریکارڈ قائم کیا اور دشمن کی فضائیہ کی کمر ٹوٹ گئی۔ اکثر رن وے پر تباہ کر دیئے گئے ان کے تمام باقی ماندہ جہاز گراؤنڈ ہوگئے۔

ان دنوں سیبر کی مدح میں پنجابی کے ایک ملی نغمہ کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔

سیبر جا وڑیا ہلواڑے
کاغذ وانگوں رن وے پھاڑے
تکیں میریا سیبر بہلے پیا
دشمن دا سینہ ہلنے پیا

1965ء کی جنگ میں دو نیوز براڈ کاسٹرز کو کافی پذیرائی ملی۔ ایک شکیل احمد اور دوسرے انور بہزاد۔ شکیل احمد نمبر 1 تھے۔ جن کی پُر اثر اور بارعب آواز سے دشمن بھی خائف تھا۔ وہاں دیگر ارباب حکومت کے ساتھ شکیل احمد کے پتلے بھی جلائے جاتے۔ شکیل احمد کا خبریں پڑھنے کا ایک مخصوص اور دلنشیں انداز ہوا کرتا تھا جیسے کہ پاک فضائیہ کی کارکردگی بتلاتے ہوئے وہ یوں خبر پڑھتے۔

”کل رات ہمارے جاں باز ہوابازوں نے دشمن کے ہوائی اڈوں...... ہلواڑہ، پٹھانکوٹ، آدم پور، جام نگر اور جودھ پور پر ٹھیک ٹھیک نشانے لگائے اور جب ہمارے

ہوا باز واپس لوٹے تو وہاں آگ کے شعلے نظر آ رہے تھے"۔ ثقافتی محاذ پر شاعروں نے بڑے اعلیٰ نغمے تخلیق کئے اور گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے انہیں گا کر نہ صرف محاذوں پر لڑنے والی فوج کے حوصلے ابھارے بلکہ پوری قوم میں نیا جوش اور ولولہ بھرا۔ پاک فوج، فضائیہ اور بحریہ کے افسروں اور جوانوں نے بہادری کے بڑے اعلیٰ باب رقم کئے۔ اس جنگ میں نشان حیدر پانے والے فرزندان ملت کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ اس طرح دیگر تمغات حاصل کرنے والوں کی گنتی ہی بھی کم نہ تھی۔ پوری قوم کی کارکردگی بے مثال رہی۔ قوم آزمائش کی اس بھٹی سے سرخرو ہو کر نکلی۔ کسی نے بھی اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتی۔ سول اور فوجی ہسپتالوں کے عملے نے اپنی خدمات کی اعلیٰ مثالیں پیش کیں۔

جنگی محاذوں سے کٹے پھٹے اور ادھڑے ہوئے جسم جب ہسپتالوں میں پہنچائے جاتے جن کی حالت دیکھ کر ہی کمزور دل آدمی غش کھا جاتے۔ تو ہسپتالوں کا عملہ جس مستعدی، فرض شناسی اور حسن کارکردگی کا مظاہرہ کرتا وہ قابل ستائش اور صد تحسین ہوا کرتا۔ کہتے ہیں زخم سینے والی انگلیاں اگر کانپنے لگ جائیں تو زخموں کے منہ کھلے رہ جاتے ہیں۔ ہسپتالوں کے عملے کے کام میں ذرا بھر بھی غفلت روا نہیں رکھی گئی۔ 18 دن کی اس جنگ میں دی گئی قربانیوں سے پاکستانیوں نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک زندہ قوم ہیں۔

صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اس لحاظ سے خوش نصیب واقع ہوئے کہ بعد میں آنے والے حالات کے واقعات کے برعکس کسی ذلت آمیز شکست کے داغ سے اپنا دامن بچا کر نکل گئے۔ وہ محب وطن ضرور تھے بہر حال یہ ایک دفاعی جنگ تھی۔ دشمن ملک کی طرح پاکستان کے کوئی جارحانہ مقاصد نہ تھے۔ پاکستان نے دشمن کے عزائم کا منہ توڑ جواب دیا اور دشمن کا فتح کا خواب چکنا چور کر دیا۔ یہ بذات خود ایک بہت بڑی بات ہے۔

پاکستانی وسائل محدود تھے لیکن یہ جنگ جو اس پر مسلط کر دی گئی تھی بڑے عزم، ہمت، حوصلہ اور جذبے سے لڑی گئی۔

جنگوں میں وہ فریقین کے قیدی اور علاقے بھی ہتھیائے جاتے ہیں۔ جنگی قیدیوں کے علاوہ دشمن کا ایک وسیع علاقہ پاکستان کے ہاتھ لگا جو جنگی قوائد وضوابط کے تحت بالآخر دوسرے ملک کو واپس کرنا ہوتا ہے۔

بعض بڑی طاقتوں کی مداخلت کے باعث 18 دن کی جنگ کے بعد جنگ بندی عمل میں لائی گئی۔ جنگ بندی کے معاہدہ پر دستخط کے لئے دونوں ملکوں کے سربراہان سوویت یونین (روس) کے شہر تاشقند پہنچے۔

جہاں جنگ بندی کے معاہدہ پر باہمی رضامندی سے دستخط ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے صدر ایوب خان کو ایک رعب دار اور پُرکشش شخصیت سے نوازا تھا۔ ان کے دور حکومت میں ملکہ برطانیہ سرکاری دورے پر پاکستان آئیں تو صدر نے سفارتی آداب کے ملحوظ خاطر ملکہ کا گرمجوشی سے استقبال کرتے ہوئے ان سے ہاتھ ملایا۔

پھر کسی اور ملاقات پر ملکہ نے صدر ایوب کی شخصیت کے بارے میں شاہی ریمارکس دیتے ہوئے کہا۔ "مسٹر پریذیڈنٹ! میں آپ سے پہلی ملاقات کے دوران آپ سے مصافحہ کرتے ہوئے آپ کے ہاتھ کی گرمی ابھی تک محسوس کر رہی ہوں"۔

یہ امر ملحوظ خاطر رکھا جائے کہ ملکہ برطانیہ سربراہان مملکت کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے ہاتھوں میں چمڑے کے سفید دستانے پہنے ہوتی ہیں۔

ہاں تو جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے دونوں متحارب ملکوں کے سربراہان کے وفود کے تاشقند پہنچنے پر روسی صدر کی نگرانی میں معاہدہ تاشقند طے پایا اور دونوں سربراہوں نے معاہدے پر بہ رضا و رغبت

دستخط ثبت کر دیئے۔ معاہدہ پر دستخطوں کے بعد اخباروں میں دونوں ملکوں کے سربراہوں کی تصویر چھپی جو ایک دلچسپ اور یادگار تصویر تھی۔

جنگ بندی کے معاہدہ پر دستخطوں کے بعد دونوں ملکوں کے سربراہوں نے آپ میں ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ معاہدہ کی رُو سے طے پایا کہ دونوں ممالک آئندہ طاقت کے استعمال سے گریز کریں گے اور آپس کے متنازعہ مسائل باہمی گفت وشنید کے ذریعے حل کریں گے۔ اچھے پڑوسیوں کی طرح رہتے ہوئے پُرامن بقائے باہمی کے اصولوں کی پابندی کرنا ہوگی۔

معاہدہ میں ہو بہو یہ الفاظ تو نہیں ہوں گے لیکن لب لباب اس معاہدہ کا یہی تھا۔ دونوں پڑوسی جو کسی وجہ سے آپس میں لڑ پڑے تھے اور 18 دن لڑنے کے بعد صلح کی میز پر آ گئے۔ پڑوسی ملک کے سربراہ لال بہادر شاستری نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستانی صدر سے کہا۔ "مہاراج! آپ تو بادشاہ ہیں، میں نے واپس جا کر جنتا کو جواب دینا ہے...... آپس کے جنگی قیدیوں اور جنگ کے دوران کے مقبوضہ علاقوں کی واپسی کی بھی یہیں پر بات ہو جائے تو اچھا ہے"۔ لیکن ان کی زندگی میں ایسا نہ ہو سکا کیونکہ ان کا وہیں پر انتقال ہو گیا۔ ورنہ وطن واپسی پر ان کی اپنی اپوزیشن پارٹیوں کی جانب سے نہ جانے ان کا سینہ کیسے کیسے تیروں سے چھلنی ہوتا۔

کیونکہ اپوزیشن جماعتوں کا تو یہ کام ہوتا ہے کہ سربراہ مملکت بالخصوص پاکستان اور بھارت کا آپ میں جیسے بھی معاہدہ یا اعلامیہ پر دستخط کریں انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ضرور اس معاہدہ کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ اپوزیشن کا معاملہ تو ان تماشائیوں جیسا ہوتا ہے جو اکھاڑے سے باہر بیٹھ کر کھلاڑیوں پر تنقید کرتے ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ اکھاڑے کے اندر کھلاڑیوں کے ساتھ کیا بیت رہی ہوتی ہے۔

ستمبر 1965ء میں آج سے 50 سال پہلے پاکستان نے دفاعی جنگ لڑی جو اس پر مسلط کی گئی تھی۔ افواج پاکستان نے بے مثال قربانیاں دے کر جنگوں کی تاریخ میں بہادری کے کئی نئے باب رقم کیئے۔ یہ فولادی عزم اور جذبوں کی جنگ تھی۔ جب گوشت پوست کے انسان لوہے سے ٹکرا گئے۔ پوری قوم نے حب الوطنی کا جس طرح شاندار مظاہرہ کیا تھا وہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ وطن سے محبت قربانی بھی مانگتی ہے۔ جو قوم قربانی دینا جانتی ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔

قوم نے یہ ملک حاصل کرنے کے لئے بھی بے دریغ قربانیاں دی تھیں۔ یہ اپنے اس پیارے وطن کا دفاع کرنے میں کب کسی قربانی کے دینے میں گریز کرتی۔ قوم کے بہادر فرزندوں نے اپنا آج آنے والی نسل کے کل پر قربان کر دیا۔ انہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر آنے والی نسل کے کل کو بچا لیا۔ ہم سب کو چاہئے کہ ہم ان کی ان قربانیوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ ہم آپس میں ایک دوسرے سے سر پھٹول کرنے کی بجائے ملت کے اتحاد کو برقرار رکھیں۔ ہم ایک زندہ قوم ہیں، اقوام عالم کے سامنے سر اٹھا کر چلنے والی قوم۔ اگر ہم آپس میں ہی دست وگریباں رہے تو ظاہر ہے بحیثیت قوم اس کا ہمیں ہی نقصان ہوگا۔ ہم اپنے وقت سے بچھڑ کر بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

یہ ملک قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور ان شاء اللہ قائم ودائم رہے گا کیونکہ اس کی بنیادوں کی مٹی کو شہیدوں نے بے مثال قربانیاں دے کر اپنے لہو سے سینچا ہے اور ان کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔

جب جب بھی موقع آیا قوم ان شاء اللہ آزمائش کی بھٹی میں سے کندن بن کر نکلے گی!

مسئلہ کشمیر

آزادی کی روشن کرنیں

دنیا بھر میں انسانی حقوق کی سب سے زیادہ پامالی و بے حرمتی مقبوضہ کشمیر اور فلسطین میں ہو رہی ہے۔ مگر بڑی طاقتوں نے لب سی لئے ہیں۔

☆ گلزار اختر کاشمیری 0345-8599944

دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی تنظیم لیگ آف نیشن (Leageu of Nation) کو ختم کرنے کی بات ہوئی اور کہا گیا کہ جو عالمی تنظیم ایک ایسی عالمی جنگ کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکی جس نے انسانیت کو موت کی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں دیا وہ اپنے وجود کا جواز نہیں رکھتی۔ لیگ آف نیشن کی راکھ پر ایک نئی تنظیم کا تاج محل اس امید کے ساتھ تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی جو دنیا کو جنگوں، بھوک، افلاس، جہالت اور بیماری سے بچائے گی۔ اس تنظیم کا نام یو این United Nation) یعنی اقوام متحدہ ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کی منظوری دیتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا گیا کہ مظلوم اور غلام قوموں کو اپنی آزادی اور حق خودارادیت کے لئے جدوجہد کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اقوام متحدہ کے قیام کے بعد دنیا میں بہت سے مقامات پر مظلوم طبقات اور قوموں نے ایسے چارٹر کا سہارا لے کر نہ صرف آزادی اور حق خودارادیت کی تحریکیں شروع کیں بلکہ اس چارٹر سے اپنی جدوجہد کے لئے جواز مہیا کیا۔

مسلم لیگ کی طویل جدوجہد کے بعد برصغیر کو تقسیم کرنے کا ایک فارمولہ طے پایا گیا کہ مسلمان اکثریتی علاقے پاکستان اور ہندو اکثریتی علاقے بھارت میں شامل ہوں گے۔ قائداعظم چونکہ کانگرس میں رہ چکے تھے، وہ ہندو ذہنیت سے بخوبی واقف تھے، تقسیم برصغیر کے وقت دیاستوں سے متعلق بھی یہ فارمولہ طے پایا کہ ریاستی حکمران اپنی عوام کے مشورہ سے یہ فیصلہ کریں کہ وہ ہندوستان اور پاکستان میں سے کس کے ساتھ الحاق کریں گے۔ ریاست جوناگڑھ جہاں کا حکمران مسلمان تھا اور عوام کی اکثریت ہندو تھی، اس ریاست پر بھارت نے بزور قوت قبضہ کر لیا اور جواز یہ پیش کیا کہ یہاں کی عوامی اکثریت ہندو ہے اس لئے یہ بھارت میں شامل ہوگی اور کشمیر میں ایک جعلی دستاویز پر دستخط کر کے فوجیں اتار دیں اور جواز یہ پیدا کیا کہ ڈوگرہ مہاراجے نے ہم سے امداد طلب کی ہے۔ حالانکہ ہندوستان میں تحریک پاکستان جب شروع ہوئی تو مہاراجے کے خلاف بھی آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اسلامیان کشمیر کا ذہنی میلان پاکستان کی جانب تھا جبکہ کانگریسی قیادت اسلامیان کشمیر کی خواہشات کو جبر دھونس، دھاندلی، مکر وفریب، ترغیب اور تحریص کے انداز پر کھیلنے پر آمادہ ہوگئی۔ کانگریسی قیادت کے ان خوابوں میں انگریز بھی نہایت عیاری سے رنگ بھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں کشمیر ایک تنازعہ بنتا چلا گیا اور کشمیری مسلمان حالات کی دلدل میں دھنستے چلے

گئے۔ کشمیری مسلمانوں کی فکر اور خواہشات کو اغوا کرنے کے لئے جو سازشی جال بنے گئے ان کے تحت بھارتی افواج کشمیر میں داخل ہو گئیں جبکہ کشمیر کے اس حصے میں جو آزاد کشمیر کہلاتا ہے۔ نتیجے عوام نے ڈوگروں کے خلاف جہاد شروع کیا۔ قیام پاکستان نے ان کا حوصلہ بڑھایا کہ جدوجہد اور قربانی کے ذریعے انہیں آزادی مل سکتی ہے۔ یہ مجاہد اللہ کی امداد کے بھروسے پر کھڑے ہوئے مہاراجے کی فوج سے ہی ہتھیار چھین کر اس کے خلاف استعمال کرنے لگے۔ میرپور، پونچھ شہر، راجوری اور کپواڑہ اور کارگل تک پہنچ گئے تھے۔

بھارتی حکومت نے جب مجاہدین کو پے در پے آگے بڑھتے دیکھا تو وہ کشمیر کا مقدمہ اس دعوے کے ساتھ اقوام متحدہ میں لے گئے کہ کشمیر میں حالات بہتر ہوتے ہی رائے شماری کا اہتمام کر کے کشمیریوں کو آزادانہ طور پر اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے گا۔ جبکہ پاکستان کا مؤقف تو تھا ہی یہ کہ کشمیریوں کو حق خودارادیت ملنا چاہئے۔ پاکستان اور بھارت دونوں نے اقوام متحدہ میں اپنا اپنا مؤقف رکھا۔ بھارت کے مؤقف کی حمایت میں شیخ محمد عبداللہ اور پاکستان کے مؤقف کی حمایت میں آزاد کشمیر کے بانی صدر سردار محمد ابراہیم خان اقوام متحدہ میں پیش ہوئے اور جنرل اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کیا۔ اقوام متحدہ نے مختلف اوقات میں یکے بعد دیگرے کئی مصالحتی مشن کشمیر بھیجے جنہوں نے اپنی رپورٹس مرتب کر کے اقوام متحدہ میں پیش کیں۔

بھارت کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح اس مسئلے کو طول دے کر کشمیر میں اپنی گرفت مضبوط کرے۔ اقوام متحدہ میں کشمیر پر قراردادوں کی منظوری کا عمل تو جاری رہا مگر اس پر عمل درآمد کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ ہو سکی۔ 5 جنوری 1949ء کو اقوام متحدہ نے ایک قرارداد منظور کی بھارت اور پاکستان دونوں کی ذمہ داریوں کا تعین کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کیا گیا کہ کشمیری عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے بین الاقوامی نگرانی میں رائے شماری کرائی جائے۔ اس قرارداد کو پاکستان اور بھارت دونوں حکومتوں کی حمایت حاصل تھی۔ اسی دوران پاکستان کے تعلقات امریکہ سے اور بھارت کے تعلقات روس سے بڑھتے چلے گئے۔ مگر امریکہ نے کشمیر کے معاملے میں پاکستان کی کوئی مدد نہیں کی مگر روس نے سلامتی کونسل میں بھارت کی بھرپور حمایت کی اور کشمیر کے حوالے سے کوئی قرارداد پیش ہوتی تو روس بھارت کی ایما پر ویٹو کر جاتا۔ کشمیری اس انتظار میں رہے کہ اقوام متحدہ اپنے وعدے کے مطابق رائے شماری کے ذریعے کشمیریوں کو حق خودارادیت دلوائے گا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ جن کا نعرہ تھا...... ''جان سے پیاری رائے شماری ہو کر رہے گی، رائے شماری''۔

سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد انہیں آزادی مشکل نظر آئی تو انہوں نے اندرا گاندھی سے اقتدار کا معاہدہ کر لیا۔ 12 فروری 1975ء کو شیخ عبداللہ نے ''دہلی ایکارڈ'' کو باضابطہ تسلیم کر کے ان فلک شگاف نعروں کے تسلسل کو توڑ دیا۔ اندرا گاندھی نے سقوط ڈھاکہ کے بعد پھر ایک بار خوشی کا اظہار کرتے ہوئے 24 فروری 1975ء کو اس معاہدے کے مندرجات کو منظر عام پر لے آئی۔ مقبوضہ کشمیر میں اندرا کانگرس کے لوگوں نے شیخ عبداللہ کو قائد ایوان بنا دیا اس طرح ان کی 22 سالہ جدوجہد بالآخر وزیراعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھانے پر اختتام پذیر ہوئی۔ 25 فروری 1975ء کو کانگرس نے شیخ عبداللہ کو قائد ایوان بنایا تو پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اندرا عبداللہ ایکارڈ کے خلاف ہڑتال کی اپیل کی۔ پاکستان، آزاد کشمیر، گلگت بلتستان اور مقبوضہ جموں و کشمیر میں ایک زبردست اور تاریخی ہڑتال ہوئی جسے کشمیر کی تاریخ کا مؤرخ پاکستان کے حق میں ریاست جموں و

کشمیر کے عوام کا حتمی فیصلہ قرار دے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 28 فروری بروز جمعہ ہڑتال کی اپیل کرتے ہوئے کہا تھا۔ جمہوریت کے دعوے دار شیخ عبداللہ ایک ایسی پارٹی کے سربراہ بننے جا رہے ہیں جس کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں اور ایک ایسی اسمبلی کے ذریعے جس کے وہ ممبر بھی نہیں۔

اس وقت حکومت پاکستان نے اقوام متحدہ سے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ معاہدہ شملہ سمجھوتہ اور رائے شماری سے متعلق اقوام متحدہ کے تقاضوں کی صریح خلاف ورزی ہے۔ 28 فروری کی تاریخی ہڑتال کے بعد 23 مارچ 1987ء کے ریاستی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم متحدہ محاذ کی یقینی فتح کو دھن، دھونس اور دھاندلی سے شکست میں تبدیلی کر کے بھارت نے ریاستی عوام کو پرامن ذریعے سے تبدیلی لانے سے مایوس کر دیا۔ اس طرح 1989ء کے اواخر میں ''ہم چھین کے لیں گے آزادی''...... ''ہے حق ہمارا آزادی''...... ''آزادی کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کے نعروں سے پورا جموں وکشمیر گونج اٹھا۔ تحریک آزادی کشمیر ایک ایسے مرحلے میں داخل ہوئی جس کا بھارت کو وہم وگمان بھی نہ تھا۔ اس نے عوامی انقلاب کو روکنے کے لئے مسلم نوجوانوں کے قتل عام اور غیر مسلموں کو محفوظ مقامات پر منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ بھارتی ظلم وجبر سے تنگ آ کر اور بے سروسامانی کے عالم میں مرنے پر ہجرت اور جہاد کی تیاری کو ترجیح دیتے ہوئے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے آزاد خطے کا رخ کیا۔ جہادی تنظیمیں بنیں اور بھارت کے خلاف مسلح جہاد شروع کیا۔ جہاد اس قدر عروج پر پہنچ گیا کہ بھارتی حکومت پریشان ہو گئی۔ بھارتی آرمی چیف نے بھی حکومت کو جہادی تنظیموں سے مذاکرات کرنے کی بات کی اور کہا کہ ان تنظیموں کو قوت کے ساتھ نہیں دبایا جا سکتا۔ اسی دوران 11-9 والا واقعہ ہو گیا۔ بھارت نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ اور یورپی یونین کو کشمیر کی حق خودارادیت کی تحریک کے خلاف بھڑکایا اور اسے دہشت گردی کی کارروائی قرار دیا اور پوری دنیا میں آزادی کی اس تحریک کے خلاف آواز اٹھائی۔

اسی دوران پاکستان میں جنرل مشرف کی حکومت آئی، آگرہ مذاکرات تک تو جنرل مشرف بھی بات کرتے رہے کہ دنیا کو حق خودارادیت کی تحریک اور دہشت گردی میں فرق کرنا ہوگا مگر 11-9 کے بعد جنرل مشرف بھی امریکہ کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ ہندوستان کے سامنے ڈھیروں فارمولے لے آئے، بھارت وقت گزاری کے لئے جنرل مشرف سے بات کرتا رہا۔ بالآخر جنرل مشرف نے خود ہی اقوام متحدہ کی قراردادوں کو فرسودہ قرار دیا۔ بھارتی افواج کو ساری کشمیری بارڈر لائن پر کانٹے دار باڑ لگانے کا موقع دیا۔ مجاہدین کو دہشت گرد قرار دیا۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں جہادی تنظیموں پر پابندی لگا دی اور بھارت کے ہاتھ مضبوط کئے۔ جنرل مشرف نے نہ صرف جہاد بند کر دیا بلکہ حریت کانفرنس کو بھی تقسیم کرا دیا۔ سید علی گیلانی جنہوں نے مشرف کے فارمولوں کو مسترد کر دیا تھا، ان کو ہٹ دھرم قرار دیا اور یوں کشمیر کی یہ مسلح تحریک اپنوں کی غداری کی وجہ سے دبتی چلی گئی۔ آئی ایس آئی میں کشمیر ڈیسک بند کر دیا گیا۔ اس دوران بھارتی افواج، پیرا ملٹری فورسز سمیت بھارتی سکیورٹی فورسز نے نہتے اور غیر مسلح شہریوں پر مسلسل ظلم اور دہشت گردی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور نوجوان کو اندھا دھند قتل کیا جا رہا ہے۔ لوگ اپاہج اور زخمی کئے جا رہے ہیں۔ خواتین کی آبروریزی ہو رہی ہے۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 1989ء سے جون 2010ء تک بھارتی فورسز کے ہاتھوں 93274 افراد شہید کئے گئے۔ اس کے علاوہ دوران حراست 6969 افراد شہید

کئے گئے۔ یتیم اور بے سہارا رہ جانے والے بچوں کی تعداد 1,30,000 ہے۔ 22,728 خواتین بیوہ ہو گئیں۔ 23,000 خواتین کی آبروریزی کی گئی۔ 50 ہزار ماؤں سے ان کے جگر گوشے چھین لئے گئے۔ ایک لاکھ سے زائد عقوبت خانوں میں گرفتار ہیں اور تین ہزار سے زائد لوگ لاپتہ ہیں۔ انہیں شہید کر کے کہیں گڑھوں میں ڈال دیا گیا ہوگا۔ حالیہ تحریک میں ڈیڑھ سو سے زائد لوگ شہید ہو کر تاریخ کے روشن باب میں امر ہو چکے ہیں۔ انہوں نے تحریک آزادی کے بنجر ڈھانچے کو خون سے سیراب کیا۔ 3,000 لوگ موجودہ چار ماہ کے اندر گرفتار ہو گئے انہیں انڈین کوماتا موبے کے ٹارچر سیلوں میں پہنچا دیا گیا ہے۔ تحریک بام عروج کی طرف رواں دواں ہے۔ تحریک کی شدت نے بھارتی حکمرانوں کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔ وہ جو طاقت کے نشے میں اٹوٹ انگ کی بات کر رہے ہیں وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ کشمیریوں کو کیسے قابو کیا جائے۔ یہ ظلمت کی سیاہ شب ڈھلنے کو ہے۔

تنازعہ کشمیر دو فریقوں کے مابین سرحدی تنازعہ نہیں بلکہ یہ کشمیر کے اصل مالک ڈیڑھ کروڑ کشمیریوں کی آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کی کارفرمائی کا آئینہ دار ہے۔ کشمیری جوانوں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی آنکھوں میں انتقام کا شعلہ جوالہ بھڑکا ہوا ہے۔ ایک طرف بھارتی غاصبین سے آزادی پانے کا جنون حریت پسندوں کے چہرے پر سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ دوسری طرف کشمیریوں کے رگ و پے میں غاصبوں سے نفرت کا خون جوش مار رہا ہے۔ انتقام کی آگ بھارتی فورسز سے نفرت حریت پسندوں کا جنون اس بات کا متقاضی ہے کہ غیور کشمیریوں کو آزادی کی روشنیوں سے منور کرنے کی خاطر اقوام متحدہ میدان میں اترے اور اپنی پاس کردہ قراردادوں پر عمل کروائے تاکہ کشمیری اپنی مرضی سے پاکستان یا بھارت کسی سے الحاق کر سکیں۔

دنیا بھر میں انسانی حقوق کی سب سے زیادہ پامالی و بے حرمتی مقبوضہ کشمیر اور فلسطین میں ہو رہی ہے۔ مگر بڑی طاقتوں نے لب سی لئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی طاقتیں خاموش ہیں۔ بڑی طاقتیں کشمیر کا مسئلہ حل کرنے کے لئے اس لئے مخلص نہیں کیونکہ کشمیر میں مسلمان بستے ہیں۔ اس کے برعکس مشرقی تیمور کا مسئلہ حل کرانے کے لئے اقوام متحدہ اور بڑی طاقتوں نے کس طرح اپنا کردار ادا کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عالمی برادری چاہے تو مسئلہ کشمیر بھی ہنگامی بنیادوں پر حل ہو سکتا ہے لیکن جب مسئلہ فلسطین اور مسئلہ کشمیر کی باری آتی ہے تو اقوام متحدہ کی قراردادیں بے اثر اور سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کی بھی زبانی بیانات سے بات آگے نہیں بڑھتی ہے۔ جب تک عالمی برادری دہرا رویہ ترک نہیں کرے گی اس وقت تک دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔

11 اگست 2010ء کو اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی (OIC) کی جانب سے کشمیر میں ظلم و ستم کی مذمت کی گئی دنیا کے کسی ملک سے یا کسی بھی بین الاقوامی تنظیم سے جب کشمیری مسلمانوں پر ظلم و ستم اور بھارت پر دباؤ ڈالنے کی بات کی جاتی تو جواب ملتا ہے کہ پہلے حکومت پاکستان اس کے خلاف آواز اٹھائے۔ ہم سے پھر جتنا پاکستان کی حکومت مطالبہ کرے گی ہم اتنا ہی تعاون کریں گے۔ ڈکٹیٹر پرویز مشرف کی حکومت نے تو اپنی شہ رگ سے منہ پھیر لیا تھا۔ حکومت پاکستان کو پتہ ہی نہیں ہے کہ مسئلہ کشمیر کیا ہے اور کیوں پیدا ہوا۔ 16 جنوری 2010ء کے اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ سابق صدر پاکستان اور پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین جناب آصف علی زرداری نے فرمایا کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جو کشمیر کا تنازعہ ہے اس کی جڑ یعنی اصل وجہ پانی کی تقسیم ہے۔

صدر پاکستان کے اس انکشاف پر الحاق پاکستان کی حامی کشمیری تنظیموں کے کارکنوں نے سر پیٹ کر کہا کہ پاکستان ہمارا وکیل ہے اور پوری دنیا میں کشمیر کے حوالے سے ہماری نمائندگی کرتا ہے۔ اگر اس ملک کے صدر کو یہ علم ہی نہیں کہ کشمیر کا مسئلہ کیا ہے تو وہ ہماری کیا وکالت کرے گا؟

ایک اندازے کے مطابق 1947ء سے آج تک تقریباً پانچ لاکھ سے زیادہ لوگوں نے جانوں کی قربانی دی ہے۔ ان شہداء کا مقصد اقتدار سنبھالنا یا کرسی یا مراعات حاصل کرنا نہیں تھا۔ وہ کشمیریوں کے مخلص ترین لوگ تھے جنہوں نے ہمارے آج کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ جان کی قربانی سے بڑھ کر کوئی قربانی نہیں ہے۔ اپنا جسم اور اپنی روح کو قربان کرنا بڑی بات ہے۔ شہدا کا لہو اتنا بہہ گیا ہے کہ اس سے وادی کشمیر سیراب ہو چکی ہے۔ اس لئے اس لہو کو فروخت نہیں کیا جا سکتا ہے نہ ہی لوگ اس کی اجازت دیں گے جنہوں نے اس تحریک میں اپنے بیٹوں کا خون شامل کیا ہے، اپنی جان و مال عزت اور آبرو اور عصمتوں کی قربانی دی وہ کسی عیش کدے کے لئے نہیں تھیں، وہ کسی تجارت کے لئے نہیں تھا بلکہ مکمل آزادی کے لئے تھا۔ کشمیر میں آٹھ لاکھ فوج جس کے پاس بندوق اور توپ اور ہر قسم کا ہتھیار ہے، طاقت ہے، قوت ہے لیکن نئی نسل ان سے بالکل دبنے والی نہیں ہے۔ ان کا عزم ہے وہ ہر صورت میں بھارت سے آزادی چاہتے ہیں۔ کوئی ساتھ دے نہ دے نئی نسل کی قوت ایمانی دیکھ کر ہر کوئی حیران ہے۔ سرینگر میں پاکستان کا پرچم لہرانا اور پاکستانی ترانہ پڑھنا اور کشمیر بنے گا پاکستان...... پاکستان سے رشتہ کیا، لا الہ الا اللہ کا نعرہ لگانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جدوجہد آزادی میں مصروف لوگ بکنے اور جھکنے والے ہرگز نہیں ہیں۔

کبھی برطانیہ اس غرور میں تھا کہ اس کی سرزمین سے سورج غروب نہیں ہوتا تھا مگر اب برطانیہ سے تمام نوآبادیاتی ریاستیں آزاد ہو چکی ہیں۔ برصغیر سے بھی برطانیہ کا چراغ گل ہو چکا ہے۔ جغرافیہ اور سرحدیں بدل گئیں۔ بھارتی حکمرانوں کا غرور بھی ان شاء اللہ ختم ہو گا۔ جو لوگ تحریک کے نام پر کاروبار کرنا چاہتے ہیں انہیں بھی کشمیری ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ سرینگر کی تازہ صورتِ حال اس کی نشاندہی کرتی ہے۔ نئی نسل کا یہی عزم ہے۔ آزادی کی جنگیں عزم سے لڑی جاتی ہیں۔

جون میں شنگھائی کانفرنس میں وزیراعظم پاکستان جناب نواز شریف نے بھارتی وزیراعظم نریندر مودی سے ملاقات کی، مودی نے بمبئی کے فرضی مقدمات کے حوالے سے بات کی، لکھوی کی ضمانت پر رہائی کے حوالے سے بھرپور بات کی مگر نواز شریف کشمیر پر کوئی بات نہ کر سکے۔ اس سے کشمیریوں میں مایوسی پھیلتی ہے۔ نواز شریف نے پاکستان میں ''را'' کی دہشت گردانہ کارروائیوں پر بھی کوئی بات نہیں کی۔ کراچی اور بلوچستان میں ''را'' نے پے بہ پے وار شروع کر رکھی ہے مگر وزیراعظم پاکستان کی پُراسرار خاموشی پر اہل پاکستان پریشان ہیں۔ 1952ء میں بھارت اور چین کی جنگ ہوئی۔ بھارت کی ساری فورس اس طرف چین کی طرف لگی ہوئی تھی۔ چینی قیادت نے جنرل ایوب سے کہا تھا کہ کشمیر خالی ہے، فوراً قبضہ کر لو۔ مگر امریکہ نے ایوب خان کو یقین دہانی کرائی کہ کشمیر کا فیصلہ کرانے میں امریکہ مکمل تعاون کرے گا اور اس وقت پاکستان کوئی ایسی مداخلت نہ کرے وہ موقع ہم نے ضائع کیا۔ پھر امریکہ بھی وعدہ وفا نہ کر سکا اور پاکستان کو بھی دوبارہ ایسا موقع نہ مل سکا اور لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر بھی ابھی مسئلہ کشمیر اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔

○❖○

زارش کے فلیٹ میں لگا تالا توڑ کر پولیس نے تلاشی لی تو ایسا کچھ نہیں ملا جو قابلِ اعتراض ہوتا۔ ہاں، ٹی وی کے پاس رکھے ایک دعوتی کارڈ نے پولیس کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا۔

☆ دستگیر شہزاد
0300-9667909

لاہور کے باشندے مدثر عباس فوج میں تھے اور اب سبکدوش ہو کر پنشن لے رہے تھے۔ ان کے کنبہ میں بیوی کے علاوہ دو اولادیں تھیں۔ بیٹی زارش اور بیٹا ابوبکر۔ تقریباً سولہ سال قبل مدثر عباس نے زارش کی شادی شاہ زیب سے کی تھی۔

شاہ زیب آبائی طور سے غازی پور کا باشندہ تھا۔ کنبہ میں بیوہ ماں سحرش اور بڑا بھائی احسان الٰہی تھا۔ احسان رائے ونڈ میں واقع ایک بڑی کمپنی میں ملازم تھا۔ رہنے کے لئے اس نے شاہدرہ میں ایک مکان لے رکھا تھا جس میں وہ بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔

حال ہی میں شاہ زیب کی نوکری بھی رائیونڈ میں لگ گئی تھی۔ وہ پھول نگر میں آکسیجن کمپنی میں انجینئر تعینات ہوا تھا۔ رہنے کے لئے اس نے الگ مکان نہیں لیا اور بھائی کے کنبے کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ شادی کے

میں رہی، اس کے بعد شاہ زیب اسے شاہدرہ لے گیا۔ جیٹھ کے کنبے کے ساتھ زارش بھی رہنے لگی۔ شادی کے ڈیڑھ سال بعد زارش نے ایک بچی عائشہ کو جنم دیا۔ اس کے دو سال بعد بیٹی کا جنم ہوا جس کا نام ارم رکھا گیا۔ موجودہ وقت میں عائشہ کی عمر 14 سال اور ارم کی 12 سال تھی۔

بیٹیاں سکول جانے کے لائق ہوئیں تو شاہ زیب نے رائے ونڈ کے مشہور نیشنل سکول میں ان کا داخلہ کرا دیا۔ تب سے عائشہ اور ارم اسی سکول میں پڑھ رہی تھیں۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ 2 جون 2013ء کو ایک ٹرین حادثے میں شاہ زیب کی موت ہو گئی۔ ان دنوں زارش صرف 33 سال کی تھی اور یہ عمر زیادہ نہیں مانی جاتی۔ وہ بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ شوہر کے پرائیویٹ فنڈ، بیمہ، حادثاتی کلیم کے طور پر

اپنے بنک کھاتے میں جمع کردی۔

"تمہیں کوئی کام کرنے یا بینک کھاتے سے پیسہ نکالنے کی ضرورت نہیں ہے"۔ اس کے جیٹھ احسان نے زارش سے کہا۔ "تم تینوں کا سارا خرچ میں اٹھاؤں گا"۔

احسان نے یہ صرف کہا ہی نہیں بلکہ اس پر شدت سے عمل بھی کیا۔ جہاں روح کے رشتے قائم ہوں وہاں پھول موسموں کے محتاج نہیں ہوا کرتے، بس کھل اٹھتے ہیں۔

کچھ ماہ گزرے زارش کے سر سے غم کے بادل چھٹ گئے تو وہ مستقبل کے بارے میں اپنے نقطۂ نگاہ سے سوچنے لگی کہ اس کے پاس پیسہ ہے، شوہر کی پنشن بھی اسے ملتی ہے تو جیٹھ جٹھانی پر بوجھ بن کر کیوں رہے۔ ان کا بھی اپنا کنبہ ہے، اپنی ذمہ داریاں ہیں۔ آخر بہت غور کرنے کے بعد زارش نے ذاتی مکان خرید کر الگ رہنے کا فیصلہ کرلیا لیکن جیٹھ جٹھانی اس فیصلہ سے متفق نہیں ہوئے مگر جب زارش نے کچھ دلائل پیش کئے، ان کے مدِنظر دل مار کر انہوں نے اسے ذاتی مکان خریدنے کی اجازت دے دی۔ زارش نے کوشش کی تو رائیونڈ میں قصور روڈ پر ایک فلیٹ مل گیا۔ چوتھی منزل پر واقع وہ فلیٹ حمزہ کا تھا۔ تیسری منزل پر بھی حمزہ کا ایک فلیٹ تھا جس میں وہ اپنی ماں اور بیوی مہرالنسا، کے ساتھ رہتا تھا۔

زرش کو چوتھی منزل پر حمزہ کا بکاؤ فلیٹ اس لئے پسند آیا کیونکہ وہاں سے بیٹیوں کا سکول قریب تھا۔ رسمی بات چیت کے بعد بارہ لاکھ میں فلیٹ کا سودا ہوگیا۔ اپنے نام رجسٹری کرانے کے بعد زارش دونوں بیٹیوں کے ساتھ اس میں رہنے آ گئی۔ وہ اپنے طریقے سے زندگی گزارنے کی سمت قدم بڑھا رہی تھی۔ جب کہ اس کے والد مدثر عباس، ساس سحرش اور جیٹھ احسان الٰہی وغیرہ اپنی سمجھ سے اس کے بھلے کی سوچ رہے تھے۔ سبھی کا خیال تھا کہ زارش بھری جوانی میں بیوہ ہوئی ہے، ساری زندگی اس کے سامنے پڑی ہے، اس لئے اس کی دوسری شادی کر دینا چاہئے لیکن زارش کو جب ان باتوں کی خبر ہوئی تو اس نے بزرگوں کے فیصلے کے خلاف بغاوت کر دی اور دوسری شادی کے لئے تیار نہیں ہوئی۔

وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا رہا لیکن دنیا کا یہ رواج بھی ہے کہ کوئی غمزدہ عورت زندگی سے نبردآزما ہو تو لوگ اس کے بارے میں، اس کے کردار پر انگلی اٹھانے سے بھی نہیں چوکتے۔ لوگوں نے دیکھا کہ زارش نے بارہ لاکھ روپے دام چکا کر فلیٹ خریدا ہے، شان سے رہتی ہے۔ دو بیٹیاں اچھے سکول میں پڑھتی ہیں۔ بس، لوگوں کے دل میں خرافات مچلنے لگیں۔ شیطان سب سے پہلے انسان کی شرم وحیا پر ضرب لگاتا ہے تاکہ وہ بے حیا ہو کر آسانی سے گناہ کر سکے۔

ایک تو زارش جوان دوم بلا کی حسین اوپر سے وہ بیوہ، ایسی عورتوں کے چاہنے والے کم نہیں ہوتے، اسی لئے تو شان سے رہتی ہے اور سسرال سے الگ ہی اس لئے ہوئی ہے تاکہ وہ جہاں کہیں بھی جائے اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو۔

حمزہ کو زارش سے ہمدردی تھی اس لئے کبھی کبھی اس کا حال پوچھنے آ جاتا تھا۔ اس بہانے وہ اس فلیٹ کو بھی دیکھ لیتا تھا جو کبھی اس کا ہوا کرتا تھا۔ حمزہ کا آنا جانا بھی لوگوں کے لئے چٹ پٹی خبر بن گیا۔ پہلے لوگ زارش کے خفیہ یاروں کا اندازہ لگاتے تھے، اب ان میں سے ایک کا نام حاصل ہوگیا، حمزہ۔ افواہیں اس قدر پھیلیں کہ زارش کے کانوں تک جا پہنچیں۔ افواہیں جتنی پھیل چکی تھیں اب انہیں وہیں دبا دینا ضروری تھا۔ نہ دبانے کی صورت میں زارش کی بدنامیوں کا دائرہ بھی بڑھتا جاتا۔

وقت اور سمجھ ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں کو ملتے ہیں کیونکہ اکثر وقت پر سمجھ نہیں ہوتی اور سمجھ آنے تک وقت نہیں رہتا۔ ایک دن زارش نے اپنے جیٹھ احسان

الٰہی کو بلا کر ساری باتوں سے آگاہ کیا۔

"زارش! تمہارے بارے میں کچھ غلط باتیں میں نے بھی سنی ہیں"۔ اس کے جیٹھ نے اس کی بات سن کر کہا۔ "لیکن مجھے تمہارے پاکیزہ کردار پر پورا بھروسہ ہے، اس لئے میں نے ان باتوں کا ذکر تم سے نہیں کیا"۔

"میں شکرگزار ہوں کہ آپ نے اپنا اعتماد مجھ پر قائم رکھا"۔ زارش نے کہا۔ "اسی لئے اب میں چاہتی ہوں کہ یہ فلیٹ چھوڑ دوں اور آپ کے گھر کے آس پاس ہی دوسرا مکان لے کر رہوں"۔

"یہ بہت اچھی بات ہے"۔ احسان چہک کر بولا۔ "مگر دوسرا مکان لینے کی کیا ضرورت ہے، پہلے کی طرح ہمارے ساتھ رہو"۔

مگر زارش اس کے لئے تیار نہیں تھی۔

"بھائی صاحب! آپ میرے لئے ٹھیک ٹھاک مکان دیکھئے"۔ زارش نے احسان سے کہا۔ "آپ کے گھر کے پاس اور آپ کی نگرانی میں رہوں گی تو کوئی مجھ پر انگلی نہیں اٹھا سکے گا"۔

احسان نے زارش کے لئے اوسط درجے کا بکاؤ مکان تلاش کرنا شروع کر دیا۔

زارش نے یہ بات اپنے باپ مدثر عباس کو بھی بتا دی تھی۔ وہ بھی خوش تھے کہ نیا مکان مل جانے کے بعد زارش کو فضول کی بدنامیوں سے نجات مل جائے گی اور وہ جیٹھ کی سرپرستی میں رہے گی۔

زارش نہ تو پرانا مکان بیچ سکی اور نہ نیا مکان خرید پائی۔ اس سے پہلے ہی لاپتہ ہو گئی۔ زارش کے لاپتہ ہونے کی خبر تب ہوئی جب 3 اپریل کو مدثر عباس نے فون کیا۔ گھنٹوں بیت جانے کے بعد بھی ریکارڈ شدہ پیغام سننے کو ملتا رہا۔ "آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے، برائے مہربانی کچھ دیر بعد ٹرائی کریں"۔

مدثر عباس کو لگا ضرور کہیں گڑبڑ ہے۔ اس لئے انہوں نے شاہدرہ میں رہنے والے اپنے قریبی رشتہ دار مومن اقبال کو ماجرا بتا کر پتہ کرنے کو کہا۔ حقیقت معلوم کر کے مومن اقبال مدثر کو فون کرتا کہ اس سے پہلے ہی ایک فون آ گیا۔ زارش بشارت مغل کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ عائشہ اور ارم کو بھی وہ ساتھ لے گئی ہے۔ اس فون نے مدثر عباس کی کھوپڑی گھما دی۔ ان کا دل یہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ زارش بشارت مغل کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اگر اسے بھاگنا ہوتا تو جیٹھ کو بلا کر اس کے پاس رہنے کی خواہش بیان کرنے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ مدثر عباس یہی سوچ رہے تھے کہ کہاں اور کیسے بشارت مغل کا پتہ لگایا جائے۔ پھر وہ احسان الٰہی کو فون لگا کر واقعات سے انہیں آگاہ کرنے والے تھے کہ ان کا موبائل فون بج اٹھا۔

مدثر عباس نے کال ریسیو کی اور کہا۔ "مدثر عباس!"

"زارش اور اس کی دونوں بیٹیوں کو ہم نے اغوا کر لیا ہے"۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تینوں ہمارے قبضے میں ہیں، انہیں رہا کرانا چاہتے ہو تو بیس لاکھ روپے لے کر شاہدرہ بس اسٹینڈ پر آ جاؤ۔ روپے بریف کیس میں رکھ کر لانا، ہم ایک ہاتھ سے بریف کیس لیں گے اور دوسرے ہاتھ سے زارش اور اس کی بیٹیاں تمہارے حوالے کر دیں گے"۔

مدثر عباس کے فون پر وقفے سے دو فون آئے تھے اور دونوں فون الگ الگ نمبروں سے کئے گئے تھے اور آوازیں بھی الگ تھیں۔ مدثر عباس سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ دونوں میں سے کون سی کال سچی تھی۔ زارش بشارت مغل کے ساتھ بھاگ گئی تھی یا کسی گروہ نے اسے اغوا کر کے قید کر رکھا تھا اور ان تینوں کی رہائی کے لئے بیس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہا تھا۔

مدثر عباس اسی سوچ میں تھے کہ انہیں اب کیا کرنا

چاہئے کیا نہیں کہ شاہدرہ سے مومن اقبال کا فون آ گیا۔

''آپ کی ہدایت کے مطابق میں زارش کے گھر گیا تھا''۔ اس نے بتایا۔ ''دروازہ پر تالا لگا ہوا ہے، پڑوسیوں کو بھی پتہ نہیں کہ ماں بیٹیاں کہاں گئی ہیں۔ تین چار دن سے انہیں بلڈنگ میں کسی نے دیکھا نہیں ہے''۔

معاملہ حقیقت میں سنگین تھا، مدثر عباس نے فوراً شاہدرہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے دوسری تیاریاں بھی کیں۔ بینک کے اپنے کھاتے میں بیس لاکھ روپے نقد لے کر بریف کیس میں رکھ لئے اس کے ساتھ ہی سحرش اور احسان الٰہی کو بھی پورے معاملے سے آگاہ کر کے اپنے شاہدرہ پہنچنے کی اطلاع دی۔

طے شدہ دن و وقت پر مدثر عباس اور احسان الٰہی تاوان کی رقم لے کر شاہدرہ بس سٹینڈ پہنچے بھی مگر نہ کوئی پیسہ لینے آیا اور نہ اغوا کاروں نے فون سے کوئی نیا پیغام دیا۔ مدثر عباس نے وہ نمبر ڈائل کیا جس سے زارش وغیرہ کو اغوا کر کے قید میں رکھنے، قید کئے جانے کی اطلاع دینے کے علاوہ بیس لاکھ روپے کا تاوان مانگا گیا تھا۔ وہ نمبر بند ملا۔ مایوس مدثر عباس اور احسان الٰہی شاہدرہ بس سٹینڈ سے لوٹ آئے۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ اس کے بعد قانون کی پناہ میں جانے کا فیصلہ کیا۔

اسی شام مدثر عباس تھانہ رائے ونڈ جا کر انچارج شہریار سے ملے اور انہیں واقعات سے آگاہ کر دیا۔ وہ موبائل نمبر پولیس کو نوٹ کرا دیئے جن سے انہیں زارش کے بشارت مغل کے ساتھ بھاگ جانے اور زارش وغیرہ کے اغوا کی اطلاع دی گئی تھی لیکن اس کے باوجود انسپکٹر شہریار نے سنگین دفعات کے تحت معاملہ درج نہیں کیا۔

تھانہ سے مایوس ہو کر مدثر عباس نے پولیس ڈی پی او سے انصاف کی فریاد کی۔ اس کے بعد کچھ اخبارات کے دفاتر بھی گئے اور انصاف کی لڑائی میں میڈیا سے مدد کرنے کی اپیل کی۔ اخبارات نے واقعہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا تو اس کی گونج رائے ونڈ پولیس تک ہونے لگی، بس اس کے بعد پولیس سرگرم ہو گئی۔

> بہت پیارے اور بہت نایاب ہوتے ہیں جو آپ کی پیٹھ پیچھے آپ کا دفاع کرتے ہیں اور آپ کو علم بھی نہیں ہوتا۔

زارش کے فلیٹ میں لگا تالا توڑ کر پولیس نے تلاشی لی تو ایسا کچھ نہیں ملا جو قابل اعتراض ہوتا۔ ہاں، ٹی وی کے پاس رکھے ایک دعوتی کارڈ نے پولیس کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا۔

وہ انویٹیشن کارڈ لاہور روڈ کے باشندے محمد عرفان کی شادی کا تھا۔ کارڈ پر انگریزی میں مسز زارش وفیملی لکھا ہوا تھا۔ عرفان کی شادی 3 اپریل کو تھی اور تین اپریل سے ہی واقعات نے سنگین موڑ لینے شروع کئے تھے۔ اس لئے چھان بین میں لگے پولیس افسران نے عرفان کو تفتیش میں شامل کرنا مناسب سمجھا۔ عرفان کو تھانہ رائے ونڈ بلا کر پوچھ گچھ کی گئی تو کارڈ اس نے اپنی شادی کا ہونا تو قبول کیا مگر کسی زارش کو جاننے سے انکار کر دیا۔

''اگر نہیں جانتے تو تمہاری شادی کا کارڈ زارش کے گھر سے کیسے ملا؟'' اس سے پوچھا گیا۔ ''اگر کارڈ تم نے نہیں دیا تو کنبے کے کس دوسرے فرد نے دیا ہو گا۔ مسز زارش وفیملی ہاتھ سے لکھا ہوا ہے، ذرا غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ یہ کس کی ہینڈ رائٹنگ ہے؟''

عرفان کچھ دیر تک اس تحریر پر نظریں جمائے رہا پھر بولا۔ ''سر! رائٹنگ جانی پہچانی سی تو لگ رہی ہے لیکن حقیقت میں ہے کس کی، چاہ کر بھی یاد نہیں کر پا رہا ہوں''۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہاری شادی کے کارڈ سرکل میں کون تقسیم کر سکتا ہے؟''

''میں نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو پانچ پانچ

کارڈ دیئے تھے تاکہ وہ جنہیں مناسب سمجھیں شادی میں مدعو کرلیں"۔

"آپ کچھ رشتے داروں کے نام بتا سکتے ہیں"۔

جواب میں عرفان نے کچھ نام گنوائے۔ ان میں ایک نام حمزہ بھی تھا۔ حمزہ کے نام سے پولیس افسر چونکے۔ آگے کی پوچھ گچھ سے پتہ چلا کہ عرفان حمزہ کا بھانجا تھا۔ اب شک کی گنجائش نہیں رہی کہ زارش کو شادی کا دعوت نامہ حمزہ نے ہی دیا تھا۔

حمزہ کا نام سامنے آنے پر پولیس نے اس کی بابت معلومات جمع کیں تو معلوم ہوا کہ وہ قصور روڈ میں واقع دُکان 20/1 کا مالک تھا، اس دُکان میں پہلے میاری کا سامان بکتا تھا اور اس کا نام حمزہ سٹور تھا۔ بعد میں حمزہ نے میاری کا کام ختم کر کے دُکان کو سیلون کی شکل دے دی۔ اب دُکان خوب اچھی چلتی تھی۔ اپنے ذرائع سے پولیس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ دُکان کو نیا لُک دینے اور نیا کام شروع کرنے کے لئے 2014ء میں حمزہ کو ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی اس لئے اس نے چوتھی منزل والا فلیٹ زارش کو بارہ لاکھ روپے میں فروخت کر دیا۔

یوں تو پوچھ گچھ کے لئے حمزہ کو تھانہ بلانے کی پولیس کے پاس پختہ بنیاد تھی مگر شہریار نے اسے فی الحال چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر حمزہ ملزم تھا تو کچی زمین پر اسے کھینچ کر وہ اسے ہوشیار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اب ان دو موبائل نمبروں پر توجہ مرکوز کی جو مدثر عباس نے نوٹ کرائے تھے۔ ان دونوں نمبروں کو سرولانس پر لگانے کے ساتھ ہی دوسرے طریقوں سے بھی ان کی چھان بین کی گئی۔ اس سے چونکا دینے والی بات علم میں آئی۔ وہ نمبر حمزہ کے ہی تھے۔ رات کو گیارہ بجے سے صبح چھ بجے تک ہی وہ ان نمبروں کے سم ہینڈ سیٹ میں لگائے رکھتا تھا۔ جہاں کہیں بات کرنا ہوتی کرتا اور پھر صبح ہوتے ہی دونوں سم کارڈ نکال لیتا تھا۔

11 اپریل 2015ء کو رات حمزہ نے مشتبہ سیل نمبر سے ایک دوسرے نمبر پر تقریباً دو گھنٹے لمبی بات کی تھی۔ پولیس نے مزید چھان بین کی تو پتہ چلا کہ وہ نمبر حمزہ کے بھتیجے حسنین شاہد کا تھا۔ چچا بھتیجا آدھی رات کو دو گھنٹے سے زیادہ باتیں کرتے رہے تھے۔ پولیس کے لئے یہ تجسس کا موضوع تھا۔ پولیس نے اس بار بھی حمزہ کو نہیں چھیڑا۔ حسنین شاہد کو چپکے سے اٹھا لیا۔ اس سے جب پوچھ گچھ کی گئی تو زارش عائشہ اور ارم کی گمشدگی کا راز کھلتے دیر نہیں لگی۔

حسنین شاہد کے اقبال جرم کے بعد 12 اپریل کو ہی پولیس نے حمزہ کو بھی اس کے گھر سے گرفتار کرلیا۔ یہ معلوم ہونے پر کہ زارش اور اس کی بیٹیوں کی گمشدگی کا راز کھل چکا ہے۔ حمزہ نے بھی کچھ نہیں چھپایا۔ واقعہ کی پوری تصویر اس نے پولیس کے سامنے رکھ دی۔

حمزہ نے تحت مجبوریوں کے تحت چوتھی منزل والا فلیٹ زارش کو فروخت تو کر دیا تھا مگر دل سے وہ دکھی تھا۔ حمزہ کا نیا کام چل نکلا، پیسہ بھی چھپر پھاڑ کر برسنے لگا تو اس کے دل میں یہ خیال گہرائی تک جڑیں جمانے لگا کہ جب بھی زارش فلیٹ بیچے گی تو وہی اسے خریدے گا۔ اس لئے مجبوری میں بیچا گیا فلیٹ پھر سے اس کا ہو جائے گا۔ یہی سبب تھا کہ حمزہ اکثر زارش سے ملنے جانے لگا۔ بعد میں حمزہ نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر مستقبل قریب میں وہ فلیٹ فروخت کرنے کی خواہش مند ہو تو اسے ضرور بتائے، اپنا فلیٹ وہ پھر سے واپس پانا چاہتا ہے۔

ادھر جب مفت میں ہو رہی بدنامی کے سبب زارش نے جیٹھ کے گھر کے آس پاس رہنے کا فیصلہ کرلیا تب اس نے حمزہ کو بھی بلایا۔

"بھائی! آپ اپنا فلیٹ واپس پانا چاہتے ہیں، شوق سے لیجئے، میں اپنوں کے قریب رہنا چاہتی ہوں"۔

حمزہ کے لئے یہ بے حد خوشی کی بات تھی، زارش

نے آگے کہا لیکن یہ بتائیے کہ آپ کتنی رقم دیں گے؟
"آپس کی بات ہے، سودے بازی تو کرنی نہیں ہے۔ جتنی رقم آپ نے دی تھی وہی لوٹا دوں گا"۔
"لیکن فلیٹ کی موجودہ قیمت پچیس لاکھ روپے ہے"۔ زارش نے حمزہ سے کہا۔ "چونکہ فلیٹ میں نے آپ سے خریدا ہے اس لئے بازار کے بھاؤ سے ایک دو لاکھ کم دے دینا"۔

حمزہ نے زارش کو بہت منایا مگر وہ دام گھٹانے کو راضی نہیں ہوئی۔ جب زارش منانے پر بھی نہیں مانی تو حمزہ نے مفت میں فلیٹ ہڑپنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اپنے اس منصوبے میں اس نے حسنین شاہد، آصف اور نور حسین کو پیسے کا لالچ دے کر شامل کر لیا۔ منصوبہ زارش اور اس کی دونوں بیٹیوں کو قتل کر کے لاشیں لاپتہ کر دینے کا تھا۔ اسی مقصد سے حمزہ نے دو مزدور لگا کر اپنی دکان کے اندر دو گڑھے کھدوانے شروع کر دیئے اور قتل کے لئے 29 مئی 2015ء کی تاریخ مقرر کی۔

منصوبے کے تحت 29 مئی کو دوپہر کے وقت حمزہ اپنے ساتھیوں کو لے کر زارش کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ حمزہ آڑ میں کھڑا ہو گیا، آصف نے ڈور بیل بجائی تو عائشہ نے دروازہ کھولا۔ زارش کے بارے میں پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بازار گئی ہے۔ آصف نے عائشہ سے یہ کہہ کر کہ تمہارے گھر کے اندر کوئی الیکٹرک وائر خراب ہے، اسے درست کرنے کے لئے تمہاری ماں نے فون کر کے ہمیں بلایا ہے۔ اندر داخل ہونے کی اجازت لے لی۔

جونہی عائشہ اندر پہنچی حمزہ نے آڑ سے نکل کر ہاتھوں میں لئے ہتھوڑے سے اس کے سر پر مہلک وار کر دیا۔ عائشہ کا سر پھٹ گیا، خون کی دھار بہہ نکلی۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی اور وہ زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگی۔ اس کے گرنے اور چیخنے کی آوازیں سن کر بیڈ روم میں پڑھ رہی ارم باہر آئی تو حمزہ نے ہتھوڑے سے اس کا سر بھی ناریل کی طرح پھوڑ دیا۔ اس کے باوجود ان لوگوں کو تسلی نہیں ہوئی تو دونوں کا گلا گھونٹ دیا اور زارش کا انتظار کرنے لگے۔

تقریباً 22 منٹ بعد زارش واپس آئی تو اس کا سر بھی تربوز کی طرح پھوڑ دیا۔ اس کے بعد ان چاروں نے فلیٹ کی تلاشی لی اور نقدی، گہنے، اے ٹی ایم کارڈ وغیرہ کی شکل میں جو ملا اپنے قبضے میں کر لیا۔ شام کو حمزہ وغیرہ بازار سے دو بڑے صندوق، دو بلیک پولی تھین شیٹ خرید لائے۔ کالی پولی تھین میں زارش کی لاش لپیٹ کر ایک صندوق میں رکھی اور باقی دو لاشیں دوسرے صندوق میں۔ 30 مئی کو علی الصبح وہ لوگ قصور روڈ حمزہ سٹور لے گئے تھے۔ گڑھے پہلے ہی کھدے ہوئے تھے، اس لئے انہوں نے ٹرنک سمیت لاشیں ان میں دفنا دی تھیں۔ اس کے بعد گڑھوں کو مٹی سے پاٹ دیا گیا تھا اور پکا کر دیا تھا۔

پولیس کی تفتیش میں یہ راز بھی کھلا کہ جب لاشیں دفنائی جا رہی تھیں تب عبداللہ نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ چالیس سالہ عبداللہ باغ جنگ کا رہائشی تھا۔ اس کے خلاف پولیس میں چھ مجرمانہ معاملے درج تھے۔ عبداللہ نے پولیس کا خوف دلا کر ان سے دس ہزار روپے نقد وصول کر لئے تھے۔ 10 جون کو گرفتار ملزموں کی نشاندہی پر پولیس نے زمین میں دفن زارش، عائشہ اور ارم کی لاشیں برآمد کر لیں۔ 12 جون کو عبداللہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ حمزہ کی نشاندہی پر گندے نالے سے قتل میں استعمال ہونے والا ہتھوڑا اور گھر سے لوٹا ہوا کچھ سامان بھی برآمد کر لیا گیا تھا۔ تادم تحریر تمام ملزمان ڈسٹرکٹ جیل میں بند تھے۔

زندگی جنہیں خوشی نہیں دیتی انہیں تجربہ ضرور دیتی ہے۔

لاہور کا پُل صراط

لاہور کے مینار اور برج اسی شان سے کھڑے تھے جس شان سے 5 ستمبر 1965ء کی شام کھڑے تھے۔ جم خانہ کلب کی عمارت باغ جناح کی ہریالی میں کھڑی مسکرا رہی تھی اور جنرل چوہدری دلی میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔

☆ ملک محمد ساجد گل

بھارتی بھارتی جرنیل بی ایم کول اپنی کتاب "The Untold Story" (ان کہی کہانی) میں لکھتا ہے۔ 1962ء کے بعد (چین سے شکست کھا کر) بھارتی فوج کی نفری اور قوت دگنی اور جنگی بجٹ تین سو کروڑ سے نو سو کروڑ روپے کر دیا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ایک ہی حملے میں پاکستان کو فتح کر لیا جائے۔

مگر پاک فوج نے دشمن کی عددی برتری اور ہتھیاروں کی افراط کا جواب جذبہ جہاد اور جواں مردی سے دیا اور ہر محاذ پر دشمن کو دندان شکن جواب دیا۔ جنگِ ستمبر کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا جائے تو پوری کتاب کی ضرورت ہو گی۔ میں یہاں صرف ایک محاذ کا ذکر رہا ہوں جو ولولہ انگیز بھی ہے اور ایمان افروز بھی۔

یہ لاہور کا محاذ ہے۔ بھارتی کمانڈروں نے اعلان کر دیا تھا کہ ہم لاہور لینے کے لئے 80 فیصد نفری مروا دیں گے۔

6 ستمبر 1965ء کی سحر کی تاریکی میں بھارت نے اعلان جنگ کے بغیر پاکستان پر حملہ کر دیا۔ اس کا بڑا حملہ لاہور پر تھا جو سہ طرفی تھا۔ باٹا پور، بھینی اور برکی پر حملہ تین ڈویژنوں سے کیا گیا۔ باٹا پور اور بھینی پر نمبر پندرہ انفنٹری ڈویژن سے اور برکی پر نمبر سات انفنٹری ڈویژن سے۔ انہیں کمک اور دیگر مدد دینے کے لئے نمبر 23 ماؤنٹین ڈویژن ساتھ تھا اور ایک نامعلوم ڈویژن امرتسر کے گرد و نواح میں پا بہ رکاب تھا۔ ان کے ساتھ ایک ایک اضافی ٹینک رجمنٹ اور عقب میں اور کا توپخانہ تھا جو حملے کے وقت خاموش تھا کیونکہ بھارتی کمانڈروں کو جانے کس نے یقین دلا رکھا تھا کہ وہ توپخانے کا ایمونیشن ضائع کئے بغیر لاہور میں داخل ہو جائیں گے۔

اس بے پناہ لشکر کو روکنے کے لئے جنرل سرفراز خان کا صرف ایک ڈویژن تھا۔ تین سو توپوں کے مقابلے میں صرف ایک سو تو بیں تھیں۔ ادھر تین جرنیل، ادھر صرف ایک جرنیل۔ ادھر نو بریگیڈیئر ادھر صرف تین بریگیڈیئر۔ بریگیڈیئر آفتاب احمد خان، بریگیڈیئر قیوم شیر اور بریگیڈیئر اصغر۔ دو روز بعد بھارت نے اپنا نامور چھاتہ بردار بریگیڈیئر نمبر پچاس بھی واہگہ کے میدان میں اتار دیا تھا۔ اس طرح حملہ آور لشکر کی نفری، صرف پیادہ

پینتیس ہزار اور ہماری صرف پانچ ہزار تھی۔ اس میں دشمن کی ٹینک رجمنٹوں کی نفری شامل نہیں۔

اس کے ساتھ ہی دشمن جنگ کو وزیر آباد تک لے گیا جہاں اس کے طیاروں نے دھونکل، گکھڑ اور راہوالی کے ریلوے سٹیشنوں پر کھڑی گاڑیوں پر راکٹ اور بم برسائیں ان میں ایک مسافر گاڑی تھی جس میں متعدد پاکستانی شہید اور شدید زخمی ہوئے۔ شہید ہونے والوں میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ محمد بن قاسم کو بھی ایک مسلمان لڑکی نے پکارا تھا جسے اسی ہندو نے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ آج ہندو نے اپنی تاریخ کو دہرایا اور ایک اور مسلمان لڑکی کے خون نے قوم کو پکارا۔

محمد بن قاسم پاک فضائیہ کے شاہبازوں، فلائٹ لیفٹیننٹ آفتاب عالم جان اور فلائٹ لیفٹیننٹ امجد خان کے روپ میں فضا میں موجود تھا۔ یہ دونوں شاہباز چھمب جوڑیاں کی طرف جا رہے تھے کہ انہیں وائرلیس پر کہا گیا کہ راہوالی پر آ جاؤ۔ وہ آئے تو انہیں اپنے نیچے چار مسٹیئر طیارے گاڑیوں پر جھپٹتے نظر آئے۔ آفتاب عالم خان نے اٹھائیس ہزار فٹ کی بلندی سے غوطہ لگایا اور ایک مسٹیئر کو فضا میں بھسم کر دیا۔ باقی تین تتر بتر ہو کر ہاتھ سے نکل گئے۔

بھارتی کمانڈر انچیف جنرل چوہدری نے نو بجے لاہور کے جم خانہ کلب میں جشن فتح منانے کا اعلان کر دیا۔

سرحدی چوکیوں پر رینجروں نے چھوٹے ہتھیاروں سے مقابلہ کیا۔ کوئی شہید ہوئے، بعض پیچھے آ گئے اور کچھ قید ہو گئے۔ آگے جنرل سرفراز خان کے ڈویژن کی پلٹنوں کی کمپنیاں نہر سے آگے تھیں جنہوں نے پوری کی پوری پلٹن کا مقابلہ کیا۔ وہ فی الواقع آخری گولی اور آخری سپاہی تک لڑے۔ دشمن کا دباؤ بے پناہ تھا۔ وہ ڈوگرئی تک آن پہنچا۔ سرحدی دیہات کے بچے، بوڑھے اور عورتیں کچلی گئیں جو نکل سکے نکل آئے۔

اپنے توپخانے نے ٹارگیٹ پہلے سے رجسٹر کئے ہوئے تھے۔ کرنل امداد علی ملک اور کرنل گلزار احمد کے توپخانوں نے قیامت بپا کر دی۔ پیادہ پلٹنوں کے افسروں اور جوانوں نے خطرناک حد تک قلیل تعداد کے باوجود جم کر مقابلہ کیا۔ سورج نکلتے ہی پاک فضائیہ کی مدد مانگی گئی۔ شاہبازوں نے ڈوگرئی سے اٹاری تک اور راوی سائفن سے ہڈیارہ تک نہایت دلیرانہ حملے کئے۔ اس طرح توپخانے، ٹینکوں اور پیادہ جوانوں اور پاک فضائیہ نے حملے کا دم خم توڑ دیا اور بھارتی حکمرانوں کو ذہن نشین کرا دیا کہ لاہور میں داخل ہونے کے لئے انہیں کم از کم یہ تین ڈویژن مروانے پڑیں گے۔

بھارتی کمانڈروں نے اعلان کر دیا۔

''ہم لاہور لینے کے لئے اسی فیصد نفری مروا دیں گے۔''

جنرل سرفراز خان نے ''آرڈر آف دی ڈے'' دیا۔

''پاکستان کے جوانو! آخری سپاہی تک، آخری گولی تک لڑو، سنگینوں سے، خالی ہاتھوں سے ناخنوں سے لڑو۔ اپنے وطن کا ایک انچ بھی دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔''

باٹاپور کا پل دشمن کے فائر کی زد میں ہونے کی وجہ سے اس کے قبضے میں تھا مگر یہ پل اس کے لئے پل صراط بن گیا اور یہی پل جنرل سرفراز خان، بریگیڈیئر آفتاب احمد خان اور بلوچ رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل تجمل حسین کے لئے جنگ کا انتہائی نازک مسئلہ بن گیا۔ انجینئرز کے جوانوں نے شہید اور زخمی ہو کر پل میں ڈائنامیٹ لگایا مگر پل نہ اڑا۔ آخر 6/7 ستمبر کی رات پل مکمل طور پر اڑ گیا۔

6 تاریخ نو بجے لاہور میں جشن فتح منانے والے 7 ستمبر نو بجے بھی وہیں تھے جہاں ان سے پہلا تصادم ہوا

تھا۔ میدان کا جوش و خروش اور زیادہ بڑھ گیا تھا مگر ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ لاہور محفوظ ہے کیونکہ دشمن تازہ دم پلٹنوں اور ٹینکوں سے حملے پہ حملہ کر رہا تھا۔

7 ستمبر کا دن اور ساری رات بھارتی توپخانہ بے دریغ آگ اگلتا رہا۔ پاک فضائیہ مدد کو آتی رہی اور بری جوان دشمن کو بڑی ہی جانبازی سے روکے ہوئے تھے۔

7 ستمبر رات کے وقت دشمن کے حملوں کی شدت میں کمی محسوس کی گئی اور اس کے وائرلیس پر پیغامات جو ہمارے وائرلیس سیٹوں پر بھی سنے گئے، صاف بتا رہے تھے کہ بھارتیوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے اور اب وہ مرے ہوئے سپاہیوں کی کمی کو کمک کے ذریعے پورا کر رہے ہیں۔ جنرل سرفراز خان نے اس موقعے سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اس ارادے سے کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے۔ اپنے محفوظہ (Strike Froce) کو دشمن پر جوابی حملے کا حکم دیا۔ اس فورس کے کمانڈر بریگیڈیئر قیوم شیر تھے۔ یہ فیصلہ انتہائی دلیرانہ تھا کیونکہ محفوظہ کی نفری اور قوت خطرناک حد تک کم تھی۔

8 ستمبر کی سحر کی تاریکی میں ہمارے مختصر سے دستے نہر پار کر گئے۔ چند ایک ٹینک ساتھ تھے۔ بریگیڈیئر قیوم شیر نے بھینی کی طرف سے واہگہ کی سمت حملہ کیا اور بریگیڈیئر آفتاب احمد نے اس مقام سے شمال کی طرف رانی، طوطلی اور شمشیر پوسٹوں کی طرف پیشقدمی کی جو اس قدر تیز اور شدید تھی کہ دشمن سرحدوں سے دور پیچھے ہٹ گیا۔ اس حملے میں بھارت کے پندرہویں ڈویژن کا کمانڈر جنرل نرنجن پرشاد اپنے ہیڈ کوارٹر کی چار جیپیں بمع جنگی دستاویزات بھسین کے قریب چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اس حملے سے یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ بی آر بی سے آگے مورچے قائم کر لئے گئے۔ دشمن اب سرحد سے باہر تھا اور ڈوگرئی جیسا اہم گاؤں ہمارے جان بازوں کے قبضے میں تھا۔ ایک دفاعی مورچہ اس گاؤں سے ڈیڑھ میل آگے قائم کر دیا گیا جس پر دشمن نے فائر بندی تک چھبیس بڑے حملے کئے۔ اسی طرح بھسین کے قریب بھی اپنا ایک مورچہ تھا جسے دشمن نے اکھاڑنے کے لئے پوری پوری پلٹنوں اور ٹینکوں سے حملے کئے مگر ناکام رہا۔ ان دونوں اگلے مورچوں میں شجاعت اور جذبۂ حب الوطنی کے جو مظاہرے ہوئے ان کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ خصوصاً ڈوگرئی کے اگلے مورچوں نے تو خود پاکستانیوں کو محوِ حیرت کر دیا۔

20 ستمبر جب اقوام متحدہ میں فائر بندی کا معاہدہ طے ہو گیا تو بھارت نے فائر بندی سے پہلے پہلے بی آر بی پار کر کے لاہور کے کسی بھی حصے پر قبضہ کرنے کی خاطر کور آرٹلری کی گولہ باری شروع کر دی اور تازہ دم بریگیڈوں سے حملے پہ حملہ شروع کر دیا۔ یہ شدت فائر بندی کے پندرہ منٹ بعد تک رہی۔

23 ستمبر کی سحر پورے تین بجے یعنی جب فائر بندی ہو جانی چاہئے تھی، بھارتیوں نے باٹاپور سے مایوس ہو کر ساڑھے چار میل شمال میں بھینی کے مقام پر دو پلٹنوں سے حملہ کر دیا اور ان پلٹنوں کو آگے بڑھانے کے لئے دشمن نے جو گولہ باری کی وہ جنگ کی شدید ترین گولہ باری تھی لیکن پاکستانیوں نے اس حملے کو پندرہ منٹ میں پسپا کر دیا اور فائر بندی سوا تین بجے، طے شدہ وقت سے پندرہ منٹ بعد ہوئی۔

جب 23 ستمبر کی صبح کا اجالا ابھرا تو میدانِ جنگ کی کیفیت بھیانک اور ہولناک تھی۔ بھارتی افسروں اور سپاہیوں کی لاشیں ایک دوسری کے اوپر پڑی تھیں۔ ان میں پہلے معرکوں کی لاشیں بھی تھیں۔ دشمن کے ٹینک اور ٹرک جل رہے تھے۔ بھارتی توپخانے کی آخری گولہ باری کا دھواں سیاہ گھٹا کی صورت آہستہ آہستہ بھارت کی سمت اڑا جا رہا تھا جیسے بھارتی حکمرانوں کے عزائم کی ارتھی مرگھٹ کو جا رہی ہو۔ لاہور کے مینار اور برج اسی

شان سے کھڑے تھے جس شان سے 5 ستمبر 1965ء کی شام کھڑے تھے۔ جم خانہ کلب کی عمارت باغ جناح کی ہریالی میں کھڑی مسکرا رہی تھی اور جنرل چوہدری دلی میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔

جس وقت بھارتی فوج لاہور کے محاذ پر پاک فوج کے قہر وغضب کا شکار ہو رہی تھی اس وقت دلی میں ہندو سکھ سڑکوں پر بھنگڑے ڈال رہے تھے۔ چاندنی چوک دلی کا ایک ہندو دکاندار جو لاہور سے ہجرت کر کے انڈیا گیا تھا، اس نے یہ سب دیکھ کر کہا۔ ''یہ لوگ پاگل ہیں جو لاہور کو فتح کرنے کی خوشیاں منا رہے ہیں۔ میں لاہور کا رہنے والا ہوں اس لئے لاہوری مسلمانوں کو جانتا ہوں...... میری یہ بات لکھ لیں کہ ہندو لاہور کو فتح نہیں کر سکتے۔ اگر پاکستانی فوج پیچھے ہٹ بھی گئی تو لاہوری پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ وہ ایسے منچلے لوگ ہیں کہ اگر ہندو نے لاہور لے بھی لیا تو وہ لاہور نہیں ہوگا، خاک کا ڈھیر ہو گا''۔

کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ ''لاہور...... لاہور اے!''

برکی کے میدان میں دشمن کا جو حشر ہوا وہ اس سے بھی بدتر تھا۔

برکی - لاہور کا دوسرا دروازہ

لاہور میں داخل ہونے کے لئے انڈین آرمی کے ساتویں انفنٹری ڈویژن نے 6 ستمبر کی صبح ہڈیارہ کی سمت سے حملہ کیا۔ وہاں سے سڑک سیدھی لاہور چھاؤنی میں آتی ہے۔ اس ڈویژن کا کمانڈر جنرل سیبل اور ہراول کے بریگیڈ کا کمانڈر بریگیڈیئر پیارا سنگھ تھا۔ ان کے مقابلے کے لئے بریگیڈیئر پیارا سنگھ تھا۔ ان کے مقابلے کے لئے بریگیڈیئر اصغر تھا جس کے پاس صرف دو پلٹنیں تھیں۔ اس تناسب کو خاص طور پر پیش نظر رکھئے کہ بھارتی ڈویژن میں نو پلٹنیں تھیں۔ ہر ایک کی نفری کم از کم ایک ہزار اور زیادہ سے زیادہ بارہ سو تھی۔ اس کے برعکس ہماری پلٹن کی نفری ساڑھے چھ سو سے ساڑھے سات سو تک تھی۔ یعنی جس علاقے پر دس ہزار پیادہ سپاہی حملہ کر رہے تھے اس کا دفاع صرف ڈیڑھ ہزار جوان کر رہے تھے۔

بھارتی بریگیڈ گھونڈی اور ہڈیارہ میں داخل ہوا اور دیہاتیوں پر ظلم وتشدد اور عورتوں پر دست درازیاں کرنے لگا۔

بھارت کا ساتواں انفنٹری ڈویژن تو ہڈیارہ نالے تک بھی نہ پہنچ سکا۔ وہ بھی صرف ایک بریگیڈ تھا جو ہڈیارہ نالے تک پہنچا تھا جہاں میجر شفقت بلوچ کی کمپنی نے اسے روک لیا تھا۔ پیچھے آنے والے بریگیڈ ابھی سرحد سے پرے چھوٹی نہر سے بھی پرے تھے۔ اس نہر کے پل سے ان کے ٹرک گزر رہے تھے۔ کرنل محمد نواز سیال کے توپخانے نے یہ ٹارگیٹ رجسٹر کر رکھا تھا۔ ہماری اگلی توپوں نے گولہ باری شروع کر دی جو پل پر سے گزرتے ٹرکوں پر پڑی۔ ان ٹرکوں میں ایمونیشن تھا جو پھٹنے لگا اور ٹرک جلنے لگے۔ اس طرح پل بند ہو گیا اور پندرہویں ڈویژن کے باقی بریگیڈ دور رک گئے۔ بریگیڈیئر پیارا سنگھ کا بریگیڈ ہی نکل آیا تھا جو ہڈیارہ نالے پر رک گیا۔ نالے کا پل اڑا دیا گیا مگر نالے پر چھوٹے چھوٹے دو تین اور پل بھی تھے جو اڑائے نہ جا سکے۔ ان کی حفاظت کے لئے فرنٹیئر فورس کی آر آر جیپیں اور مشین گنیں پوزیشن میں چلی گئیں۔

دشمن نے نالے کو کئی جگہوں سے عبور کرنے کی کوشش کی لیکن اپنے توپخانے نے اسے نالے کے قریب نہ آنے دیا۔ ''او پی'' ہر جگہ موجود تھے۔ دوپہر کے بعد میجر شفقت بلوچ کی کمپنی کو بحفاظت پیچھے ہٹا لیا گیا۔ اب ہڈیارہ سے برکی تک اپنا کوئی دستہ نہیں تھا نہ کوئی مورچہ۔ دشمن کے سامنے میز کی طرح کھلا میدان تھا مگر وہ

نالہ عبور کرنے کی بھی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے توپخانے نے بہت آگ اگلی اور مسلسل اگلی مگر پاکستانی توپخانے کی جوابی گولہ باری Counter Bombardment نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ دشمن نے بذیارہ نالے کے پل پر جب بھی عارضی پل ڈالنے کی کوشش کی اس پر گولہ باری کی گئی اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔

برکی کا دروازہ تو دشمن کے لیے 6 ستمبر کے روز ہی بند ہو گیا تھا لیکن بھارتی ڈویژن کمانڈر کے لئے مشکل یہ تھی کہ اسے واہگہ والے ڈویژن سے لاہور میں جا ملنا تھا۔ اس لئے اسے بہرصورت آگے آنا تھا۔ 10 ستمبر تک ایک بریگیڈ بصد مشکل بذیارہ نالہ عبور کر سکا لیکن توپخانے کی گولہ باری سے اسے اس طرح بکھیر دیا گیا تھا کہ یہ بریگیڈ ساری قوت مرکوز کر کے حملہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ برکی کا چوبارہ توپ خانے کی ایک ایسی ابزرویشن پوسٹ (او پی) تھی جہاں سے دور دور تک دشمن کی نقل و حرکت نظر آتی تھی۔ جہاں کہیں وہ گولہ بارود یا پٹرول جمع کرتا تھا وہیں ہمارے توپخانے کے گولے جا گرتے تھے۔ برکی کے علاوہ اور کئی جگہوں پر توپ خانے کے 'او پی' بیٹھے ہوئے تھے جو دشمن کو سر نہیں اٹھانے دے رہے تھے۔ اس دوران اس کے ٹینکوں اور پیادہ دستوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر ہماری پیادہ کمپنیوں نے اس کا ہر حملہ پسپا کر دیا۔

10 ستمبر کی رات اسے تازہ دم کمک مل گئی جس سے اس نے برکی پر بھرپور حملہ کر دیا۔ یہ برکی کا پہلا اور آخری معرکہ تھا۔ دشمن کے ٹینک اور پیادہ دستے برکی کے اندر آ گئے۔ میجر عزیز بھٹی شہید اور توپخانے کے صوبیدار شیر دل نے چوبارے سے اپنے توپخانے کی راہنمائی کر کے برکی کے سکول کی گراؤنڈ، سڑک اور برکی کے آگے اس قدر گولہ باری کرائی کہ دشمن کی ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر مارا گیا اور جو پیادہ دستوں کا حال ہوا وہ برکی کی گلیوں سڑک اور میدان میں دوسرے دن نظر آ رہا تھا۔ جلتے ہوئے ٹینکوں اور ٹرکوں نے سپاہیوں کے لئے پیچھے کو بھاگنے کی راہ روک لی تھی۔ سپاہی زندہ جل رہے تھے۔

معرکہ اس قدر شدید اور خونریز تھا کہ گماں ہوتا تھا کہ دشمن نہر پار کر لے گا لیکن ہماری کمپنیوں نے بی آر بی سے آگے والی پوزیشنیں نہ چھوڑیں اور توپخانہ آگ اگلتا رہا اور یہ جذبہ نہیں حریت کا جنون تھا کہ ہمارے جانبازوں نے دشمن کو برکی سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ دوسری صبح برکی گاؤں میں لاشیں ہی لاشیں تھیں اور دشمن گاؤں سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس رات برکی میں شجاعت کے جوہر ان کن مظاہرے ہوئے۔

اس کے بعد دشمن برکی کے قریب نہ آیا۔ اس کا صرف توپخانہ گولہ باری کرتا رہا جس کی نوعیت دفاعی تھی۔ دشمن برکی سے دستبردار ہو چکا تھا اور اب بھارت کا یہ ڈویژن واہگہ والے ڈویژن کو کمک دے رہا تھا۔

لاہور سیکٹر کے دو گاؤں ڈوگرئی اور برکی کو دشمن نے اپنے ریڈیو سے خوب اچھالا ہے۔ دونوں کے متعلق آل انڈیا ریڈیو نے فیچر تیار کیے ہوئے تھے جنہیں وہ اپنے مختلف سٹیشنوں سے نشر کرتا رہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دو مقامات پر بھارتیوں نے سب سے زیادہ سپاہی اور جنگی سامان ضائع کیا ہے۔ بھارت میں برکی کے متعلق جو خبریں چھپتی رہی ہیں اور اب تک بھارت میں جنگ ستمبر کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں برکی کو قلعہ بند گاؤں Portified Village of Burki لکھا ہے۔ اب بھی جا کر دیکھئے۔ برکی میدان میں ایک ایسا گاؤں ہے جس کے اردگرد کسی ندی نالے کی قدرتی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔

◆✱◆

تلخیص

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

بنگل گیٹ - 1

قسط 17 ☆ ---------------- 0300-4154083 ---------------- میاں محمد ابراہیم طاہر

جمعرات 16 جنوری 1988ء کی صبح کی اولیں کرنیں جلوہ افروز ہو رہی تھیں کہ ایک سرکاری گاڑی اس سفید گھر سے برآمد ہوئی جو یروشلم کے نواح میں، اسرائیل اور اردن کی سرحد پر برقی رو والی باڑ کے قریب واقع تھا۔ اسرائیل کی ٹیڑھی میڑھی مختصر تاریخ میں یہی وہ فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے اپنی موثر جاسوسی کا نظام قائم کرنے کے لئے منصوبہ بندی کی تھی۔ اب اس گھر سے موساد کا نیا سربراہ ڈینی یاطوم (Danny Yatom) اپنے کیریئر کے ایک اہم ترین آپریشن کی نوک پلک سنوارنے کے لئے موساد کے ہیڈ کوارٹرز کی طرف جا رہا تھا۔

جولائی 1997ء میں، سات ماہ قبل امان (اردن) کی گلیوں اور سڑکوں پر موساد کی قاتلوں کی ٹیم جو حماس کے رہنما خالد مشعال کو ہلاک کرنے میں ناکام رہی تھی اور موساد کے کارندے پکڑے گئے تھے، اس کی بدنامی، ناکامی اور شرمندگی نے یاطوم کی زندگی سولی پر لٹکا رکھی تھی اور وہ اب کوئی ایسا ناکامی کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا جس سے اس کا مستقبل تباہی سے دوچار ہو۔

وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو (Benyamin

Netanyahu) نے ہی اسے موساد کا ڈائریکٹر جنرل بنایا تھا اور اس کے آپریشن کی ناکامی کی وجہ سے وہی اب اس سے بیزار اور جان چھڑانا چاہتا تھا۔ یا تو ان دونوں شخصیات، نیتن یاہو اور یاطوم کے درمیان گہری دوستی تھی، یا اب کوئی دن نہیں جاتا تھا کہ وزیراعظم کے دفتر میں بلا کر موساد کے سربراہ کی کھینچائی نہ کی جاتی ہو۔ اس کے اپنے دفتر کے ساتھی بھی اس کے خلاف کانا پھوسی میں مصروف رہنے لگے تھے اور توقع کر رہے تھے کہ وزیراعظم کی طرف سے کسی لمحے بھی اس کی برخاستگی کے احکام آسکتے تھے۔ ماضی میں اس نے کئی کامیاب خفیہ آپریشن کیے تھے جن کا کسی کو علم نہ تھا۔

''یہ صرف ناکامی ہوتی ہے جس کی تشہیر کی جاتی ہے اور ناکامیوں کا سارا ملبہ میرے دروازے پر ڈال دیا جاتا ہے''۔ وہ اپنے دوستوں کو بتاتا تھا۔

اس کے دوستوں اور گھر کے افراد نے بھی مایوسی کے اثرات کو اس کے چہرے سے بھانپ لیا تھا۔ بے خوابی، اچانک اور بغیر وجہ کے اشتعال میں آ جانا، تنہائی اور خاموشی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ انتہائی مایوسی کی حالت سے دوچار تھا۔

اسے موساد کا سربراہ بنے دو سال بیت گئے تھے اور اس دوران اس پر اتنا دباؤ آچکا تھا کہ اس کے پیشروؤں پر کبھی نہیں آیا ہوگا۔ اس کے نتیجے میں اس کے اپنے سٹاف کا مورال بھی گر چکا تھا اور خود اسے ان کی وفاداری پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ میڈیا بھی اس کی کمزوریوں کا اندازہ لگا کر اپنا گھیرا تنگ کر رہا تھا لیکن فی الحال خاموش تھا۔ نیتن یاہو نے اس کے ساتھ سرد مہری کے رویے سے اس سے مزید دوری اختیار کر لی تھی۔

فروری کی اس سرد صبح کو یاطوم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ اس کا یہ آپریشن جس کی اس نے گزشتہ ہفتے منصوبہ بندی کی تھی، کامیابی سے ہمکنار ہو۔ اس سے وزیراعظم پر ثابت ہو جائے گا کہ اس کے سپائی ماسٹر کا فن اور تجربہ ابھی مرا نہیں تھا لیکن اس کے چہرے سے اس کے اندرونی جذبات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اب تک اس نے جو کچھ بھگتا تھا اسے اس نے دل کے تہہ خانے میں چھپا رکھا تھا۔

پیجو کاری کی پچھلی سیٹ کے ایک گدے میں دھنسا ہوا یاطوم کالے رنگ کے چمڑے کی بمبر جیکٹ کھلے گلے کی قمیص اور گرے رنگ کی پینٹ میں ملبوس حقیقتاً گھبراہٹ کا شکار نظر آتا تھا۔ وہ اپنے دفتری امور کی انجام دہی کے دوران اسی قسم کا لباس پہننے کا عادی تھا۔ کپڑوں کے معاملے میں وہ بالکل لاپرواہ تھا۔

اس کے سر کے جھڑے ہوئے بال، سٹیل فریم کا چشمہ اور پتلے ہونٹ اس کے عرف نام پروشین (Prussian) سے بڑی مناسبت رکھتے تھے۔ اس کو پتہ تھا کہ وہ اس وقت بھی خوف کی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس کے ساتھ اس کی سیٹ پر اس روز کے اخبارات پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی اخبار میں بھی اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیشگوئی موجود نہ تھی۔

پیجو کار نے پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے تل ابیب جانے والی شاہراہ کو اپنا لیا۔ سورج کار کی باڈی پر لشکارے مار رہا تھا کیونکہ ڈرائیور پالش سے اسے شیشے کی طرح چمکائے رکھتا تھا۔ پیجو کار کی کھڑکیاں بلٹ پروف، بم پروف باڈی اور ہارڈ دی سرنگ پروف فرش تھا۔ ایسی سرکاری حفاظتی کار صرف ایک اور تھی، جو وزیراعظم کے زیر استعمال تھی۔

وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو نے شہتائی شاوت کے رخصت ہوتے ہی چند منٹوں کے اندر اندر یاطوم کو ڈائریکٹر جنرل موساد کی حیثیت سے کنفرم کر دیا تھا۔ موساد کے نئے سربراہ کے طور پر یاطوم پہلے چند ہفتوں کے دوران اپنا اختتام ہفتہ کا وقت وزیراعظم نیتن یاہو کے

اور ایک دفعہ پھر وہ آگ بھڑک اٹھی تھی، جسے منتہائی شاوت نے جان بوجھ کر مدہم کیا ہوا تھا۔

امن کے آثار سامنے نہیں آ رہے تھے حالانکہ اوسلو معاہدے کے تحت فلسطینیوں کو غزا، کی پٹی اور مغربی کنارے کے علاقوں میں اپنا وطن قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ یاطوم نے یاسر عرفات کی جاسوسی کے لئے عرب ایجنٹوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اس نے موساد کے کمپیوٹر پروگرامرز کو حکم دیا تھا کہ پی ایل او کو ہیک (Hack) کرنے کے لئے نیا سافٹ ویئر ایجاد کریں اور ایسے الیکٹرانک مائیکروب (Microbes) تیار کریں جو ضرورت پڑنے پر ان کے کمیونیکیشن سسٹم کو تباہ کر سکیں۔ اس نے اپنے سائنسدانوں اور ریسرچ کے شعبے کے ماہرین کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ ایسی جدید ترین ٹیکنالوجی ایجاد کریں جس کے ذریعے دشمن کے نشریاتی ذرائع میں اپنا گندا پروپیگنڈہ میٹریل سرایت کیا جا سکے۔ اس کی خواہش تھی کہ موساد کو ایک ایسی عظیم الشان جنگی مشین بنا دیا جائے جس کے جنگی ہتھیار کمپیوٹر کے کی بورڈ میں ہوں جو جب چاہے دشمن کی نقل و حمل کی صلاحیت کو مفلوج بنا سکے۔

یاطوم موساد کی پرانی آزمودہ سرزمین، افریقہ بھی واپس آ گیا۔ مئی 1997ء میں اس کی ایجنسی نے زائرے کے صدر موبوتو (Mobutu) کے خلاف ایسی خفیہ امداد اس کے مخالفین کو فراہم کی کہ وہ سینٹرل افریقہ میں عرصہ دراز سے اقتدار پر بیٹھے ہوئے موبوتو کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گئے۔ موساد نے نیلسن منڈیلا کی خفیہ تنظیم سے بھی رابطے بڑھائے جہاں وہ گورے انتہا پسندوں کے خلاف کامیاب آپریشن کرنے کے قابل ہو سکے۔ قبل ازیں انہی گوروں کے موساد نے رابطے بڑھائے ہوئے تھے۔ یاطوم نے موساد کے اسپیشل یونٹ اے ون (A1) کے بجٹ اور طاقت میں بھی اضافہ کر دیا۔ یہ یونٹ امریکہ سے تازہ ترین سائنسی اور تکنیکی معلومات چرا کر لانے کا ذمہ دار تھا۔

51 سال کی عمر میں ذہنی یاطوم میں ایسی تبدیلیاں آنی شروع ہو گئی تھیں جن سے بچنا ممکن نہ تھا۔ وہ ایک انتھک، محنتی اور بے رحم اور سنگدل سٹریٹ فائٹر کی شہرت رکھتا تھا۔ اس میں تبدیلی کی علامت اس کے اس جواب سے ظاہر ہوئی جب ایف بی آئی کی طرف سے جنوری 1997ء میں کلنٹن انتظامیہ کے اندر چھپے ہوئے میگا نامی موساد کے اہم ایجنٹ کا سراغ لگایا گیا۔ اس نے سروسز کے سربراہوں کی کمیٹی کو، جس کا کام کسی آپریشن کا ناکامی کی صورت میں اپنے بچاؤ کے لئے دلائل تیار کرنا تھا، بتایا تھا کہ امریکہ میں یہودیوں کی طاقتور لابی کو متحرک کر کے امریکن انتظامیہ پر دباؤ ڈالے کہ عرب ملکوں کے اس مطالبے پر کان نہ دھرے جائیں کہ ایف بی آئی جس طریقے سے دوسرے جاسوسوں کے خلاف کارروائیاں کیا کرتی ہے میگا کے معاملے میں "مٹی پاؤ" کی پالیسی اختیار کی جائے۔ نتیجتاً وائٹ ہاؤس میں کھانے کی میز پر مہمان بننے والے یہودی، ہالی وڈ کے فلم سٹارز، قانون دان، صحافی اور اخبارات کے یہودی ایڈیٹر حرکت میں آ گئے اور یہ سرگوشیاں ہونے لگیں کہ بات انتظامیہ کے لئے بڑی خجالت اور شرمندگی کا باعث ہوگی کہ اس کی اپنی صفوں سے جاسوس تلاش کر کے پکڑا جائے۔ صدر کلنٹن کا عہدہ پہلے ہی کئی قسم کے سکینڈلوں کی زد میں تھا۔ یہ نیا سکینڈل اس کی صدارت کی کرسی کو ہلا کر رکھ دے گا۔ چھ ماہ بعد، 4 جولائی 1997ء کو یوم آزادی کے دن، یاطوم کو معلوم ہو گیا کہ ایف بی آئی نے خاموشی کے ساتھ میگا کی تلاش کے کام سے ہاتھ روک لیا تھا۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی عمان (اردن) کی سڑکوں اور گلیوں میں ہونے والے ایک واقعہ نے موساد کا بھیانک چہرہ بے نقاب کر دیا۔ پھر فوراً ہی بعد دمشق کے خفیہ ایجنٹ، جو

ساتھ گزارا کرتا تھا۔ وہ دونوں ٹھنڈی بیئر پیتے، زیتون کا پھل کھاتے ہوئے دنیا کو درست کرنے کی منصوبہ بندی کیا کرتے تھے۔ یاطوم وزیراعظم کو وہ وقت بھی یاد دلایا کرتا تھا جب وہ آئی ڈی ایف کمانڈو یونٹ میں بی بی کا کمانڈر ہوا کرتا تھا۔ (نیتن یاہو کا فوجی دوستوں میں عرفیت بی بی تھا)۔ پھر نیتن یاہو کو اسرائیل کا سفیر بنا کر اقوام متحدہ بھیج دیا گیا تھا۔ پھر گلف وار کے دوران وہ خود ساختہ ماہر بن کر بین الاقوامی دہشت گردی کے خلاف تجزیہ کاری کے طور پر میڈیا پر آنے لگا۔ وہ نشریات کے دوران بھی گیس ماسک پہنے رکھتا تھا کہ مبادا اسکڈ میزائل اس کے قریب آن گرے۔

جہاں تک یاطوم کا تعلق تھا، اس کے کہنے کے مطابق وہ، انٹیلی جنس کمیونٹی کے باہر کا بندہ ہو کر سب سے اہم عہدے پر فائز ہو کر بے حد خوش ہوا تھا۔ بطور تجربہ کار فوجی سپاہی وہ وزیراعظم یزہاک رابن کے دور میں اس کے ملٹری اتاشی کے طور پر کام کر چکا تھا۔ لوگ یاطوم اور نیتن یاہو کو ایک ایسی جوڑی سمجھتے تھے جن کی علیحدگی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا لیکن دو سانحات نے ان کے درمیان ناقابل عبور خلیج حائل کر دی۔ ایک تو امان کا آپریشن ناکام ہوا اس آپریشن کا حکم خود نیتن یاہو نے دیا تھا۔ جب قاتلانہ حملہ ناکام ہوا اور موساد کے قاتل گروپ کے کارندے دن دیہاڑے، دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کے سامنے پکڑے گئے تو وزیراعظم نے آپریشن کی ناکامی کا ذمہ دار یاطوم کو ٹھہرا دیا۔ اس نے تمام تر تنقید چپ چاپ برداشت کر لی لیکن علیحدگی میں دوستوں کو بتایا کہ نیتن یاہو میں یہ "جرأت" ہے اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرایا جائے۔

ایک دوسری اور سب سے بڑی ناکامی کی صورتِ حال اس طرح پیدا ہوگئی۔ اکتوبر 1997ء میں موساد کا ایک سینئر افسر یہودا گل (Yehuda Gil) گزشتہ 20 سال سے دمشق کے ایک خفیہ ایجنٹ کی جعلی ٹاپ سیکرٹ رپورٹس بناتا اور اس ایجنٹ کو ادائیگی کے لئے موساد کے سلش فنڈ سے بھاری رقوم نکلواتا رہا تھا حالانکہ دمشق میں کسی ایجنٹ کا وجود ہی نہ تھا اور یہ ساری رقم اس کی اپنی جیب میں جاتی رہی تھی۔ یہ سکینڈل اس طرح سامنے آیا کہ موساد کے ایک تجزیہ کار نے ایجنٹ کی تازہ ترین رپورٹ کا مطالعہ شروع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ شام عنقریب اسرائیل پر حملہ کرنے والا تھا۔ تجزیہ کار کو اس رپورٹ پر شک گزرا۔ گل کو یاطوم کے سامنے پوچھ گچھ کے لئے پیش کیا گیا اور اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔

نیتن یاہو پھٹ پڑا۔ وزیراعظم کے دفتر میں ایک طوفانی میٹنگ کے دوران یاطوم کو انتہائی بے رحمی سے رگیدا گیا اور تلخ و ترش سوالات پوچھے گئے، کہ وہ موساد کو کس طریقے سے چلا رہا تھا۔ نیتن یاہو نے اس دلیل کو بھی ماننے سے انکار کر دیا کہ گل پچھلے چار ڈائریکٹروں کی ناک کے نیچے اپنی ٹھگی کا کام جاری رکھے ہوئے تھا، یاطوم نے اسے پکڑا تھا لیکن نیتن یاہو مسلسل چیخ چلا رہا تھا۔ وزیراعظم کے دفتری سٹاف کے مطابق انہیں یاد نہیں کہ قبل ازیں اس قسم کا شور شرابہ اس دفتر میں ہوا ہو۔ اس میٹنگ کی تفصیلات ذرائع ابلاغ کو "لیک" کر دی گئیں جو یاطوم کے لئے مزید شرمندگی، مایوسی اور پریشانی کا باعث بنیں۔

یاطوم کے لئے دنیا کس قدر تبدیل ہو چکی تھی۔ جب اسے موساد کا سربراہ بنایا گیا تھا تو اس کا نام اور تصویر دنیا بھر کے میڈیا پر بریکنگ نیوز کے طور پر چمک رہا تھا۔ اخباری رپورٹر اس سے بات کرنے کے لئے کالیں کیا کرتے اور اس کی تعریفوں کے پُل باندھا کرتے تھے اور پیشینگوئیاں کیا کرتے تھے کہ یاطوم کا نام بھی عظیم سپائی ماسٹرز کی فہرست میں چمکے گا جیسے امیت، ہوفی اور ایڈمونی

بھی وہاں موجود تھا ہی کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس آپریشن کی کامیابی سے اسے اپنی شہرت کی بحالی اور موساد پر اپنی گرفت دوبارہ موقع مل سکے گا۔ لہٰذا جنوری 1998ء کی اس سرد صبح کو وہ اپنے دفتر کے راستے میں تھا۔ تاکہ اپنے آپریشن کی آخری دفعہ نوک پلک سنوار سکے۔

اس آپریشن کی منصوبہ بندی کا آغاز ایک ماہ پہلے کر دیا گیا تھا، جب ایک عرب مخبر نے جنوبی لبنان سے اطلاع بھیجی تھی اور اپنے کنٹرولر سے ملاقات کر کے اطلاع کی دوبارہ تصدیق کی تھی کہ عبداللہ زین مختصر دورے پر بیروت آیا تھا اور حزب اللہ کے رہنماؤں سے ملا تھا۔ پھر اسے اس کے والدین سے ملانے کے لئے جنوبی لبنان میں چھوٹے سے قصبے رومان لے جایا گیا تھا۔ اس موقع پر قصبے میں بڑی خوشی منائی گئی تھی۔ زین ایک قصبے میں نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے رشتہ داروں کو اپنی نوجوان خوبصورت اٹالین بیوی اور یورپ میں اپنے اپارٹمنٹ کی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔

کنٹرولر نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے اپنے مخبر کو جلد بات ختم کرنے کو نہیں کہا تھا۔ عرب روایت کے مطابق بات کرنے والا پوری جزئیات کے ساتھ بات سناتا تھا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح اگلے روز اپنے والدین کے گھر سے رخصت ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کئی عرب سوغاتیں، اس کی بیگم کے لئے تحائف اور کس طرح حزب اللہ نے اسے اپنی سوئٹزرلینڈ واپسی کی فلائٹ پکڑنے کے لئے سکیورٹی فراہم کی تھی اور بیروت ائرپورٹ پہنچایا تھا۔

''کیا یہ زین کی آخری منزل تھی؟'' کنٹرولر نے اپنے مخبر کی بات ختم ہونے پر سوال کیا۔

''یس، ہاں، برن جو سوئٹزرلینڈ میں واقع ہے''۔ مخبر نے جواب دیا۔

یہی جگہ تھی جہاں زین کی رہائش گاہ تھی لیکن مخبر کو حتمی یقین نہیں تھا۔

تاہم موساد کے لئے زین کے بارے میں یہ پہلی مثبت خبر تھی جو لبنان سے اس کے یورپ جا کر مالدار شیعہ مسلمانوں سے فنڈ اکٹھے کرنے اور حزب اللہ کو پہنچانے کے بارے میں ملی تھی۔

یورپ سے یہ رقوم اور ایرانی فنڈنگ، ایرانی سفارتخانہ واقع بون، جرمنی کے ذریعے حزب اللہ کو پہنچتی تھیں جس سے وہ اسرائیل کے خلاف مسلسل جنگ جاری رکھے ہوئے تھے۔ گزشتہ سال زین کے بارے میں مختلف جگہوں سے اس کی سرگرمیوں کی خبریں آتی رہی تھیں۔ کبھی وہ پیرس میں ہوتا تھا، کبھی میڈرڈ (سپین) اور برلن (جرمنی) میں اس کی موجودگی کی خبریں ملتی رہی تھیں لیکن جب بھی یاطوم نے خبر کی تصدیق کے لئے کسی کو وہاں بھیجا، دبلے پتلے 32 سالہ اٹالین کٹ سوٹ اور خصوصی برانڈ کے جوتوں کے رسیا زین کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

یاطوم نے برسل (بلجیم) سے اپنے ایک ایجنٹ کو برن بھجوایا۔ موساد نے یورپ میں اپنے آپریشن کے لئے اپنا ہیڈ کوارٹر پیرس سے برسل منتقل کر لیا تھا۔ موساد کے ایجنٹ نے زین کی تلاش میں پورے دو دن برن (Bern) میں گزارے لیکن ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس نے اپنی تلاش کا دائرہ وسیع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی کرائے کی کار میں چھوٹے چھوٹے گھروں پر مشتمل جنوب میں واقع لیبے فیلڈ (Liebefeld) کے علاقے کا رخ کر لیا۔ اس ایجنٹ کا اس قصبے کی گلیوں سے گزر پانچ سال پہلے ہوا تھا، جب وہ موساد کی اس ٹیم کا حصہ تھا جس نے زیورچ کے قریب ایک بائیو انجینئرنگ کمپنی میں تیار ہونے والے میٹل واٹس (Metal Vats) تباہ کئے تھے۔ یہ واٹس بیکٹیریا (Becteria) تیار کرنے کے لئے ایران کی طرف سے آرڈر کئے گئے تھے اور اس تخریب کاری کے بعد سوئٹزرلینڈ سے باہر بھاگتے ہوئے

وہ اس قصبے سے گزرا تھا۔ اس کی ٹیم نے یہ وائس آتش گیر مادہ پھینک کر تباہ کیے تھے جس کے نتیجے میں کمپنی نے ایران کے ساتھ اپنے تمام معاہدے منسوخ کر دیے تھے۔

اس ایجنٹ نے ثابت کیا تھا کہ اچھی جاسوسی کے لئے صبر اور پیدل سفر نہایت ضروری تھا۔ اس نے یہ دیکھنے کے لئے لیبے فیلڈ کی گلیوں کی بادہ پیمائی کی کہ یہاں مڈل ایسٹ کا کوئی بندہ نظر آئے۔ اس نے علاقے کی فون بک بھی زین کا نام تلاش کرنے کے لئے کھنگال ڈالی تھی۔ اس نے پراپرٹی ڈیلروں اور گھر کرایہ پر دینے اور خرید وفروخت کا کاروبار کرنے والی کمپنیوں کو ٹیلیفون کیے تھے کہ شاید انہوں نے اس نام کے بندے کو گھر بیچا یا کرائے پر لے کر دیا ہو۔ اس نے مقامی ہسپتالوں اور کلینکس کو بھی فون کیے تھے کہ شاید اس نام کا کوئی مریض ان کے ہاں کبھی داخل رہا ہو۔ ہر ایک کو وہ یہی بتاتا تھا کہ وہ زین کا رشتہ دار تھا۔ پورے دن کی تلاش وجستجو کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ آخر اس نے ایک دفعہ پھر کرائے کی گاڑی میں قصبے کو کھنگالنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ قصبے کی گلیوں میں کچھ دیر گاڑی گھماتا پھرا کہ اچانک مخالف سمت کی سڑک پر والوو کار میں ایک گہری رنگت کا بندہ، سردی سے بچاؤ کے لئے گرم کپڑوں میں ملبوس نظر آ گیا۔ ایجنٹ نے ڈرائیور کی ایک ہلکی سی جھلک ہی دیکھی تھی لیکن اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ زین ہی تھا۔ اسے والوو کے تعاقب میں گاڑی موڑنے کے لئے انٹرسیکشن بڑی دور جا کر ملا۔ اتنے میں والوو غائب ہو چکی تھی۔ اگلی شام کو موساد کا ایجنٹ دوبارہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں گزشتہ شام والوو نظر آئی تھی۔ اب اس نے اپنی گاڑی ایسی پوزیشن میں کھڑی کی کہ مطلوبہ کار نظر آنے کی صورت میں فوراً اس کے تعاقب میں روانہ ہو سکے۔ خوش قسمتی سے والوو نظر آ گئی اور ایجنٹ اس کے پیچھے چل پڑا۔

تقریباً ایک میل آگے جانے کے بعد والوو ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور باہر نکلا اور بلڈنگ کے مین گیٹ سے اندر داخل ہو گیا، یہ تھی بلڈنگ نمبر 27، وابر ساخر سراے (Wabersacherstrasse)۔

اب ایجنٹ کو کوئی شک نہ رہا کہ یہ عبداللہ زین ہی تھا۔

موساد کا ایجنٹ بھی زین کے پیچھے اپارٹمنٹ بلاک میں داخل ہو گیا۔ شیشے کے مین گیٹ کے پیچھے ایک چھوٹی سی ڈیوڑھی تھی، جہاں لیٹر بکس لگے ہوئے تھے۔ تیسری منزل کے ایک لیٹر بکس پر زین لکھا تھا۔ ڈیوڑھی کے قریب سے ایک دروازہ تہہ خانے کے خدمات (سروسز) کے شعبے کی طرف جاتا تھا۔ ایجنٹ نے دروازہ کھولا اور تہہ خانے میں اتر گیا۔ وہاں ایک دیوار کے ساتھ بلڈنگ کے تمام ٹیلیفونوں کا جنکشن بکس لگا تھا۔ چند لمحے بعد وہ واپس اپنی کرائے کی کار میں بیٹھا تھا۔

اگلے دن اس نے وہاں سے آدھے میل کے فاصلے پر اپنے محفوظ ٹھکانے کے طور پر ایک گھر کرائے پر لے لیا اور کرائے کا گھر لے کر دینے والی کمپنی کو بتایا کہ اس کے چند دوست اس کے ساتھ پہاڑوں پر سکائنگ کے لئے آنے والے ہیں، وہ وہیں چھٹیاں گزاریں گے۔

ڈینی یاطوم نے اپنی منصوبہ بندی جاری رکھی۔ اس نے موصلات کے ایک ماہر کو لیبے فیلڈ بھیجا تاکہ ٹیلیفون کے جنکشن بکس کا جائزہ لے سکے۔ یہ ٹیکنیشن جنکشن بکس کے اندر کی تصویریں لے کر، جو اس نے کھینچی تھیں، واپس تل ابیب پہنچا۔ ان تصاویر کا ریسرچ وڈویلپمنٹ کے شعبے میں جائزہ لیا گیا اور بگنگ کے لئے لگائی جانے والی ڈیوائسز میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کی گئیں۔ ایک ایسی پیچیدہ ڈیوائس تیار کی گئی جو زین کے اپارٹمنٹ میں باہر سے آنے والی اور اندر سے جانے والی ہر کال کا ڈاٹا تیار کر سکتی تھی اور اسے ایک ایسی چھوٹی سی ریکارڈنگ کل

سے جوڑ دیا گیا تھا جو کئی گھنٹوں کی کالوں کو ریکارڈ کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ریکارڈ کے اندر ہی یہ صلاحیت بھی پیدا کر دی گئی تھی کہ سیف ہاؤس سے سگنل ملنے پر وہ خالی یعنی صاف ہو جائے اور ریکارڈ شدہ میٹریل ایک محفوظ مشین کے ذریعے تل ابیب منتقل کر دیا جائے۔

فروری 1998ء کے پہلے ہفتے تک تمام ٹیکنیکل امور انجام پا چکے تھے۔ اب یاطوم نے اس آپریشن کے سب سے اہم حصے پر کام کا آغاز کیا اور ایک ایسی ٹیم منتخب کی جو عملی طور پر اس آپریشن پر عمل درآمد کی ذمہ دار تھی۔ آپریشن دو مرحلوں میں مکمل ہونا تھا۔ پہلے مرحلے میں ایسے ثبوت اکٹھے کرنا تھے کہ زین مسلسل حزب اللہ کی سرگرمیوں کا اہم حصہ تھا دوسرے مرحلے میں اسے قتل کرنا تھا۔

فروری 1998ء تک اس آپریشن پر عمل درآمد کے لئے ہر چیز تیار تھی۔

صبح 6:30 بجے سے چند لمحے قبل سوموار 16 فروری 1998ء کو یاطوم کی پیجو کار تل ابیب میں موساد کے ہیڈ کوارٹرز کے تہہ خانے میں بنے پارکنگ ایریا میں داخل ہوئی اور اس نے دفتر کی چوتھی منزل پر، کانفرنس روم تک پہنچنے کے لئے لفٹ پکڑی۔ وہاں اس کے انتظار میں دو مرد اور دو خواتین پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے میز کے گرد بیٹھے ہوئے پہلے ہی اپنے جوڑے بنا لئے تھے۔ اسی حیثیت سے انہوں نے سوئٹزرلینڈ میں اپنا اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کی عمر 25 اور 30 کے درمیان تھیں، دھوپ میں تپائے ہوئے جسم اور ہر لحاظ سے صحت مند اور تندرست و توانا۔ وہ گزشتہ کئی روز سے شمالی اسرائیل کے برفانی علاقے میں سکیٹنگ کی پریکٹس کرتے رہے تھے۔

گزشتہ شام انہیں ان کے مشن بارے پوری طرح سمجھا دیا گیا تھا اور انہوں نے اپنی شناخت کے لئے جعلی نام بھی انتخاب کر لئے تھے۔ مردوں نے اپنے آپ کو شاک ایکسچینج کے نہایت کامیاب ٹریڈرز کی حیثیت سے متعارف کرانا تھا جو ٹریڈنگ ہال کی سرگرمیوں سے وقت نکال کر اپنی گرلز فرینڈز کے ساتھ تفریح منانے نکلے ہوئے تھے لیکن اپنے لیپ ٹاپ کمپیوٹر کے ذریعے اپنے بزنس سے بھی غافل نہ تھے اور مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ لیپ ٹاپ کو سیف ہاؤس اور زین کے اپارٹمنٹ کے فون جنکشن سے جوڑا جانا تھا۔ ایک جوڑے کا کام ہر وقت لیپ ٹاپ پر نظر رکھنا تھا تاکہ اپارٹمنٹ کے اندر کی گفتگو اور دوسری سرگرمیوں کی ریکارڈنگ محفوظ کی جا سکے۔ دوسرا جوڑا موساد کی قاتل ٹیم میں سے تھا جس کا نام زین (Zein) کو تلاش کر کے قتل کرنا تھا۔ انہوں نے ہتھیاروں کے بغیر یہ سفر طے کرنا تھا۔ انہیں گنیں و قتل کے باقی آلات برسل کے دفتر سے مہیا کئے جانے تھے۔

کانفرنس کی میز پر خفیہ گفتگو سننے کے آلات اور ریکارڈر پڑے ہوئے تھے۔ یاطوم نے ان کا معائنہ کیا اور کہا کہ یہ آلات نہایت جدید اور پیچیدہ ہیں۔ اس نے ایسے آلات پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ اس کی آخری ہدایات نہایت مختصر تھیں۔ اس نے ہر ایک سے اس کا وہ جعلی نام پوچھا جو انہوں نے اپنے لئے آپریشن روم کی لسٹ سے انتخاب کیا تھا۔ آدمیوں نے سولی گولڈ برگ (Solly Goldber) اور متی فنکلسٹین (Matti Finklestin) اور عورتوں نے لی کوہن (Leh Cohen) اور راخیل جیکبسن (Rakhel Jacobson) کے نام منتخب کئے تھے۔ چونکہ وہ براہ راست تل ابیب سے اسرائیلی ائرلائن ایل ال سے ملک سے باہر جا رہے تھے۔ اس لئے وہ اپنے اصلی اسرائیلی پاسپورٹوں پر سفر کریں گے۔ وہ اپنے جعلی نام سوئٹزرلینڈ جا کر استعمال کریں گے لہٰذا وہیں ان کے جعلی ناموں کے

جعلی پاسپورٹ ان کے منتظر تھے۔

چاروں افراد بڑے تربیت یافتہ تھے لیکن اردن میں پیش آنے والی ناکامی کے بعد ایسے نازک مشنوں پر بھیجنے کے لئے ایجنٹوں کی تعداد محدود تھی۔ امان میں ناکامی سے دوچار ہونے والی ٹیم، موساد کی بہترین ٹیم خیال کی جاتی تھی اور ان کی تربیت کا معیار کینیڈا کے برابر تھا۔ سب کو بین الاقوامی سطح پر آپریشن کرنے کا تجربہ تھا۔ سوئٹزرلینڈ بھیجی جانے والی ٹیم کا عملی تجربہ صرف قاہرہ کے آپریشن تک محدود تھا، جہاں موساد کے لئے آپریشن کرنا ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ اس ٹیم کو انڈرکور سوئٹزرلینڈ میں کام کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ لندن کے اخبار "سنڈے ٹائمز" کے مطابق یاطوم نے اپنی ہدایات اس بات کی یاددہانی پر ختم کی تھیں کہ لیبے فیلڈ کا علاقہ جہاں جرمن زبان بولی جاتی اور جرمن عادات و اطوار کے مطابق معمولی سی بھی خلاف واقعہ حرکت دیکھ کر فوراً پولیس کو اطلاع کر دیتے ہیں۔

یاطوم نے ان سے ہاتھ ملایا اور ان کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ کسی بھی نئے مشن پر بھیجے جانے والوں کے لئے یہ موساد کی روایتی الوداع ہوتی تھی۔ گروپ نے اپنے ٹکٹ پکڑے اور اگلے 24 گھنٹے موساد کے ایک محفوظ ٹھکانے پر گزارے۔

اگلے منگل کی صبح 20 فروری کو وہ تل ابیب کے بن گوریان ائرپورٹ پر ائرلائن کی ہدایات کے مطابق فلائٹ کی روانگی سے دو گھنٹے قبل پہنچ گئے اور زیورچ پہنچنے کے لئے اسرائیلی ائرلائن ایل ال کی فلائٹ 347 میں سوار ہو گئے۔ اس سے پہلے وہ مسافروں کی قطار میں لگ کر سکیورٹی چیکنگ سے گزرے۔ مسافروں میں سے زیادہ تر کا تعلق سوئٹزرلینڈ یا اسرائیلیوں سے تھا۔ 9 بجے تک دونوں جوڑے جہاز کی بزنس کلاس میں بیٹھے شمپین سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے تفریحی سفر اور تعطیلات کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے سوٹ کیس سامان رکھنے کی ہولڈ میں رکھے جا چکے تھے۔

کلوٹن ائرپورٹ، زیورچ پر برسل سے موساد کا ایک ایجنٹ منی بس میں ان کا منتظر تھا۔ اس نے ان کے گائیڈ کا روپ دھارا تھا اور اپنا جعلی نام افرائیم روبنٹین (Ephrahim Rubenstein) چنا تھا۔

شام ڈھلے انہیں لیبے فیلڈ کے محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا۔ دونوں عورتوں نے رات کا کھانا تیار کیا اور اس کے بعد وہ سب ٹی وی کے آگے بیٹھ گئے۔ شام کے وقت دو کاریں زیورچ سے پہنچ گئیں اور جو ڈرائیور لے کر آئے تھے وہ منی بس میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ صبح کے تقریباً ایک بجے روبنٹین پہلی کار میں تھا جو ویبرساخرسراسے (Wabersackerstrasse) کی طرف ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ وہاں پہنچنے پر دونوں کاریں اپارٹمنٹ بلاک کے بالکل سامنے رک گئیں۔ زرین کے اپارٹمنٹ سے کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ جن لوگوں کے نام سولی گولڈ برگ، راخیل جیکبسن اور افرائیم تھے، تیزی سے بلڈنگ کے شیشے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ روبنٹین کے ہاتھ میں پلاسٹک ٹیپ کا ایک رول تھا۔ گولڈ برگ لیپ ٹاپ اٹھائے ہوئے تھا۔ جیکبسن کے پاس ایک کاریگروں کا تھیلا تھا جس میں سننے والی ڈیوائسز تھیں۔ اسی دوران لی کوہن اور متی فنکلسٹین نے اردگرد کے ماحول پر نظر رکھی اور بظاہر محبوب و محبوبہ کا روپ دھارے ہوئے۔

گلی کے دوسری طرف ایک ادھیڑ عمر عورت، جو دمے کی مریضہ تھی، جسے بعدازاں سوس پولیس نے صرف میڈم ایکس (Madam "X") کے نام سے متعارف کرایا، کو بے خوابی کے عارضے کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے اپنی خوابگاہ کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے

عجیب سا منظر نظر آیا۔ ایک شخص، روبنٹین، سامنے کی بلڈنگ کے شیشے کے دروازے پر پلاسٹک چڑھا رہا تھا تاکہ باہر سے اندر نہ دیکھا جاسکے۔ پلاسٹک چڑھانے والے بندے کے پیچھے اسے دو مزید افراد بھی نظر آئے۔ باہر ایک کھڑی کار میں اسے ایک اور جوڑے کی حرکات و سکنات نظر آئیں۔ جیسا کہ ڈینی یاطوم نے انہیں انتباہ بھی کیا تھا، عورت نے جو کچھ دیکھا، وہ مناسب نہیں تھا۔ اس نے پولیس کو کال کر دی۔

صبح کے دو بجے کے فوری بعد پولیس کی بی ایم ڈبلیو کار گلی میں داخل ہوئی اور اس نے کوہن اور کنسٹلشٹین کو تقریباً بغلگیر ہوتے ہوئے قابو کر لیا۔ اتنے میں پولیس کی مزید امدادی گاڑیاں بھی پہنچ گئیں اور دروازے کے اندر داخل تینوں افراد سے پوچھا کہ وہ وہاں کیا کر رہے تھے۔ گولڈ برگ اور جیکبسن نے کہا کہ وہ اپنے دوستوں کی تلاش میں غلط بلڈنگ میں داخل ہو گئے تھے اور روبنٹین نے بتایا کہ وہ شیشوں پر پلاسٹک چڑھا نہیں بلکہ اتار رہا تھا۔

معاملہ مزید مشکوک ہو گیا تھا۔ گولڈ برگ اور جیکبسن نے اجازت مانگی کہ وہ اپنی کار تک جا کر اپنے دوست کا ایڈریس چیک کر لیں۔ کوئی پولیس والا ان کے ساتھ نہیں گیا۔ اسی دوران روبنٹین زمین پر گر گیا، گویا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ سارے پولیس والے اس کے گرد مدد اور ایمبولینس بلانے کے لئے جمع ہو گئے۔ ان دو کاروں کو گلی سے باہر کی طرف بھاگنے سے روکنے کی کسی نے کوشش ہی نہیں کی۔ جلد ہی دونوں کاریں رات کی تاریکی میں جنگل میں غائب ہو گئیں اور بارڈر کراس کر کے فرانس کی طرف نکل گئیں۔

اسی دوران رابنشٹین کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اسے کوئی ہارٹ اٹیک نہیں ہوا۔ چنانچہ اسے حراست میں لے لیا گیا۔

تل ابیب کے وقت کے مطابق صبح 4:30 بجے موساد ہیڈ کوارٹرز میں ڈیوٹی دینے والے افسر نے یاطوم کو اس کے گھر میں نیند سے بیدار کیا اور پیش آمدہ واقعہ سے آگاہ کیا۔ یاطوم نے ڈرائیور کو بلانا بھی گوارا نہیں کیا اور خود ہی گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ہیڈ کوارٹرز کی طرف دوڑ لگا دی۔

امان کی مضحکہ خیز ناکامی کے بعد یہ دوسرا نہایت احتیاط اور سوچ سمجھ کر بنایا گیا ''آپریشن پلان'' تباہی سے دوچار ہو گیا تھا۔ یاطوم کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ وزارت خارجہ کے ڈیوٹی افسر کو فون کر کے واقعہ سے آگاہ کرے۔ اس افسر نے وزیر اعظم کے دفتر کے انچارج کو فون کر دیا جس نے بنیامین نیتن یاہو کو آگاہ کر دیا۔ اس نے یورپین کمیونٹی میں اسرائیل کے سفیر کو برسلز فون کیا۔ انگلینڈ میں پیدا ہونے والے اسرائیلی سفیر افرائیم ہالوی (Efraim Halevy) نے اپنی زندگی کے 30 سال موساد کی خدمت کرتے اور یورپی یونین کی ان خفیہ سرحدوں کے ساتھ اچھے تعلقات بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے گزارے تھے۔ جن ممالک کے ساتھ اسرائیل کے سفارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے اس نے اردن کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ جب امان آپریشن کے بعد تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو گیا تھا۔

بعد میں نیتن یاہو کے ہالوی کو کہے گئے جو الفاظ سامنے آئے وہ یہ تھے۔

''اس معاملے کو سلجھا دو، تم زندگی بھر کے لئے میرے دوست بن جاؤ گے''۔

اسرائیلی سفیر کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ وہ سب سے پہلے کس سے رابطہ پیدا کرے۔ سوئس وزارت خارجہ میں سینئر افسر جیکب کیلر برگر سے اس کے بہت اچھے مراسم تھے۔ اس کی نظر میں ہالوی بہترین سفارت کار تھا۔ ہالوی نے سفارتی زبان میں اسے بتایا

کہ قابل افسوس سانحہ رونما ہو گیا ہے جس میں موساد ملوث ہے۔

''کس قدر افسوس ناک؟''

''بہت زیادہ افسوسناک۔'' ہالوی نے جواب دیا۔ اس نے سمجھا کہ بات بن جائے گی کیونکہ کیلر برگر نے آگے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

کیلر برگر نے سوئس حکومت کی فیڈرل پراسیکیوٹر کارلا ڈیل پونٹے (Carla Del Ponte) کو فون کر دیا۔

پتلے ہونٹوں اور سٹیل فریم کا چشمہ پہننے والی ڈینی یاطوم سے بڑی مشابہت رکھتی تھی اور سوئس حکومت کے قانونی حلقوں میں اتنی ہی اہمیت رکھتی تھی جتنی کسی وقت اسرائیلی انٹیلی جنس کمیونٹی میں یاطوم کو حاصل تھی۔ اس کے پہلے ہی سوال نے طے کر دیا کہ وہ کس قسم کا رویہ اپنائے گی۔

''لیپے فیلڈ پولیس نے تمام ایجنٹوں کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟'' کارلا کا پہلا سوال تھا۔

کیلر برگر کو اس بارے کچھ معلوم نہ تھا۔ ڈیل پونٹے کے اگلے سوال سے وہ قدرے آگاہ تھا۔

''کیا موساد کے ایجنٹوں کی واردات کا تعلق ایرانی معاملے سے تھا؟''

گلف وار کے بعد سے اسرائیل تواتر کے ساتھ دعویٰ کرتا آرہا تھا کہ سوئس کمپنیاں میزائل بنانے کی ٹیکنالوجی ایران کو مہیا کر رہی تھیں۔

یا کیا موساد کے ایجنٹوں کے آپریشن کا تعلق اس جیوئش گولڈ سکینڈل سے تھا؟ کہا جاتا ہے دوسری جنگ عظیم سے قبل جرمنی کے امیر یہودیوں نے اپنی بڑی بڑی رقوم سوئس بینکوں میں جمع کرا رکھی تھیں جو بعد ازاں نازیوں کے ظلم کا شکار ہو گئے تھے۔

اختتام ہفتہ 21، 22 فروری کو اس کے سوالات مسلسل جاری رہے، جبکہ سفیر ہالوی کی کوشش تھی کہ معاملہ خاموشی سے نمٹا دیا جائے۔

اس کو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ اسرائیل کے اندر چند قوتیں ڈینی یاطوم کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ یہاں تک کہ موساد کے اپنے حلقوں میں جب اس آپریشن کی ناکامی کی خبر پھیلی تو سب کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس بار یاطوم اس ناکامی بارے نیتن یاہو پر کوئی الزام نہ دھر سکا کیونکہ اس آپریشن بارے وزیراعظم کو پہلے سے کوئی خبر ہی نہ تھی۔ وزیراعظم کے دفتر سے یہ خواہ مخواہ کا سلسلہ اسرائیلی میڈیا تک بھی پہنچنے لگا کہ یاطوم کا انجام قریب ہے۔ تھا۔ تمن دن تک اسرائیلی سفیر ایفرائیم ہالوی کارلا ڈیل پونٹے کسی کی سننے کی روادار نہ تھی۔ بدھ 25 فروری کے روز اس نے پریس کانفرنس بلائی اور موساد کی مذمت کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا۔ جو کچھ ہوا، ناقابل قبول ہے اور دوست اقوام کے درمیان دراڑیں ڈالنے کے مترادف ہے۔

اس کے چند ہی گھنٹے بعد ڈینی یاطوم نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کا کیریئر ختم ہو گیا اور ساتھ ہی موساد کی شہرت کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔ بطور ڈائریکٹر انٹیلی جنس ایجنسی اپنے آخری لمحات میں اس نے اپنے سٹاف کو جو موساد ہیڈ کوارٹرز کی کینٹین میں جمع ہو چکا تھا، وہاں پہنچ کر حیران کر دیا۔ اس کا معمول کی سرد مہری کا رویہ ایک جذباتی کیفیت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے افسوس ہے کہ وہ انہیں مشکل وقت میں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس نے کوشش کی انہیں بہترین رہنمائی کرے۔ انہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ موساد سب سے بالاتر ہے۔ اس نے اپنی جگہ لینے والے ڈائریکٹر کے لئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور اس کے لئے کامیابی کی دعا کی۔

وہ یہ کہتے کہتے رک گیا کہ وزیراعظم کے دفتر کی یہ کوشش کہ موساد کو وہاں سے کنٹرول کیا جا سکتا تھا، کامیابی سے ناکام بنا دی تھی۔ یاطوم باہر کی طرف چل پڑا۔ جب وہ

برآمدے میں پہنچا تو اسے اپنے پیچھے تالیاں بجنے کی آواز سنائی دی لیکن یہ آواز جیسے اچانک آئی تھی اسی طرح اچانک خاموش بھی ہوگئی۔

ایک ہفتہ بعد افریم ہالوی (جو سوئٹزرلینڈ میں اسرائیل کا سفیر تھا اور جسے نیتن یاہو نے زندگی بھر کے لئے دوست بنانے کا وعدہ کیا تھا) اس بات پر راضی ہوگیا کہ وہ موساد کی سربراہی قبول کرلے گا، جب نیتن یاہو نے برسرعام تسلیم کیا کہ بعض ناکام آپریشنز کی وجہ سے موساد کی ساکھ بُری طرح متاثر ہوئی تھی، اسرائیلی تاریخ میں کسی وزیراعظم کی طرف سے موساد کی کارروائیوں کو برسرعام تسلیم کرنے کا یہ پہلا واقعہ تھا لیکن ایک پختہ کار سیاستدان ہونے کی حیثیت سے اس نے یہ نہیں بتایا کہ موساد کے مشنوں کی ناکامیوں میں اس کا اپنا کتنا ہاتھ تھا۔

جمعرات، 5 مارچ 1998ء کو افریم ہالوی موساد کا نواں ڈائریکٹر جنرل بن گیا۔ اس نے نئی روایت یہ قائم کی کہ اپنے سینئر سٹاف کو اپنے دفتر میں بلا کر یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ آئندہ دو سال کے دوران سروس کو کس طرح چلایا جائے گا۔ ہالوی کے تقرر کا اعلان کرتے وقت وزیراعظم نیتن یاہو نے واضح کردیا تھا کہ 3 مارچ 2000ء سے ادارے کا نیا سربراہ، موجودہ ڈپٹی ڈائریکٹر امیرام لیوائن بنے گا۔ اس خبر کو قدرے تعجب و حیرت سے سنا گیا تھا۔ آج تک کبھی ڈائریکٹر جنرل کو کسی مقررہ مدت کے لئے تعینات نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی کسی ڈپٹی ڈائریکٹر کو پیشگی یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ وہ آئندہ ادارے کا سربراہ بنے گا۔

1999ء تک یاطوم کو اسرائیل کی اسلحے کی پھلتی پھولتی انڈسٹری میں مصروفیت مل گئی۔ وہ اسرائیل کی اسلحہ سازی کی سب سے بڑی کمپنی کا سیلز مین بن گیا۔ کمپنی نہ صرف اندرون ملک ضرورت کے لئے ہتھیار تیار کرتی تھی بلکہ تیسری دنیا کے ممالک کو ہتھیاروں کی ایکسپورٹ کے لئے وسیع مواقع موجود تھے۔ اب یاطوم باقاعدگی کے ساتھ، اپنا سودا بیچنے کے لئے افریقی ممالک اور جنوبی امریکہ کی قومیتوں کے سفر پر رہتا تھا۔ اس دوران وہ کبھی کبھی واشنگٹن کا چکر بھی لگا لیتا تھا۔

مسٹر امیت کی طرح لیوائن (Levine) کو بھی پہلے سے جاسوسی کے کام کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ شمالی اسرائیل اور جنوبی لبنان میں اسرائیلی فوج کی کمانڈ کی تھی اور فوج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

ہالوی کا پہلا کام موساد کی صفوں میں پھیلی ہوئی بھاری کشیدگی، مایوسی اور چپقلش کو ختم کرنا تھا، کیونکہ اس سے موساد کی اندرون ملک اور بیرونی دنیا میں دھاک کو سخت دھچکا لگ چکا تھا۔ حسب روایت اسے امریکن سی آئی اے اور برطانوی ایم آئی 6 کی طرف مبارک باد دی جا رہی ہیں۔ دونوں خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے بتایا گیا کہ [illegible] کسی بھی قسم کے تعاون کا وعدہ کرنے سے پہلے یہ دیکھیں [illegible] اندرونی خلفشار کو دور کرنے کے لئے کیا حکمت عملی اپناتے ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ [illegible] ساتھ اس کے ساتھ خفیہ روابط اور انٹیلی جنس میں شراکت کے بارے فیصلہ کریں گے۔

ایک بدنما حقیقت ہالوی کے لئے یہ بھی تھی کہ وہ اسرائیلی حکومت میں شامل سخت گیر اور انتہاپسند افراد سے کس انداز سے نمٹتا ہے، خصوصاً اپنے وزیراعظم سے۔

شائستہ، مہذب اور خوش اخلاق ہالوی، جو اپنی پنشن سے صرف ایک سال کی دوری پر تھا اور اپنے پیشروؤں کی نسبت کئی سال عمر رسیدہ، جسے یہ ذمہ داری دے دی گئی تھی، کیا نیتن یاہو کو فاصلے پر رکھ سکے گا؟ جو ہر معاملے میں دخل در معقولات کا عادی تھا۔

نوٹ:۔ اس سلسلے کا آخری حصہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

اندھیروں سے اُجالے تک

سکون چاہئے!

کسی سے لے کر آزمایا جارہا ہے اور کسی کو دے کر کیونکہ یہ دنیا ہے ہی ایک آزمائش اور یقین مانو عطا محرومی سے بڑی آزمائش ہے۔

☆ رمیز احمد
0331-5178929

کوئی بھی پریشانی کبھی نہ ختم ہونے کے لئے کبھی نہیں آتی، بس ہماری مایوسی ہی زخموں کو ناسور بنا دیتی ہے۔ اسی لئے تو مایوسی کفر ہے۔ یہ ایمان کی ضد ہے۔ یقین کی رسی ہاتھ سے چھوٹ جائے تو پریشانی دروازہ نہیں چھوڑتی۔ اپنے آپ پر ہی غور کرنے لگ جاؤ تو خدا کو پہچان لو گے۔ اسے پہچان لیا تو یقین کامل ہو جائے گا اور صحیح کہتے ہیں کہ "پیر کامل نہیں ہوا کرتے یقین کامل ہوتے ہیں"۔

تم کہتے ہو کہ تمہیں اپنا آپ نہیں ملتا۔ وہ ملے کیسے؟ تم نے کبھی غور کیا ہے کہ جس کو جتنی اہمیت دی جائے وہ اتنی ہی مشکل سے ملتا ہے، اتنا ہی تو آگے بھاگتا ہے۔ کسی کو بھی پانے کا یہ ایک بہت کارآمد طریقہ ہے کہ اس کو کم اہمیت دی جائے اس کے سامنے دوسروں کو اہمیت دیتے رہو گے تو وہ پیچھے آجائے گا۔ بس اسی کلیے کے تحت تم اپنے آپ کو کم اہمیت دیا کرو۔ اسی طرح وصالِ خودی ممکن ہے۔ اپنے سامنے دوسروں کو اہمیت دو گے تو اپنے آپ سے ملنا آسان ہوگا ورنہ تم کھو جاؤ گے۔ اس پاتال میں جہاں سمت کا وجود ہی نہیں ہے۔ بے شک اپنے آپ کو مت بھولو کہ کسی کو نقصان یا پریشانی دیئے بغیر اپنا فائدہ کرنا خودغرضی نہیں کہلاتا۔

اس کی مخلوق میں سکون بانٹو وہ تمہیں سکون دے دے گا کیونکہ بانٹنے سے صرف علم کی ہی نہیں ہر دولت بڑھا کرتی ہے۔ انسانیت کی خدمت ہی بہترین ذریعہ ہے، سکون کا۔ اور ایک بات یاد رکھو۔ مال سے مدد سب سے آسان کام ہے اور پھر بھی اگر مالی مدد ہی کرنا چاہو تو اس مال سے وہ چیز خرید لو جس کی تمہیں سب سے زیادہ

خواہش ہے اور وقف کر ڈالو، خدا کی راہ میں۔ کیونکہ اصل میں بے سکونی پیدا ہی خواہش سے ہوتی ہے۔ خواہش کی قربانی پر سکون کے ساتھ ساتھ مفت میں مرتبے ملتے ہیں پھر شرط یہ ہے کہ خواہش کو خالق کی رضا پر قربان کیا جائے۔

پریشانی یا تو گناہ سے آتی ہے یا قربت کی دعا سے آتی ہے۔ قربت کی دعا سے آنے والی پریشانی کو آزمائش کہتے ہیں اور گناہ سے آنے والی پریشانی کو عذاب کہتے ہیں۔ آزمائش میں صبر کرنے سے قرب عطا ہوتا ہے اور عذاب میں صبر کرنے سے آخرت کے عذاب میں کمی آتی ہے اور کلیتاً بھی دیکھا جائے تو پریشانی انسانیت میں گہرائی پیدا کرتی اور اسے مضبوط کرتی ہے تو پریشانی تو ہر حساب سے رحمت ہوئی۔ ہم ناشکری کیوں کرتے ہیں، گلہ کیوں کرتے ہیں؟

تم کہتے ہو دولت کی اتنی بے ربط تقسیم کیوں ہے، کہیں گناہ گار کروڑوں میں کھیل رہے ہیں اور کہیں پارسا فاقے کر رہے ہیں۔ پر غور کرو تو کسی سے لے کر آزمایا جا رہا ہے اور کسی کو دے کر کیونکہ یہ دنیا ہے ہی ایک آزمائش اور یقین مانو عطا محرومی سے بڑی آزمائش ہے۔

لیکن اگر دوسری طرف سے دیکھا جائے تو تم دولت کہہ ہی غلط شئے کو رہے ہو، اصل دولت سکون ہے۔ ہم بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی کے پیچھے ہی بھاگ رہے ہیں اور اس کو اعمال کے حساب سے ہی بانٹا گیا ہے۔ یہ تو مخلوق خدا کی خدمت میں چھپی ہے اور ہم اسے کبھی عہدے میں تلاش کرتے ہیں، کبھی پیسے میں۔ پیسے سے زیادہ سکون کے پیچھے بھاگو گے تو زندگی میں پچھتاوے بہت کم آئیں گے اور پچھتاوے انسان کو امید سے کھوکھلا کر دیتے ہیں۔

یہ اتنی احساس کمتری کیوں ہے بھائی! کبھی ہوس کی آنکھ بند کر کے روح کی آنکھوں سے کسی بے عمل رئیس کی کوٹھی میں جھانکنا۔ تمہیں ہر طرف بے سکونی کی بدصورت بلائیں گھومتی نظر آئیں گی جو ہر وقت اپنے خوفناک نوکیلے دانت مکینوں کے سروں میں گاڑھے ان کا خون چوستی ہیں اور وہاں نیند کی پریاں بھی نہیں اترنے دیتیں اور کبھی جانا کسی فقیر کی کٹیا میں سکون کی حوریں تمہیں بھی دو پل میں پُرسکون کر دیں گی پھر سوچنا کہ امیر کون ہے اور غریب کون!

سوچنے کی بات

ہو کہ تمہاری دی ہوئی تعلیم پر تمہاری اولاد مکمل طور پر عمل پیرا ہے پر تمہاری آنکھ میں آنسو کیوں ہیں؟

اچھا یہ خوشی کے آنسو ہیں؟ لیکن مجھے تو یہ پچھتاوے کے آنسو لگتے ہیں پر پچھتاوا کس بات کا کیا تم نے انہیں نہیں کہا تھا کہ پیسے کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے۔ مال و دولت کے بغیر تمہیں کوئی پوچھے گا بھی نہیں اور تم نے کر کے بھی تو یہی دکھایا تھا اور تم جانتے ہی ہو کہ عمل قول سے بڑی تبلیغ ہے۔

تو کیا یہ آنسو اس لئے ہیں کہ تمہاری اولاد تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہارا مال اور جائداد بانٹ رہی ہے۔ ارے پگلے تجھے تو خوش ہونا چاہئے کہ انہوں نے تمہارے کچھ اقوال تو پلے سے باندھ کر رکھے ہیں۔ تم نے بچپن سے ان کے دل میں مال و جائداد کا پیار کوٹ کوٹ کر بھرا ان کی افادیت پر تقریریں کیں تو اب وہ بڑے ہو گئے ہیں اور ان کے ساتھ ان کی وہ سوچ جو تم نے خود بنائی تھی وہ بھی تو بڑی ہونی ہی تھی۔

ہم خود اس سارے معاملے کا آغاز بھی ہوتے ہیں اور انجام پر بھی روتے ہیں۔ اگر بنیاد ہم نہ رکھتے تو ہماری اولاد اس طرح کی عمارتیں کیسے بناتی۔

چلو ایک اور طرح دیکھتے ہیں۔ اگر ہم اپنی اولاد کو یہ بتائیں کہ بیٹا خوب کما لینا، جتنا چاہے کما لینا لیکن اگر

تمہارے سامنے ایسا مرحلہ آ جائے کہ یا تم کسی کا دل توڑنے سے بچا لو یا خوب دولت کما لو۔ تو خدارا! تم دل کو ٹوٹنے سے بچا لینا۔ ورنہ تم کو شاید دولت دے دی جائے گی پر ساتھ بے سکونی کے جلتے کوئلوں کا بار بھی تمہارے گلے میں ڈال دیا جائے گا جو سینے پر جلن کے ساتھ ساتھ گردن پر وزن بھی ہوگا۔ اگر یہ تعلیم ہوتی ہماری تو آج ہمارے دل کی وقعت ہوتی۔ ہمارے دل کو بھی نہ توڑنے کے بارے میں کم از کم سوچا ضرور جاتا۔

سب سے حیران کن بات تو یہ ہے کہ ہم دولت اپنے لئے اکٹھی نہیں کرتے دوسروں کو دکھانے کے لئے اکٹھی کرتے ہیں کہ اس پیسے کی وجہ سے ہماری عزت ہو گی۔ ہاں چلو مان لیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے تمہیں اہمیت مل رہی ہوگی پر وہ تمہیں نہیں مل رہی تمہاری دولت کو مل رہی ہے۔ تو کیا یہ ذلت کی بات نہیں کہ تمہاری اپنی کوئی عزت نہیں ان فانی چیزوں کی وجہ سے بس اہمیت ہے جو کسی بھی وقت ضائع ہو سکتی ہے۔ ہر انسان تمہارے منہ پر خوشامد سے تمہارا غرور بڑھاتا ہے۔ تمہارے نفس کو تسکین دیتا ہے اور پیٹھ پیچھے گالیاں ملتی ہیں تمہیں اور یہ سب کچھ اپنی زندگی میں دیکھ کر بھی کچھ سیکھ نہ پائے اور تم نے اپنی اولاد کو بھی یہ ہی ترغیب دی اور آج بات یہاں تک پہنچ گئی کہ اب وہ دولت کو تم پر بھی فوقیت دینے لگ گئے ہیں۔

چلو! اب برداشت کرنا تو مجبوری ہے۔ تم تو گزار ہی چکے ہو پر اولاد کی اولاد کی فلاح چاہتے ہو تو بلاؤ بیٹوں کو اور جو تمہیں اب سمجھ میں آیا ہے ان کو سمجھا دو کہ شاید تمہاری اگلی نسل کے گلے سے یہ طوقِ غلامی نفس نکل جائے اور ان کی وجہ سے تمہاری قبر بھی ٹھنڈی ہو جائے۔ رلو ان کے سامنے کہ شاید آزادی تمہارا انتظار کرتی ہو اب تو ایک بار مڑ کر بستی پر نظر ڈالو تا کہ سمجھ سکو کہ یہ دنیا ایک خواب ہے، فقط ایک سراب ہے۔

▼✱▼◻▲◻

وہ ان افراد میں سے ایک تھا جن کی زندگی کا مقصد ہی وطن کی بقا اور حفاظت ہوتا ہے اور وہ اپنی مٹی سے ہمہ وقت عہد وفا استوار رکھتے ہیں۔ دشمن اُن کی موجودگی میں کبھی اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے بڑھتے ہوئے جارحانہ قدم روکنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ اُسے بھی ایک ایسی ہی بھیانک یلغار کو روکنا تھا۔

زخم خوردہ

خصوصی کہانی

☆ اختر حسین شیخ

ملک سجاول خان اپنے مہمان دوستوں کے ہمراہ سیر وتفریح سے لوٹا تو اس ناخوشگوار منظر نے ان کا استقبال کیا۔ وہ خود تو ایسے مناظر کا عادی تھا۔ لہٰذا اس کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر اس کے دوست واقعی حیران وششدر رہ گئے۔

دراز قد، شہابی رنگت اور حسن جہاں سوز کی مالک ایک دوشیزہ فرشِ زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ''منج'' کی رسی سے جکڑے ہوئے تھے اور وہ اسی جہازی سائز پلنگ کے رنگین پائے سے بندھی ہوئی تھی۔ جس پر علاقے کی ممتاز ترین شخصیت، ملک حاکم خان براجمان تھا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ علاقے کا قانون تھا۔ بھاری بھرکم وجود، بارعب چہرہ اور مغل شہنشاہ اکبر جیسی مونچھیں، حاکم خاں واقعی حاکم وقت دکھائی دیتا تھا۔

دوشیزہ کی سوگوار نرگسی آنکھوں کا کاجل بکھر چکا تھا۔ رنج بستہ کلائیوں کے قریب زمین پر کانچ کی ٹوٹی ہوئی رنگین چوڑیاں بکھری پڑی تھیں۔ ٹوٹی چوڑیاں کسی داستان کا عنوان ضرور بنتی ہیں۔ وہ داستان پُرکیف ورنگین بھی ہوسکتی ہے اور غم واندوہ سے بھرپور سنگین بھی۔ اس رنگینی اور سنگینی کا انحصار حالات پر ہوتا ہے۔ بہرحال وہ منظر کسی طوفان کا پیش خیمہ دکھائی دیتا تھا۔ سجاول اس طوفان سے کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دوست رضوان کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور تسلی آمیز انداز میں سرگوشی کی ''صبر وتحمل سے کام لو میرے چاند! میں اس ناخوشگوار صورت حال کی وضاحت کردوں گا''۔

سجاول کو ایک ہی فکر تھی کہ اگر اس کا دوست بپھر گیا تو نقصان ناقابل معافی وتلافی ہوگا۔ اس کے مہمان دوستوں کا تعلق فوج کے ایک خفیہ حساس ادارے سے تھا۔ رضوان کا وجود طاقت وتوانائی کا خلاصہ ہونے کے ساتھ عملی میدان میں برق رفتار کارکردگی کا حامل بھی تھا۔ ان خصوصیات کی بناء پر ادارے کے افراد اسے راجو راکٹ کے نام سے پکارتے تھے۔

سجاول کا دوسرا دوست نصیر الدین ڈیٹی البتہ ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانے کا عادی تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ڈیٹی اور راکٹ لازم وملزوم قرار دیئے جاتے تھے۔ سجاول سے ان کی دوستی مضبوط اور گہرے تعلق پر استوار تھی۔ وہ گہرا تعلق جو قابل فخر اور سرمایہ افتخار ہوتا ہے۔ وہ تعلق جس پر دوریاں اور فاصلے اثر انداز نہیں ہوا کرتے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ڈیٹی اور راکٹ نے پاک فوج کی ملازمت اختیار کرلی مگر سجاول خاں لیلائے علم کی زلف کا اسیر ہوکر رہ گیا۔ اس کی تشنگی تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ الیکٹرانک کے شعبے میں اس نے قدم رکھا تو دوست احباب کے تخمینے اندازے غلط ثابت کردیئے۔ بظاہر وہ کھیل کود شکار وغیرہ کا شوقین دکھائی دیتا تھا۔ اس کا تعلق بھی دور افتادہ معمولی سے گاؤں حاکم پور سے تھا مگر اس کا ذہن ایک سائنس داں کی سوچ کا حامل تھا۔ شہر میں وہ علم کتب کے حصول کے لئے آتا۔ یہ دولت سمیٹ کر وہ پھر اپنے گاؤں لوٹ جاتا...... اس لحاظ سے وہ مجموعہ اضداد قسم کی شخصیت کا حامل تھا...... اپنی گہرائی سے وہ شاید خود بھی آگاہ نہیں تھا۔ ڈیٹی اور راکٹ اسے قومی سرمایہ گردانتے تھے۔

''تایا جان! میں اپنے دوستوں کا تعارف کرانے حاضر ہوا تھا''۔ سجاول پلنگ پر دراز ''حاکم وقت'' سے مخاطب ہوا۔ ''مگر آپ تو شاید اس وقت کسی مقدمے میں الجھے ہوئے ہیں''۔

''آمینڈ ھا شیر پتر، یہ مقدمے شقدمے تو چلتے ہی رہتے ہیں''۔ حاکم خاں نے مہمانوں کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ جوان تو مجھے جنگلی چیتا دکھائی دیتا ہے''۔ ملک صاحب نے حقے کی نے سے راجو راکٹ کی طرف اشارہ کیا۔ دوشیزہ نے بھی سوگوار شرمیلی

آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ نگاہ کسی ہمدرد کی متلاشی تھی۔ ایک پل کے لئے نگاہوں کا تصادم ہوا، رضوان کا سارا جسم کڑی کمان کی طرح تن گیا۔ ڈینی کی گرفت اس کی کلائی پر مضبوط ہوگئی۔

''ایسا محاذ کھولنا جس کے متعلق ہم بالکل بے خبر ہیں، نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے''۔ ڈینی نے بڑی رسان سے کہا۔ ''یہ دیہاتی ماحول ہمارے لئے اجنبی ہے۔ یہ لوگ اپنے مسائل سے اپنے انداز میں نمٹ سکتے ہیں''۔

''مگر...... یہ تو سراسر نسوانیت کی توہین ہے''۔ راجو نے اپنے لہجے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا لیکن سجاول اپنے دوست کو بڑی فراست سے کام لیتے ہوئے اس دربار سے دور لے گیا۔

رتن بستہ دوشیزہ نے مایوسی سے نگاہیں جھکا لیں۔ شاید وہ تنکے کا سہارا تھا جو ناپائیدار ثابت ہوا۔ توقع بھی کوئی اتنی زیادہ نہیں تھی لہٰذا مایوسی بھی توقع کی مناسبت سے ہوئی۔

''سجاول خان! یہ سب کیا خرافات...... میرا مطلب ہے معاملہ کیا ہے؟'' راجو نے منظر سے ہٹتے ہی سوال کیا۔ ''مائی گاڈ! ایک لڑکی کو بھیڑ بکری کی طرح رسی سے باندھ کر ذلیل و خوار کیا جارہا ہے۔ زنجیر تو دیوانوں کو پہنائی جاتی ہے''۔

''میرے چاند! وہ تابو، دیوانی ہی نہیں قتل جیسے جرم کا ارتکاب بھی کر بیٹھی ہے''۔ سجاول نے صورتِ حال کی وضاحت کی۔

''قتل؟'' ڈینی نے اظہار حیرت کیا۔ ''یہ قتل اس نے اپنی نگاہوں سے کیا ہے یا باقاعدہ خنجر آبدار سے؟''

''نہ خنجر سے نہ بندوق پستول سے''۔ سجاول نے زیرلب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس نے کلہاڑی سے قتل کیا ہے''۔

''کون تھا وہ خوش نصیب جسے شہادت کی سعادت نصیب ہوئی؟'' ڈینی نے سرسری سے لہجے میں سوال کیا۔

''ہمارے ملک صاحب کی اعلیٰ ترین نسل کی بیش قیمت کتیا''۔ سجاول نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔ اس کے دوستوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''یعنی وہ حسین دوشیزہ ایک کتیا کے قتل میں ملوث ہے؟'' ڈینی نے دوسری بار حیرت کا اظہار کیا۔

''ملوث نہیں رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے''۔ سجاول نے مزید وضاحت کی۔ ''خلق خدا نے تابو کو اپنی گنہگار آنکھوں سے قتل جیسے گھناؤنے فعل کا ارتکاب کرتے دیکھا۔ اگرچہ اس نے یہ قتل حالتِ اشتعال میں کیا لیکن قتل تو بہرحال قتل ہوتا ہے''۔

''اور مقتولہ اگر خاندانی کتیا ہو تو جرم کی شدت میں کتنا اضافہ ہوجاتا ہے''۔ راجو نے تبصرہ کیا۔

❖❖❖

ادھر دربار خاص میں فضلو مراثی نے تابو کی کمر پر پوری قوت سے جوتا رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہن گل کر بے حیا کڑیے......'' ضرب اتنی شدید تھی کہ تابو اپنی چیخ پر قابو نہ رکھ سکی۔

سارے حاضرین حاکم وقت کے طرف دار اور وفادار تھے۔ سب کتیا کی شرافت و نجابت کو یاد کر کے گہرے غم و غصے کا اظہار کررہے تھے۔ تابو اتنی قہر آلود نگاہوں کی تاب نہ لاسکی۔ اس کی گردن مزید جھک گئی۔ وہ شاہ کا ظلم تو شاید مسکرا کر برداشت کرلیتی مگر شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں کا رویہ برداشت نہ کرپائی کیونکہ وہ سب اس کے اپنے تھے اور اپنوں کی چوٹ ناقابل برداشت ہوا کرتی ہے۔

❖❖❖

''تابو کے پس منظر پر اگر تھوڑی سی روشنی ڈال سکو تو اس مقدمے کی وضاحت بھی ہوجائے گی''۔ رضوان نے

دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ سجاول اور ڈینی دونوں نے بیک وقت گھور کر اسے دیکھا۔ تھوڑی دیر تک ماحول پر سناٹا طاری رہا پھر وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

''تو اس کا مطلب ہے پتھر میں جونک لگنے کا وقت آ گیا ہے''۔ سجاول نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ''بخدا اگر ایسا ہو گیا تو سارے گاؤں کی قسمت بدل جائے گی''۔

''آپ سے جس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے اس پر توجہ دیں تو زیادہ مناسب ہوگا''۔ رضوان نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''تابو ہمارے گاؤں کے ماچھی گھرانے کی موم بتی ہے''۔ سجاول نے بتایا۔ ''چشم بد چراغ میں نے اس لئے نہیں کہا کہ مفلس گھرانے میں صرف موم بتی ہی روشن ہو سکتی ہے اور اس میں شک وشبے کی کوئی گنجائش بھی نہیں کہ تابو کے حسن و جمال کا اس وقت سارے گاؤں میں جواب نہیں۔ گاؤں کیا اس پورے علاقے میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تم نے اسے خرام ناز بکھیرتے نہیں دیکھا۔ نام تو اس کا مہتاب خاتون ہے مگر ایک ماچھن تو صرف ''تابو'' ہی ہو یا کہلا سکتی ہے۔ ماہ تاباں اور ''خاتون'' تو کمی کمین گھرانوں کا استحقاق ہی نہیں۔ خیر! ہمارے گاؤں کی تابو جب تھوڑی سی جوان ہوئی تو گویا ساکن جھیل میں پتھر گر گیا۔ تابو کے روشن ہوتے ہی سب کے چراغ گل ہو گئے۔ چراغ کیا آفتاب و مہتاب ہی بجھ گئے...... ویسے کتنی حیران کن بات ہے کہ ایک دور افتادہ دیہات کے پس ماندہ سے ماحول میں حسینان عالم کو چت کر دینے والی ہستی نے جنم لیا مگر کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں......''

''میرے خیال میں اگر آپ اختر شیرانی یا جان کیٹس کو تھوڑی دیر کے لئے بھول جائیں تو شاید ہم تابو کے متعلق کچھ زیادہ جان سکیں''۔ ڈینی نے مداخلت کی۔

''میں جانتا تھا کہ تم فوجی لوگوں میں وہ حس ہی نہیں ہوتی جو حسن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے اشد ضروری ہوتی ہے''۔ سجاول نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

''برخوردار! فوج کو مفت میں بدنام کرنے سے بہتر ہے کہ تم اس مقدمے پر روشنی ڈالو''۔ ڈینی نے سنجیدگی سے کہا۔

''اس تابو ماچھن نے ایک خوبصورت بکری پال رکھی تھی جسے وہ پیار سے چت پری کہا کرتی تھی''۔ سجاول نے موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''تابو کی اس بکری نے ایک میمنے کو جنم دیا جس کا نام شاہ بہرام رکھا گیا۔ شاہ بہرام اور چت پری میں اس تابو کی جان تھی۔ وہ میمنے کو گود میں اٹھائے گلی گلی پھرتی رہتی اور ممتا کی ماری چت پری اس کے تعاقب میں رہتی۔ سارے گاؤں میں ''یہ تکون'' مشہور تھی۔ اس نظارگی سے میں بھی اکثر لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ تابو اپنے شاہ بہرام کو ایک پل آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی اور چت پری دہری زنجیر محبت میں جکڑی اپنی مالکن کا سائے کی طرح پیچھا کرتی۔

ایک روز تابو گھریلو استعمال کے لئے ایک کیکر (ببول) کا درخت کاٹ رہی تھی۔ شاہ بہرام اس کے قریب قلانچیں بھر رہا تھا۔ ہمارا نوکر فضلو بڑے ملک صاحب کی چہیتی کتیا کو سیر کراتا ہوا ادھر آ نکلا۔ کتیا کتے کو زنجیر سے آزاد کر دیا جائے تو وہ ہمیشہ اپنی آزادی کے حصول کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ ان میں ضرورت سے زیادہ ''کتا پن'' پایا جاتا ہے۔ ہماری اعلیٰ نسل کی کتیا بھی ان تمام حرکات کی مرتکب ہو رہی تھی جو ''کت پنے'' کا خاصہ ہوتی ہیں۔ اسی اچھل کود میں اس کی نگاہ تابو کے شاہ بہرام پر جا پڑی۔ شومئ تقدیر سے عین اس وقت کیکر کا درخت تابو کی ضربوں سے کٹ کر زمین پر آ رہا۔ اعلیٰ نسل کی کتیا اچھل کر درخت کی زد سے تو بچ گئی مگر آتش زیر پا ہو کر بھونکنے لگی۔ تابو کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی مگر شاہ بہرام نہتا تھا۔ ویسے وہ ایک کمزور حریف تھا۔ نتیجہ یہ ہوا

کہ کتیا نے سارا غصہ معصوم میمنے پر نکالا...... اس نے ناتواں حریف کو گردن سے دبوچا اور تابو کے واویلا مچاتے مچاتے میمنے کو چیر پھاڑ کے رکھ دیا۔ تابو اس خونی منظر کی تاب نہ لا سکی۔ اس پر تو جانو دیوانگی طاری ہو گئی اور آنکھوں میں خون اتر آیا۔ آنکھوں میں جب خون اتر آتا ہے تو بُرے بھلے کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ اس دیوانی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ وہی کلہاڑی جس سے پیڑ گرایا تھا، کتیا کے سرِ پُرغرور پر دے ماری۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ اس ضرب میں دیوانی کا غم وغصہ بھی شامل تھا۔ اعلیٰ نسل کی کتیا تو ایک ضرب بھی برداشت نہ کر سکی اور بھونکے بغیر سفرِ آخرت اختیار کر گئی۔ تابو نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ زمیں بوس کتیا پر پے در پے وار کر کے اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کیا۔ فضلو کے لئے یہ صورت حال بڑی ہی ناخوشگوار تھی۔ ایک طرف گاؤں کی حسین وجمیل دوشیزہ دوسری طرف ملک صاحب کی لاڈلی کتیا۔ تھوڑی دیر بعد تابو عالم دیوانگی سے باہر آئی تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگی...... فضلو بھی ہوش کے دائرے میں آیا تو مصلحت خوف کا عالم غالب آ گیا۔

''اوئے خانہ خراب! یہ کیا ظلم کر دیا تُو نے''۔ کتیا کے رکھوالے نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب تو تجھے کولھو میں پیڑ دیں گے''۔

تابو خود اشتعال کا ریلا گزر جانے کے بعد آہوئے مرگ دیدہ کی طرح لرز رہی تھی۔ ایک طرف اس کے شاہ بہرام کی لاش پڑی تھی، دوسری طرف برتر نسل کی کتیا خون میں لت پت دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ پل بھر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ تابو نے ملک صاحب کی کتیا کو قتل کر دیا۔ جس نے سنا وہ دھک سے رہ گیا۔ کسی نے اسے قرب قیامت کی نشانی قرار دیا، کسی نے شامت اعمال کے نتیجے میں زلزلے کی نوید سنائی۔ اس طرح تابو ماچھن، کتیا کے قتل میں گرفتار ہوئی۔ آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ آپ حضرات کی آمد شاید فیصلے میں تاخیر کا باعث بن جائے۔ ملک صاحب کو علم ہے کہ فوج کے حساس ادارے سے بگاڑ سودمند نہیں ہوتا، دوسرے ایک اور وجہ بھی مجھے صاف دکھائی دے رہی ہے''۔

''وہ کیا؟'' رضوان نے اس انوکھی داستان کے سحر سے باہر آتے ہوئے سوال کیا۔

''ملک صاحب نے تمہیں بڑی ہی پسندیدہ نگاہوں سے نوازا ہے''۔ سجاول نے مسکرا کر کہا۔ ''مردم شناسی میں ملک صاحب کو یدطولیٰ حاصل ہے شاید تابو کی جاں بخشی ہو جائے''۔

''میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس مرد کی بچی سے ایک طویل ملاقات کی جائے''۔ رضوان نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

''کیا واقعی تم اس تابو کی جان بچانا چاہتے ہو؟'' سجاول نے بھی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے سوال کیا۔

''اس کی جان تو بچ ہی جائے گی مگر اس کی وجہ وہ نہیں جو تمہارے یا کسی اور کے ذہن میں آ سکتی ہے۔ میں اس خاتون کو کسی اور مقصد کے لئے تیار کرنا چاہتا ہوں''۔ رضوان نے وضاحت کی۔ ''ضرورت پیش آئی تو میں خود ملک صاحب سے بات کروں گا''۔

''خدا کے لئے ایسا کبھی نہ کرنا''۔ سجاول نے متنبہ کیا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیدا ہو۔ میرے ذہن میں ایک بڑی عمدہ تجویز آئی ہے۔ اس سے لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی اور سانپ بھی مر جائے گا''۔

''ایک بات ذہن میں رہے کہ میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یہاں قیام کر سکتا ہوں اور تمہارے پاس ایک خاص مقصد سے آیا ہوں۔ ذیل کا قیام البتہ طویل ہو سکتا ہے۔ یہاں کے مسائل میں میرا الجھنا نامناسب سا لگتا ہے''۔

''ملک صاحب کے اثر ورسوخ سے شاید تم واقف نہیں ہو۔ اس لئے میں تم دونوں کا ٹکراؤ ناپسند کرتا ہوں''۔ سجاول نے کہا۔ ''ان کو ہر اس کھیل سے دلچسپی ہے جس میں جوانمردی کا مظاہرہ ہو۔ میری یہ بات شاید غیر متعلقہ لگتی ہو مگر تمہاری ذات بلکہ اس سارے مسئلے کا اس شوق سے گہرا تعلق ہے۔ کل ہمارے گاؤں میں میلے کا انعقاد ہوگا۔ قرب وجوار کے تقریباً سارے گاؤں اس میں حصہ لیں گے اور میرے اندازے کے مطابق تم ملک صاحب کو اپنا گرویدہ بنا لو گے پھر دیکھنا ان کا کمال، تمہارے لئے وہ ایسے ایسے دروازے کھول دیں گے جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں نے بھی تو تم لوگوں کو ایک خاص مقصد کے لئے شہر سے اتنی دور آنے کی دعوت دی تھی۔ اس میلے کی وجہ سے تابو کا مقدمہ بھی التوا میں پڑ جانے کا امکان ہے......''

''افسوس ہم اپنا قیمتی وقت ان فضول میلوں ٹھیلوں میں برباد کر رہے ہیں اور اصل مسئلے کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں''۔ رضوان نے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔

''کیا کوئی خاص مسئلہ درپیش ہے؟'' اب سجاول بھی دوست کی سنجیدگی سے متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

''مسئلہ تو واقعی قومی اہمیت کا حامل ہے مگر تم ان میلوں وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ تو اطمینان سے بات ہو گی۔ شاید تمہیں اپنے بل سے باہر نکل کر میدانِ عمل میں آنا پڑے''۔

''یار! مجھے تو کم از کم ایک برس مزید اپنے بل میں رہنے دو۔ میں ایک بڑے اہم پراجیکٹ پر کام کر رہا ہوں۔ اس کے لئے جس ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہے وہ مجھے شہروں میں میسر نہیں آ سکتی''۔

''میرے خیال میں تو تم اپنا وقت سیر وشکار میں ضائع کر رہے ہو''۔ ڈینی نے مداخلت کی۔

''نہیں یار! وہ تو میں تھکن اتارنے کی خاطر کرتا ہوں''۔ سجاول نے وضاحت کی۔ ''ذہنی ورزش کے بعد ہاتھ پاؤں ہلانا جسم کو آرام پہنچانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اپنے کام سے تو میں ایک پل بھی غافل نہیں رہتا''۔

''ویسے یہ میلہ کس خوشی میں لگ رہا ہے؟'' ڈینی نے سوال کیا۔

''یہ ہمارے علاقے کا مزاج ہے۔ چھوٹے بے سروسامان لوگ اسی بہانے وقت کے لمحات سے اپنے حصے کی خوشیاں کشید کر لیتے ہیں اور طبقہ اعلیٰ کے افراد اپنی سوائی منوا کر مسرور ہو لیتے ہیں۔ بڑے ملک صاحب جیسے حضرات کو اپنی ملکیت کے اظہار کا موقع ایسی تقریبات ہی میں ملتا ہے''۔ سجاول خاں نے میلے کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔

❖❖❖
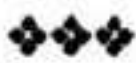
شام کے کھانے پر ملک حاکم خان گہری تفکیر میں مبتلا تھا۔ وہ بار بار سجاول کے مہمانوں کا جائزہ لیتا پھر اس کی نگاہ اپنے جواں سال فلک شیر پر آ کر ٹک جاتی۔

''تایا جان! آپ کس فکر میں مبتلا ہیں؟'' سجاول خان نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ ''وہ تابو والا مسئلہ تو نہیں......''

''او نئیں جھلا پتر! وہ بھی کوئی فکر مند ہونے والی بات ہے''۔ بڑے ملک صاحب نے سجاول کا فقرہ بھی پورا نہ ہونے دیا۔ ''میں تو نور پوریوں کے ڈُلے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کل کبڈی میں اس کا مقابلہ کون کرے گا؟''

''اپنا فلک شیر کسی سے کم ہے کیا؟'' سجاول نے قد آور بھائی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''نہ پتر! نہ، ڈُلا مرد مار قسم کی شے ہے۔ دھوکا فریب مکاری میں اپنا فلک شیر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا''۔

''تایا جان! نور پور والوں کے پاس ایک ڈُلا ہے۔ اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ اندیشے والی کوئی بات نہیں''۔

کھانے کے دوران دوسرے روز ہونے والی تقریب ہی زیر بحث رہی۔ ڈینی اور رضوان اس بات پر حیران ہو رہے تھے کہ کھیل تماشے کو یہ لوگ زندگی اور موت کا مسئلہ بنائے بیٹھے تھے۔ قومی مسائل کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ زمانہ کس قیامت کی چال چل رہا ہے۔ اس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ تھا۔ کبڈی کے ایک کھلاڑی کو نیچا دکھا کر اپنی انا کی تسکین ان کے ہاں اہم ترین مسئلہ تھا۔

❖❖❖

گاؤں سے باہر رڑی (کھلے میدان) میں رجکوٹ، ڈسجکوٹ، نور پور، حاکم پور اور گرد و پیش کے مختلف علاقوں سے آنے والے تماشائیوں کا جم غفیر دکھائی دے رہا تھا۔ ملک حشمت پوری تیاری سے اپنے جوانمردوں کے جلو میں آیا تھا۔ اس نے سیاسی چال یہ چلی کہ ملک حاکم خاں کو منصف اعلیٰ قرار دے دیا۔ ہر میدان میں اپنی فتح کے کامل یقین کے پیش نظر وہ چاہتا تھا کہ اس کا حریف اپنی شکست کا اعلان خود اپنی زبان سے کرے۔ اس طرح اپنے سامانِ تضحیک میں آخری کیل بھی خود ہی ٹھونکے۔

کھلاڑی اپنے اپنے ڈھول کی تال پر رقص کرتے ہوئے میدان میں اترے۔ راجو، ڈینی اور سجاول خان تماشائیوں میں شامل تھے۔ پہلے مقابلے کا اعلان ہوتے ہی لوگ ایک وسیع و عریض گول دائرے میں کھڑے ہو گئے۔ نور پور کا جیونا مسلی نعرہ مار کر میدان میں اترا اور اپنا بایاں بازو بلند کر کے کھڑا ہو گیا۔ یہ تمام جوانوں کو چیلنج تھا کہ کوئی مائی کا لال "بینی" پکڑنے میں اس کا مقابلہ کرے۔ یہ پنجاب کا ایک مشہور کھیل ہے۔ اس میں ایک شخص مبارزت طلبی کرنے والے کی کلائی دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیتا ہے۔ چیلنج کرنے والا دائیں ہاتھ سے اپنی کلائی حریف کے شکنجے سے آزاد کراتا ہے۔ اس میں فنی مہارت تو بہرحال درکار ہوتی ہے لیکن اگر بازوؤں میں کس بل نہ ہوں تو سارا فن دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

حاکم پور کے ایک مضبوط قد کاٹھ والے نوجوان نے ناٹے قد والے دبلے پتلے جیونے کا چیلنج قبول کر لیا اور اس کی کلائی آہنی شکنجے میں جکڑ لی۔ جیونے نے "یا علیؑ" کا نعرہ بلند کیا اور ایک ہی جھٹکے سے اپنی کلائی آزاد کرا لی۔ اب حسب دستور جیونے نے حریف کی کلائی پکڑی تو حریف ہزار کوشش کے باوجود اس شکنجے سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ منصف کے اشارے پر جیونے نے حریف کی کلائی چھوڑ دی۔ ملک حشمت نے اپنے ناٹے قد والے کھلاڑی کی پیٹھ ٹھونکی اور ایک دھماکا خیز اعلان کیا۔

"جو شخص ہمارے جیونے کو شکست دے گا اسے نیلی بار کی ایک عدد بھینس بطور انعام دی جائے گی"۔

یہ بہت بڑا اعلان تھا کیوں کہ "پڑ" میں ایک سے ایک شہ زور جوان موجود تھا۔ حاکم خان نے اپنے ایک شہ زور کو اشارہ کیا۔ لمبا تڑنگا نوجوان میدان میں اترا تو جیونا پھدکتا ہوا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ قد آور نوجوان نے اپنا بایاں بازو بلند کیا تو جیونا اس تک پہنچ ہی نہیں پا رہا تھا۔ تماشائیوں کو اپنے قہقہوں پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ جیونے نے اچانک اچھل کر حریف کی کلائی پکڑ لی۔ اب ایک نئے تماشے کا آغاز ہوا۔ قد آور نوجوان ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے اور جیونا جونک کی طرح کلائی سے چمٹا ہوا ہے۔ نوجوان نے ہر داؤ آزمایا مگر اپنی کلائی آزاد نہ کرا سکا۔ اپنی خفت مٹانے کے لئے قد آور نوجوان نے اپنا بازو بلند کر دیا۔ جیونا توری کی طرح لٹکنے لگا مگر اس کی گرفت میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ ہجوم نے دل کھول کر جیونے کو داد دی۔ اس طرح نور پوری بھینس حاکم پور نہ پہنچ سکی۔ یہ نور پور والوں کی پہلی فتح تھی۔ میدان گرم ہو چکا تھا جب "چھمل کبڈی" کا اعلان ہوا۔ ڈھولچی نے ڈغا تیز کیا۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی میدان میں اترے۔ فلک شیر

اور ڈلا ماچھی اپنی اپنی ٹیم کے کپتان تھے۔ دونوں نے منصف سے ہدایات وصول کیں۔ ہاتھ ملائے اور کھیل کا آغاز ہوا۔ فلک شیر کا جسم سانچے میں ڈھلا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر ڈلے کے سراپا پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ رانوں اور بازوؤں کی مچھلیاں پارے کی طرح پھڑک رہی تھیں۔ پتلی کمر چوڑا سینہ، فصیل جاں میں بلا کی پھرتی۔ آدھی بازی تو وہ اپنی دہشت ہی سے جیت لیا کرتا تھا۔

کھیل کا آغاز فلک شیر نے کیا۔ وہ حریف کی "ہو" میں گیا، باز کی طرح جھپٹا اور مخالف ٹیم کے ایک کھلاڑی کو چت کر کے واپس آ گیا۔ حاکم پوریوں نے فلک شگاف نعرے سے اس کی کارکردگی کو سراہا۔ اب مخالف ٹیم کی باری تھی۔ ڈلے نے آ کر فلک شیر اور نائب کپتان قادر کو للکارا پھر برق رفتاری سے جھپٹ کر ایک تیسرے کھلاڑی کے سر پر "تھاپ" رسید کی۔ یہ اصولاً غلط تھا مگر جوانمردی کے کھیل میں اس قبیل کی چھوٹی موٹی اشتعال انگیزیاں درگزر کی جاتی ہیں۔

"عذر اے!" فلک شیر نے بہ آواز بلند کہا یعنی ہمیں حریف کی اس حرکت پر اعتراض ہے۔

"عذر بھن گھنوں" ڈلے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا یعنی اعتراض کا ازالہ کئے دیتے ہیں۔

حشمت نے میدان میں کود کر ڈلے کو بظاہر سرزنش کی مگر ایک آنکھ میچ کر زیر لب کہا۔ "دبا رکھ" یہ کارروائی البتہ خلاف دستور تھی۔ منصف کی موجودگی میں کسی کو "پڑ" میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی مگر حاکم خان اسے نظر انداز کر گیا۔

کھیل کا آغاز ہوا تو ڈلے نے چیتے کی طرح چھلانگ لگائی اور قادر کے سر پر سے ہوتا ہوا میدان کے کونے میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ قادر سپرنگ کی طرح اچھلا، ہوا میں گویا تیرتا ہوا حریف کی طرف لپکا اور قینچی مار کر ڈلے کی ٹانگوں کو اپنی ٹانگوں میں جکڑ لیا۔ اس داؤں سے نجات حاصل کرنا بڑا دشوار مرحلہ تھا مگر ڈلے نے حریف کی قینچی سے نجات حاصل کر لی اور بلیاں لگاتا اپنی ٹیم میں آ گیا۔

کھیل جاری رہا۔ رفتہ رفتہ نور پوری ٹیم کا پلہ بھاری ہونے لگا تو فلک شیر جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے ایک حریف کو وہاں ضرب لگائی جہاں کوئی سپورٹس مین ہٹ نہیں کرتا...... اس نے اپنا پاؤں ہتھوڑے کی طرح حریف کے فوطوں پر مارا۔ نور پوریوں کا یہ کھلاڑی نہ صرف ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا بلکہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ تماشائی میدان میں گھس گئے مگر حاکم خان جائے واردات پر پہنچا۔ اس نے خلق خدا کو "پڑ" خالی کرنے کا حکم دیا۔ زخمی کو فوراً طبی امداد کے لئے گاؤں روانہ کیا اور فلک شیر کو نااہل قرار دے کر میدان سے نکل جانے کا حکم دیا۔

"ملک صاحب! یہ جوانوں کا کھیل ہے، اس میں زخموں کا لین دین تو ہوگا"۔ چوہدری حشمت نے منصف کے فیصلے پر احتجاج کیا۔ "اس میں فلک شیر کا کوئی قصور نہیں۔ قصور سراسر ہمارے احمق کھلاڑی کا ہے۔ اس بے وقوف نے حریف کا وار جسم کے نازک ترین حصے پر روکنے کی حماقت کی۔ اب خمیازہ تو اسے بھگتنا ہی تھا"۔ اب یہ ایک ایسی تشریح تھی جیسے کوئی تجربہ کار وکیل ذہانت بھری دلیل سے جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھاتا ہے۔ "ملک صاحب! کوئی بات نہیں ہم آپ کی اجازت سے متبادل کھلاڑی میدان میں لے آتے ہیں"۔

"میری طرف سے اجازت ہے"۔ حاکم خان نے فراخ دلی سے اجازت دے دی۔

"ادئے دارے پتر! شروع کر تماشا"۔ حشمت خاں نے ایک درمیانے قد کے خونخوار چہرے والے نوجوان کو اشارہ کیا۔

"جو حکم سرکار! پر حد کیہ ہے؟" (جانا کہاں تک

ہے)

''جھلیا، کوئی حد نہیں''۔ چوہدری نے زہریلی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''موج کر موج، باقی میں سنبھال لوں گا''۔

''ڈینی یار! مجھے خون کی بو آ رہی ہے''۔ رضوان نے سرگوشی کی۔

'یہ دارا کیا شے ہے بھئی؟'' ڈینی نے سجاول سے پوچھا۔

''یہ پیشے کے اعتبار سے تو توبہ (ڈبکی لگانے والا) ہے مگر علاقے کا وحشی ڈکیت ہے''۔ سجاول نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''رب خیر کرے مجھے فلک شیر کی جان خطرے میں دکھائی دیتی ہے''۔

''سجاول خان! یہ کھیل تماشا ہے یا میدان جنگ''۔ رضوان عرف راجو راکٹ نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ ہماری جہالت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہم اپنی صلاحیتوں کو اسی انداز میں ضائع کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس ڈاکو لٹیرے کو چوہدری حشمت کا تحفظ حاصل ہے اور یہ فیل بے زنجیر بنا پھرتا ہے''۔ سجاول نے بڑے غور سے رضوان کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے خیال میں یہ نیک کام اب تمہیں سرانجام دینا ہی پڑے گا۔ یار! اس ناسور سے علاقے کو نجات دلا ہی دو''۔ سجاول نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو رضوان گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

''یار! میرا کام اپنوں کی حفاظت ہے نہ کہ ان کو زخم عطا کرنا''۔ راجو نے دلیل پیش کی۔

''اپنے خواہ ہڑکائے کتے کا کردار ادا کرنے لگیں؟'' سجاول نے دوست کی دلیل کو رد کر دیا۔

یہ لوگ محو گفتگو ہی تھے کہ ادھر دارے نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ وہ مخالف ٹیم میں یوں گھسا جیسے بھوکا بھیڑیا بکریوں کے ریوڑ میں گھس جاتا ہے۔ فلک شیر نے اس طوفان کو روکنے کی کوشش کی مگر دارے نے اچھل کر اپنی دونوں ٹانگیں اس کی چھاتی پر رسید کیں۔ حریف زمیں بوس ہوا اور لڑکھڑا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دارا پہلے سے تیار کھڑا تھا۔ اس نے بپھرے ہوئے بھینسے کی طرح فلک شیر کے سینے پر ٹکر ماری۔ فلک شیر نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور دارا اسے چاولوں کی بے جان بوری کی طرح کاندھے پر لاد کر خراماں خراماں اپنی ٹیم کی طرف چلنے لگا۔ تماشائی دم سادھے یہ کارروائی ملاحظہ فرما رہے تھے۔ فلک شیر نیم بے ہوشی کے عالم میں حریف کے کاندھے پر کسمسانے لگا، دارا نے اسے تول کر سر سے بلند کیا اور ناگوار بوجھ کی طرح زمین پر پٹخ دیا۔ معاملہ کبڈی کی حدود سے تجاوز کر گیا تھا۔ حاکم پوری ٹیم اپنے کپتان کی سابقہ زیادتی کی وجہ سے لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

قادر اپنی باری لینے مخالف ٹیم کی حدود میں داخل ہوا تو دُلے نے اس کا بھرکس نکال دیا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے واپس آیا اور آتے ہی زمین پر گر گیا۔ اب حاکم پوری ٹیم اپنے کپتان اور نائب کپتان کے بغیر میدان میں کھڑی تھی۔ بے سالار قافلہ اور بے پتوار کشتی دونوں کے نصیب میں منزل کہاں...... حاکم خان نے اپنے حریف چوہدری حشمت خاں کو منصفی قبول کرنے کی درخواست کی۔ اس وقت نور پور کی ٹیم کوسوں آگے تھی۔ وقفے کا اعلان ہوا۔ حشمت خاں نے زیر لب مسکراتے ہوئے منصفی قبول کر لی۔

کھیل کا ازسر نو آغاز ہوا تو حالت یہ تھی کہ حاکم خان کی ٹیم کے ہر جوان کو ہر حریف دارا اور دُلا دکھائی دے رہا تھا۔ انسان ہمت ہار بیٹھے تو اس کے دامن میں ہارنے کے لئے مزید کچھ نہیں رہتا۔ حاکم خان فرائض منصفی سے سبکدوش ہو کر اپنی ٹیم کو حوصلہ دینے کی سر توڑ

کوشش کر رہا تھا۔

''اوئے ڈوب مرو بے غیرتو! کیوں میری مٹی پلید کرنے پر تلے بیٹھے ہو''۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ سب کو کچا چبا ڈالتا۔ آخر اس نے گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کی ایک آخری کوشش کی۔

''ہماری ٹیم کا ہر کھلاڑی جتنے پوائنٹ حاصل کرے گا اتنے کلّے زمین کا وہ حق دار ہوگا۔ دارے کو شکست دینے والے کے نام ایک مربع زمین کر دی جائے گی''۔

یہ پُرکشش ترغیب بھی ناکام ہوگئی پھر وہ مایوس ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھا۔

''تایا جان! یہ مایوسی آپ کی شان کے خلاف ہے''۔ سجاول نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''فکر کی چنداں ضرورت نہیں، فتح آپ ہی کی ہوگی۔ میں نے نور پور کی ٹیم کا توڑ تلاش کر لیا ہے''۔

''برخوردار! تم کوئی جادوگر نہیں ہو''۔ حاکم خان نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''سجاول پتر! اگر کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو ہماری قبر کا انتظام کر دو۔ یہ ذلت اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ ہار جیت کی بات نہیں، ذرا دیکھو تو ہمارے جوان کیسے ڈرپوک ''کتوروں'' کی طرح سہمے کھڑے ہیں۔ فلک شیر زخموں سے چُور بے ہوش پڑا ہے۔ تمہارے قبضے میں کون سا جن ہے جو مخالف ٹیم کو کھا جائے گا؟''

''جن نہیں تایا جان! کالا دیو کہیں''۔ سجاول خان نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''میری ملکیت میں فوج کا مایہ ناز کمانڈو رضوان ہے۔ بس آپ ایک متبادل کھلاڑی کی اجازت طلب کریں باقی کام اوپر والے پر چھوڑ دیں''۔

حاکم خان نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھتے ہوئے منصف سے ایک متبادل کھلاڑی کی اجازت طلب کی۔ ویسے بھی ان کی ٹیم کے دو کھلاڑی زخمی ہو چکے تھے۔ ان کو دو متبادل کھلاڑیوں کا استحقاق تھا۔ چوہدری حشمت نے خندہ پیشانی سے اجازت مرحمت فرما دی۔

''راج پتر! تم ہمیں اس وقت خرید سکتے ہو''۔ حاکم خان نے اپنا سارا دبدبہ لپیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اس تذلیل کی خبر ہوتی تو اس سال مقابلے میں شریک ہی نہ ہوتے یا دارے کا بندوبست کر کے شریک ہوتے''۔

''ملک صاحب! بندے کا کام صرف کوشش کرنا ہے۔ فتح و شکست تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے''۔ راجو نے جواب دیا۔

کسی نے ٹیم میں اس اضافے کو اہمیت ہی نہ دی۔ صرف ایک شخص نے حیرت سے نئے کھلاڑی کو گھور کر دیکھا۔ وہ دارا ڈکیت تھا۔ اس نے چپکے سے آ کر منصف کے کان میں کھسر پھسر کی، منصف نے سرگوشی پر یقین کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ''میں ان خرافات پر یقین نہیں رکھتا، کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا''۔

''شاہ جی! میں نے خود اپنی ان گنہگار آنکھوں سے اس نوجوان کو جنگلی بھینسے سے لڑتے دیکھا تھا''۔ دارا ڈکیت نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''اس نے بھینسے کو پسپا کر دیا تھا۔

''تو تم آج اس کی گردن توڑ دو، حساب برابر ہو جائے گا''۔ حشمت خان نے حکم صادر فرما دیا۔

''جو حکم سائیں! مگر ذمے داری آپ کی ہوگی''۔

''اوئے جھلیا! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، جا...... جا کر عیش کر۔ کوئی تیری ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھ سکتا''۔

''حشمت خان! یہ کھسر پھسر بند کرو اور کھیل شروع کراؤ''۔ حاکم خان نے بدلے ہوئے لہجے میں آواز دی۔

کھیل کا از سرِ نو آغاز ہوا۔ دارا نے ڈُتے کو ''کوڈی ڈالنے'' کا اشارہ کیا۔ وہ بکلی لگاتا، بڑھکیں مارتا ہوا آیا تو راجو اطمینان سے اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں

نے بغور ایک دوسرے کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا۔
ڈلا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا پھر برق رفتاری سے بھاگتا ہوا حریف کی طرف آیا اور اپنے پسندیدہ انداز میں اس نے چھلانگ لگائی۔ وہ حریف کو الاہنگ کر مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ حریف کے عین سر کے اوپر پہنچا تو تماشائیوں نے حیرت انگیز مظاہرہ دیکھا۔ رضوان نے سپرنگ کی طرح اچھل کر ہوا میں الٹی قلابازی لگائی۔ اس کے دونوں پاؤں ہتھوڑے کی طرح ڈلے کی پشت پر لگے۔ ڈلے کی ائر سپیڈ میں یکلخت یوں اضافہ ہوا جیسے جیٹ لڑاکا طیارے کا آفٹر برنر After Burner آن کر دیا گیا ہو۔ ساتھ ہی اس کا توازن بھی بگڑ گیا اور وہ منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ اسی وقت راجو بھی پنجوں کے بل زمین پر آیا۔ اس نے گھٹنوں کو تھوڑا سا آگے جھکا کر بڑے فنکارانہ انداز میں اپنے توازن کو برقرار رکھا۔ یوں لگا جیسے کسی ماہر چھاتا بردار نے زمین پر "لینڈ" کیا ہو۔

ڈلا ابھی زمین سے اٹھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس کی کلائی آہنی شکنجے میں آ گئی۔ اس نے اس آہنی گرفت سے آزاد ہونے کے ہزار جتن کئے مگر بری طرح ناکام رہا پھر رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ تماشائیوں کے لئے یہ ایک حیران کن منظر تھا۔ راکٹ کی رفتار سے راجو کی ٹانگ حرکت میں آئی تو ڈلا زمین بوس ہو گیا۔ اس کی کلائی بدستور شکنجے میں تھی۔ آخر اس نے اپنے آزاد ہاتھ کو بلند کر کے اعتراف شکست کر لیا۔ اہل حاکم پور جو تھوڑی دیر پہلے خجل خجل سے، شرمسار سے دکھائی دے رہے تھے، یکلخت گویا حصار شرمندگی سے باہر آ گئے اور فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔ ہر شخص جوش و خروش کا مظاہرہ اس انداز میں کر رہا تھا جیسے ڈلے کو شکست دینے والا وہی ہو۔ منصف کے اشارے پر راجو نے حریف کی کلائی چھوڑ دی اور معتدل رفتار سے چلتا ہوا مخالف ٹیم کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے جز پرواز کرنے کی خاطر دارے کو مقابل آنے کا اشارہ کیا۔ تماشائیوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ دارے ڈکیت کی دہشت کا طلسم اتنا پائیدار تھا کہ اسے چیلنج کرنا، ناظرین کے خیال میں موت کو دعوت دینا تھا۔

"اوئے تیرا نام دارا ہے؟" راجو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"نام دی کی لوڑ پے گئی جوان! کوڈی کھیڈنے آئے ہو کہ تفتیش کرنے؟" دارا نے بے پروائی سے کہا۔

"سنا ہے تم چوری شوری بھی کرتے ہو اور لوگوں سے کہتے پھرتے ہو کہ تمہیں دہشت گرد کہا جائے؟"

"چوری شوری!" دارے نے حیران کن نگاہوں سے حریف کو دیکھا لیکن جب توہین آمیز مفہوم آشکار ہوا تو اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "تم نے ڈاکو سردار خان کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ اس نام سے مائیں اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں"۔

"ڈراتی تھیں کہو"۔ رضوان نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آج کے بعد وہ تم پر ترس کھایا کریں گی۔ کیونکہ تم اپنے پیشے سے تائب ہونے والے ہو"۔

دارا کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ اس نے برق رفتاری سے لپک کر حریف کو کمر سے دبوچ لیا اور اٹھا کر زمین پر پٹخنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اپنی کوشش میں قدرے کامیاب بھی ہوا۔ راجو زمین سے کوئی چھ سات انچ بلند بھی ہوا لیکن اچانک اس نے پوری قوت سے حریف کے دونوں کانوں پر تالی بجائی۔ دارا کے دماغ میں گویا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ سائیں سائیں کی عجیب و غریب صدائیں آنے لگیں۔ اس شور کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ جاں لیوا عذاب تو اس کے دماغ کے اندر سے پھوٹ رہا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں دبوچا ہوا حریف کا وجود فوراً چھوڑ دیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ لئے۔ وہ بزعم خویش کرخت شور کا راستہ

روک رہا تھا۔ یہ ساری کارروائی بس آناً فاناً ہی ہوگئی۔ اس نے دو تین بار سر کو جھٹکا۔ آنکھوں کے سامنے رقص کرنے والے رنگین ستارے پہلے ساکن ہوئے پھر رفتہ رفتہ غائب ہونے لگے تو وہ اچھل کر حریف سے چند قدم دور ہٹ گیا۔ اس کا زبردست حفاظتی نظام حریف کی چوٹ کو برداشت کر گیا۔

"اوئے لنگور کی اولاد! تم نے مجھے اپنی گرفت میں لینا ہے"۔ رضوان نے ہلکی سی چوٹ کی۔ "اس اچھل کود اور مداری کی طرح سر جھٹکنے کو چھوڑ دو اور مجھے پکڑنے کی کوشش کرو۔ آخر کوشش کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟"

ہجوم بے کراں کو سانپ سونگھ چکا تھا۔ ملک حاکم اور منصف دم بخود یہ طرفہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ شہ زور دارا حریف کو چھوڑ کر اچانک پیچھے کیوں ہٹا ہے۔ سجاول یا ڈینی ہی بات کی تہہ تک پہنچے تھے کہ دارے کو دن میں تارے نظر آ رہے ہوں گے۔

دارا کے حواس بجا ہو چکے تھے۔ اس نے اچھل کر "قینچی" ماری مگر اس کی دونوں ٹانگیں حریف کو جکڑنے کے بجائے ہوا کو کاٹ کر رہ گئیں۔ وہ فرش زمین پر چاروں شانے چت پڑا آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے صدق دل سے حریف کی برق رفتاری کو سراہا۔ راجو نے اچھل کر اپنا پاؤں دارا کے سینے پر رکھ دیا۔ دارے نے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حریف کا پاؤں قابو کر لیا...... اس کی پکڑ لاجواب مشہور تھی۔

"یار! تیرا تعلق تیسری جنس سے تو نہیں؟" راجو نے اسے طیش دلانے کی کوشش کی۔ "پاؤں پڑنے یا پکڑنے سے کام نہیں چلے گا، اٹھ کر میرے گلے پڑو"۔

دارا اس توہین آمیز گفتگو کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے واقعی حریف کا پاؤں چھوڑ دیا پھر اچانک وہ ہتھیلیوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوگوں نے دیکھا کہ اس نے راجو کی گردن اپنی ٹانگوں کے شکنجے میں جکڑ رکھی ہے۔

اس وقت وہ حریف کی پشت کی جانب کھڑا تھا۔ راجو رفتہ رفتہ کمان کی طرح پیچھے کی جانب جھکتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس کا سر زمین سے ایک فٹ کے فاصلے پر آ گیا۔ یہ کسی ہسپانوی رقاصہ کا انداز تھا۔ اچانک راجو نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر الٹی قلابازی لگا دی اور اپنی گردن آزاد کرا لی۔ "مسٹر دارا! یہ صرف تمہید تھی، میں پھر آؤں گا"۔ یہ کہہ کر وہ قلانچیں بھرتا ہوا اپنے ساتھیوں میں آ شامل ہوا۔

بڑا ملک ساری شان و شوکت نظرانداز کرتے ہوئے بے صبر تماشائی کی طرح بھاگتا ہوا آیا اور راجو سے لپٹ گیا۔ "اوئے صدقے شیر پترا! اوئے...... اوئے"۔ شدت جذبات سے اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"لوگو! گواہ رہنا، میں نے دس مربع زمین اپنے ایس شیر پتر دے ناں لائی"۔ ملک صاحب نے اسی جگہ راجو کا ہاتھ بلند کر کے بہت بڑا اعلان کیا۔ دوسرے تماشائی بھی "پڑ" میں اپنی ٹیم کے گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ منصف نے تمام لوگوں کو دور ہٹایا اور کھیل جاری رکھنے کا حکم دیا۔

"چوہدری جیسا! کوئی ہور ساہن کڈھ میدان وچ۔ تینڈے داند کسی تھمبے گئے"۔ (کوئی اور سانڈھ نکالو میدان میں تمہارے بیل خصی ہو گئے) ملک صاحب نے مونچھوں کو تاؤ دے کر للکارا۔

حریف ٹیم کا مورال ریتلی دیوار کی طرح گر گیا۔ وہی حاکم پور کے کھلاڑی جو کنی کترا رہے تھے کامیابی کے جھنڈے گاڑنے لگے۔ بزدلی اور بہادری دونوں متعدی امراض کی طرح پھیلتی ہیں۔ راجو راکٹ نے حرف آخر کے طور پر ایک ایسا اعلان کیا کہ تماشائی بس دنگ رہ گئے۔ اس نے غنیم کے "پڑ" میں جا کر سیدھا سیدھا دارے کو چیلنج کر دیا۔ دارے نے فوراً یہ چیلنج قبول کر لیا اور

خم ٹھونک کر راجو کے سامنے آ گیا۔
"بس بندیا! تیری حد ختم ہوئی"۔ دارے نے ناگ کی طرح پھنکار کر کہا۔ "اب کھیل تماشے کا سمے بیت گیا"۔
"سردارے! کوئی شے ختم نہیں ہوئی"۔ رضوان نے سرسری لہجے میں کہا۔ "عزیزم! ابھی تو کھیل کا آغاز ہوا ہے"۔
"شاید تُو ٹھیک ہی کہتا ہے۔ بات اب کھیل تماشے کی نہیں رہی"۔
"بڑی دیر میں سمجھے ہو"۔ رضوان نے کہا۔ "ناکارہ اور خطرناک اشیاء سے خلقِ خدا کو نجات دلانا میرا پیشہ ہے"۔
دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے محوِ گفتگو تھے۔ نور پور ٹیم کے ایک کھلاڑی نے اس موقع پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی مگر دارے نے گرج کر اسے منع کر دیا۔ "کوئی شخص مداخلت کی جرأت نہ کرے۔ فیصلہ ہم دونوں میں ہوگا اور میدان سے صرف ایک بچ کر جائے گا"۔ پھر وہ راجو سے مخاطب ہوا۔ "میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی؟"
"بات تو بالکل درست ہے مگر تمہارے سامنے ابھی ایک راستہ کھلا ہے"۔
"کیا مطلب؟"
"چوری چکاری سے تائب ہو کر خلقِ خدا سے معافی مانگ لو"۔
دارے کو جیسے بجلی کے ننگے تار نے چھو لیا لیکن وہ رزم و بزم دیدہ انسان تھا اور اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ حریف اسے اشتعال دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے موت کا کھیل ٹھنڈے مزاج سے کھیلنے میں فائدہ ہوتا ہے۔ اس نے صرف اسی قدر کہا۔ "یار! تم سے اس قدر اوچھے وار کی امید نہ تھی"۔ یہ کہتے ہی وہ حریف پر حملہ آور ہوا اور خطرناک کھیل کا آغاز ہو گیا۔
دونوں فنکارانہ انداز میں ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے۔ کوئی بھی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا۔ دونوں کے اندازِ نبرد آزمائی میں فرق صرف یہ تھا کہ راجو راکٹ فوجی کمانڈو یعنی پیشہ ور کھلاڑی تھا اور اس کا حریف فنِ حرب و ضرب میں ماہر ہونے کے باوجود فنی باریکیوں کو نظرانداز کر سکتا تھا۔ وہ زخم لگانے میں بے شک طاق تھا لیکن زخم کھانے کے فن سے آشنا نہیں تھا اور فوج میں تو پسپائی کے بھی ضوابط ہوتے ہیں۔ تماشائی بھی اس انوکھے تماشے کو دھڑکتے دلوں سے دیکھ رہے تھے۔ راجو اکثریت کے دلوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔ لہٰذا ان کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں لیکن میدان میں ہمدردیاں نہیں زورِ بازو کام آتا ہے۔ یہ جنگ پندرہ بیس منٹ تک جاری رہی۔
رضوان اچانک پینترا بدل کر پیچھے ہٹ گیا اور پھر کئی قدم ہٹتا چلا گیا۔ حریف نے چونک کر اسے دیکھا۔ یہ اچانک پسپائی تھی اس کی سمجھ میں نہ آئی لیکن وہ کسی خطرناک وار کے لئے فیصل جاں کو تیار کرنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ فیصلہ کن گھڑی آ پہنچی ہے یا اِدھر یا اُدھر۔ یہ خیالات اس کے ذہن میں گردش کر ہی رہے تھے کہ حریف راکٹ کے سے انداز میں اسے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ دارے نے فوراً اپنا خطرناک داؤ کھیلا اور اچھل کر دونوں ٹانگوں سے راجو کی گردن میں قینچی ڈالنے کی کوشش کی۔ راجو نے بجلی کی تیزی سے اس کی دونوں ٹانگوں کو ہوا میں ہی دبوچ لیا اور اسے الٹا کر کے اس کی کمر پر بیٹھ گیا پھر اس نے ایک ہاتھ بلند کیا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کھڑے ہاتھ کا وار کیا۔ دارے کے منہ سے آہ نکل گئی۔ سب نے جان لیا کہ دارا ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گیا ہے۔ اس کی حیثیت اب کمر ٹوٹے سانپ جتنی تھی۔ خاموش تماشائی بنے حریف کھلاڑی، اچانک ہوش میں آئے۔ انہوں نے مداخلت کا ارادہ کیا تو سجاول خان

اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے میدان میں آ گیا۔

"احمقو! ہوش کے ناخن لو، کھیل ختم ہو چکا ہے۔ قتل و غارت کو مزید دعوت نہ دو۔ اس شخص سے تم واقف ہی نہیں ہو۔ یہ اگرچہ اپنا تعارف کرا چکا ہے لیکن یہ تعارف بھی نامکمل تھا۔ اس شخص کی تربیت دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کے لئے فنکار ہاتھوں نے مکمل کی ہے اور تم لوگ دشمنوں میں شمار نہیں ہوتے"۔ اس تقریر دل پذیر کا یہ اثر ہوا کہ خود منصف نے کھیل ختم ہو جانے کا اعلان کر دیا۔ ملک حاکم کے درباریوں نے رضوان کو کاندھوں پر اٹھا لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے ماما! ان سے کہو مجھے نیچے اتاریں"۔ رضوان نے سجاول سے کہا۔

"یہ بدتمیزی نہیں، لوگوں کا اظہار عقیدت ہے"۔ سجاول نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "چپکے سے بیٹھے رہو ورنہ میں تمہیں اس جگہ سے قابو کروں گا جہاں سے سگ خونخوار، ریچھ کو قابو کرتا ہے"۔

فاتح گاؤں میں اس رات چراغاں ہوا۔ حاکم خاں نے اپنی حویلی کو بقعہ نور بنانے کا حکم دیا۔ جانور ذبح کئے جا رہے تھے۔ دیگیں پک رہی تھیں۔ ملک صاحب نے دعوت عام کا انتظام کیا۔ راجو کو لوگ ایک عجوبے کی طرح دیکھ رہے تھے۔

وہی دربار تھا وہی درباری جہاں راجو نے رسن بستہ تابو کا نظارہ کیا تھا۔ سوگوار نگاہوں نے اس کے دل پر دستک دی تھی اور اس نے دل کا دروازہ لاشعوری طور پر کھول دیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ درباریوں کے علاوہ مبارک باد دینے والے لوگ بھی وہاں موجود تھے اور ملک حاکم کا چہرہ فتح کی خوشی سے ہشاش بشاش تھا۔ اس نے اپنے سابقہ اعلان کی توثیق کی۔ "آج ہم نے دس مربع زمین اپنے شیر پتر راجو کے نام کی جس نے ہماری لاج رکھی بلکہ ہمارے طرے کو بلند کر دیا"۔

"ملک صاحب! یوں سمجھ لیں کہ آپ نے مجھے زمین دے دی اور میں نے وصول کر لی"۔ رضوان نے پُروقار لہجے میں کہا۔

"شیر پتر! اگر یہ کم ہے تو ہم اس میں اضافہ......"

"ملک صاحب! زمین تو بندے کے لئے بس دو گز ہی کافی ہوتی ہے۔ میں اتنی زمین لے کر کیا کروں گا"۔

"اوئے پترا! ہم زبان دے چکے ہیں"۔ ملک صاحب نے مسکرا کر ایک اور پیشکش کی۔ "چلو ہم دکھن محلے والی حویلی بھی تمہارے نام لکھ دیتے ہیں"۔

"ملک صاحب! اینٹ پتھر کی دوستی بھی کوئی دوستی ہوتی ہے"۔ رضوان نے نکتے کی بات کی۔ "دوستی تو انسان سے ہونی چاہئے جس کی خوشبو بڑی مشکل سے ہاتھ آتی ہے۔ آپ نے مجھے "اپنا" کہہ دیا تو باقی کیا رہا"۔

"واہ بھئی واہ......" ملک صاحب نے "واہ" کو طول دیتے ہوئے کہا۔ "مزہ آ گیا"۔

اہل دربار نے ہاں میں ہاں ملائی لیکن ایک سفید ریش بزرگ سمجھانے والے انداز میں لب کشا ہوا۔ "برخوردار! دس مربع زمین اور حویلی معمولی شے نہیں اور ملک صاحب کی خوشی بھی تو اس عطا میں شامل ہے"۔

"خیر! اگر آپ کچھ دینا ہی چاہتے ہیں تو......" راجو عمداً خاموش ہو گیا۔

"ہاں، ہاں...... بول پتر! میرے پاس جو کچھ ہے دینے کو تیار ہوں"۔ ملک صاحب نے پہلی بار عام لہجے میں بات کی۔

"ملک صاحب! وہ تابو کا گناہ معاف کر دیں اور اسے آزاد کر دیں"۔

رضوان نے گویا بم کا دھماکا کیا۔ حاضرین و سامعین دم بخود رہ گئے۔ "دس مربع زمین اور حویلی کے بدلے وہ کمیوں کی ہتھ چھٹ گوی؟"

سادہ لوح حاضرین آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ لوگوں کو اس کی ذہنی صحت پر شک سا ہونے لگا۔

''ہشکے بھئی ہشکے!'' ملک صاحب کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رقص کرنے لگی مگر وہ دل میں لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''مگر اس نے ہماری اعلیٰ نسل کی کتیا کو قتل کر دیا۔ اس کے تو ''ڈکرے'' کر دینے چاہئیں''۔

''ملک صاحب! اس کتیا کی وقعت آپ کے کھسے کی نوک برابر بھی نہیں''۔ سجاول نے گفتگو کو نیا رخ دیا۔

''اور آج تو آپ کی دستار زد پر تھی''۔

ملک صاحب نے بے ساختہ فلک شگاف قہقہہ بلند کیا۔ یہ ایک انہونی سی بات تھی مگر وہ دن تو شاید انہونیوں کے ہونے کا دن تھا۔

''ماچھیاں دی گوی تے دہ مربعے زمین داہ شیر پترا!'' ملک صاحب اس لطیفے سے بار بار لطف لے رہے تھے پھر اچانک ان کے چہرے پر گہری سوچ کا قبضہ ہو گیا۔ وہ اپنے عنفوانِ شباب کا وہ واقعہ یاد کر رہے تھے جب ان کے دل نے کوئی ایسا ہی اوٹ پٹانگ فیصلہ کیا تھا۔ ان کے چہرے پر ریشم ایسی نرمی آ گئی اور وہ زیر لب مسکرانے لگے۔ ''یہ سودا اتنا برا بھی نہیں کہ عدالتِ دل کے فیصلے کسی اور نوعیت کے ہوتے ہیں''۔ یہ بات انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہی۔

◆◆◆

سارے علاقے میں زیر بحث یہی موضوع تھا۔ اپنے اپنے ظرف وشرف کے مطابق خلق خدا نے اس پر تبصرہ کیا۔ تابو نے سنا تو وہ سرور کی لہروں پر ڈولنے لگی۔ راجو کا ذکر بچے بچے کی زبان پر تھا۔ وہ اپنے گھر میں دیئے کی روشنی میں آئینہ دیکھ رہی تھی۔ ''ہائے نی تاباں! اس شہزادے نے تجھ میں کیا دیکھا۔ تجھے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔ شاید سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں۔

''چنگیائی'' بندے کی اکھ میں ہوتی ہے۔ ویکھن والی اکھ تو بس راجو شہزادے کے پاس ہے''۔

''راجو یار! کیا واقعی تاباں تمہیں پسند آئی ہے؟'' سجاول نے بھی اظہار حیرت کیا۔

''تم واقعی گھاس کھا گئے ہو''۔ راجو نے کہا۔ ''میں تاباں کو کسی اور نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ایک خاص مقصد کے لئے اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو وہ بڑی باصلاحیت شے ہے۔ بس تم دیکھتے جاؤ میں دنیا کو کیسے حیران کرتا ہوں''۔

رات گئے تک محفل ہاؤ ہو جاری رہی۔ دیہاتوں میں کاروبار زندگی سر شام ہی معطل ہو جاتا ہے لیکن وہ رات تو خوشیاں منانے کی تھی۔ دیہات کتنے ہی ''ترقی'' کر جائیں ہنگامہ ہائے زندگی کے اعتبار سے شہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ رضوان کا تجربہ تو یہی کہتا تھا کہ شہری زندگی عذاب جاں بنتی جا رہی ہے۔ بھاگ دوڑ، لینا پکڑنا ہر شخص پاگلوں کی طرح ہوا کے تعاقب میں رہتا ہے۔ اکثر حضرات کو تو یہ ادراک بھی نہیں ہوتا کہ آخر تعاقب کس شے کا کیا جا رہا ہے۔ آخر اسی بھاگ دوڑ میں ایک خوشگوار سانس تک کو ترستا ہوا بندہ، تو نیند میں جا سوتا ہے۔

گلابی جاڑے کا موسم تھا۔ رات ڈھلے خنکی ہو جایا کرتی تھی۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ راجو گہری نیند سویا ہوا تھا کہ معمولی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ اس کی فوجی تربیت کا نتیجہ تھا۔ بس چوبی دروازہ آہستہ سے کھلا تھا لیکن رات کے سناٹے میں کواڑ کی ہلکی سی چرچراہٹ بلند چیخ کی طرح تھی۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال نور پور والوں کی انتقامی کارروائی سے متعلق تھا لہٰذا اس کے عضلات تن گئے۔ اگرچہ وہ چپ چاپ لیٹا رہا لیکن اس کا ہاتھ تکیے تلے سرک گیا۔ جہاں اس کی حفاظت کا سامان رکھا تھا۔

کمرے میں کیروسین لیمپ کی مدھم سی روشنی ہو

رہی تھی۔ آنے والے کا صرف ہیولا سا دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی حساس سماعت سے چوڑیوں کی کھنک ٹکرائی تو اس کے تنے ہوئے عضلات ڈھیلے پڑ گئے۔ اب اس کے ذہن کو تجسس نے گھیر لیا۔ ''اس وقت شب تنہائی میں عورت کا یہاں کیا کام ہو سکتا ہے؟'' ایک بے نام سی الجھن بھی ہونے لگی۔

آنکھوں کی پتلیاں جب مناسب حد تک سکڑ گئیں تو مدھم روشنی میں ہر شے کے خطوط قدرے واضح ہو گئے۔ آنے والی خاتون دبے پاؤں چلتی ہوئی اس کی پائنتی کی جانب آ کر کھڑی ہو گئی پھر اس نے ایک عجیب سی حرکت کی۔ وہ آہستہ سے فرش پر بیٹھ کر اپنے رخسار اس کے تلوؤں سے ملنے لگی۔ راجو کا دل جو خطرناک صورت حال میں بھی متوازن رفتار سے دھڑکنے کا عادی تھا، اچانک دگنی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ اس نے فوراً اپنے پاؤں سکیڑ لئے اور ہاتھ بڑھا کر شمع کی لو اونچی کر دی۔

''مہتاب خاتون! تم...... اس وقت یہاں؟'' راجو نے لکنت زدہ لہجے میں سوال کیا۔

تابو نے فوراً اٹھ کر ہاتھ جوڑ دیئے اور وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح لرزنے لگی۔ ''وہ...... جی...... میں......'' اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

''پاگل لڑکی! تم یہاں اس وقت کیا کر رہی ہو؟'' عجیب و غریب صورتِ حال اور تابو کو دست بستہ اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر راجو کو الجھن سی ہونے لگی۔ اس کے لہجے میں یقیناً تلخی در آئی ہو گی جسے تابو برداشت نہ کر سکی۔ اس کی مفلسی، پستی، ماحول کے رسم و رواج، ہر چیز اس کی انا کی قاتل تھی۔ نسوانی جرأت جانے کتنی تہوں تلے دب چکی تھی ایسی صورتِ حال میں تو اسے آنسو بہانا یا ہاتھ جوڑنا ہی آتا تھا۔ یہ صدیوں کے جبر کا نتیجہ تھا۔ وہ جبر جو بندے کی مت مار دیتا ہے۔

''جی! میں تہاں نیں قدماں دی غلام ہاں جی''۔ (میں آپ کے قدموں کی غلام ہوں جی) تابو نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

''مگر...... یہ انسانیت کی سطح سے گری ہوئی حرکت؟'' رضوان تو اس رویے کو سمجھ ہی نہیں سکتا تھا جو ایک فرسودہ اور بے ہودہ نظام کی پیداوار تھا۔ وہ نظام جو مرد و زن کی عزت نفس کو خاک میں ملا دیتا ہے ان کی انائیں کچل دیتا ہے...... اس بے رحم نظام کے نتیجے میں افراد کی زندگی کوئی دوسرا فرد بسر کرتا ہے۔ رضوان نے اس نظام کا عملی مظاہرہ دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مہرِ سکوت لگ گئی۔

تابو نے ڈرتے ڈرتے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ناراض نہ تھیو...... میں تاں مرگ منڈھ کھلی ہاں'' (ناراض نہ ہوں، میں تو موت کی سرحد پر کھڑی ہوں)۔

اس کی مرتعش آواز سے رضوان کا غصہ پشیمانی میں بدل گیا اب اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ سامنے کھڑی حسن جہاں سوز کی مالک دوشیزہ خوف و دہشت کے چنگل سے آزاد ہو جائے۔

''او جھلی کوی...... یہ ہاتھ جوڑنا بند کر اور سامنے کرسی پر بیٹھ کر بات کر''۔

''ناں جی! یہ تاں بے ادبی والی گل اے''۔

''کیسی بے ادبی، میں کوئی پیر بزرگ ہوں؟''

''آپ جی سب کچھ ہیں میڈے، مالک سائیں دی''۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''آپ نے تاں مجھے بڑا مہنگا خریدا ہے''۔

''کیا تم کوئی بھیڑ بکری ہو جسے میں نے خرید لیا ہے؟''

''وہ جی، وہ مربع زمین تے حویلی کے بدلے میں آپ نے میری ڈھیر قیمت دی ہے جی''۔

''اچھا تو یہ بات ہے''۔ ساری صورتِ حال رضوان کی سمجھ میں آ گئی۔ تابو اس کے چہرے کا کنکھیوں سے جائزہ لے رہی تھی اور وہ پلنگ سے اٹھ کر کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

''ملک صیب! آپ ناراض نہ ہوئیں، میں ڈر سے مر جاواں گی''۔

''تم سمجھتی ہو، میں نے تمہیں خرید لیا ہے''۔ اس نے اپنے لہجے کو تلخی سے پاک رکھا تاکہ وہ تابو کا اعتماد بحال کر سکے۔ وہ مسکرایا تو دوشیزہ کی جان میں جان آئی۔

''سارے پنڈ والیاں دا یہی کھیال ہے جی''۔ تابو شہری زبان بولنے کی کوشش کرنے لگی۔ ''یہ گل وی سچی ہے آپ نے نور پوری دانداں کو نتھ پا دتی۔ پھیر جو کمایا اوہ روہی کے مینوں خرید لیا''۔

''مگر میں اکیلا تو نہیں تھا''۔ گفتگو میں قدرے روانی آتی جا رہی تھی۔

''ناں جی ناں، باقی سارے تے کھڈونے تھے۔ پر وہ پنڈ دیاں کو یاں چٹکیاں گلاں نہیں کر دیاں''۔

''وہ کیا کہتی ہیں وہ؟''

''میں کس طراں بتاواں، مجھے ڈر لگدا اے''۔

''کس سے مجھ سے؟''

''نہیں جی!'' تابو نے فوراً تردید کی۔ ''ملک صاحب کے کتوں سے۔ وہ کہتے تھے، جے میں نے آپ دی بے ادبی کیتی، تاں میرے پر کتے چھوڑ دیں گے''۔

''بے ادبی کیسی؟''

''وہ جی کوئی گل نہ منی، کسی بات کا انکار شکار کیتا''۔

''اچھا تو گویا تم میرا انعام ہو''۔ رضوان کی طبیعت مکدر ہونے لگی۔ اس کے سامنے آنکھوں کی پُرتکلف دعوت کرنے والی ہستی کھڑی تھی۔ نکھری نکھری سی پاگل

کر دینے والے رنگوں کی منہ بولتی تصویر لیکن جس انداز میں گویا پلیٹ میں سجا کر وہ بطور انعام پیش کی جارہی تھی، وہ بڑی توہین آمیز بات تھی۔ اس کا ماتھا شکن آلود ہوا تو تابو نے یہ تبدیلی فوراً محسوس کرلی۔

"آپ رب رسولؐ کے واسطے غصے نہ ہوویں جی"۔

"مہتاب خاتون! تم نے غصہ دلانے والی کوئی بات نہیں کی۔ لہٰذا یہ ناراض نہ ہونے والی بات بار بار مت کہو"۔

"اچھا جی، جو حکم جی"۔

"اب بتاؤ وہ گاؤں کی لڑکیاں کیا کہتی تھیں؟"

"وہ کوئی چنگی گل نہیں جی! میں نے تے صغی کو پھینٹی وی لائی تھی"۔

"تم لوگوں کو مارتی ہو؟"

"بس جی...... وہ ذرا جب غصہ آجاوے"۔

"غصہ تو کوئی اچھی چیز نہیں"۔

"اچھا جی! اب نہیں کیا کروں گی۔ پر کدے نال کدے تے آہی جاتا ہے ناں"۔

"لیکن اتنا غصہ بھی نہیں آنا چاہئے کہ کسی کو کلہاڑی سے کاٹ دیا جائے"۔ رضوان نے گزشتہ واقعہ اسے یاد دلایا جس مقصد کے لئے وہ ادھر اُدھر کی گفتگو کر رہا تھا وہ پورا ہوتا جارہا تھا۔ تابو رفتہ رفتہ کھلتی جارہی تھی۔

"وہ میری غلطی تھی پر دیکھیں ناجی، اس مردار نے بھی تو میرے شاہ بہرام کو چیر کے رکھ دتا تھا۔ اب آپ کہتے ہیں تاں میں کدے غصے وچ نہیں آواں گی"۔

"تم نے صغی کی پٹائی کیوں کی تھی؟"

"میں بتاتی ہوں، پر آپ غصے والی شکل نہ بنانا۔ آپ ہنستے ہیں تو کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ ہر شے چنگی لگدی اے"۔ رضوان کو یہ مکروفریب سے پاک خالص اور سچی گفتگو اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر تابو کے کاندھوں پر بڑی رسان سے ہاتھ رکھ دیئے اور اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ پھر کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"لو، اب میں نے اپنا مصنوعی نقاب اتار پھینکا"۔

"وہ کیا ہوتا ہے جی!" تابو کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آیا تھا۔

"ارے پاگل لڑکی! میرا مطلب ہے اب میں ڈراؤنی شکل نہیں بناؤں گا مگر شاید میری شکل ہی ایسی ہے"۔

"نہ جی، جھوٹ نہ بولیں"۔ تابو کو یہ بات ناگوار گزری۔ "جھوٹ سے اللہ میاں ناراض ہو جاتا ہے۔ آپ تو چن ورگے سیف الملوک شہزادے ہیں جی!"

"اچھا، کمال ہے بھئی، میں 'سیف الملوک' ہوں اور مجھے خبر ہی نہیں"۔

"آپ لسوڑی شاہ ہوراں سے تویت (تویذ) ضرور لیں پھر آپ کو نظر نہیں لگے گی"۔ تابو حرف مدعا زبان پر لے آئی۔

"تو بات نظر لگنے والی ہے"۔

"ہاں جی! آپ شیشہ تو دیکھیں؟" تابو ایک پل سوچ میں گم ہوگئی پھر بے تکلفی سے گویا ہوئی۔ "آپ یوں کریں سات لال مرچیں وار کر چلکھ دی اگ وچ جلا دیا کریں"۔

"خیر لال مرچیں تو میں ضرور جلا دیا کروں گا مگر تم نے صغی کی پٹائی والی بات تو بتائی ہی نہیں"۔

"وہ مرن جوگی کہتی تھی آپ 'شرشرار' ہیں"۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہ جی...... شرشرار جن بھوت"۔ تابو نے وضاحت کی۔

"میں تمہیں بھوت دکھائی دیتا ہوں"۔

"توبہ، توبہ کریں"۔ تابو نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے اپنے رخسار کو چھوتے ہوئے کہا۔ "اس

واسطے میں نے اس کی ٹھکائی کر دی۔ میں تو ملک صاحب کے کتوں سے ڈرتی ہوں اور بس......"

"لیکن وہ صگی مجھے جن بھوت کیوں سمجھتی ہے؟"

"اب دیکھیں ناجی، بات وی تو سوچنے والی ہے۔ کلا بندہ دارے ڈکیت، ڈلے ماچھی تے سارے کھڈار کیسے مار سکتا ہے؟ پر میں اس وچ کوئی "اچرج" گل نہیں دیکھتی۔ بھانویں سارا پنڈ کہتا پھرے"۔

"تمہاری سوچ کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی؟"

"کھسی دانداں نوں پہلی وار شیر مرد ٹکرایا، تے سب دی ماں مرگئی"۔ تابو نے گویا کوزے میں دریا بند کر دیا۔

"پر آپ نے وہ مربع تے حویلی چھڈ کے چنگی گل نہیں کیتی"۔ وہ پھر پٹری سے اترنے لگی۔ رضوان نے اس کی غلط سوچ کو راہ راست پر لانا ضروری خیال کیا۔

"تابو! ایک بات غور سے سنو اگر میں زمین وغیرہ قبول کر لیتا تو وہ لوگ تمہیں جان سے مار دیتے"۔

مہتاب خاتون نے اس فقرے سے یہی مفہوم اخذ کیا کہ وہ کوئی واقعی بیش قیمت چیز یا ہستی ہے۔ اسے اپنا نام اور وہ ہونٹ جنہوں نے بڑی چاہت سے وہ نام ادا کیا تھا بڑے ہی پیارے لگے۔

"اچھا، یہ بتاؤ اگر مجھے کوئی بیچ رہا ہو تو تم کتنی قیمت ادا کر سکو گی؟" راجو نے تابو کو امتحان میں ڈال دیا۔

"جی میرے پلے تاں کَکھ وی نہیں"۔

"پھر سوچ لو، تمہارے پاس بیش قیمت سرمایہ ہے"۔

تابو کچھ دیر سوچتی رہی پھر جیسے اسے اپنے سرمائے کا خیال آ گیا۔ "سب سے پہلے تاں میں اپنی چت پری دے دوں گی"۔

"واہ بھئی مہتاب خاتون! کیا قیمت لگائی ہے، تُو نے میری"۔

"وہ جی...... اصل میں جو کچھ پلے ہووے خرچ تاں وہی کیا جاتا ہے نا۔ او مصر دی منڈی وچ اک مائی وی تے سوتر دی اٹی بدلے یوسف خریدن آ گئی سی"۔ تابو نے زبردست دلیل پیش کی۔ رضوان چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"پھر جی میں اپنی دونوں آنکھیں دے دوں گی۔ سارا پنڈ کہتا ہے میری اکھیاں وچ دو ہیرے ہیں"۔

راجو مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا مگر اچانک اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ "اگر پھر بھی سودا نہ بنے تو کیا کرو گی؟" راجو دیکھنا چاہتا تھا کہ اس سادہ لوح دوشیزہ کی آخر گہرائی کتنی ہے۔ ویسے دلوں کی گہرائی کی پیمائش حماقت کے زمرے میں آتی ہے۔

"پھر میں اپنے ساہ (سانسیں) ویچ کر قیمت پوری کر دوں گی"۔ تابو نے وہ قیمت چکا دینے کا اظہار کیا جو امکان کی آخری حد ہوتی ہے۔ رضوان حیرت کے سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ اسے اس عام سی دیہاتن الھڑ مٹیار پر ٹوٹ کر پیار آیا جو اتنی گہری باتیں کر گئی تھی۔

"تابو! اب تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے تمہاری کوئی زیادہ قیمت ادا نہیں کی۔ پگلی انسان کے ایک سانس کی قیمت ادا نہیں کی جا سکتی اور پھر جو چیز دل کو اچھی لگے وہ تو ہر قیمت پر سستی ہوتی ہے۔ بھلی لگنے والی چیز کے معاملے میں برے بھلے یا نفع نقصان کا خیال بھی نہیں کیا جاتا۔ شاہ بہرام کا بدلہ لینے کے لئے تُو نے ان چیزوں پر غور کیا تھا؟"

تابو پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور لاشعوری طور پر اپنے پاؤں کو آگے پیچھے جھلا رہی تھی۔ اس کے ہلتے ہوئے پاؤں اچانک ساکت ہو گئے۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے تکنے لگی۔

"میں...... میں...... آپ کو اتنی اچھی لگتی ہوں ہائے میں مراں"۔

"اس میں مرنے والی کون سی بات ہے؟"

"اتنی سوہنی بات پر تو میں ابھی اسی وقت مرنے و

تیار ہوں"۔

"تم بڑی سیانی باتیں کرتی ہو"۔

"ناں جی، میں تے بڑی بے اکل (بے وقوف) آں۔ نہ سوہنی نہ گن پلے۔ پر آپ کہتے ہیں تو پھر سب ٹھیک ہے"۔ تابو نے بات ہی ختم کر دی۔

"اچھا اب تم ایسا کرو کہ گھر جا کر آرام کرو، رات زیادہ بیت چکی ہے میں بھی ذرا سونا چاہتا ہوں"۔

"یہ کیسے ہو سکدا اے جی، میں تو اب ساری عمر آپ دے قدموں میں رہوں گی"۔ پھر وہ سوچوں میں گم ہو گئی۔ "آپ جی! پلنگ پر لیٹ جائیں میں آپ کے پیر گھٹ دوں" (پاؤں دبا دوں)۔

"کیوں میرے پاؤں کو کیا ہو گیا ہے"

"سارا دن آپ کو دکاں نیں اک پل چین نہیں لین دِتا۔ میں دو منٹاں وچ ساری تھکاوٹ اتار دیاں گی"۔

"نہیں مہتاب خاتون! میں ان باتوں کا عادی نہیں ہوں"۔

"آپ مالک ہیں جی، میں نے تاں اج وی آپ کو سر دا سائیں من لیا ہے۔ اب چاہے ذبح کریں، چاہے بازار وچ بیچ دیں"۔ وہ سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔

"میری ایک بات مانو گی؟" رضوان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں لرزش سی تھی۔ تابو نے سر اٹھا کر بڑی عجیب نگاہوں سے اسے دیکھا پھر دونوں پاؤں اٹھا کر پلنگ پر بیٹھ گئی اور اپنا سر زانوؤں میں دے لیا۔ اس کا جسم ہلکے ہلکے لرز رہا تھا۔ جیسے سہمی ہوئی فاختہ بارش میں بھیگ چکی ہو۔

"آپ کی بات میں کیسے نہیں مانوں گی"۔

"اوئے پاگل کُڑی تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں بے رحم قصائی نہیں ہوں"۔

"ہور کیہہ حکم اے جی!" شب تنہائی میں قربت کا مفہوم تابو کی سمجھ میں کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جس ماحول میں اس نے شعور کی آنکھ کھولی تھی اس میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا تھا۔ یہاں تو وہ اپنے سیف الملوک شہزادے کو اپنا سب کچھ مان چکی تھی لیکن وہ شخص اس کی سوچ کو غلط ثابت کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

"حکم یہ ہے کہ جھلی کُڑی کہ تُو اب دوسرے کمرے میں جا کر آرام سے سو جا"۔ راجو نے اگرچہ یہ فقرہ سرسری لہجے میں کہا تھا لیکن تابو اسے اپنی نسوانیت کی توہین سمجھی۔ اس نے بارہا دستِ ہوس کو جھٹک دیا تھا۔ اسے اتنا شعور بہرحال تھا کہ اسے دھتکار دیا گیا ہے۔ شدت خجالت، عالم بے بسی اور توہین کے احساس سے اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ "شاید مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو چکی ہے"۔ یہ سوچ کر وہ تڑپ سی اٹھی۔

"آپ پیر دستگیر کے واسطے میری خطا معاف کر دیں۔ ربا میں کدھر جاواں!" وہ پلنگ سے اٹھ کر رضوان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"اوئے جھلیئے! تُو کس خطا کی معافی مانگ رہی ہے"۔ راجو نے سٹپٹا کر کہا۔ "جتنا راضی میں تجھ سے ہوں تُو اندازہ بھی نہیں لگا سکتی۔ بس یہی سمجھ لے میں اسی لئے تجھے دوسرے کمرے میں بھیج رہا ہوں کہ تُو مجھے بہت ہی اچھی لگ رہی ہے"۔

تابو حیران و ششدر کفر و ایمان کی درمیانی کیفیت میں معلق تھی۔ یقین و بے یقینی والا یہ تجربہ سوہان روح بھی تھا اور اسے کیف و انبساط سے سرشار بھی کر رہا تھا۔ "آپ...... آپ سچ مچ مجھ سے بہت خوش ہیں اور میں آپ کو سوہنی لگ رہی ہوں؟"

"ہاں تابو رانی!" راجو نے انگشت شہادت سے اس کی ٹھوڑی کو ہلکا سا سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"ہائے میں مراں! یہ بل جھوٹ وی ہووے تاں ساری حیاتی سچ نالوں سوہنا اے۔ اب تو میں وڈھے ملک

اور اوس دے کتیاں کولوں وی نہیں ڈروں گی۔ میں...... میں تو زہری کتیاں کو وی چیر کے رکھ دیاں گی"۔ اس کے سینے میں پریم کی شمع روشن ہوئی تو فصیل جاں سے ڈر و خوف کوچ کر گیا اور یہی راجو کا مقصد تھا۔

"آپ آرام سے سو جائیں...... میں ساری رات یہاں بیٹھ کر پہرا دوں گی"۔ تابو نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"بس سمجھ لیں میں کمرے میں ہوں ہی نہیں"۔

راجو نے ہتھیار ڈال دیئے اور شمع کی لو مدھم کر کے آنکھیں بند کر لیں لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس کا سنگِ خارا سے سخت دل موم ہو چکا ہے۔ یہ سیدھی سادی لڑکی اسے شکست سے ہمکنار کر چکی ہے۔ اس نے دل میں ایک حیران کن فیصلہ کر لیا۔ ایسا فیصلہ جو آج تک کسی نے نہ کیا اور نہ شاید کوئی کرے گا۔

❖❖❖

ملک حاکم خاں، رضوان کو دل و جان سے اپنا کہہ چکا تھا۔ سجاول حالات کے اس رخ سے مسرور و مطمئن تھا۔

تابو ہواؤں میں محو پرواز تھی۔ راجو نے دنیا جہان کا ڈر خوف اس کے دل سے نکال دیا تو وہ طوفانوں کا رخ پھیر دینے والی ہستی کے روپ میں آ گئی۔ اس کی بس ایک ہی تمنا تھی کہ اس کا سیف الملوک اسے قدموں سے جدا نہ کرے۔ تابو اپنے راج کے حکم پر دہکتے الاؤ میں کود جانے کی ہمت رکھتی تھی۔ یہی محبت کا کرشمہ ہے جو ناتوانوں کو شہ زور بلکہ منہ زور بنا دیتا ہے۔

سب سے پہلے تو راجو نے تابو کو فنِ حرب و ضرب سے روشناس کرایا۔ فصیل جاں کے نازک ترین حصوں پر مہلک وار کرنے کی تربیت دی۔ گاؤں کی پاکیزہ ہوا میں سانس لے کر جوان چڑھنے والی دوشیزہ کی تو جون ہی بدل گئی۔ یہ تربیت، حویلی کے نسبتاً ویران گوشے میں دی جاتی۔ تابو کے لئے پسندیدہ بات یہی تھی کہ اس کا مالک و مختار اسے نئے روپ میں دیکھنے کا خواہشمند ہے۔ سجاول اور ڈیفی البتہ اس "انہونی" میں بدلتے دیکھ کر اظہار حیرت سے باز نہ رہ سکے۔ تابو نے ڈرائیونگ میں مہارت حاصل کر کے تو سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

"تابو رانی! دنیا میں تمہیں سب سے اچھی شے کون سی لگتی ہے؟" چند روز بعد رضوان نے عجیب و غریب سوال کیا۔ عجیب و غریب اس لئے کہ وہ تابو کے اندر باہر سے آگاہ ہو چکا تھا پھر بھی اس کی زبان سے اعتراف چاہتا تھا۔

"مجھے تو جی ہر پاسے بس آپ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی چمڑی کے جوتے بھی آپ کو پہنا دوں تو سمجھوں گی کہ کچھ نہ کر سکی"۔ تابو نے بے دھڑک جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے جو شے مجھے اپنی جان سے بڑھ کر پیاری ہو، وہ تمہیں بھی پیاری ہو گی"۔ رضوان رفتہ رفتہ اپنے مطلب کی طرف آنے لگا۔

"وہ جی بات یہ ہے کہ یار کی گلی کا تو کوڑا بھی سوہنا لگتا ہے"۔ تابو نے اپنے انداز میں کہا۔ "جو شے آپ کو چنگی لگے مجھے چنگی جکیوں نہ لگے گی"۔

"بس تو رانی فیصلہ ہو گیا"۔ رضوان نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے اپنی جان سے زیادہ اپنے وطن کی مٹی پیاری ہے۔ میں نے اسی لئے اپنے کفن کے لئے خاکی وردی کا انتخاب کیا ہے۔ اگر مجھ سے پیار کرنا چاہتی ہو تو تمہیں اپنے دیس کی مٹی سے پیار کرنا ہو گا"۔

یہ اتنی بڑی بات تھی کہ تابو پہلے تو اس کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکی۔ اسے صرف کفن والی بات یاد رہ گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ واقعی اس کے شہزادے کو کسی نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

"جو بندہ آ کو زخم دے گا، میں...... میں اس کا کلیجا چبا جاؤں گی۔ میری یہ گل لکھ لیں جی! میں تو ویسے بھی غصے کی

بہت بُری ہوں۔ کون ہے آپ کا دشمن، اب تو میں مردوں کی طرح لڑ بھی سکتی ہوں"۔

"وقت آنے پر میں تم کو سب کچھ بتا دوں گا"۔ رضوان نے اس کی بے چینی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "بس تم میری ہر بات کو غور سے سنا کرو اور اس پر عمل بھی کیا کرو"۔

اس روز راجو نے ڈینی اور سجاول کو شریک راز کرتے ہوئے عجیب و غریب انکشاف کیا۔ "مجھے کسی ایسی ہستی کی ضرورت تھی جو میری ہر بات پر بغیر سوال کئے ایمان لے آئے اور میرے اشارے پر آگ کے دہکتے الاؤ میں کود جانے کی ہمت بھی اس میں ہو۔ تابو بے شک عورت ہے مگر وہ مجھ پر مر مٹی ہے، میں اس کی محبت کا رخ موڑ کر حب الوطنی کی جانب کر رہا ہوں۔ وہ اب میرے دماغ سے سوچے گی اور میری پسندیدہ شے سے محبت کرے گی، بس یہی میرا مقصد تھا"۔

سجاول اور ڈینی حیرت زدہ سے یہ انوکھی "داستان محبت" سماعت کر رہے تھے۔ ایسا تو کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ "کیا اسے توقعات کا فلک بوس محل تعمیر کرنا نہیں کہتے"۔ دونوں نے بیک زبان کہا۔

"اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟" رضوان نے سوال کیا۔ "کسی نصب العین کی خاطر جدوجہد کرنے میں مرد و زن کی قید کہاں سے آن ٹپکی، میں اسے بیمار سوچ کا فتور سمجھتا ہوں"۔

"کون سی بیمار سوچ اور کون سا فتور؟" سجاول نے وضاحت طلب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"عورت جیسی باصلاحیت ہستی کو صرف اور صرف بچے پیدا کرنے کی مشین تصور کرنا بیمار سوچ ہے اور سارا فتور اسی کی پیداوار ہے"۔ رضوان نے تشریح کی۔ "آپ جانتے ہیں کہ عورت مرد سے کہیں زیادہ خونخوار ثابت ہو سکتی ہے اور نسبتاً زیادہ یکسوئی سے اپنے مقاصد حاصل کر سکتی ہے"۔

"مگر تابو کی منزل صرف اور صرف تم ہو میری جان!" ڈینی نے مسکرا کر کہا۔

"اور میں اس مسافر کو نئی منزل کا راستہ دکھا رہا ہوں۔ وہی جو ہم سب کی منزل ہونی چاہئے اور وہی منزل جسے اکثر لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔ اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے؟"

"یار! بات تو ٹھیک ہی لگتی ہے"۔ سجاول بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ "تابو واقعی باصلاحیت خاتون ہے، اس کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کی ضرورت تھی جسے راجو پورا کر رہا ہے۔ خدا کی قسم وہ تو طوفان بن سکتی ہے، ایسا طوفان جو ناپسندیدہ اشیاء کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ اگر جذبہ نفرت کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے تو جذبہ محبت کو استعمال میں کیوں نہیں لایا جا سکتا، یہ جذبہ تو دیسے بھی نفرت، رقابت، بغض و حسد تمام جذبوں سے زیادہ طاقتور اور پائیدار ہوتا ہے"۔

"لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمارا راجو بڑی دور کی کوڑی لایا ہے"۔ یہ تبصرہ ڈینی نے کیا۔

"میں چند روز کے لئے اسلام آباد جا رہا ہوں"۔ راجو نے سجاول کو مطلع کیا۔ "ڈینی اور تابو بھی میرے ساتھ جائیں گے، واپسی پر میں تم سے ایک اہم مسئلے پر گفتگو کروں گا"۔

راجو گیا تو چند روز کے لئے تھا لیکن کوئی ایک ماہ بعد لوٹا۔ تابو صرف ایک ماہ میں سر سے پاؤں تک بدل چکی تھی۔ پُراعتماد گفتگو، رکھ رکھاؤ میں وقار آ چکا تھا۔ شلوار کو "ستھن" کہنے والی خود شلوار قمیص میں ملبوس تھی۔ نشست و برخاست میں نسوانی فراست اور دلکشی سی در آئی تھی۔ اگر کوئی شے نہیں بدلی تھی تو وہ اس کا رضوان سے دلی لگاؤ تھا۔ اس کی ہر بات کو وہ ایک پجارن کی طرح سنتی اور اس پر حرف بہ حرف عمل پیرا ہوتی۔ راجو بھی اسے مہتاب

خاتون کہہ کر پکارتا اور اس کی عزتِ نفس کا ہر طرح خیال رکھتا۔

''یار! تم اس دوشیزہ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟'' سجاول نے بڑا آسان سا سوال کیا۔

''میں اسے ایک بڑے مقصد کے لئے منتخب کر چکا ہوں''۔ رضوان نے ٹیڑھا سا جواب دیا۔ ''ہمارا رشتہ اعتماد کا رشتہ ہے۔ شادی کے بعد اس کی نوعیت بدل جائے گی۔ میں نے اپنی محبوبہ پر واضح کر دیا ہے کہ مناسب وقت آنے پر ہم شادی کے رشتے میں منسلک ہو جائیں گے لیکن فی الحال ہماری شادی ایک مقصد سے ہو چکی ہے اور اسی مقصد پر میں تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں''۔

''تو تمہیں اعتراف ہے کہ وہ تمہاری محبوبہ ہے؟'' سجاول نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ اس کے پیار کی گہرائی کو دیکھ کر تو میں اپنے آپ سے شرمندہ سا ہو جاتا ہوں۔ لوگ عظیم مقاصد کے لئے اپنی محبت کی قربانی دیتے آئے ہیں مگر میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی دو محبت کرنے والے جب ایک منزل کا تعین کر لیں اور وہ منزل جسمانی ملاپ کے علاوہ ہو تو سفر کتنا خوشگوار ہو جاتا ہے۔ بس میں یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں وصل سے بڑھ کر بھی کوئی راحت موجود ہے''۔

ملک صاحب نے تابو کی کایا پلٹ کیفیت دیکھی تو غیر متوقع طور پر کسی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ صرف جامع تبصرے پر اکتفا کیا۔ ''اپنا راجو پتر وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے اور تابو تو نصیبوں والی ہے''۔

''وہ کون سا اہم مسئلہ تھا جس پر تم گفتگو کرنا چاہتے تھے؟'' تینوں دوستوں کی محفل میں تابو بھی شریک تھی جب سجاول خان نے رضوان سے سوال کیا۔

''کم ظرف پڑوسی نے خطرناک قسم کے میزائل تیار کر لئے ہیں۔ ترشول، اگنی، پرتھوی وغیرہ۔ ہمارے افسران اعلیٰ و بالا کا خیال ہے کہ حریف کے ان ہتھیاروں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں''۔ رضوان نے صورتِ حال کی وضاحت کی۔ ''یہ مایوسی پھیلانے والی بات ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے کہ ہندی میزائلوں کا ہمارے پاس کوئی توڑ نہیں؟''

''احمقانہ باتیں مت کرو''۔ سجاول نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''بڑی کرسی پر بیٹھ جانے سے کوئی بڑی عقل کا مالک نہیں بن جاتا۔ خدا کسی نااہل کو اس کرسی پر نہ بٹھا دے جہاں سے وہ ملک و قوم کی قسمت کے فیصلے صادر کرنے کا اہل ہو جائے''۔ سجاول نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ کوئی میزائل ایسا نہیں جس کا کوئی علاج نہ ہو۔ وہ علاج مشکل اور مہنگا ضرور ہو سکتا ہے لیکن ''ناممکن'' والی بات ہرگز نہیں''۔

''میزائل اور راکٹ میں کیا فرق ہوتا ہے؟'' ڈپٹی نے بنیادی سوال کیا۔

''راکٹ ایک ساکن ہدف کے لئے استعمال کیا جاتا ہے''۔ سجاول نے تشریح کی۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہدف اپنی جگہ یا مقام بدل ڈالے تو راکٹ اسے نشانہ نہیں بنا سکتا۔ البتہ اگر نشانہ باز عقل سے کام لے کر متحرک ہدف کو اڑانا چاہے تو اسے سو فیصد کامیابی ہو جاتی ہے۔ بندوق کی گولی بھی راکٹ ہی کا کام کرتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ راکٹ میں اپنا ایندھن ہوتا ہے جو جل کر اسے ہدف تک پہنچاتا ہے''۔

''تمہارا مطلب ہے راکٹ اپنی سمت تبدیل نہیں کر سکتا؟'' رضوان نے مزید وضاحت طلب کی۔

''بالکل یہی مطلب ہے میرا۔ راکٹ کے پاس دیکھنے والی آنکھ نہیں ہوتی''۔

''انھے گتے ہرناں دے شکاری والی گل ہوئی نا

جی!'' تابو نے بہترین مثال دی۔

''یار! یہ معصوم اور سوہنی گڑوی تو مجھے قدم قدم پر حیران کر رہی ہے''۔ رضوان نے بڑی ملائم نگاہوں سے تابو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بعض اوقات تو مجھے بھی لاجواب کر دیتی ہے''۔

''واقعی اندھے کتے والی مثال راکٹ پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے''۔ سجاول نے بھی تابو کی تعریف کی۔

''پتا نہیں یہ دانش بھری باتیں اسے کون سکھاتا ہے؟''

''اصل میں میرا پیر بڑا کامل ہے جی''۔ تابو نے راجو کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''کلا قائم ہووے تاں آپے بجھ آ جاندی اے''۔

''میزائل کو ہدف تک پہنچانے کا فرض تو بے شک اس کے پچھلے حصے میں نصب شدہ راکٹ موٹر ہی سرانجام دیتی ہے لیکن اس کے اگلے حصے میں اس کا دماغ بھی موجود ہوتا ہے جسے ہومنگ ہیڈ (Homing Head) کہتے ہیں۔ یہ بصیرت وبصارت کا مالک ہوتا ہے''۔ سجاول نے میزائل کا مختصر تعارف پیش کیا۔ ''یہ سرگویا، ہدف کے گھر تک پہنچنے کے کام آتا ہے۔ اگر ہدف اپنا مقام بدل لے تو میزائل بھی اپنا رخ تبدیل کر لیتا ہے اور جب تک ہدف کو اڑا نہ لے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہ ان میزائلوں کا ذکر ہو رہا ہے جو ہوا سے ہوا میں مار کرنے والے کہلاتے ہیں''۔

''اس نوعیت کے میزائل کو گائیڈڈ (Guided) کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ جس کی راہنمائی ممکن ہو اور حیران کن بات ہے کہ گائیڈڈ میزائل اپنی راہنمائی خود بھی کر سکتا ہے''۔

''یہ ہتھیار چونکہ ہوا میں محو پرواز یا متحرک ہدف کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے لہٰذا محدود کارکردگی کا حامل ہوتا ہے''۔ سجاول نے سامعین کو ہمہ تن گوش پایا تو اسے گونا گوں اطمینان ہوا۔ اس نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میزائل کی خطرناک ترین قسم وہ ہوتی ہے جو دور مار کہلاتی ہے۔ جیسے بھارتی پرتھوی، ترشول وغیرہ۔ اسے ہدف تک پہنچانے کے لئے بہت بڑی ''راکٹ موٹر'' درکار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حساس اور عمدہ نیوی گیشن کمپیوٹر بھی اس کے اندرونی نظام میں شامل ہوتا ہے جو بہ آسانی اسے ہدف تک پہنچا دیتا ہے۔ نیوی گیشن کمپیوٹر (Navigation Computer) کی سادہ اور آسان قسم عام لڑاکا جہازوں میں بھی استعمال ہوتی ہے''۔

''یہ ایجاد تو واقعی گہری دانش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے'' رضوان نے زیر لب کہا۔ ''اس پر مزید روشنی ڈالو کہ جہاز کو یہ کمپیوٹر گھر تک کیسے پہنچا دیتا ہے؟''

''یار! یہ کوئی انوکھی ایجاد نہیں''۔ سجاول نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو ہر تخلیق کے لئے تھوڑی بہت عقل درکار ہوتی ہی ہے''۔

''سوائے اس ''تخلیق'' کے جس میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں''۔ ڈبی نے مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

''کرہ ارض خیالی خطوط کے گھیراؤ میں ہے جو خیالی ہونے کے باوجود اپنے وجود کا ثبوت مہیا کرتے ہیں''۔ سجاول نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''عام سی زبان میں انہیں طول بلد اور عرض بلد کہا جاتا ہے۔ ان خطوط کے ذریعے اس زمین پر موجود ہر شہر، قصبے، گاؤں وغیرہ کا صحیح تعین کیا جا سکتا ہے۔ بس کمپیوٹر میں ایک چھوٹے سے کارڈ پر یہ اطلاع نقش کر دی جاتی ہے اس طرح یہ کمپیوٹر ''مسافر'' کی راہنمائی کرتا رہتا ہے۔ مسافر ایک جہاز بھی ہو سکتا ہے، ایک تباہ کن میزائل بھی''۔

''اس سے چنگا کم تاں ساڈے کھوجی کر لیندے

نیں"۔ تابو بے تکلف اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔ "وہ بڑے سیانے ہوتے ہیں جی، وہ زمین سے بھی باتاں کر لیتے ہیں"۔

"ہر ہواباز کو "کھوجی" کا کردار بھی ادا کرنا ہوتا ہے میری رانی! اسے "لینڈ مارک" کی پہچان کہتے ہیں"۔ رضوان نے تابو کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سارے جہان سے بڑے "کھوجی" تے آپ ہی جی۔ سینے کے اندر بھی جھانک لیتے ہیں"۔ تابو نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"راجو یار! اس لڑکی کا نام بدل دینا چاہئے"۔ ڈیمی نے موضوع گفتگو بدلتے ہوئے کہا۔ "تاراج یا تاراج کیسا رہے گا۔ اپنی بے خبری کو تاراج کر رہی ہے اور اس میں تابو کے ساتھ راجو بھی آ جاتا ہے"۔

متفقہ طور پر تابو کا نام "تاراج" رکھ دیا گیا۔

"آپ کو پسند ہے جی میرا یہ نام؟" تابو نے رضوان سے دریافت کیا۔

"بڑا خوبصورت ہے، دو نام ایک رشتے میں جکڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں"۔ راجو نے کہا۔

"پھر تاں بڑا سوہنا نام ہویا"۔

"پڑوسی ملک نے ہماری سرحدوں پر جو ڈھیر سارے میزائل نصب کر رکھے ہیں تم نے اس کا کوئی حل تلاش کیا؟" راجو اس موضوع کی طرف لوٹا۔

"تمہیں یہ سن کر یقیناً دلی مسرت ہوگی کہ میں نے اس کا بہترین حل تلاش کر لیا ہے"۔ سجاول نے خوشخبری سنائی۔ "میں لیزر بیم سے دشمن کا ہر میزائل اس کی پرواز کے ابتدائی مراحل ہی میں تباہ کر سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ اپنے وطن عزیز کی فضائی حدود میں داخل ہونے والے ہر میزائل کا رخ بھی بدل سکتا ہوں"۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" سب نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"حریف کے کمپیوٹر کو گمراہ کر کے"۔ سجاول نے مختصر سا جواب دیا۔ "کاغذات پر میری تیاری مکمل ہو چکی ہے اب صرف عملی مظاہرہ کرنا باقی ہے"۔

تو پھر دیر کس بات کی ہے؟" جو کچھ درکار ہو مجھے بتاؤ۔ فوراً سے پہلے مہیا کر دیا جائے گا"۔ رضوان نے بہت بڑی بات بڑی آسانی سے کہہ دی۔

❖❖❖

ایک دور افتادہ گاؤں کے گمنام سے گوشے میں مکمل رازداری کے ساتھ ایک عظیم پراجیکٹ کا آغاز کر دیا گیا۔ راجو کا خیال تھا کہ اگر حفاظت کے خیال سے فوجی کمانڈوز وغیرہ کو طلب کیا گیا یا کوئی دوسرا اہتمام کیا گیا تو خلق خدا کا چونک اٹھنا عین ممکن ہوگا۔ اس طرح دشمن کے ہوشیار ہو جانے کا خطرہ بھی تھا۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ چھوٹے پیمانے پر کامیاب تجربے کے بعد یہ پراجیکٹ فوجی حساس ادارے کے حوالے کر دیا جائے۔ پھر جو خدا کو منظور ہو۔

جس روز سجاول نے کامیاب تجربے کی نوید مسرت سنائی وہ دن سب کے لئے یوم عید سے کم نہیں تھا۔ دوسرے روز مجلس شوریٰ کا انعقاد ہوا اور یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ جملہ سازو سامان کیسے محفوظ ہاتھوں تک پہنچایا جائے۔

"فوجی تعاون کے بغیر سامان کی نقل و حرکت ممکن نہیں"۔ سب کا یہی متفقہ فیصلہ تھا اور اسی پر عملدرآمد ہوا۔ ڈیمی تاراج اور راجو تینوں مطلوبہ تعاون حاصل کرنے سوئے اسلام آباد چل دیئے۔ ڈیمی اور راجو کو اپنے محکمے کے سربراہ سے گفتگو کرنا تھی اور تاراج تو راجو کا سایہ تھی۔ سفر کے ناخوشگوار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تاراج خوشیوں کی خوابناک سی دھندلی وادی میں سانس لے رہی تھی۔ اس کے گرد و پیش راحتوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ رضوان کو امید تھی کہ مطلوبہ تعاون حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ ان کا پراجیکٹ قومی اہمیت کا

حامل تھا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب قومی سلامتی کے اہم ترین معاملے کو بھی سرخ فیتے کا شکار ہونا پڑا۔ بعض بے مغز کرسی نشینوں نے طرح طرح کے سوال اٹھائے۔ لت و لعل سے کام لیا تو راجو آتش زیر پا ہو گیا۔ اس آزمائش کی گھڑی میں اسے تاراج کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ وہ ہر حیلے وسیلے سے اپنے شہزادے کو حد اعتدال میں رکھتی۔ اس ناخوشگوار صورت حال سے نمٹتے ہوئے چوتھا روز بھی گزر گیا تب جا کر کہیں اسے کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔

راز میں جتنے زیادہ لوگ شریک ہوں اس کے افشا ہونے کے مواقع اتنے ہی بڑھ جاتے ہیں اور ایسے مواقع سے خاموش دیواریں بھی استفادہ کر جاتی ہیں۔ راجو نے یہ چار دن کانٹوں پر لوٹ لوٹ کر گزارے۔ خدا خدا کر کے فوجی قافلہ سوئے منزل روانہ ہوا۔ راجو کا سینہ انجانے خدشات کی آماجگاہ بن چکا تھا اور جب وہ حاکم پور پہنچے تو اس کے بدترین خدشات سچ ثابت ہوئے۔ حاکم پور تو اپنی جگہ قائم دائم تھا لیکن موتی کے بغیر سیپ کی صورت میں۔

گاؤں میں داخل ہونے سے پیشتر ہی رضوان کو احساس ہو گیا کہ کوئی بڑی ہی خرابی والی بات، کوئی ناخوشگوار حادثہ رُونما ہو چکا ہے۔ ملک صاحب کی حویلی کے سامنے سوگواروں کا ہجوم سا تھا۔ سوگوار اور خوشی سے تمتماتے ہوئے چہروں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ''رب خیر کرے'' تاراج نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

حویلی کی گویا اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ ملازموں کی لاشیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ ملک صاحب زخموں سے چُور تھے۔ سانسوں کا رشتہ ٹوٹا تو نہیں تھا مگر کٹی ہوئی ڈور کی طرح ہلکے سے جھٹکے کا منتظر تھا۔ سجاول کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا مگر وہ ایک کونے میں بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔

''سجاول! یہ...... یہ سب کیا ہو گیا؟ کون ہے اس بزدلانہ فعل کا ذمے دار؟'' رضوان نے تپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اگر یہ چوہدری حشمت کی کارروائی ہے تو اس کے سارے خاندان کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں''۔ راجو نے سن رکھا تھا کہ دیہاتی معاشرے میں دشمنیاں باقاعدہ ''پال پوس'' کر جوان کی جاتی ہیں۔ رنجشوں کی نشوونما کی جاتی ہے لیکن حیران کُن بات یہ تھی کہ سجاول نے لاتعلق سی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''سجاول خان! تم بولتے کیوں نہیں؟'' ڈینی نے بڑی رسان سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ مگر سجاول نے اسے بھی پہچاننے سے صاف انکار کر دیا۔

اچانک تاراج نے رضوان سے سرگوشی کی۔ ''سجاول خان آپے میں نہیں ہے''۔

''کیا مطلب؟''

''اس دیے کے اندر کی لو بجھ گئی ہے یا بجھا دی گئی ہے۔ اس کے پلے کچھ نہیں رہا''۔ تاراج نے وضاحت کی۔

''مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر دکھائی دیتا ہے''۔ رضوان نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ، اپنے پراجیکٹ کی خبر لیں''۔

جن کمروں کو وہ بطور ورکشاپ استعمال کیا کرتے تھے ان کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ کام کی ہر شے غائب تھی اور آہنی الماری سے ''بلیو پرنٹ'' والی فائل بھی غائب ہو چکی تھی۔

''ڈینی! دشمن وار کر گیا''۔ رضوان نے بکھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہم نے تو فائل کی فوٹو کاپی بھی نہیں کروائی تھی''۔

''مگر یہ کیسے ممکن ہوا؟ ہم نے اس قدر رازداری سے کام لیا اور پھر دشمن ہماری سرزمین پر اتنی دور تک کیسے

آ سکتا ہے؟'' ڈپٹی نے احمقانہ سی بات کی۔ زیاں کی شدت کے پیش نظر وہ سامنے کی بات تک سمجھنے سے قاصر تھا۔

''تمہارے خیال میں کوئی مہاراج، ماتھے پر قشقہ سجائے نہرو ٹوپی پہنے یہاں آیا ہوگا''۔ راجو نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''آج کے بازار میں سستی ترین شے انسان کا ضمیر ہے۔ دشمن کو ضمیر فروش ہمیشہ دستیاب تھے، ہیں اور رہیں گے۔ کبھی خوشگوار چہرے کی جھلک، کبھی لکشمی دیوی کی چمک، کبھی دونوں کا استعمال۔ یہ واردات نہ نئی ہے اور نہ انوکھی۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ حملہ آوروں نے پاکستانی فوج کی وردیاں پہن رکھی ہوں گی۔ فوجی جوان سے شناختی کارڈ طلب کرنا ویسے بھی نامناسب سی حرکت شمار ہوتی ہے''۔

ملک صاحب کو طبی امداد فراہم کی گئی۔ لاشوں کی تجہیز و تکفین کے بعد وہ سب سجاول خان کی طرف متوجہ ہوئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سجاول اپنے آپ کو اجنبی ماحول میں دیکھ رہا ہے۔ اس کی گفتگو میں بھی کوئی ربط نہیں تھا۔

''جسم پر خراش تک نہیں لیکن شخصیت مکمل طور پر بدل دی گئی ہے''۔ ہنگامی طور پر بلوائے گئے ڈاکٹر نے معائنے کے بعد فیصلہ سنا دیا۔ ''آج میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ایسی کیفیت صرف ایک انجکشن سے پیدا کی جاسکتی ہے۔ میرے خیال میں آپ ان کو شہر منتقل کردیں مناسب علاج سے افاقے کی امید ہے''۔

معجزاتی طور پر ملک صاحب روبہ صحت ہونے لگے۔ سجاول کو راولپنڈی منتقل کردیا گیا۔ جہاں مسیحاؤں نے بدترین خدشات کی تصدیق کردی کہ سجاول کے ذہن کو مستقل طور پر ماؤف کردیا گیا ہے۔ اگر مریض بچ گیا تو ذہنی معذوروں کی سی زندگی بسر کرے گا۔

''ڈاکٹر صاحب! سجاول کا آئی کیو (Quotient Intellegence) ایک عام آدمی سے کہیں زیادہ تھا۔ کیا دوا سے کسی کی ذہانت کو بھی لوٹا جاسکتا ہے؟'' رضوان نے تصدیق چاہی۔

''ڈاکا تو سرمائے پر ہی ڈالا جاتا ہے''۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ''دولت مند سے دولت چھینی جاتی ہے، ذہین شخص کو ذہانت سے محروم کردیا جاتا ہے۔ آج نفسانفسی کے دور میں تو لوگ مفلسی تک لوٹ لے جاتے ہیں''۔

''تو گویا دشمن نے ہمارے منہ پر طمانچہ مارا ہے''۔ راجو نے یہ بات زیر لب کہی۔

ملک صاحب حال دل سنانے کے قابل ہوئے تو انہوں نے واردات کی تفصیل بیان کی۔ ''ایک شخص کپتان کی وردی میں آیا۔ ایک فوجی ٹرک میں سپاہی سوار تھے۔ سارے آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے''۔

''آپ ان میں سے کسی کو پہچان سکتے ہیں؟'' رضوان نے پوچھا۔

''راجو پتر کیسی بات کر رہے ہو؟'' ملک صاحب نے بڑے عجیب لہجے میں کہا۔ ''میں تو ان سب کو روزِ حشر میں بھی پہچان لوں گا لیکن حشر بپا ہونے سے پہلے میں ان کو عذاب جہنم کا مزہ ضرور چکھاؤں گا''۔ ملک صاحب کچھ دیر تک اپنی کیفیت پر قابو پاتے رہے۔ ''ان میں سے کسی ایک کا بھی فوج سے تعلق نہیں تھا۔ وردیاں بے شک انہوں نے پہن رکھی تھیں''۔

''سب سے پہلے آپ کو کس پر شک ہوا؟'' ڈپٹی نے بصد احترام پوچھا۔

''کپتان پر''۔ ملک صاحب اس کیفیت میں بھی مسکرانے لگے۔ ''خنزیر دے پتر کو حجامت تک بنوانے کی توفیق نہ ہو سکی۔ کیا تم نے کبھی کوئی ایسا فوجی کپتان دیکھا ہے جس نے کاندھوں تک زلفیں بکھیر رکھی ہوں؟ لیکن شاید وہ عجلت میں تھے۔ میں نے اس کی یونٹ وغیرہ کے متعلق سوال کیا تو وہ چوکنا ہوگیا پھر سب کچھ آناً فاناً ہو

گیا"۔

"آپ کو مزاحمت نہیں کرنا چاہیے تھی"۔ رضوان کے ہونٹوں پر وہ ناگوار فقرہ آ ہی گیا۔

"بندوق پستول نے جواں مردی کی بے حرمتی کر رکھی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے لیکن میں آخری عمر میں عمر بھر کی انا کو اپنے ہاتھوں سے کیسے کچل سکتا ہوں۔ ذرا مجھے صحت مند ہو لینے دو"۔

"نہیں ملک صاحب! جس کی اولاد جوان ہو اسے خود ہتھیار اٹھانے یا میدان میں اترنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ نے بھری محفل میں مجھ سے ایک رشتہ استوار کیا تھا۔ اب اس رشتے کو نبھانے کا وقت آ گیا ہے"۔ رضوان نے بڑے پیار سے ملک صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

ملک صاحب کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کو بڑی ملائم نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"خدا نے فلک شیر کا نعم البدل مجھے عطا کر دیا ہے"۔ ملک صاحب نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "بندہ اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اب مجھے تم سے تنہائی میں دو ایک باتیں کر لینی چاہئیں۔

ڈیپی تو فوراً باہر نکل گیا مگر وہ تابو رانی جو اب تاراج خاتون بن چکی تھی اور اس کی کایا بھی پلٹ چکی تھی، بڑی بے تکلفی سے ملک صاحب کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ "ملک صاحب! دھیاں کولوں کاہدا پردہ (بیٹیوں سے کس شے کا پردہ) تسیں ٹھیک ہو جاؤ میں اپنے ہتھاں نال ویریاں نوں قبراں وچ دباں گی" (آپ ٹھیک ہو جائیں میں اپنے ہاتھوں سے دشمنوں کو قبروں میں دفن کروں گی"۔

ملک صاحب نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنا دست شفقت بلند کر کے اس کے سر پر رکھ دیا۔ "راجو پتر! ایک خوشخبری سنو! دشمن اپنی طرف سے میرا کام تمام کر چکا تھا۔ ان کا پہلا ہدف میں ہی تھا کیوں کہ میں نے اس کپتان کو پہچان لیا تھا"۔ یہ الفاظ انہوں نے سرگوشی میں ادا کیے۔ "اگر تم لوگ مجھے اعتماد میں لے لیتے تو شاید وہ کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ میں حملہ آوروں کا اچھی طرح "استقبال" کرتا مجھے تو اس بہروپئے کپتان کی زبانی معلوم ہوا کہ تم لوگ قومی اہمیت کے پراجیکٹ پر کام کر رہے تھے؟"

"ملک صاحب! کچھ باتیں صرف عمر کے ساتھ سمجھ میں آتی ہیں"۔ رضوان نے اعتراف کیا۔ "ہم لوگ صرف یہ چاہتے تھے کہ ہمارے کام کی بھنک کم سے کم کانوں میں پڑے"۔

ملک صاحب نے بہروپئے کپتان کا نام، گاؤں وغیرہ کا مکمل پتا رضوان کے گوش گزار کیا۔ "میری خواہش ہے کہ میں اس کپتان کو اپنے انداز سے سبق سکھاؤں اور مجھے امید ہے کہ تم لوگ مجھے اس "سواد" سے محروم نہیں کرو گے"۔

"ملک صاحب! میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس خنزیر کو آپ کے قدموں میں موت نصیب ہو گی"۔ تاراج نے کمال روانی سے گفتگو کی تو ملک صاحب حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"اس خاتون پر میں نے بہت محنت کی ہے"۔ رضوان نے دوسری بار اعتراف کیا۔ "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اپنا لہجہ اور انداز گفتگو بہتر تھا"۔

"گویا تم نے بڑی محنت سے اسے بگاڑا ہے؟" ملک صاحب نے مختصر مگر جامع تبصرہ کیا۔

"تاراج خاتون! میرا خیال ہے تمہاری آزمائش کا وقت آ گیا ہے"۔ رضوان نے تابو سے کہا۔

(اس سنسنی خیز کہانی کا بقیہ حصہ آئندہ ماہ میں ملاحظہ فرمائیں)